رنگا رنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ

ماہنامہ

نئے اُفق

کراچی

ابتدائیہ

سچی کہانیاں

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

ناول

مغرب سے انتخاب

مستقل سلسلے

خط و کتابت کا پتا: ماہنامہ نئے افق پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74200 فون نمبر 021-35620771/2
فیکس 021-35620773 یکے از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز ای میل info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

مملکت خداداداِ اسلامی ورعمرہ کے مسائل

پاکستان دنیا کے نقشے پر واحد مملکت ہے جو خالص اسلام کے نام پر وجود میں آئی ہے۔اس کے آئین میں اور کاروبار سلطنت چلانے کے تمام اہداف میں اسلام اور نظریہ اسلام شامل ہے اور اب تو جونئی حکومت وجود میں آئی ہے الحمدللہ اس کے حکمرانِ اعلیٰ جناب میاں محمد نواز شریف نہ صرف خود بڑے دیندار اور اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزار بندے ہیں اور سونے پر سہاگہ ان کے مراسم سعودی عرب سے بھی بڑے بلکہ سب سے زیادہ خوش گوار ہیں۔ وزیراعظم نواز شریف سے امید کی جاسکتی ہے کہ وہ زائرین عمرہ وحج کے مسائل پر نہ صرف توجہ فرمائیں گے بلکہ ان کا مناسب حل بھی پیش کردیں گے۔

میاں صاحب اور ان کی پوری فیملی خوب اچھی طرح جانتی مانتی اور سمجھتی ہے کہ حرمین شریفین کی ایک مسلمان کے لیے کیا اہمیت وحیثیت ہے۔ان مقدس مقامات کی زیارت ودیدار کا شوق وجذبہ ہر مسلمان کے دل میں مچلتا تڑپتا ہے ہر باہوش مسلمان جو اگر صاحب حیثیت ہوتا ہے تو وہ اپنی یہ آرزو ضرور پوری کرتا ہے اور جو نادار وغریب غربا لوگ ہوتے ہیں وہ بے چارے اس روز بروز بڑھتی ہوئی مہنگائی کے ہاتھوں دل مسوس کر رہ جاتے ہیں اور اب تو بتدریج زیارت حرمین شریفین یعنی عمرہ وحج اس قدر مہنگا ہوگیا ہے کہ سفید پوش درمیانہ درجے کے افراد کے ہاتھوں سے بھی نکلا جارہا ہے۔اس سفر مقدس کے راستے کو دن بدن مشکل تر بنایا جارہا ہے افسوس کہ یہ سب کچھ صرف ایک ایسی ریاست' ایک ایسی مملکت خداداد میں کیا جارہا ہے جس کا وجود ہی اللہ اور اس کے رسول کے نام پر ہوا۔

اس سفر مقدس عمروحج کے خواہش مندوں کو سب سے پہلی مشکل تو پاسپورٹ بنوانے میں پیش آتی ہے اس کے بعد ویزے کا حصول جسے سفری ایجنٹوں نے مشکل بنادیا کیونکہ سعودی وزارت حج وعمرہ نے عمرے کا تمام تر نظام ٹریول ایجنسیوں کے سپرد کردیا ہے۔ پاکستانی معتمرین سے ویزے کی فیس دیگر ممالک کے مقابلے میں کہیں زیادہ وصول کی جاتی ہے۔ یہ بات اعداد وشمار سے ہی ثابت ہورہی ہے جو ممالک ویزا فیس ادا کرتے ہیں ان میں برطانیہ سے سعودی حکومت ایک سوستر ریال ویزہ فیس وصول کرتی ہے۔امریکا سے 180 ریال' ملائشیا' انڈونیشیا سے 190 ریال جبکہ پاکستان سے ربیع الاول سے جمادی الثانی میں 450 سعودی ریال اور رجب میں یہ 600 سو ریال ہوتی ہے۔ پھر شعبان مکرم میں یہ فیس بڑھ کر 720 سعودی ریال ہوتی ہے اور رمضان میں یہ ویزا فیس 1070 سعودی ریال کے برابر ہوجاتی ہے۔اس فیس میں سفری ایجنٹ عام دنوں میں تو معتمرین کو ٹرانسپورٹ کی سہولت مہیا کرتے ہیں لیکن رمضان کے مبارک مہینے میں یہ سہولت یعنی ٹرانسپورٹ کی سہولت ختم کردی جاتی ہے اور ٹرانسپورٹ کے لیے الگ سے رقم وصول کی جاتی ہے۔اس مہنگائی کے باوجود سعودی حکومت نے اس بار عمرے کا کوٹہ

کم کردیا ہے گزشتہ سال پاکستان سے تقریباً چار لاکھ چھ ہزار آٹھ سو معتمرین رمضان میں اس سفر مقدس پر روانہ ہوئے تھے جبکہ اس سال اس کوٹے کو کم کر کے صرف 78 ہزار کردیا گیا ہے۔ پاکستان جو سعودی عرب کا ایک برادر ملک ہے اور سعودی عرب کے حکمران پاکستان کے ساتھ ہر اچھے برے وقت میں ساتھ دیتے رہے ہیں پھر جانے کیوں اور کس وجہ سے پاکستانی معتمرین کے ساتھ یہ امتیازی سلوک روا رکھا جارہا ہے۔ پاکستان سے دنیا بھر سے کہیں زیادہ افراد حج وعمرے کی سعادت حاصل کرنے ہر سال حرمین شریفین کی حاضری کے لیے جاتے ہیں۔ان کے ساتھ تو خصوصی رعایت کا معاملہ ہونا چاہیے پھر برادر اسلامی ملک ہونے کے ناتے پاکستانی معتمرین خصوصی برادرانہ رعایت کے حق دار ٹھہرتے ہیں۔

تمام اسلامی اور غیر اسلامی ممالک کی وزارتیں اپنے معتمرین کی پوری طرح دیکھ بھال کرتے ہیں ان کے مسائل حل کرنے کے لیے پوری طرح کوشاں رہتے ہیں لیکن ہماری مملکت اسلامی کے اہل کار موجود تو ہوتے ہیں لیکن بے چارے بے خبر ہوتے ہیں انہیں پتا ہی نہیں ہوتا کہ جس مملکت خداداد کی نمائندگی اور سفارت کی ذمہ داری انہیں سعودی عرب میں سونپی گئی ہے اس کی کچھ ذمہ داریاں بھی ہیں اکثر لوگ تو سفارشی بھرتی والے ہوتے ہیں جنہیں سفارتی آداب کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ سعودی وزارت حج نے خصوصاً پاکستانی معتمرین کے لیے اس سفر مقدس کو مشکل ترین بنادیا ہے۔ ہر معتمر سعودی ایجنٹ کے قبضہ میں کردیا گیا ہے تاکہ وہ سعودی عرب میں کہیں غائب نہ ہوسکے۔ سعودی عرب کی وزارت حج کی فراہم کردہ تمام سہولیات کو پاکستانی سفارت کاروں نے اپنی بے خبری بے پروائی کے باعث مشکل تر بنادیا ہے اور ہماری وزارت حج کو پاکستان سے بھیجے جانے والے حجاج ومعتمرین کے معاملات پر توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں ہے ہاں ان کا کام تو صرف اتنا رہ گیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ معتمرین کو سعودی عرب بھیج دیا جائے اس کے بعد ان کا کام ختم۔ سعودی حکومت جانے اور پاکستانی معتمرین۔

اب جبکہ پاکستان جو اسلامی مملکت خداداد ہے کی حکمرانی ایک سعودی عرب کے دوست جناب میاں نواز شریف اور ان کے رفقا کو مل چکی ہے ان سے امید اور درخواست ہے کہ وہ پاکستانی معتمرین کے لیے سہولیات پہنچانے میں اپنا اہم ترین کردار ادا کریں گے۔ اللہ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ہمارے حکمرانوں کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ پاکستانی حجاج اور معتمرین عمرہ کے لیے وہ تمام سہولیات فراہم کرسکیں جو ان کا جائز حق بنتی ہیں۔



گفتگو

عمران احمد

> حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمایا کرتے تھے ”اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں فکر سے، غم سے اور کم ہمتی اور کاہلی و بزدلی سے اور بخل و کنجوسی سے اور لوگوں کے دباؤ سے۔“ (البخاری و مسلم)

عزیزان محترم...... سلامت باشد!

شکر الحمدللہ انتخابات بخیر و خوبی ہوگئے۔ نئی حکومت نے حلف بھی اٹھالیا اور پہلا بجٹ بھی پیش کردیا۔ کچھ لوگوں نے بجٹ کو عوام دشمن قرار دیا ہے تو کچھ اسے متوازن قرار دے رہے ہیں۔ حکمرانوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے اگر کچھ سخت فیصلے کیے ہیں تو اس سے ”عام آدمی“ زیادہ متاثر نہیں ہوگا۔ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے تب سے ہم اس ”عام آدمی“ کو تلاش کررہے ہیں۔ جو نجانے کس مٹی کا بنا ہوا ہے کہ وہ نہ تو بجلی کی بڑھتی ہوئی قیمت سے متاثر ہوتا ہے نہ پیٹرول اور گیس کے نرخ بڑھنے سے۔ دو دن قبل اخبارات میں خبر شائع ہوئی ہے کہ اسٹیل ملز کا ایک ملازم دو ماہ سے تنخواہ نہ ملنے پر برین ہیمبرج کا شکار ہوکر اور علاج کی سہولتیں نہ ملنے کی وجہ سے چل بسا۔ کچھ عرصہ قبل پنجاب میں ایک ماں نے اپنے بچوں سمیت دریا میں کود کر خودکشی کرلی کہ وہ اپنے بچوں کو روٹی نہیں دے سکتی تھی۔ ایک باپ نے محض اس لیے اپنے بچوں کو قتل کرکے خودکشی کرلی کہ وہ اپنے بچوں کو نئے کپڑے نہیں دلاسکتا تھا۔ یہ لوگ شاید ”خاص آدمی“ تھے جو حالات کی تلخیوں سے متاثر ہوگئے ورنہ تو ہمارے حکمرانوں کا ”عام آدمی“ متاثر نہیں ہوتا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تھا کہ اگر فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مرگیا تو روزِ قیامت مجھے اس کا جواب دینا ہوگا۔ شاید ہمارے سیاسی رہنماؤں کو یقین ہے کہ ان سے روز قیامت کوئی سوال جواب نہ ہوگا۔ نہ ان سے سوئس بینکوں میں رکھی دولت کا حساب ہوگا نہ لندن کے کروڑوں ڈالر کے فلیٹوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ شاید ایسا ہی ہو کیونکہ اصل مجرم یہ سیاسی رہنما نہیں بلکہ ہم سب بحیثیت مجموعی پوری قوم ہے۔ جو انہیں اپنا حکمراں چنتی ہے کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ہمارے ہاں سیاسی رہنما تو بہت ہیں لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ حضرت عمرؓ حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ جیسا لیڈر کوئی نہیں۔ ایسے لیڈر کیسے پیدا ہوں گے۔ فرصت کی گھڑیوں سے چند لمحے مستعار لے کر اس پر سوچیے گا ضرور......

شہناز بانو...... کراچی۔ محترم عمران بھائی السلام علیکم اور دعائیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ تمام لوگ بخیر و عافیت ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم سے میں اب ٹھیک ہوں۔ طبیعت ذرا گڑبڑ ہوگئی تھی۔ اتنے محبت کرنے والے ساتھیوں کی دعائیں ہیں اللہ آپ سب کو ہمیشہ خوش رکھے۔ خاص طور پر میرے بھائی عبداللہ شاہد جس طرح اور جس محبت سے مجھے بجیا کہتے ہیں دل خوشی سے سرشار ہوجاتا ہے الیکشن کا شور تھا ہو بھی گئے اب رہ گئیں ایک دوسرے پر دھاندلی کی الزام تراشیاں جس وقت میرا یہ خط پڑھا جارہا ہوگا وزیراعظم کا انتخاب ہوچکا ہوگا۔ اب تو یہی دعا ہے کہ اللہ پاک ہمارے ملک کے سربراہ کو نیک ہدایات اور آخرت میں جواب دہی کا خوف عطا فرمائے کیونکہ اللہ تعالیٰ جتنی بڑی ذمہ داری عطا کرتا ہے حساب بھی اسی طرح لیا جائے گا۔ لو بھئی فیصلہ ہوگیا اب نئے افق لیٹ ملا کرے گا۔ کوئی بات نہیں ہم یہ انتظار بھی برداشت کرلیں گے کیونکہ جس سے پیار ہو اس کے نخرے بھی برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ اس مرتبہ جناب امجد جاوید صاحب کا خط شامل

ہے۔ پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ آپ کے ناول پر میں فی الحال اپنا تبصرہ محفوظ رکھتی ہوں۔ آئندہ بھی ضرور آیئے گا۔ واجد نگینوی صاحب کو اس مرتبہ سب نے آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ یہ بات نوٹ کی تھی کہ ان کے نام سے جو کلام چھپ رہا ہے اس کے نیچے شاعر کا نام کیوں نہیں دیا جارہا۔ کیونکہ ظاہر ہے میں دیکھ رہی تھی کہ کلام تو کسی اور شاعر کا ہے اس بات کی نشاندہی میں نے گزشتہ شمارے میں کردی تھی۔ جناب واجد صاحب کیا فائدہ ہوا ایسی گری ہوئی حرکت کرنے کا سوائے اس کے کہ ”بڑے بے آبرو ہوکر تیرے کوچے سے ہم نکلے“ انجم فاروق ساحلی تمہاری اسٹوری کہاں ہے۔ گردش کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ ریاض حسین قمر تمہاری محبت اور پسندیدگی کے لیے بہت شکریہ۔ حیدر حسن ابدال سے تشریف لائے ارے بھائی تمہارا کون بچھڑ گیا۔ بتا تو دیا ہوتا۔ اب ہم فکر مند ہورہے ہیں۔ تم نے حضرت عمر فاروقؓ کی مثال خوب دی۔ بھیا کیا ہمارے اعمال ایسے ہیں کہ ہمیں حضرت عمرؓ جیسا حکمراں ملے۔ محمد اسلم جاوید شاعر ہیں صرف شاعری کی بات کرتے ہیں۔ نثر کو لفٹ نہیں کراتے۔ کیا ایسی ہی بات ہے آپ۔ بہت اچھے شعر کہتے ہیں اس شمارے میں بھی آپ کی غزل اچھی ہے۔ بھائی ریاض بٹ یہ جان کر دکھ ہوا کہ مہروں کی تکلیف میں مبتلا ہیں میں اس کیفیت کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت عطا فرمائے۔ پچھلے دنوں میری یہ تکلیف اتنی زیادہ بڑھ گئی تھی کہ دونوں ہاتھ متاثر ہوگئے تھے۔ خاص طور پر سیدھا ہاتھ اور ڈاکٹر نے مجھے لکھنے سے بھی منع کردیا تھا۔ جس پر میں نے کہا کہ ایسا نہیں ہوسکتا چاہے کچھ ہو کتنی ہی تکلیف ہو لکھنا نہیں چھوڑ سکتی۔ اگر ایسا ہوا تو نجانے میرا کیا حال ہو ویسے بھی اب دیگر رسائل میں لکھنا چھوڑ دیا ہے۔ صرف نئے افق کے لیے لکھتی ہوں۔ گردش کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ بھائی فقیر لنگاہ گفتگو میں میں کہاں آپ کو بھولتی ہوں۔ آپ بھی کوئی بھولنے والی شے ہیں دعاؤں اور گردش کو پسند کرنے کے لیے بہت شکریہ۔ عبدالمالک کیف تم رہتے تو صادق آباد میں ہو لیکن تمہارے ادبی کہنے سے میں سمجھتی ہوں کہ تمہارا تعلق سندھ سے ہے۔ گردش میں تمہیں سرمئی اور حشام کی محبت اچھی لگ رہی ہے۔ ثمروز کی جدوجہد نہیں، بہت خوش رہو۔ گفتگو کی محفل میں میرا پیارا بھیا عبداللہ بیٹھا ہے چپ چاپ سب کی سنتا رہا اب بولا اور خوب بولا۔ کیسے ہو میرے بھائی تم نے جس محبت سے مجھ سے گفتگو کی۔ اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔ کیا کروں صرف دعا ہی دے سکتی ہوں۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو سارے جہاں کی خوشیاں اپنے بھیا کے دامن میں بھر دیتی۔ پتا ہے عبداللہ میرے ماشاءاللہ تین بھائی ہیں لیکن تینوں اپنے گھر اور بچوں میں اتنے مصروف ہیں کہ مہینوں انہیں اپنی بہن کو فون کرنے کا خیال تک نہیں آتا۔ بہنیں تو ہمیشہ بہت پیار اور دعائیں کرتی ہیں لیکن بھائی انہیں گھروں سے رخصت کرنے کے بعد بھول کیوں جاتے ہیں۔ میرے ابو نے میرے لیے زندگی کا بہترین ساتھی منتخب کیا ہے میں بہت خوش اور مطمئن ہوں۔ لیکن بھائیوں کی جانب سے ہمیشہ قلق رہتا ہے تم نے بھرے منہ سے پیار سے بجیا پکارا تو دل تمہارے لیے محبت سے بھر گیا۔ اسی لیے تمہارے دکھوں کا سوچ کر دل دکھی ہوجاتا ہے اور تمہاری خوشیوں کے لیے دعا گو رہتی ہوں۔ اللہ کرے تم ہزاروں سال خوشی کے ساتھ جیو، آمین۔ یہ تو تھی قارئین سے گفتگو اب آتے ہیں اپنے نئے افق کی جانب دستک میں جناب مشتاق قریشی صاحب نے بہت بہترین بات کی ہے کہ ہم جو کام خود نہیں کرنا چاہتے اپنے حکمراں سے توقع رکھتے ہیں بات پھر وہیں آجاتی ہے کہ پہلے خود اپنا محاسبہ کریں اپنے اعمال درست کرلیں اپنی فکر و سوچ بہتر ہوگی تو خود بخود بہترین حکمراں ملے گا۔ جزاک اللہ جناب۔ اقرا میں ایک بار پھر اللہ تعالیٰ ہمیں شرک اور ریاکاری سے باز رکھنا چاہ رہا ہے۔ اس لیے پیارے نبی کا فرمان بار بار آنکھوں کے سامنے آرہا ہے۔ اللہ طاہر بھائی کو خوش رکھے۔ بہترین احادیث کا چناؤ کرتے ہیں احادیث تو سب ہی بہترین ہیں لیکن ہمیں کس وقت کس کی زیادہ ضرورت ہے یہ اللہ ہمیں یاد دلاتا ہے۔ سچی کہانیوں میں سب سے بہترین میری سوتن تھی۔ پڑھ کر حقیقت میں رونگٹے کھڑے ہوگئے دل کی کیفیت لفظوں میں بیان نہیں کی جاسکتی۔ دوسرے نمبر پر ”وہ لمحہ“ رہی پھر طاہرہ جبیں تارا کی ”بدلتی رتیں“ رہی۔ طاہرہ یہ کہانی کیا آنچل کے لیے بھیجی تھی؟ ناول ”محبان وطن“

بہت اچھی تھی بس کہیں کہیں کچھ کمی محسوس ہوئی۔ ذکر اس لیے نہیں کروں گی کہ کہانی تحریر کرنے کا ہر ایک کا اپنا انداز ہے۔ گنگا کا پجاری ہمیشہ کی طرح اچھی لگی۔ بے چاری پروین سابقہ پاروتی کو نہ جانے کب اور کہاں امان ملے گی۔ خوش بوئے سخن میں ریحانہ سعیدہ، عبداللہ شاہد، خالد فاروق اور زینب ظفر زریں کا کلام اچھا لگا۔ اس مرتبہ محفل میں بہت سے ساتھی غائب ہیں۔ جناب جاوید مقبول کہاں ہیں آپ، عالیہ طاہرہ اور این شاہین تم سب کے بغیر محفل سونی ہے خط بہت طویل ہو گیا ہے اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گی کہ اللہ ہم سب پر رحم فرمائے، ہمیں ہدایت دے اور شیطان کے شر سے ہمیشہ محفوظ رکھے آمین۔

شھنی ارشاد...... کراچی۔ محترم جناب عمران بھائی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ اللہ کرے سب لوگ خیریت سے ہوں اس مرتبہ نئے افق مہینے کے آخر میں ملا پتا چلا کہ اب دیر سے ہی ملے گا۔ نئے افق میں اس ماہ سچی کہانیوں کی تعداد کم رہی کم تھیں لیکن سب اچھی تھیں۔ ناول محباب وطن زبردست لگی۔ مغرب سے انتخاب بھی ٹھیک تھا۔ مسلسل ناولز تینوں اچھے تھے۔ مجموعی طور پر سارا پرچہ بہترین رہا۔ عمران بھائی اس کو سجانے اور سنوارنے میں محنت بھی تو بہت کرتے ہیں اب یہ بھی سنا ہے کہ پرچے میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں کی جارہی ہیں امید ہے یہ تبدیلیاں اس میں مزید چار چاند لگا دیں گی۔ ہمیشہ کی طرح دستک اور اقراء سے فیض یاب ہونے کے بعد گفتگو کے صفحات کی جانب آ گئی۔ سب سے پہلے شہناز آپی سے ملاقات ہوئی سب سے آگے ہی بیٹھی تھیں۔ ہائے اللہ آپی میں آپ سے شکوہ کروں میری یہ مجال، وہ تو بس...... میں جھینپ کر آگے بڑھ گئی۔ اوہو حاصل پور سے امجد جاوید صاحب تشریف لائے ہیں ویسے یہ حاصل پور کہاں ہے؟ بہت معذرت کے ساتھ جناب مجھے آپ کا ناول سمجھ میں نہیں آیا شاید آگے آجائے۔ عصمت اقبال آپ نے اور ریاض قمر آپ نے اچھا کیا واجد نگینوی کی خوب کھنچائی کی اور عمران بھائی نے انہیں بلیک لسٹ کر دیا۔ واجد صاحب تھوڑی شرم کر لیں۔ انجم فاروق ساحلی میں نے آپ کی حوصلہ افزائی کی اور آپ نے میری، حساب برابر ہو گیا۔ ویسے میں آپ کی کہانیوں کی فین ہوں۔ آپ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ ریاض انکل آپ نے شہناز آپی کے مشورے کو پلو سے باندھ لیا اچھا کیا۔ فائدے میں رہیں گے۔ میرے لیے بھی ان کے مشورے مفید ہوتے ہیں۔ ہائے بے چاری نازش کی کہانی۔ ہر ایک دعائیں کر رہا ہے میرا تو خیال ہے نازش کہ تم اس پر فاتحہ پڑھ لو۔ مل جائے اور چھپ جائے تو گھی کے چراغ جلا لینا۔ انکل فقیر لگتا ہے کچھ ناراض ناراض سے لکھ رہے ہیں بھئی سب لوگ اپنے خطوط میں خاص طور پر ان کا ذکر کیا کریں۔ انکل حقیقت میں میں بہت مصروف رہتی ہوں اور میری مصروفیات کے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہیں۔ ادا عبدالمالک کیف تم نے کیا کہا ذرا ایک بار پھر کہنا۔ میں نے محفل میں آ کر گستاخی کی ہے کس کی شان میں؟ تم نے اپنی تحریر پر تبصرہ نہ کرنے پر جل کر میرے لیے یہ کہا ہے تو تبصرہ اس لیے نہیں کیا کہ......! آگے تم سمجھ دار ہو تم نے بالکل ٹھیک پہچانا۔ نئے افق کے دفتر کے باہر ڈھیر ساری بکریاں بندھی ہیں اور عمران بھائی ساری ردی ان کے آگے ڈال دیتے ہیں۔ اب سمجھ میں آیا کہ کہانیاں کہاں جاتی ہیں۔ جی ہاں، بکریوں کے پیٹ میں...... ہاہاہاہا...... ویسے جلاد مسیحا پسند کرنے کا شکریہ۔ دیکھو ادا کیف غصے میں لال پیلا ہونے کی نہیں ہو رہی ہے۔ میں مذاق کر رہی تھی۔ مجھ سے ہمیشہ جھگڑا کرنے والے عبداللہ شاہد آخری صف میں بیٹھے ہیں۔ جناب میں قطعی غصے میں نہیں ہوں بلکہ آج تو بہت اچھے موڈ میں آئی ہوں۔ شادی کے بعد بھی اسی طرح آتی رہوں گی اور میرے "وہ" نہ تو جاہل ہیں اور نہ ہی باؤلے بلکہ بہت ہی باذوق انسان ہیں۔ میری اسٹوریز اور فضول سی شاعری پڑھ کر نجانے کہاں سے مجھے ڈھونڈتے اور کھوجتے مجھ تک آ گئے اور امی کے بیٹے بن بیٹھے۔ اگر میں نہیں لکھوں گی تو وہ فرمائش کر کے لکھوائیں گے۔ خبردار اب ان کا ذکر عزت کے ساتھ کیجیے گا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ موصوف نے مجھے بغیر دیکھے پسند کیا ہے۔ بعد میں بھانڈا پھوٹے گا میں حجاب کرتی ہوں۔ آپ سب کی ڈھیر ساری دعائیں چاہیے آئندہ ماہ میں مزید دوسرے

ساتھیوں کے بارے میں خوشخبریاں سناؤں گی ان شاء اللہ۔ زندگی رہی تو پھر ملیں گے اللہ حافظ۔

امجد جاوید...... حاصل پور۔ محترم عمران قریشی صاحب۔ اسلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ چوتھی قسط حاضر خدمت ہے۔ اس بار چاہ رہا تھا کہ آپ اور قارئین سے خوب گپ شپ کروں، مگر بات کرنے کا کوئی جواز تو ہو، کوئی موضوع ہو جس پر بات کی جا سکے۔ ابھی تو میں نئے افق کے قارئین کے لئے شاید نیا ہوں، ان سے میرا خیال ہے شناسائی بھی نہیں ہوگی۔ پھر قارئین نے "قلندر ذات کا" پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور نہ اسی حوالے سے کوئی بات سے بات نکلی۔ ممکن ہے قارئین محترم سلسلہ وار کہانیاں دیر سے پڑھتے ہوں اور اپنے خطوط جلدی لکھنے کی وجہ سے ان میں اپنی رائے شامل نہ کر پاتے ہوں۔ خیر، شکریہ محترمہ شہناز بانو آپ کا کہ آپ نے تبصرہ کیا۔ اب دیکھیں ان سے بات کرنے کا موضوع اور موقعہ مل جاتا، اگر وہ یہ بتا دیتیں کہ پہلی کے مقابلے میں دوسری قسط انہیں کیوں متاثر کن نہ لگی، تب مجھے بھی معلوم ہوتا۔ یہ بات آپ سب جانتے ہیں کہ قارئین کی رائے ہی کسی کہانی کو اس کا مقام عطا کرتی ہے۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ لکھاری کے لئے اس وقت آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں جب قارئین تبصرہ آرائی کرتے ہیں۔ لکھاری کو نہ صرف حوصلہ ملتا ہے بلکہ وہ مزید اچھا لکھتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ سب ان معروضات سے اتفاق کریں گے۔ میں اپنے قارئین کے لئے اپنا نمبر دے رہا ہوں، کال یا ایس ایم ایس کے ذریعے وہ اپنا تبصرہ براہ راست مجھے بھی دے سکتے ہیں۔ میرا نمبر ہے 03336347166 مجھے امید ہے کہ آپ مجھے اپنے پن کا احساس دیں گے اجازت۔

ریحانہ سعیدہ...... گڑھی شاہو لاہور۔ محترم عمران بھائی اسلام علیکم اور دعائیں ملک میں بخیر یت الیکشن ہوئے اور ایک جمہوری عمل بڑے عرصے بعد اپنی مدت مکمل کر کے اختتام پذیر ہوا۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ پاکستان کے لئے اچھے حکمران عوام کو اس کے صبر کے پھل کے صلے میں نصیب کرئے کیونکہ جب مئی میں یوم تکبیر منایا جارہا تھا تو عوام کی حالت یہ تھی کہ ایٹمی طاقت ہونے کے باوجود ایک ہاتھ میں سرکنڈوں کا بنا پنکھا اور دوسرے ہاتھ میں پانی کی بالٹی تھی اور سرکاری نلکوں پر لمبی لائن اور لاہور میں تو سی این جی کی ہڑتال تو کیو سواری کے لیے گدھا گاڑیاں میری نوائے وقت کے ایڈیٹر سے بات ہو رہی تھی تو میں نے انھیں مشورہ دیا کہ یوم تکبیر کے ساتھ ساتھ یوم چلینڈو دن بھی منائیں کہ ایٹمی پاور ہونے کے باوجود ہماری حالت جہالت کے دور جیسی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے ایریا میں لوڈشیڈنگ اور پانی کی کمی نہیں تھی پر زیادہ تر علاقے اسی صورت حال کا شکار تھے۔ اب اللہ سے دعا ہے کہ اللہ ہمارے لئے ابوبکرؓ عمرؓ عثمانؓ اور علیؓ جیسے نہ سہی تو کم از کم اچھے حکمران تو ضرور دے جو ڈالرز سے اپنی جیبیں بھرنے کی بجائے عوام کی فلاح پر توجہ دے مشتاق صاحب کی دستک سے واقعی امی کی دستک یاد آ گئی وہ بھی یہی فقرہ کہا کرتی تھیں جیسی روح ویسے فرشتے اب ذرا ہو جائے کہانیوں پر تبصرہ محمد حنیف کی محبان وطن بڑی زبردست کہانی تھی کہ میں نے ایک ہی نشست میں پڑھی اور کھانا کھانا بھول گئی ورنہ پہلے میں قسط وار کہانیاں پڑھتی تھی طعام خاص میں اہم چیز چٹنی بنانا تھی اگر ترکیب بھی لکھ دیتے تو میرا بھلا ہو جاتا کیونکہ اچار چٹنی کا مجھے بہت شوق ہے فوزیہ صاحبہ کی کہانی میں دلچسپ انداز میں بلی کے کردار کو بیان کیا ہے واقعی وفاداری جانوروں سے مشروط ہے کیونکہ انسانوں کے لئے بقول شاعر

ہم کو ہے ان سے وفا کی امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

اسرار صاحب نے چھوٹی سی مگر دلچسپ کہانی کا انتخاب کیا۔ گردش کے بارے میں تو شہناز آپی نے ہمیشہ داد کمیٹی ہے خلیل جبار نے درست کہا کبھی کبھی ایک لمحہ انسان کی زندگی بدل دیتا ہے اور وہ رحمان سے شیطان اور شیطان سے رحمان بن جاتا ہے میری سوتن کچھ خاص نہیں تھی قلندر ذات بہت دلچسپ ہو رہی ہے انجم صاحب نے دلچسپ انداز

میں لڑکیوں کے اہم مسلے جہیز کو بیان کیا اس دفعہ رسالے کا آغاز بھی اچھا تھا اور انجام بھی کمال یعنی اے حمید صاحب کی کہانی باقی سب لکھنے والوں کو مجھے اچھے الفاظ میں یاد رکھتے ہیں سلام کسی بھی لکھنے والے کے لیے تعریف اس کے لیے اتنی اہم ہے ہوتی ہے۔ جیسے پودے کے لیے پانی اسے نشو ونما دیتا ہے اور تر و تازہ رکھتا ہے اور جائز تنقید اور اصلاح بھی اتنی ضروری ہوتی ہے جو اس کی کانٹ چھانٹ کر کے اسے خوبصورت اور پرفیکٹ بناتی ہے عمران بھائی دو کہانیاں اور کچھ شاعری بھیج رہی ہوں شکریہ و سلام۔

محمد حنیف قادری...... پنڈی بھٹیاں۔ ڈیئر ایڈیٹر! نئے افق عمران احمد قریشی صاحب۔ سب سے پہلے تو میں شکر گزار ہوں اس ذات وحدہ لاشریک کا جس کے قبضہ قدرت میں ساری کائنات ہے۔ اس کے بعد میں انتہائی مشکور ہوں نئے افق کی پوری ٹیم کا جس نے مجھے اس قابل سمجھا کہ میری تحریر کو اپنے پرچے میں جگہ دی۔ خصوصاً بالخصوص ایڈیٹر جناب مشتاق احمد قریشی صاحب اور عمران احمد قریشی صاحب کا جنہوں نے مجھ جیسے عاجز و مسکین بندے کو اپنے پرچے میں نمایاں مقام دیا۔ مہنگائی اور ارزانی کے اس دور میں اتنی کم قیمت پر نئے افق کو مارکیٹ میں لانا اور اس طرح سے لانا کہ اس کا معیار بھی کسی مہنگے اور مشہور ڈائجسٹ سے کم نہ ہو یقیناً اس کے لیے پوری نئے افق کی ٹیم مبارکباد کی مستحق ہے۔ میری کہانی خانقاہ درویش پسند کرنے کے لیے میں نئے افق کے قارئین کا انتہائی مشکور ہوں۔ خصوصاً عالیہ انعام الٰہی کا بے حد مشکور ہوں جنہوں نے بھرپور اور انتہائی بہترین الفاظ میں تبصرہ کر کے مجھ میں اور بھی لکھنے کا حوصلہ پیدا کیا۔ محبان وطن پر آپ کی آراء اور تبصرے کا منتظر ہوں۔ آخر میں دعا گو ہوں کہ اللہ پاک اپنی بے انتہا نوازشوں اور رحمتوں سے نئے افق کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے اور نئے افق کے قارئین کے لیے بھی اس ذات بابرکات سے خصوصی دعا کی اپیل کرتا ہوں کہ مولائے کائنات انہیں ہمیشہ خوش و خرم رکھے اور دوستوں کی یہ محفل سدا شاد و آباد رکھے۔

محمد سلیم اختر...... راولپنڈی۔ السلام علیکم آپ کی صحت اور سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ پہلی بار گفتگو میں حاضری دے رہا ہوں۔ اس امر پر کہ آئندہ بھی یہ حاضری لگتی رہے۔ محترم مشتاق احمد قریشی کی دستک صحیح معنوں میں دستک ہوتی ہے بند کواڑوں اور بند ذہنوں اور دماغوں پر میں ان کے کالم بھی خاص طور پر پڑھتا ہوں۔ ان جیسے بڑے لوگوں کو پڑھ کر ہی مجھے قلم اٹھانے اور لکھنے کا کچھ سلیقہ آیا ہے۔ خدا کرے قریشی صاحب کا قلم یوں ہی نشتر چلاتا رہے آمین۔ میں ان تمام بہن بھائیوں اور دوستوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے میری والدہ صاحبہ کی وفات پر میرے دکھ کو محسوس کیا اور میرے درد کو بانٹا خاص کر بہن عالیہ انعام الٰہی کا۔ نئے افق واقعی رنگا رنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ اور خوب صورت جریدہ ہے جسے آپ 37 سال سے تواتر سے شائع کر رہے ہیں یہ کبھی لیٹ نہیں ہوتا کبھی غیر حاضر نہیں ہوتا اور مارکیٹ میں سب سے پہلے اپنی رونمائی کراتا ہے۔ یہ سب آپ کی محنت اور لگن کا نتیجہ ہے اور آپ مبارک باد کے مستحق ہیں پروردگار آپ کو یوں ہی چاق و چوبند رکھے، آمین۔ جون کے شمارے کا سرورق بہت ہی بھلا لگا ہے۔ شدید گرمی کے موسم میں اسے دیکھ کر ٹھنڈک کا احساس نمایاں ہوتا ہے۔ میں بہن شہناز بانو، شہنی ارشاد اور طاہرہ جبیں تارا کی تحریریں پڑھتا ہوں ان کا فین ہوں۔ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ بہن شہناز بانو کی ''گردش'' تو نئے افق کی جان اور پہچان ہے۔ بہن شہنی ارشاد ہمیشہ کڑوی سچائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔ ان سب کو مبارک باد اور دعائیں۔ سلمٰی غزل کی تحریر ''میری سوتن'' اچھی لگی۔ خلیل جبار کا شمار بھی اچھا لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ بہن عالیہ انعام الٰہی کے تبصرے بڑے ہی جاندار ہوتے ہیں۔ ریاض بٹ صاحب، حسن ابدال والے! آپ تو میرے پڑوسی ٹھہرے آپ کی تحریر رسالہ کی جان ہوتی ہے۔ کیونکہ آپ مکمل چھان کر کے کہانی کے ساتھ حاضری دیتے ہیں۔ کبھی پنڈی آنا ہو تو خدمت کا موقع ضرور دیں۔ سید

عبداللہ شاہد صاحب آپ کا تبصرہ اور تحریریں نہایت ہی جاندار ہوتی ہیں آپ کے قلم میں جادو ہے شاید دعا ہے آپ کا قلم یوں ہی چلتا رہے۔ فقیر محمد بخش صابر لنگاہ آپ نئے افق کے سب سے پرانے قاری اور تبصرہ نگار ہیں اور یہ آپ کی نئے افق سے محبت کا ثبوت ہے آپ گفتگو میں پھول بکھیرتے دکھائی دیتے ہیں۔ دعا ہے پروردگار آپ کو سدا سکھی رکھے، آمین۔ ''محبان وطن'' محمد حنیف قادری کی حاصل مطالعہ تحریر ہے۔ مبارک باد حنیف جی۔ بہن ناز سلوش آپ کو ریشم رائٹر ایوارڈ ملنے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں مگر کیا وجہ ہے کہ آپ نے اس تقریب میں شرکت نہیں کی؟ دیگر تمام نئے افق کے قارئین اور دوستوں کو سلام۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ السلام علیکم! اس ماہ کا شمارہ 24 تاریخ کو ملا۔ میں کافی دیر مبہوت سا سرورق کو دیکھتا رہا۔ اتنا منفرد اور خوبصورت سرورق، بہت خوب صفحہ الٹا تو ''یادش بخیر'' کے عنوان سے ایک اشتہار نظروں کے سامنے تھا۔ ہم محترم ابن صفی (مرحوم) کے پرستاروں میں شامل ہیں بلکہ میں تو انہیں اپنا روحانی استاد مانتا ہوں۔ کتاب کا آج ہی سے انتظار شروع کر دیا ہے۔ پلیز زیادہ انتظار نہ کروائیے گا۔ مشتاق احمد قریشی صاحب کی دستک حسب معمول سوچ کے در وا کر رہی ہے۔ بہت خوب اس کے بعد قدم رکھا اپنی محفل میں سب سے پہلا نام یعنی خط بہن شہناز بانو کا ہے۔ بہن میری کہانی کینہ پرور پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ آپ کی کہانیاں میں کافی عرصہ سے پڑھ رہا ہوں۔ موجودہ سلسلے وار کہانی ''گردش'' کا تو جواب نہیں ہے۔ اس بار کی قسط تیز رفتاری کی وجہ سے بہت پسند آئی میں بھی 1974ء سے لکھ رہا ہوں۔ اس بارے میں کبھی تفصیل سے لکھوں گا۔ امجد جاوید صاحب محفل میں خوش آمدید۔ آپ کی کہانی قلندر ذات ایک اچھی کاوش کہی جا سکتی ہے۔ مفصل تبصرہ اگلی ایک دو قسطیں پڑھنے کے بعد کروں گا۔ عصمت اقبال عین آپ کو میری کہانی کینہ پرور حسب معمول پسند آئی، بہت شکریہ۔ پروفیسر صاحب کے متعلق آپ نے اور دوسرے قارئین نے جس طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ ایک افسوس ناک بات ہے۔ سستی شہرت حاصل کرنا کسی طرح بھی اچھی بات نہیں ہے۔ خیر عمران بھائی نے پابندی لگا کر اچھا کیا ہے۔ انجم فاروق ساحلی میری کہانی آپ جیسے منجھے ہوئے لکھاری کے معیار پر پوری اترتی ہے جو میرے لیے خوشی اور اطمینان کا باعث ہے۔ ریاض حسین قمر آپ کی حوصلہ افزائی کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔ آپ کی غزلیں مجھے پسند آتی ہیں اور اکثر میری ڈائری کی زینت بنتی ہیں۔ اپنے شہر حسن ابدال کے حیدر بھائی کا خط پڑھ کر بہت خوشی محسوس ہوئی۔ حیدر بھائی مجھے تو تقریباً پورا حسن ابدال جانتا ہے۔ حیرت ہے آپ نہیں جانتے؟ بہرحال آپ یکم جولائی کو شام چھ بجے حیدر ہوٹل (شاہ جھولنا روڈ) پر تشریف لے آئیں۔ ملاقات ہو جائے گی۔ میری کہانی ''کینہ پرور'' پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ شجاع جعفر آپ کا مختصر خط محفل میں آپ کی موجودگی کا احساس دلا رہا ہے۔ محترم فقیر بخش لنگاہ صاحب آپ کے خط محفل کی جان ہوتے ہیں۔ خدا آپ کو ہمیشہ صحت مند اور خوش و خرم رکھے آمین۔ اس بار آپ کی طرف سے کہانیوں پر تبصرہ نہیں تھا۔ عبدالمالک کیف بھائی آپ کا خط مدلل اور بھرپور ہے۔ کچھ گلے شکوے بھی ہیں۔ ہم تو آپ کی کہانیوں کے فین ہیں۔ میری کہانی کینہ پرور پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ عبداللہ شاہد آپ جس محنت اور لگن سے خط لکھتے ہیں وہ قابل ستائش ہے خدا کرے زور قلم اور زیادہ۔ اب بات ہو جائے کہانیوں کی گردش کے متعلق لکھ چکا ہوں۔ اس بار سچی کہانیوں میں ایک ناول بھی شامل ہے۔ جس کو پڑھ کر محمد حنیف قادری صاحب کو بے اختیار داد دینے کو جی چاہا۔ بہت خوب، بڑی خوب صورتی سے کہانی کو لمحہ لمحہ سطر سطر آگے بڑھایا۔ باقی سچی کہانیوں کی قدر و منزلت اپنی جگہ ایک اٹل حقیقت ہے۔ وہ لمحہ (خلیل جبار) میری سوتن (سلمٰی غزل) بدلتی رتیں (طاہرہ جبیں طاہرہ) اور چھوٹی زندگی (انجم سہوانی) ہر کہانی لاجواب اور سبق آموز ہے۔ باقی کہانیاں ابھی پڑھ نہیں سکا۔ آخر میں قارئین سے گزارش ہے۔ (جو محفل سے غیر حاضر ہیں) وہ جلد از جلد حاضری لگوائیں۔ نام اس لیے نہیں لکھوں گا کہ اگر کوئی نام رہ گیا تو کسی کی دل شکنی ہوگی۔ والسلام

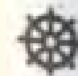
ابن شاہین...... کراچی۔ السلام علیکم! امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ رب ذوالجلال سے دعا ہے کہ وہ ہم سب پر اپنا رحم و کرم فرمائے، آمین۔ باقی تمام اسٹاف اہل نئے افق، تمام حاضرین، قارئین، سرِ معین، مصنفین اور غائبین کو سلام اور دعائیں۔ مشتاق احمد قریشی صاحب کی دستک (جیسی روح ویسے فرشتے) سے فیضیاب ہونے کے بعد گفتگو میں قدم رکھا تو شہناز بانو صاحبہ کو صدارتی کرسی سنبھالے دیکھ کر مسرت حاصل ہوئی۔ آنٹی کو سلام اور کرسی صدارت کی مبارک باد پیش کی جاتی ہے قبول کیجیے۔ آپ نے طبیعت کا پوچھا تو طبیعت کی ناسازی کے باعث ہی تو نہ آپ سے رابطہ کر پائی اور نہ ہی آپ سے ملنے آ پائی۔ اب طبیعت کافی بہتر ہو چکی ہے جبھی آپ سے ملنے کو کسی بھی وقت آسکتے ہیں اور جب تک یہ خط نئے افق میں شامل ہو پائے گا جب تک آپ اسے پڑھیں گی تب تک تو ہم ان شاء اللہ مل بھی چکے ہوں گے اور جہاں تک گردش کے انجان شخص کی بات ہے تو وہ تو آپ کے دماغ سے ہی ٹپکا ہے مگر اس کا تعلق کس سے ہے؟ اور شاہ زمان کے پیچھے کیوں؟ خیر ان سب سوالات کا جواب تو مل ہی جائے گا مگر صبر کرنے سے۔ ہمیشہ خوش رہیں اور زورِ قلم اور زیادہ ہو۔ دوسری تحریر ہے امجد جاوید صاحب کی سلام جناب اور ویلکم محفل گفتگو میں۔ آپ کی تین سال کی محنت رنگ لائی۔ سمتوں کا اندازہ تو ہو چکا اور مزید بھی قسط در قسط ہوتا ہی رہے گا۔ صبر کرنے والوں کو ہمت سے کام لینے والوں کو اجر یقیناً ملتا ہے اور بہت بہتر بھی۔ تیسرے نمبر پر انجم ساحلی صاحب تشریف لائے مختصر سے تبصرے کے ساتھ دعاؤں کی سخت ضرورت ہے انجم صاحب سب کے لیے دعا کیا کیجیے ہمارے لیے بھی اوہ سوری ایک غلطی ہو گئی تیسرے نمبر پر تو عصمت صاحبہ شامل گفتگو تھیں۔ ہم نے انجم صاحب کو تیسرے نمبر پر بٹھا دیا خیر معذرت مختصر تبصرے کے ساتھ شامل ہوئیں۔ عصمت صاحبہ یہاں تو لوگ خون کے رشتوں کے ساتھ دھاندلی کر جاتے ہیں پھر کیا گلہ کیا جائے ان سے اللہ پاک ایسے لوگوں کو ہدایت اور عقلِ سلیم عطا فرمائے تاکہ یہ غصب اور چوری جیسے فعل سے باز آجائیں۔ خیر سچ اور حق کبھی چھپتا نہیں اور جھوٹ و فریب کی کبھی بھی جیت نہیں ہو سکتی۔ ریاض حسین صاحب نے بھی تصدیق کر دی چور کے بارے میں۔ سلام تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ غزل خوب لکھی آپ نے اس بار چھٹے نمبر پر حیدر صاحب تشریف فرما ہیں۔ جنہوں نے کراچی کے حالات کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ حیدر صاحب افسوس کرنے اور دعا گو ہونے کا شکریہ اور نظم پسند کرنے کا بھی۔ بچھڑ کر جینے کے بھی بہت سے انداز ہوتے ہیں ہر کسی کو اپنا پتا ہوتا ہے۔ اسلم صاحب مختصر تبصرہ بھی خوب تھا آپ کا۔ ریاض بٹ بھائی سلام نظم کی پسندیدگی کا شکریہ۔ شجاع جعفر صاحب نظم پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ اتنا مختصر تبصرہ کیوں؟ فقیر انکل یاد رکھنے اور دعاؤں کے لیے مشکور ہوں۔ اقرا میں طاہر قریشی صاحب نے ریاکاری اور نفاق والی احادیث کا انتخاب خوب کیا۔ اللہ ہم سب کو اپنے اعمال کو درست کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف پورے رسالہ کا مطالعہ تو کر لیا لیکن مصروفیات اور وقت کی کمی کے باعث محبانِ وطن نہ پڑھ پائی۔ نسیم سحر کا انتخاب بہت ہی خوب تھا۔ طعام خاص، تمغہ شجاعت نے دل موہ لیا بہت خوب اسرار احمد کی تحریر لمحہ موت جتنی مختصر تحریر تھی اتنی ہی شاندار اور سبق آموز رہی۔ گردش کے تو کیا ہی کہنے جنید خان جیسے افراد کی تو کہیں بھی اب کوئی کمی نہیں، جہاں بھی دیکھو جنید جیسے بہت سے لوگ پائے جا رہے ہیں۔ خلیل جبار کی وہ لحبہ بھی اپنے اندر بہت سے سبق لیے موجود تھی۔ واقعی ایک جملہ ہماری پوری زندگی بنا بھی سکتا ہے اور بگاڑ بھی سکتا ہے۔ قلندر ذات دیکھتے ہیں مزید کتنے رخ پر لے جاتی ہے۔ بدلتی رتیں اچھی رہی۔ چھوٹی زندگی انجم سہوانی صاحب کی تو رلا ہی گئی۔ خوش بوئے سخن اور ذوق آگہی میں سارے کلام، ساری تحریریں پسند آئیں، اچھی رہیں۔ آخر میں فیورٹ رائٹر اے حمید صاحب کا ناول گنگا کا پجاری بھی خوب زور و شور سے اپنی منزلیں طے کر رہی ہے اور آخر میں تمام غیر حاضروں کو حاضر ہونے کی تلقین کی جاتی ہے دعاؤں کی درخواست کے ساتھ اجازت اللہ پاک ہم سب کا اور پاکستان کا حامی و ناصر ہو، آمین۔

شجاع جعفری...... تلہ گنگ۔ السلام علیکم! بھائی عمران امید ہے کہ آپ اور آپ کی ساری ٹیم بخیر و عافیت ہو گی۔ پچھلی دفعہ تو ماہنامہ نئے افق 17 تاریخ کو مل گیا تھا اس بار پرچے کے لیے بہت چکر لگائے تب جا کر 21 تاریخ کو ملا۔ سرورق ہمیشہ کی طرح بہت خوب صورت تھا۔ اس کے بعد دستک مشتاق احمد قریشی کی پڑھی جس سے علم میں مزید اضافہ ہوا۔ پھر اقرا کی طرف گئے اور احادیث پڑھ کر علم میں اضافہ کیا۔ اس کے بعد گفتگو کی طرف آگئے۔ پروفیسر صاحب جیسے لوگوں کے ساتھ ایسا ہی کرنا چاہیے۔ سب سے پہلا خط ہمیشہ کی طرح آنٹی شہناز بانو کا تھا جو لکھنے میں اپنی مثال آپ ہیں۔ اس کے بعد امجد جاوید حاصل پور نے شرکت کی بہت شکریہ۔ ریاض حسین قمر منگلا ڈیم السلام علیکم بھائی جان آپ نے کہا کہ خط کا سائز بڑھا دیں بھائی اتنا اس گرمی میں کہاں لکھا جاتا ہے۔ بہت بہت شکریہ۔ جو آپ نے مجھ غریب کو اپنے تبصرے کے قابل سمجھا۔ عصمت اقبال عین، منگلا ڈیم اور انجم فاروق لاہور کو سلام۔ محمد اسلم جاوید صاحب بقول ریاض حسین قمر کے جلدی سے آئے اور چلے گئے۔ ریاض بٹ حسن ابدال سے آئے سلام آپ کو ہماری طرف سے۔ اس کے بعد فقیر محمد بخش صابر لنگاہ صاحب خانیوال کی خوشبو سے بھری تحریر پڑھی۔ آپ نے مجھ ناچیز کو یاد فرمایا آپ کا شکریہ۔ اس کے بعد عبدالمالک کیف صاحب کی تحریر نے اپنے الفاظ کے پھول بکھیرے۔ محترم نے کراچی کا ذکر کیا یہ سب سیاستدانوں ہی کا کیا دھرا ہے۔ اگر ہم کلام الٰہی اور رسول اللہ ﷺ کے طور طریقہ پر چلیں تو برے اعمال سے بچ سکتے ہیں آخر میں سید عبداللہ شاہد سے ملے آپ کا تبصرہ پسند آیا آپ کی نظم (گیت) پسند آئی۔ سچی کہانیوں میں میری سوتن (سلمٰی غزل) چھوٹی زندگی (انجم سہوانی) کی بہت پسند آئی۔ خلیل جبار اور طاہرہ جبیں تارا کی کہانیاں اچھی تھیں۔ محمد حنیف قادری (محبانِ وطن) نسیم سحر (طعام خاص) فوزیہ ناہید (تمغہ شجاعت) اسرار احمد (لمحہ موت) تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں مصنفین کو مبارک باد۔ مستقل سلسلے بھی اچھے تھے۔ بالخصوص گنگا کا پجاری، خوش بوئے سخن میں ریحانہ سعیدہ، سید عبداللہ شاہد، ریاض حسین قمر، عصمت اقبال عین، فقیر محمد بخش صابر لنگاہ کی تحریریں پسند آئیں۔ باقی تمام غزلیں نظمیں اچھی تھیں۔ ذوق آگہی میں تمام لوگوں نے بہت اچھا لکھا۔ آخر میں اللہ سے دعا ہے کہ جموں کشمیر کے مسلمانوں کو بھارت سے نجات دلائے امید ہے کہ ایک دن ضرور کشمیری عوام آزاد ہوں گے۔ والسلام

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی۔ محترم عمران صاحب السلام علیکم۔ سادہ، جاذب نظر اور کھلے ہوئے رنگوں کے ساتھ مزین بہترین ٹائٹل سے میگزین ملا اور معصوم سی بچی کے پیچھے زمانے کے دشمن کو برا کی شکل میں آ رہا ہے مگر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ فہرست سے معلوم ہو گیا کہ قسطوں والے قصے چار ہو گئے اور جن کی وجہ سے ہماری بچی کہانیاں سکڑ کر صرف 4 رہ گئیں۔ عمران جی محبانِ وطن تقریباً 70 صفحے کی دے دی گئی دو قسطوں میں کر لیتے تو تین چار کہانیاں اور آ جاتیں خیر...... دستک حسب معلوم بیسٹ تھی۔ حدیث شریف سر آنکھوں پر۔ گفتگو میں شہناز بانو صاحبہ کا تفصیلاً تبصرہ، سیاسی باتیں اور گلے شکوے خوب۔ جی ہاں مشکل الفاظ لکھنا بھی ایک فن ہے اور رعب کی دھاک بٹھانا، آپ کی گردش تو زبردست جا رہی ہے اور میں پڑھتا ہوں تو کھو جاتا ہوں۔ کبھی کبھی جلدی اور کبھی کبھی دیر سے ختم کرتا ہوں۔ امجد جاوید صاحب سوری میں تمام قسطوں والی کہانیاں نہیں پڑھتا۔ بہرحال اچھی ہی رہی ہو گی۔ عصمت اقبال عین اور ریاض قمر آپ لوگوں نے تفصیل سے سرقہ کے متعلق بتایا ہے۔ پچھلے سال ان کی ایک کہانی 1965ء کی جنگ کے پس منظر میں شائع ہوئی تھی وہ میرے زیر مطالعہ رہ چکی تھی چلیے ڈاکٹر نگینوی سزا مل گئی۔ انجم فاروق ساحلی کی قسط بھی شائع ہو گئی۔ مگر ہمیں یاد کرنے کی بھی زحمت نہ کی۔ ریاض حسین قمر جی یاد آوری کا شکریہ۔ آپ کا تبصرہ میرے خیال میں سب سے بہتر رہا ہے اور اس دفعہ بھی عبداللہ شاہد نے یہ کیسے کہہ دیا کہ تم (نازش) نئے افق کی کہانیاں

نہیں پڑھتیں باقی نازش خود ہی بتائیں گی۔ چاروں سچی کہانیاں بہترین تھیں خاص طور پر طاہرہ جبیں تارا کی۔ باقی بھی ایک سے بڑھ کر ایک۔ مغرب سے انتخاب میں لمحہ موت تو زبردست رہی اور تمغہ شجاعت بھی۔ ہاں اس دفعہ کہانیوں پر سلمٰی غزل اور طاہرہ جبیں تارا کا نام نہیں تھا۔ خوش بوئے سخن بہت زبردست تھا اور ذوق آگہی تو عفان احمد کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ویسے آپ کے حوصلے اور بوجھ نہ بننے والی عادت نہایت ہی قابل ستائش ہے اتنے صفحے اور اتنی کم قیمت دوسرے میگزین اس سے بھی کم صفحات اور دگنی قیمت پر بک رہے ہیں۔

فقیر محمد بخش صابر لنگاہ...... خانیوال۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ میں فقیر محمد بخش صابر لنگاہ اپنے صاحبزادوں محمد شفاعت حسنین صابر لنگاہ اور محمد ثقلین صابر لنگاہ سمیت آپ کی دل سے کی گئی دعاؤں کے طفیل خیر خیریت سے ہوں۔ پیارا ماہنانہ بذریعہ ڈاک 13 تاریخ کو موصول پا کر دلی خوشی ہوئی اور دل سے دعا نکلی کہ ماہنامہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے کیونکہ اس نے مجھے بہت محبت دی' پیارے دوست دیئے' بہن بھائی دیے بلکہ بھرپور خاندان دیا جسے ''خاندان نئے افق'' کہا جا سکتا ہے۔ پہاڑی علاقے میں پانی کا چشمہ و جھیل' سبزہ و ہریالی' شیش ناگ کا پھن نکال کر کھڑا ہونا اور پھولوں کے درمیان سے فراک پہنے نو دس سالہ بچی کا ہاتھوں میں سامان لے کر بے خبر ہو جانا' نئے درختوں کے علاوہ ایک پرانے درخت کا لہلہانا جیسے تناظر کی عکاسی کرتا ہوا سرورق دل کو بھایا۔ سرورق سے گزر کر اشتہارات پر پہنچا تو دکھ ہوا کہ کارکن ماہنامہ نئے افق کوئی خاص محنت کا ثبوت نہیں دے رہے۔ مشتاق احمد قریشی صاحب کی خوشبو سے مزین دستک سبق آموز رہی۔ اقرأ محترم طاہر قریشی روحانی فیض اور کار خیر کا سبق لیے ہوئے تھا اگلے سبق کا انتظار رہے گا۔ روحانی علاج کا سبق آموز سلسلہ جب سے آپ نے حافظ شبیر احمد صاحب سے شروع کروایا ہے کافی ذہنی جسمانی اور روحانی مریضوں نے اس سے فیض اٹھایا اور اٹھا رہے ہیں یہ بھی ایک کار خیر کا کام ہے۔ خوشبوئے سخن میں صدارتی نمبر محترمہ ریحانہ سعیدہ نے حاصل کیا مبارک ہو۔ باقی سید عبداللہ شاہد' عصمت اقبال عین' زینب ظفر زریں کے انتخابات نے دل خوش کر دیا۔ فقیر کی ارسال کردہ نظم کو اشاعت میں شامل کیا گیا بہت بہت شکریہ۔ باقی بہن بھائیوں کے انتخاب بھی اچھے تھے۔ ذوق آگہی میں برادر عفان احمد نے فقیر لنگاہ کے ارسال کردہ انتخاب پر غور کرنا اور اشاعت میں شامل کرنا چھوڑ دیا ہے اس لیے اس ماہ بھی غیر حاضر رکھا گیا کوئی بات نہیں شکریہ اور دعائیں۔ باقی وسیم اختر نے ''پانچ باتیں'' پیش کر کے صدارتی نمبر حاصل کیا بہت مبارک ہو۔ باقی لوگوں کا انتخاب بھی بہت خوب تھا۔ کہانیوں میں خصوصاً گنگا کا پجاری' محبان وطن' گردش' قلندر ذات کے ساتھ ساتھ ایک اور سچ بیانی بدلتی رتیں محترمہ طاہرہ جبیں تارا ان سب عزیزان نے اپنی اپنی اسٹوریز پر بھرپور توجہ دی اور داستانوں میں رنگ بھر دیے۔ میری طرف سے ان سب لکھاریوں کو مبارک باد اور اگلے شمارے تک ان کی نئی تحریروں کا انتظار رہے گا۔ باقی اس ماہ ریاض بٹ صاحب' ناز سلوش ذشے صاحبہ اور شہنی ارشاد کی کوئی بھی تحریر پڑھنے کو نہ ملی جس کا افسوس ہے۔ گفتگو میں اس دفعہ ایک صفحہ کی کمی آئی وجہ؟ محفل میں صدارتی کرسی شہناز بانو نے حاصل کی مبارک باد دیگر تبصرہ بہت خوب صورت رہا پسند آیا۔ فقیر کے لیے دعا کرنے پر دلی شکریہ۔ اللہ پاک آپ سب کو اپنی امان میں رکھے۔ دیگر خطوط میں امجد جاوید' عصمت اقبال عین' انجم فاروق ساحلی' ریاض حسین قمر' حیدر صاحب' محمد اسلم جاوید' ریاض بٹ' شجاع جعفر' عبدالمالک کیف' سید محمد عبداللہ شاہد کے ہمراہ فقیر محمد بخش صابر لنگا کے خیالات کو گفتگو میں شامل کیا گیا اس کے لیے شکریہ۔ محفل سے کافی بہن بھائی غیر حاضر رہے۔ حاضر اور غیر حاضر سب عزیزوں کو فقیر محمد بخش صابر لنگاہ کی طرف سلام اور دعائیں۔ اگلے ماہ تک کے لیے اجازت اللہ حافظ۔



اقرأ

ترتیب: طاہر قریشی

ریا کار عابدوں اور عالموں کو جہنم کا سخت ترین عذاب:۔

(تشریح) جہنم کے اس خندق ''حب الحزن'' میں ڈالے جانے والوں کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''القراء'' کا لفظ بولا ہے' اس کے معنی زیادہ عبادت کرنے والے کے بھی ہو سکتے ہیں' اور قرآن کے علم اور قرآن پڑھنے میں خصوصیت اور امتیاز رکھنے والے کے بھی ہو سکتے ہیں۔ پس حضور کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جہنم کے اس خاص کنوئیں یا خندق میں وہ لوگ جھونکے جائیں گے جو بظاہر اعلیٰ درجہ کے دیندار' علم قرآن کے سرمایہ دار اور بڑے عبادت گزار ہوں گے لیکن حقیقت میں اور باطن کے لحاظ سے ان کی یہ ساری دینداری اور عبادت گزاری ریا کارانہ ہوگی۔

قیامت کے دن دوزخ میں ڈالے جانے کا پہلا فیصلہ ریا کار عالم و عابد' ریا کار مجاہد و شہداء اور ریا کار سخی کے بارے میں کیا جائے گا:۔

(۲۵۹)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' سب سے پہلا شخص جس کے خلاف قیامت کے دن (دوزخ میں ڈالے جانے کا) فیصلہ عدالت خداوندی کی طرف سے دیا جائے گا ایک آدمی ہوگا جو (میدان جہاد میں) شہید کیا گیا ہوگا' یہ شخص خدا کے سامنے لایا جائے گا' پھر خداوند تعالیٰ اس کو بتائے گا کہ میں نے تجھے کیا کیا نعمتیں دی تھیں' وہ اللہ کی دی ہوئی سب نعمتوں کا اقرار کرے گا' پھر اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا بتا تو نے ان نعمتوں سے کیا کام لیا؟ (اور کن مقاصد کے لیے ان کو استعمال کیا) وہ کہے گا (میں نے آخری عمل یہ کیا ہے) کہ میں نے تیری راہ میں جہاد کیا' یہاں تک کہ میں شہید کر دیا گیا (اور اس طرح میں نے سب سے عزیز اور قیمتی چیز اپنی جان بھی تیری راہ میں قربان کر دی) اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹ کہتا ہے تو نے تو جہاد میں حصہ اس لیے اور اس نیت سے لیا تھا کہ تیری بہادری کے چرچے ہوں' سو (تیرا یہ مقصد حاصل ہو چکا اور دنیا میں) تیری بہادری کے چرچے ہو لیے' پھر اس کے لیے خداوندی حکم ہوگا اور وہ اوندھے منہ گھسیٹ کے جہنم میں ڈال دیا جائے گا...... اور اسی کے ساتھ ایک دوسرا شخص ہوگا' جس نے علم دین حاصل کیا ہوگا اور دوسروں کو اس کی تعلیم بھی دی ہوگی اور قرآن بھی خوب پڑھا ہوگا' اس کو بھی خدا کے سامنے پیش کیا جائے گا' اللہ تعالیٰ اس کو بھی اپنی بخشی ہوئی نعمتیں بتائے گا' وہ سب کا اقرار کرے گا' پھر اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا' بتا تو نے میری ان نعمتوں سے کیا کام لیا؟ (اور ان کو کن مقاصد کے لیے استعمال کیا) وہ کہے گا خداوند! میں نے آپ کا علم حاصل کیا اور دوسروں کو سکھایا اور آپ ہی کی رضا کے لیے آپ کی کتاب پاک قرآن میں مشغول رہا' اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو نے یہ بات جھوٹ کہی' تو نے تو علم دین اس لیے حاصل کیا تھا اور

قرآن تو اس لیے پڑھتا تھا کہ تجھ کو عالم و قاری اور عابد کہا جائے سو (تیرا یہ مقصد تجھے حاصل ہو چکا اور دنیا میں) تیرے عالم و عابد اور قاری قرآن ہونے کا چرچا خوب ہولیا' پھر اس کے لیے بھی خداتعالیٰ کا حکم ہوگا اور وہ بھی اوندھے منہ گھسیٹ کے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ اور اسی کے ساتھ ایک تیسرا شخص ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بھرپور دولت دی ہوگی' اور ہر طرح کا مال اس کو عطا فرمایا ہوگا' وہ بھی خدا کے سامنے پیش کیا جائے گا' اللہ تعالیٰ اس کو بھی اپنی نعمتیں بتلائے گا (کہ میں نے دنیا میں تجھے یہ یہ نعمتیں دی تھیں) وہ سب کا اقرار کرے گا پھر اللہ تعالیٰ اس سے بھی پوچھے گا کہ تو نے میری ان نعمتوں سے کیا کام لیا؟ (اور کن مقاصد کے لیے ان کو استعمال کیا) وہ عرض کرے گا' خداوند! جس جس راستہ میں اور جن جن کاموں میں خرچ کرنا تجھے پسند ہے' میں نے تیرا دیا ہوا مال ان سب ہی میں خرچ کیا ہے' اور صرف تیری رضاجوئی کے لیے خرچ کیا ہے' اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو نے یہ جھوٹ کہا' درحقیقت یہ سب کچھ تو نے اس لیے کیا تھا کہ دنیا میں تو سخی مشہور ہو (اور تیری فیاضی اور دادودہش کے چرچے ہوں) سو (تیرا یہ مقصد تجھے حاصل ہوگیا' اور دنیا میں) تیری فیاضی اور دادودہش کے چرچے خوب ہولیے' پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لیے بھی حکم ہوگا اور وہ بھی اوندھے منہ گھسیٹ کے دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔

(صحیح مسلم)

(تشریح) العظمتہ اللہ! کس قدر لرزا دینے والی ہے یہ حدیث اسی کی بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اس حدیث کو بیان کرتے وقت کبھی کبھی بیہوش ہوجاتے تھے۔ اسی طرح حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا گیا ہے کہ ایک دفعہ ان کے سامنے یہ حدیث بیان کی گئی تو وہ بہت روئے' اور روتے روتے بے حال ہوگئے۔

اس حدیث میں جن تین اعمال کا ذکر ہے یعنی علم دین کی تحصیل و تعلیم' قرآن مجید میں مشغولیت اور راہ خدا میں جانی اور مالی قربانی' ظاہر ہے کہ یہ تینوں اعلیٰ درجہ کے اعمال صالحہ میں سے ہیں اور اگر اخلاص کے ساتھ یہ عمل ہوں تو پھر ان کا صلہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور جنت کے اعلیٰ درجات ہیں لیکن یہی اعمال جب دکھاوے اور شہرت کے لیے یا اسی قسم کے دوسرے دنیوی مقاصد کے لیے کیے جائیں تو اللہ کے نزدیک یہ اس درجہ کے گناہ ہیں کہ دوسرے سب گنہگاروں (چوروں' ڈاکوؤں اور زناکاروں) سے بھی پہلے جہنم کا فیصلہ ان ہی کے لیے کیا جائے گا اور یہی سب سے پہلے جہنم میں جھونکے جائیں گے۔ اللھم احفظنا!

(بشکریہ معارف الحدیث از مولانا محمد منظور نعمانیؒ)



فولادی لڑکی

انجم فاروق ساحلی

زندگی کو ہر دم داؤ پر لگانے والی ایک حسینہ کا قصہ

ہر قوم میں غدار وطن ہوتے ہیں اور وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے ہر حد پار کرجاتے ہیں. کیوں کہ ان کا مقصد صرف پیسہ ہوتا ہے' جسے پانے کے لیے وہ اپنی مادر وطن کا سودا کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے.

جہاں غدار وطن ہوتے ہیں وہیں مادر وطن بھی ہوتے ہیں اور ان کی زندگی کا مقصد ملک پر جان نثار کرنا ہوتا ہے کیوں کہ ان کی زندگی ملک کی حفاظت سے شروع ہوتی ہے اور اسی پر ختم ہوجاتی ہے. وہ خود کو غدار وطن کہلانے سے بہتر شہید کہلوانا پسند کرتے ہیں. کیوں کہ شہید کبھی مرا نہیں کرتے جب کہ حرام موت مرنے والوں کی صرف ایک ہی جگہ ہے اور وہ ہے جہنم.

زیر نظر کہانی ایسی جانباز لڑکی کی ہے جس نے اپنا سب کچھ وطن کے سپرد کرنے کا عہد کر رکھا تھا.

ایک ناقابل فراموش ناول جس کی ہر سطر تجسس اور تحیر سے بھرپور ہے

سڑک کا سناٹا مجروح ہوا اور دوڑتے قدموں کی آواز مسلسل سنائی دینے لگی۔ شام کا وقت تھا اور گلشن اقبال لاہور کے سامنے واقع گلشن بلاک کی دوسری سڑک اس وقت سنسان تھی کہ اچانک چوک کراس کرتے ہوئے ایک دراز قامت اور خوب صورت لڑکی اس طرف آئی اور بے تحاشا دوڑتی چلی گئی۔

چار نوجوان جو غنڈے قسم کے دکھائی دیتے تھے اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر جھنجلاہٹ کے آثار تھے۔ لڑکی برق رفتار پھرتیلی اور تیز طرار تھی۔ جیسے بلی چوہے کا کھیل کھیل رہی ہو۔ اس کے سنہرے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ سانس بری طرح پھولا ہوا تھا لیکن پھر بھی وہ بڑی تیزی سے بھاگتی چلی جارہی تھی۔ کبھی کبھی وہ مڑ کر غنڈوں پر نگاہ بھی ڈال لیتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک سرخ بیگ بھی تھا۔

''لڑکی ہے یا چھلاوہ استاد۔'' ایک غنڈے نے کولہو کے بیل کی مانند ہانپتے ہوئے لڑکھڑا کر کہا۔

''ہاں ہے تو بڑی تیز طرار لیکن بچے گی نہیں' استاد کے پنجے سے۔'' غنڈوں کے دراز قامت انچارج نے منہ سے آگے نکلے ہوئے دانت پیسے۔

''استاد آخر تم ریوالور کیوں استعمال نہیں کرتے۔'' تیسرے غنڈے نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''نہیں شکورے شکار کو زندہ پکڑنے میں ہی لطف آتا ہے۔ اسے زندہ پکڑنے سے ہمیں کئی فوائد حاصل ہوسکتے ہیں۔'' استاد نے تیز لہجے میں کہا۔

''تیز بھاگو اور تیز۔'' وہ چلایا کیونکہ لڑکی اب گلی کا موڑ مڑ چکی تھی اور وہ ابھی اس سے چالیس پچاس گز پیچھے تھے۔ ''نکل گئی آفت کی نانی' اگر ہاتھ آگئی تو برا حشر کریں گے۔'' چوتھا غنڈہ رنگین مزاج تھا۔ وہ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ وہ عیاش لمحوں کا تصور کر رہا تھا۔

چاروں نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ اپنی رفتار اور تیز کردی لیکن جب وہ گلی کا موڑ مڑے تو دھک سے رہ گئے۔ آگے راستہ سنسان پڑا تھا۔ لڑکی کا کچھ پتا نہ تھا۔

موڑ مڑتے ہی زمرد نے سرخ بیگ پر اپنی گرفت کچھ اور مضبوط کرلی اور گلشن اقبال میں غنڈوں کو دیئے جانے والے ڈاج کے متعلق سوچ کر مسکرادی۔

اس وقت ایک شاندار گھر کا دروازہ کھلا اور ملازم تھیلا لے کر باہر نکلا۔ وہ کسی دھن میں کھویا ہوا تھا لہٰذا دروازہ بند کرنا بھول گیا وہ آگے نکلا تو زمرد نے گلی پر نگاہ ڈالی وہ سنسان تھی۔ چنانچہ وہ آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر گھس گئی اور پھولی ہوئی سانس کے ساتھ مڑ کر دروازے کو اندر سے لاک کردیا۔ سامنے گیراج میں ایک موٹر سائیکل کھڑی دکھائی دے رہی تھی جس کے پاس ہی دوسری منزل کا زینہ موجود تھا۔ سامنے ڈائننگ ہال سے ایک مرد اور عورت کے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

زمرد نے آؤ دیکھا نہ تاؤ آگے بڑھ کر زینے پر پہنچی اور اوپر چڑھنے لگی۔ زینے کے اختتام پر خوب صورت آراستہ پیراستہ خواب گاہ تھی جس کا دروازہ بھیڑ کر وہ بستر کی طرف بڑھ گئی۔ بستر پر خوشنما لحاف موجود تھا کیونکہ سردیوں کا موسم تھا وہ بے حد تھکی ہوئی تھی اس لیے اس نے تمام خدشات اور خطرات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جوتوں سمیت بستر میں گھس کر لحاف اوڑھ لیا۔ اس کی سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی۔

تھکن نے اسے آنکھیں بند کرنے پر مجبور کردیا۔ وہ چاروں آج صبح سے ہی اس کے تعاقب میں تھے۔ ان سے دوسری ملاقات گلشن اقبال پارک میں ہوئی تھی۔ استاد نے جھیل کے پاس اس کی کمر سے پستول لگادیا تھا لیکن اس نے اچانک نیچے بیٹھتے ہوئے پستول پر چچا تلا ہاتھ مارا اور بھاگ نکلی اور تب سے وہ اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ زمرد تھکی ہوئی تھی اس لیے نیند کی وادی میں اتر گئی۔

اس مکان کی نچلی منزل پر موجود میاں بیوی کھانا کھانے کے بعد پھر باتوں میں مشغول ہوگئے۔ اس وقت رات کے بارہ بج چکے تھے۔ شمشاد علی نے دیوار پر نصب کلاک پر نگاہ ڈالتے ہوئے بیوی کو مخاطب کیا۔ ”شہزاد کی اماں! آج پھر بارہ بج گئے لیکن تمہارا لاڈلا ابھی تک گھر نہیں لوٹا۔ اسے باپ کے کہنے کا کچھ خیال ہی نہیں۔“

”جوان خون ہے اور پھر بدلا ہوا زمانہ ہے‘ کیا کہا جائے‘ سمجھایا تو بہت ہے۔“ شہزاد کی امی نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

”اب اس کی شادی ہوجانی چاہیے اس عمر میں راتوں کو باہر رہنا ٹھیک نہیں‘ کوئی گل کھلا ہی سمجھو۔“ شمشاد علی نے جھنجلا کر کہا۔

”میں کیا کروں‘ اسے کوئی لڑکی ابھی تک پسند ہی نہیں آئی۔ جس کی تصویر دکھائی اس نے انکار میں سر ہلادیا۔“

”ہمارا ایک ہی لخت جگر ہے کہیں وہ بھی نہ بگڑ جائے۔ پہلے زمانے میں لڑکیوں کی فکر رہتی تھی لیکن آج کل لڑکوں کا بھی بڑا دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ بڑی خراب خبریں اور باتیں سننے میں آتی ہیں۔“

”وہ موا کن کھجورا جسے موبائل کہتے ہیں اس نے تو لڑکے لڑکیوں کا بیڑہ غرق کرکے رکھ دیا ہے۔ جسے دیکھو لیلیٰ مجنوں بنا پھرتا ہے۔“ شہزاد کی امی نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔

اس وقت سامنے چلتے ہوئے ٹی وی پر ایک خوب صورت لڑکی ڈرامے میں موبائل پر لڑکے سے باتیں کررہی تھی۔

”اور اس پر مستزاد یہ کیبل شریف ہے جس نے شرافت اور غیرت کا جنازہ ہی نکال کے رکھ دیا

ہے۔“ شمشاد علی نے ناک سکوڑتے ہوئے کہا۔ وہ شہزاد کا انتظار کرتے کرتے اونگھنے لگے اور رات گزرتی گئی۔

☆☆☆

مون مارکیٹ اقبال ٹاؤن میں دبئی چوک کے پاس واقع مکڈونلڈ کی عمارت کے ساتھ بننے والے نئے شاندار کلب کا ڈائننگ ہال رنگین بلبوں اور خوب صورت جوڑوں کے رقص سے جگمگا رہا تھا۔ رقص کا راؤنڈ ختم ہوا تو شہزاد کے ساتھ چپکی ہوئی غزل جو کسی شاعر کے خواب کی مانند حسین و جمیل‘ خوب صورت اور حسن و شباب کا پیکر تھی بڑی لگاوٹ سے باتیں کررہی تھی۔ شہزاد نے قریبی ٹیبل پر بیٹھ کر انار کے جوس کا آرڈر دیا اور دونوں تھکن دور کرنے لگے۔ انہوں نے خوب ہی اچھل کود کی تھی۔ شہزاد چونکہ اب گھر لوٹنا چاہتا تھا اس لیے وہ مزید شراب پینا نہیں چاہتا تھا۔ ڈائننگ ہال کے نیچے واقع بار میں غزل نے اسے لال پری کے کتنے ہی جام اپنے ہاتھوں سے پلائے تھے۔

غزل میز پر شہزاد کی طرف جھکی ہوئی تھی اور اس کی شارٹ قمیص کے کھلے گلے سے اس کا شباب بڑا ہیجان خیز دکھائی دے رہا تھا۔ شہزاد نے اس وقت گھڑی پر نگاہ ڈالی تو اس کے منہ سے ”ارے“ نکل گیا۔ رات کے دو بج چکے تھے۔ ”ارے میں نے تو رات جلدی گھر جانے کا ارادہ کررکھا تھا۔ لیکن تم آفت ہو آفت۔“ شہزاد نے غزل کا ہاتھ تھام کر اسے بیرونی دروازے کی طرف دھکیل دیا۔ اسی وقت بیرا بل لے آیا اور شہزاد نے پانچ سو روپے کا نوٹ تھما کر باقی رکھنے کا اشارہ کیا اور غزل کو کھینچتا ہوا لے گیا۔

”اتنی جلدی بھی کیا ہے ڈارلنگ‘ دیکھو ابھی تو ہر طرف جوانی کی بہاریں اٹھ رہی ہیں۔“ غزل نے زرق برق جوڑوں کی طرف انگلی اٹھائی۔

”تمہیں تو یہاں ویٹرس ہونا چاہیے تاکہ ہر وقت یہیں پھرتی رہو۔“ شہزاد نے صدر دروازے سے باہر نکل کر پارکنگ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں مجھے اس کلب کی ویٹرس ہی بنوادو تاکہ میں تمہاری خدمت کرتی رہوں‘ اپنے گھر تو لے کر نہیں جاتے۔“ غزل نے شکایتی لہجے میں کہا۔

”باہر کی کہانی باہر ہی ٹھیک ہے۔ میرے والدین اپنے اسٹیٹس کو دیکھے بغیر قدم آگے نہیں بڑھائیں گے۔“ شہزاد نے ناصحانہ لہجے میں جواب دیا۔

”ہائے یہ مجبوریاں۔“ غزل نے لڑکھڑا کر ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

”چلو جلدی بیٹھو‘ تمہیں گھر ڈراپ کردوں۔“ شہزاد نے اسے پسنجر سیٹ پر دھکیلتے ہوئے کہا۔ غزل بازو چوڑے کرکے فلمی انداز میں بیٹھ گئی۔ اس کے سینے کا ابھار اس وقت بھی ہیجان انگیز تھا۔

شہزاد نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی دبئی چوک سے نکال کے یتیم خانے کی طرف موڑ دی۔ غزل کا گھر بکر منڈی کی ایک تنگ سی گلی میں واقع تھا۔ سڑکوں پر گاڑیوں کا سیلاب بہہ رہا تھا اور ٹریفک بہت سست روی سے چل رہی تھی۔ شہزاد کو بھی بار بار ہارن بجانا پڑا۔

”ڈیئر شہزاد۔“ غزل جیسے اچانک خواب سے چونک پڑی۔ ”ارے مجھے تو یاد ہی نہیں رہا۔ مکان کا دو مہینے کا کرایہ واجب الادا ہے مالک مکان کل امی سے خوب جھگڑ کر گیا ہے۔ پھر چھوٹے بہن بھائیوں کی فیسیں بھی ادا ہونے والی ہیں اور میری شاپنگ“ غزل نے لفظ شاپنگ کو لمبا کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے یاد ہے لیکن اس وقت چیک بک میرے پاس نہیں‘ کل اتوار ہے لہٰذا پیر کو مجھ سے چیک لے

لینا۔" شہزاد نے سڑک کی مخدوش صورت حال کو دیکھتے ہوئے کہا۔

غزل کچھ گنگنانے لگی۔ شہزاد کو پشیمانی سی ہونے لگی۔ اس نے والدہ سے جلد گھر آنے کا وعدہ کیا تھا مگر یہ "معجون شباب آور" وہ بڑبڑا کر رہ گیا۔ سفر تو تھوڑا سا ہی تھا لیکن شہزاد کو ٹریفک بلاک ہونے کی وجہ سے کافی دیر ہوگئی۔ غزل کو ڈراپ کرنے کے بعد جب وہ گھر کے سامنے پہنچا تو رات کے تین بج چکے تھے۔ بار بار کال بیل بجائی تب کہیں جا کر ملازم نے دروازہ کھولا۔ اس نے گاڑی اندر کھڑی کی اور کھسیانا سا ہو کر ڈائننگ ہال میں داخل ہوا۔ اس کے ابا اور اماں دونوں صوفوں پر اونگھ رہے تھے۔

وہ دبے پاؤں واپس پلٹنے ہی والا تھا کہ اس کی ماں کی آنکھ کھل گئی۔ وہ شہزاد کو سامنے پاکر مسرور ہوئی پھر بولی۔

"بری بات ہے بیٹا تم اپنے قول پر پورے نہیں اترتے۔"

"بس اماں کیا بتاؤں بعض مجبوریاں ہی ایسی ہوتی ہیں۔" شہزاد نے سر جھکالیا۔

"جاؤ۔" شہزاد کی ماں نے تھکے تھکے لہجے میں کہا پھر چونک کر بولیں۔

"کھانا تو کھالیا تھا میرے لال نے۔"

"ہاں اماں جان اچھی طرح کھا چکا ہوں۔" شہزاد نے سعادت مندی سے جواب دیا پھر دروازے کی طرف بڑھا۔ گیراج میں آکر وہ تیزی سے سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ آج شام غزل اس کے آفس میں ہی نازل ہوگئی تھی اور پھر وہ گھومتے پھرے اور اب وہ بھی تھکا ہوا تھا اور فوراً لیٹنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنا بریف کیس الماری میں رکھا' الماری لاک کی اور نائٹ ڈریس پہننے لگا۔ پھر وہ بستر کی طرف بڑھا اور جب قریب جا کر اس نے لحاف کا کونا پکڑ کر الٹا تو اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اس کا نشہ بھی ہوا ہوگیا۔ اس نے غور نہیں کیا تھا کہ لحاف پھیلا ہوا کیوں ہے۔

"ارے یہ کیا؟" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا جو بستر پر لیٹی کسی آسمانی حور کی مانند دکھائی دے رہی تھی اس کے پاس ہی سرخ رنگ کا ایک بیگ تھا جو اس کے ہاتھ میں نیند کی حالت میں بھی دبا ہوا تھا۔

وہ ٹکٹکی باندھے دیکھتا ہی چلا گیا۔ پھر اس نے اپنی انگلی چبا ڈالی لیکن وہ خواب نہیں حقیقت تھی۔ زندہ سلامت ایک دراز قامت انتہائی خوب صورت اور حسین و جمیل لڑکی جس کے جسمانی نشیب و فراز قیامت خیز تھے۔ اس کا پرشباب بدن اس کا خوب صورت چہرہ' نیلی آنکھیں' سنہرے بال اور سرخ سرخ ہونٹ جو فرشتوں کے بھی قدم ڈگمگا دیتے اسے غزل کا حسن بھی ماند معلوم ہوا۔ یہ حسن و شباب کا تراشا ہوا مرمریں پیکر تھی اور غزل کی نسبت اس کے وجود اور سراپا میں ایک وقار اور تمکنت تھی۔ اس نے سوچا کسی کو بلائے' ملازم سے استفسار کرے لیکن پھر وہ کچھ سوچ کر رک گیا۔ آگے بڑھ کر اس نے اسے کندھے سے پکڑ کر جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ وہ کسمسا کر بیدار ہوئی پھر دھیرے دھیرے آنکھیں کھولنے لگی لیکن جیسے ہی اس نے شہزاد کو دیکھا نظریں چار ہوئیں' اس کے اطمینان میں ذرا بھر بھی فرق نہ آیا۔ وہ دھیرے سے صرف مسکرا کر رہ گئی۔ اس کے ہونٹ وا ہوئے اور چمکدار دانتوں کی لڑی دکھائی دینے لگی۔

"آپ..... آپ....." شہزاد پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بولا۔

"ہاں میں۔" اس نے صرف اتنا کہا اور خاموش

ہوگئی۔

"آپ..... آپ کون ہیں؟ اور بلا اجازت میرے کمرے میں کس طرح آ کر لیٹ گئیں۔" شہزاد نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ اس کی نگاہ اس کے سرخ احمریں ہونٹوں پر جم سی گئی تھی۔

"جناب میں ایک لڑکی ہوں کوئی جن بھوت نہیں ہوں۔"

"وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔" شہزاد جلدی سے بولا۔

"بس جناب کیا بتاؤں میں ایک مصیبت زدہ دوشیزہ ہوں میرے تعاقب میں چار خطرناک غنڈے تھے جو مجھے اغوا کرنا چاہتے تھے بس میں بھاگتے بھاگتے ادھر آنکلی اور دروازہ کھلا دیکھ کر اوپر آکر بستر میں گھس گئی۔ میں چور ہرگز نہیں ہوں ورنہ واردات کرتی آرام نہ کررہی ہوتی۔" اس کی آواز بھی بڑی رسیلی اور کھنک دار تھی۔

"اب مزید کیا ارادے ہیں۔" شہزاد نے بستر پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "تمہیں گھر چھوڑ آؤں؟"

"نہیں ایسا غضب ہرگز نہ کریں۔ کم از کم مجھے رات یہیں بسر کرنے دیں۔ وہ غنڈے صبح میرے گھر پر ہی تو حملہ آور ہوئے تھے میں اب وہاں نہیں جاسکتی۔" دوشیزہ نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہ بستر چھوڑنے پر آمادہ نہیں دکھائی دیتی تھی۔

"لیکن محترمہ یہ میری خواب گاہ ہے اور میں رات کے تین بجے تھکا ہوا آرہا ہوں اگر رات آپ نے اس کمرے میں بسر کی تو صبح میں کیا منہ دکھاؤں گا؟" شہزاد نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

"آپ مجھے کوئی اور کمرا دے دیں اس منزل پر۔" زمرد نے شہزاد کو ٹٹولا۔

"اور کسی کمرے میں اس وقت بستر نہیں لگا ہوا۔ نیچے آپ کو میں لے جا نہیں سکتا' اف میں کیا کروں۔" شہزاد نے سر تھام لیا۔ وہ پریشان سا ہو کر رہ گیا لیکن لڑکی کا حسن جہاں سوز اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر چکا تھا۔

"اچھا میں کمبل لے کر قالین یا صوفے پر لیٹ جاؤں گی۔ آپ بستر پر آجائیں۔" زمرد نیچے اترنے لگی۔

"ارے اب رہنے دو۔ اپنی نیند پوری کرو آج میں ہی صوفے پر پڑا رہوں گا۔" شہزاد نے اس کے سراپا پر ایک بھرپور نگاہ ڈالتے ہوئے کمبل اٹھایا۔ مگر پھر رک گیا۔

"میں صبح کیا جواب دوں گا' تم ایسا کرنا صبح ہی صبح گھر سے باہر نکل جانا۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اچھا نکل جاؤں گی بابا۔" زمرد نے تھکے لہجے میں کہا۔

شہزاد کمبل لے کر صوفے پر لیٹ گیا اور جلد ہی خراٹے لینے لگا۔ زمرد بھی رفتہ رفتہ پھر نیند کی وادی میں پہنچ گئی۔

صبح شہزاد کی آنکھ کھلی تو ملازم دن چڑھے باہر سے دراوزہ کھٹ کھٹا رہا تھا۔ وہ چائے کی ٹرالی لایا تھا۔ "ارے غضب ہوگیا۔ میری آنکھ جلد نہ کھلی اب یہ بلا بھی بستر پر موجود ہے۔" شہزاد بڑبڑایا۔ ملازم زور زور سے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ اسی وقت اس کے والد بھی کسی کام سے اوپر آگئے۔ ان کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ شہزاد دھک سے رہ گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ دروازہ کھولوں یا بند رکھوں لیکن پھر اسے چٹخنی گرانی ہی پڑی' اس نے والدین کو صورت حال سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا ورنہ معاملہ زیادہ بگڑنے کا احتمال تھا۔

شہزاد نے تھکے تھکے انداز میں دروازہ کھول دیا۔

ملازم اوراس کے والد شمشاد علی کی نگاہ ایک ساتھ زمرد پر پڑی جوان کی طرف ہی آ رہی تھی۔

"ارے ہائیں یہ کیا؟" اس کے والد شمشاد علی نے پھٹی پھٹی نظروں سے زمرد کو سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے کہا۔ ملازم غلام رسول نظریں چرا رہا تھا۔

"شہزاد بیٹا! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔" شمشاد علی نے اندر آ کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے ملازم کو ٹرالی سامنے لانے کا اشارہ کیا۔ وہ یکدم ہی اپنی عمر سے زیادہ دکھائی دینے لگے تھے۔ شہزاد سوچ رہا تھا کہ کیا وہ میری بات پر یقین کرلیں گے یا بدگمانی میں مبتلا ہوجائیں گے۔ "گھر سے باہر تو تمہاری رنگین مزاجیوں کا مجھے اندازہ ہوچکا ہے لیکن اب گھر کے اندر بھی جسارت کرنے لگے۔" شمشاد علی نے غصیلے لہجے میں شہزاد کو گھورا۔

"ابا حضور میں نے کچھ نہیں کیا صرف رات کو دیر سے لوٹا تو یہ محترمہ میرے بستر پر بے تکلفی سے آرام فرما رہی تھیں میں نے انہیں کہا کہ تمہیں گھر چھوڑ آؤں تو اس نے کہا کہ خطرناک غنڈے اس کی تاک میں ہیں۔" شہزاد نے تیز تیز لہجے میں کہا جیسے کسی بوجھ تلے دبا ہوا ہو۔ شمشاد علی چند لمحے دونوں کو گھورتے رہے پھر بولے۔ "چلو لڑکی تم بتاؤ کیا معاملہ ہے؟"

"سیٹھ صاحب! آپ میرے باپ کے برابر ہیں میں آپ سے بالکل جھوٹ نہیں بولوں گی۔ میں ایک یتیم لڑکی ہوں اور سمن آباد ویگن کے مین اسٹاپ سے اندر آنے والی سڑک سے ملحقہ پہلی تنگ سی گلی میں رہتی ہوں۔ میرے والدین میرے بچپن میں ہی گزر گئے تھے۔ میرے چچا رفیق احمد نے میری کفالت کی۔ مجھے اپنے گھر میں رکھا پھر وہ اپنی بیوی کے کہنے پر مجھے واپس ابو کے گھر میں چھوڑ گئے۔ اب میں جوان ہوگئی تھی اور میری چچی مجھ سے جلنے لگی تھی۔ اس کی اپنی لڑکیاں سوکھی سڑی ہوئی تھیں جبکہ میری بات ہی اور تھی۔" زمرد سانس لینے کے لیے رکی۔ شمشاد علی تیز نظروں سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ زمرد نے پھر سلسلہ کلام جاری کیا۔

"ابو کا اثاثہ ختم ہوچکا' مکان ہمارا اپنا ہے' اب مجھے اخراجات کے لیے ادھر ادھر چھوٹی موٹی ملازمتیں کرکے گزر بسر کرنا پڑ رہی ہے۔ یہ دنیا ہوس پرستوں سے بھری پڑی ہے۔ دو آدمیوں کو تو میں نے بری نیت بھانپتے ہوئے دھتکار دیا اور ملازمت چھوڑ دی۔ وہ میری عزت لوٹنا چاہتے تھے۔ مجھے لڑکپن سے جوڈو کراٹے اور کھیل کود کی عادت تھی میں نے باقاعدہ جوگنگ اور جوڈو کراٹے کی تربیت حاصل کی ہے۔ چار نوجوان غنڈے اکثر گلی کے باہر چوک میں نظر آنے لگے تھے پھر وہ میرا تعاقب کرنے لگے' مجھ سے چھیڑ خانی کی میں نے جوڈو کے ہاتھ دکھائے انہیں زمین چاٹنے پر مجبور کردیا۔ وہ مجھے موبائل فون پر اور خط کے ذریعے دھمکیاں دینے لگے لیکن میں نے انہیں جوتے کی نوک پر رکھا۔ آج صبح چاروں نے خنجروں اور ریوالوروں سے مسلح ہوکر میرے گھر پر حملہ کردیا اور میں مشکل سے جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہوئی' میں پھرتے پھراتے گلشن اقبال پارک میں چلی آئی۔ اتفاق سے وہ چاروں حرامی بھی ادھر ادھر تلاش کرتے پارک میں آ نکلے اور جھیل کے پاس پھر آمنا سامنا ہوگیا۔ غنڈوں کے استاد نے پستول نکال کر مجھے آگے لگالیا لیکن میں نے یکدم نیچے بیٹھ کر پستول پر ہاتھ مارا اور بھاگ کھڑی ہوئی۔ وہ میرے تعاقب میں بھاگنے لگے' میں بھیڑ میں داخل ہوکر پارک سے باہر نکل آئی لیکن وہ خبیث وہاں بھی آ دھمکے اور مجھے پھر بھاگنا پڑا کیونکہ وہ پستولوں اور خنجروں سے مسلح تھے۔ وہ میرا تعاقب کرنے لگے میں بھاگتے بھاگتے آپ کے گھر کے قریب پہنچی تو آپ کا ملازم کسی کام سے باہر جا رہا تھا وہ دروازہ بند کرنا بھول گیا اور مجھے اندر داخل ہوکے اوپر خواب گاہ تک پہنچنے کا موقع مل گیا۔" زمرد نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

"پھر اب کیا کیا جائے۔ ہم پولیس میں رپورٹ درج کروا کے تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آتے ہیں۔" شمشاد علی نے حل پیش کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں سیٹھ صاحب خدا کے لیے ایسا مت کریں۔" "کیوں؟"

شمشاد علی نے چونک کر پوچھا۔ "صاحب وہ اس لیے کہ متعلقہ تھانے دار خود ان غنڈوں کا سرپرست ہے میں اس سے شکایت کرچکی ہوں الٹا اس نے میرے کردار پر تنقید شروع کردی تھی اور ان غنڈوں کو روکنے کے لیے کچھ نہیں کیا تھا۔" زمرد نے التجا کرتے ہوئے کہا۔ "اگر ہوسکے تو مجھے کچھ دنوں کے لیے اپنے ہاں پناہ دے دیں۔ میں خود ان سے نپٹ کے اپنا راستہ صاف کرتے ہوئے نکل جاؤں گی۔"

"کیا یہ اخلاقی طور پر درست ہے میں ایک نوجوان لڑکے کا باپ ہوں اور آزاد روی کا زمانہ ہے اس منحوس کیبل اور موبائل نے......" شمشاد علی دانت پیستے ہوئے بولے۔

"سیٹھ صاحب یہ بھی تو سوچیے اگر آپ میرے جیسی نوجوان لڑکی کے باپ ہوتے اور وہ اس طرح کی مصیبت میں پھنس جاتی تو ...... لہٰذا براہ مہربانی مجھے......" زمرد نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"بہت بے پروا آدمی ہو۔ دروازہ کھلا چھوڑ گئے تم۔" شمشاد علی نے غلام رسول کو جھاڑا۔ اس نے سر جھکالیا۔

"حضور آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔"

"تو جاؤ شہزاد کی امی کو بھیج دو۔" شمشاد علی نے اشارہ کیا۔

محبت خلیل جبران کی نظر میں......!

+ ۔گلشن زیست میں صرف محبت ہی ایک پھول ہے

+ ۔جو بہار کا محتاج نہیں' اس کی نمو اور شگفتگی خزاں اور بہار سے بے نیاز ہے۔

+ ۔محبت صنوبر کی شاخوں کی طرح دل سے شاخ در شاخ پھوٹتی ہے' ایک شاخ کے ٹوٹ جانے سے باقی شاخیں مغموم ضرور ہوجاتی ہیں مگر اپنا وجود نہیں کھو دیتیں' بلکہ ٹوٹی ہوئی شاخ کو پوری توانائی و محبت سے سینچتی ہیں۔ اور پھر کچھ ہی دیر بعد وہاں سے ایک نئی کونپل پھوٹ نکلتی ہے۔

+ ۔جب تم کسی سے محبت کرتے ہو تو اسے آزاد چھوڑ دو......! اگر وہ لوٹ آئے تو اس کی پرستش کرو اور اگر واپس نہ آئے تو سمجھو کہ وہ کبھی تمہارا ہوا ہی نہ تھا۔

+ ۔محبت ایک نورانی کلمہ ہے جسے نورانی ہاتھ نے نورانی کاغذ پر لکھا ہے۔

+ ۔ابدیت سوائے محبت کے کسی اور شے کو دوام نہیں بخشتی' ہر چیز کا کھنڈر ہونا طے ہے سوائے محبت کے۔

+ ۔شک کا طوفان' اور بدگمانی کی برف محبت کے پھولوں کو فنا کرسکتے ہیں مگر بیج نہیں مرسکتے۔

(نوشین اقبال' گاؤں بدر مرجان)

کچھ دیر بعد شہزاد کی امی شانی بیگم بھاگم بھاگ اوپر پہنچیں اور حیرت و استعجاب سے زمرد کو گھور گھور کر دیکھنے لگیں پھر ان کے چہرے پر تحسین آمیز آثار دکھائی دینے لگے۔ زمرد کسی ہیرے کی مانند جگمگا رہی تھی۔ اس کی رنگت اس کا چہرہ اس کا سراپا' اس کے یاقوتی ہونٹ' شمشاد علی بیگم کو ایک کونے میں لے گئے اور دھیمی آواز میں صلاح مشورہ کرنے لگے۔ کچھ دیر

کے بعد وہ قریب آئے اور اپنے فیصلے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹی زمرد تم اپنا شناختی کارڈ دے دو اور تمہیں شہزاد کی امی کے کمرے میں قیام کرنا ہوگا۔"

زمرد نے سرخ پرس کھول کے شناختی کارڈ نکال کے انہیں تھما دیا اور پھر آگے بڑھ کے جھکتے ہوئے شہزاد کی امی کو آداب بجالائی۔ شہزاد کی امی نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دعائیں دیں۔

چائے اور ناشتے کے بعد شہزاد فارغ تھا چونکہ اتوار کا دن تھا لہٰذا شہزاد نے اصرار کرتے ہوئے زمرد کے ساتھ باہر سیر کی اجازت حاصل کرلی۔

اجازت دینے میں بیگم شمشاد پیش پیش تھیں۔

❀ ❀ ❀

شہزاد کی ٹیوٹا کرولا چمکتی دمکتی ہوئی گیراج سے باہر نکل کے دوبئی چوک کی طرف بڑھنے لگی۔ زمرد نہا دھوکر اب زیادہ تروتازہ اور نوخیز دکھائی دے رہی تھی۔ شہزاد گنگنانے لگا۔ اس وقت اس کے موبائل کی بیل بجی۔ شہزاد نے نظرانداز کیا لیکن جب مسلسل بیل سنائی دینے لگی تو اس نے موبائل فون اٹینڈ کیا۔

"ہیلو کون بول رہا ہے۔" اس نے استفسار کیا۔

"ڈارلنگ میں تمہاری جان غزل بول رہی ہوں۔ جس کا ہر شعر لاجواب اور لذیذ ہوتا ہے۔" دوسری طرف سے غزل نے مسکراتے ہوئے دل فریب لہجے میں کہا۔ لیکن شہزاد کے تصور پر تو زمرد کا حسن بے مثال چھایا ہوا تھا۔ اس نے غزل کو ٹال دیا کہ وہ گھر میں مصروف ہے۔ بہت سے مہمان آئے ہوئے ہیں۔ کل کسی وقت رابطہ کروں گا۔" دوسری طرف غزل نے موبائل بند کرتے ہوئے جھنجلا کر کہا۔ "الو کہیں کا۔ مہمانوں میں گھسا ہوا ہے اور میں یہاں انتظار میں سوکھ رہی ہوں۔" غزل نے قدآدم آئینے کے سامنے اپنے نیم عریاں سراپا پر ایک پرتجسس نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ چند لمحے اداس رہنے اور ادھر ادھر کی باتیں سوچنے کے بعد وہ کسی اور نمبر پر رابطہ قائم کرنے لگی۔

❀ ❀ ❀

دبئی چوک کے رش کو پیچھے چھوڑتے ہوئے شہزاد کی کار وحدت روڈ کی طرف بڑھنے لگی۔ اس نے مین روڈ پر رش دیکھ کر گاڑی کو نیلم بلاک سے پائلٹ اسکول کے عقب سے وحدت روڈ پر جا ملنے والی سڑک پر ڈال دیا تھا۔ دونوں اس بات سے بے خبر تھے کہ استاد کے ساتھیوں میں سے کالے رنگ کا ایک غنڈہ جبرو ان کی کار کے تعاقب میں گلشن بلاک کی گلی سے ہی لگ چکا ہے۔ وہ موٹر بائیک پر سوار تھا۔

"استاد وہ دونوں اپنی کار میں نیلم بلاک اور پاک بلاک والی سڑک سے وحدت روڈ کی طرف آرہے ہیں۔ یہ راستہ قدرے سنسان رہتا ہے لہٰذا....." جبرو نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"فکر نہ کرو جبرو آج میرے جبر کا دن ہے۔" دوسری طرف سے استاد کی پرجوش آواز سنائی دی۔

❀ ❀ ❀

شہزاد کی کار جیسے ہی وحدت روڈ کوارٹرز سے ملحقہ قبرستان کے پاس پہنچی ایک تیز رفتار کار سامنے بغلی سڑک سے نکل کر مین روڈ پر آئی اور ترچھی کھڑی ہوگئی۔ راستہ مسدود ہوگیا۔

شہزاد نے زور سے بریک لگائے۔ زمرد چونک اٹھی۔ سامنے راستہ روکے کھڑی کار سے استاد نیچے اتر رہا تھا۔ اس کے دو ساتھی بھی پچھلی سیٹ سے باہر نکلے استاد کے ہاتھ میں لمبی نال والا ریوالور تھا۔ اتنی دیر میں جبرو بھی پیچھے سے قریب چلا آیا اور موٹر بائیک سڑک پر کھڑی کرکے چاقو نکال لیا۔ استاد کے دونوں ساتھیوں کے ہاتھوں میں بھی تیز دھار والے چاقو تھے جن کے پھل سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے ان

کے تیور وحشیانہ اور مسکراہٹیں سفاک تھیں جیسے بلی جنگلی جانوروں میں گھر گئی ہو۔

استاد پستول گھماتا ہوا شہزاد کی گاڑی کی ونڈ اسکرین کے سامنے زمرد کے بالمقابل آکر کھڑا ہوگیا۔ پھر اس نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "لال گڑیا باہر نکل آؤ ہم تم سے اپنا حساب برابر کرنا چاہتے ہیں۔"

"کیسا حساب لفنگو!" شہزاد غصے سے بول پڑا۔ وہ بہادر نوجوان تھا لیکن اس قسم کی صورت حال سے کبھی دوچار نہیں ہوا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

"ابے او خرگوش کی اولاد خاموش رہ ورنہ گھسیٹ کر باہر پھینک دیں گے۔" استاد غصے سے گرجا اور دونوں غنڈے چاقو لیے کار کے اگلے دروازوں کے پاس چلے آئے۔

"کچھ پتا تو چلے آخر تم اس لڑکی کے پیچھے کیوں ہاتھ دھوکر پڑے ہوئے ہو؟" شہزاد نے غنڈوں کی پروانہ کرتے ہوئے آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"اس لال پری نے میرے ایک ساتھی کے بٹوے سے بیس ہزار روپے پار کرلیے ہیں یہ جیب کتری ہے۔" استاد نے کچھ سوچ کر جواب دیا اور پھر زمرد کو باہر آنے کا دوبارہ اشارہ کیا ساتھ ہی اس کی انگلی ٹرائیگر پر دباؤ ڈالنے لگی۔

"استاد میں باہر آرہی ہوں تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کس شیرنی سے واسطہ پڑا ہے۔" زمرد نے ایک جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھولا' سرخ بیگ سامنے ڈیش بورڈ کے اوپر پھینکا اور اچھل کر دروازے سے باہر نکل آئی۔ چاقو والوں پر اس نے ایک مضحکہ اڑانے والی نگاہ ڈالی اور چند قدم چل کر استاد کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ "دیکھتی ہوں کیا بگاڑ لیتے ہو تم۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔ شہزاد زمرد کے تیور پر حیران نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ حسن کے ساتھ ساتھ جرأت کا پیکر بھی تھی لیکن ابھی اس کی قسمت میں اور حیران ہونا لکھا تھا۔ اب استاد اور زمرد آمنے سامنے کھڑے تھے سرخ لباس میں زمرد گل لالہ کا دہکتا ہوا پھول دکھائی دے رہی تھی۔

"لالی! لاؤ وہ سرخ فائل میرے حوالے کردو جو تم نے میرے باس کے کمرے سے چرائی ہے۔" استاد نے دھیمے لیکن سخت لہجے میں کہا اور پستول کا رخ زمرد کی پیشانی کی طرف کردیا۔

"میرے پاس کوئی سرخ فائل نہیں نہ میں نے اسے دیکھا ہے۔ تمہارے باس کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوگئی ہوگی۔ ہوسکتا ہے وہ لڑکی ہی کوئی اور ہو تم خواہ مخواہ....." زمرد نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"تم اس طرح نہیں مانو گی۔ باس کے سامنے تو پتھر بھی بولنے لگتے ہیں۔ جب تمہارا جسم سرخ سلاخوں سے داغا گیا تو تمہارے فرشتے بھی بتائیں گے۔" استاد سانپ کی مانند پھنکارا۔

"چلو تینوں قریب آکر اس کے ہاتھ پیر باندھ دو۔ اسے باس کے پاس لے کر جانا ہے۔"

جبرو تیزی سے نزدیک آگیا۔ دونوں غنڈے بھی زمرد کو گھیر کر آگے بڑھنے لگے۔ اس وقت سڑک پر آنے والے اکا دکا لوگ خطرہ محسوس کرکے گاڑیاں ذیلی سڑک پر اتار کر بھاگنے لگے۔ جان کسے پیاری نہیں ہوتی۔ شہزاد گھبرا کر باہر نکل آیا اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔

اس وقت جیسے ہی گھیرا تنگ ہوا غنڈے رسیاں لیے آگے بڑھے اسی لمحے زمرد کے دائیں ہاتھ میں موجود پڑیا کا سفوف تیز ہوا سے فضا میں بکھرا اور استاد نے زمرد کے ہاتھ کی حرکت دیکھ کر اس کے ہاتھ پر فائر کردیا۔ لیکن زمرد بجلی جیسی تیزی سے زمین پر گر

چکی تھی۔ لہٰذا گولی ضائع گئی اور کار کی چھت سے رگڑ کھاتی ہوئی پیچھے جا کر ایک سوار کے ہیلمٹ سے ٹکرائی اور وہ ایک جھٹکے کے ساتھ موٹر سائیکل سے گر کر گھسیٹتا چلا گیا۔ زمرد نے زمین پر پڑے پڑے گھومتے ہوئے ریوالونگ کک استاد کے زیر ناف مقام پر ماری اور استاد زور سے چیختا ہوا سڑک پر لڑھک گیا اس کے دونوں ہاتھ آنکھوں پر تھے۔ تینوں غنڈے بھی درد سے کراہنے لگے۔ چاقو ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گئے اور وہ اندھوں کی طرح زمرد کی طرف ہاتھ مارنے لگے اسے دبوچنے کے لیے۔ اسی لمحے بجلی سی چمکی اور شہزاد نے دیکھا کسی کے گھونسا اور کسی کے زمرد کی لات پڑی اور کچھ دیر میں ہی غنڈے سڑک پر لمبے لمبے لیٹ چکے تھے۔ زمرد نے استاد کے ہاتھ سے پستول چھین لیا اور پھر شہزاد کی طرف بڑھنے لگی جو اسے پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ”تم...... تم تو فولادی لڑکی ہو بہت جنگجو برق رفتار تمہیں تو پولیس یا فوج میں ہونا چاہیے۔“ شہزاد نے اس کے لیے کار کا دروازہ کھول دیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ دونوں کار میں وحدت روڈ کی طرف سفر کر رہے تھے۔ شہزاد ابھی تک حیرت میں مبتلا تھا۔

”تم نے کمال کر دیا۔“ وہ خوابناک لہجے میں بولا۔

”یہ سب جوڈو کراٹے جمناسٹک کی ٹریننگ اور ذہانت کا نتیجہ ہے۔ ذہانت میرے اندر جاسوسی ناولوں، جاسوسی فلموں اور ڈائجسٹ کی کہانیوں سے پیدا ہوئی میں نے فرضی کرداروں جیسی خصوصیت پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔“ زمرد نے وضاحت کرتے ہوئے سمجھایا۔

”بہر حال تم ایک جانباز لڑکی ہو جو بہادری اور خوب صورتی دونوں میں یکتا ہو۔“

”یہ آپ کی نوازش ہے جو مجھے ایسے خطابات دے رہے ہیں ورنہ میں اپنے آپ کو عام لڑکی ہی تصور کرتی ہوں۔“ زمرد نے موٹر سائیکل پر سوار ایک نوجوان جوڑے کو دیکھتے ہوئے کہا جو ابھی ابھی تیزی سے آگے نکلا تھا۔ لڑکی نے اپنا پورا وزن لڑکے پر ڈال رکھا تھا اور تیز پرفیوم کی مہک تو کار کے اندر تک چلی آئی تھی۔ اس وقت شہزاد نے تیزی سے ایک موڑ کاٹا تو زمرد بھی سرک کر شہزاد کے کندھے سے آ لگی۔ اس کے جسم کے گرم گرم لمس سے شہزاد کو ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ زمرد چند لمحے اس کے کندھے سے ٹکی رہی پھر سیدھی ہو گئی۔

❀ ❀ ❀

زمرد کے لمس نے شہزاد کے اندر ایک بجلی سی بھر دی تھی۔ اس کی کار مسلم ٹاؤن موڑ سے گزر کر نہر والی سڑک پر تیزی سے گاڑیوں کو اوورٹیک کرنے لگی۔ ایک اوپن چھت والی کار میں خوب صورت ماڈرن لڑکیاں سوار تھیں۔ ان کی ادائیں دلفریب تھیں۔ شہزاد نے بڑی تیزی اور مہارت سے انہیں اوورٹیک کیا۔ ایک شوخ لڑکی نے ہاتھ لہراتے ہوئے اسے کچھ اشارہ بھی کیا۔ ”کسی بندر کی اولاد معلوم ہوتی ہے۔“ زمرد نے اس لڑکی کو منکتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

”آپے سے باہر ہو رہی ہے کم بخت۔“ کچھ دیر کی ڈرائیونگ کے بعد وہ مال روڈ پر آ نکلے شہزاد نے چمن آئسکریم کی معروف شاپ کے باہر گاڑی روکی ایک ویٹر لڑکا تیزی سے قریب آ گیا۔ ”آئس کریم کے دو پیالے لے آؤ۔“ شہزاد نے اسے اشارہ کیا۔ ایک منٹ بعد ہی دونوں چمن کی آئسکریم سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ”واقعی بہت مزیدار ہے۔“ زمرد نے عمدہ ذائقے کا اعتراف کیا۔ ”پہلی بار کھانے کا موقع ملا ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے شہزاد کو متوجہ کیا۔ شہزاد بھی مسکرایا اور الٹے ہاتھ سے اس کے بالوں کی

دو شریر لٹیں سنوارنے لگا۔ آئسکریم سے فارغ ہونے کے بعد شہزاد نے زمرد کو پرانی اور نئی انارکلی کی سیر کرواتے ہوئے کچھ ضروری اشیا خریدیں پھر اس کے بعد شہزاد اسے عجائب گھر دکھانے لے گیا۔ زمرد نے ہر چیز کا بغور دلچسپی سے جائزہ لیا کیونکہ وہ صرف بچپن میں یہاں آئی تھی۔ جب وہ بہت چھوٹی تھی۔

عجائب گھر سے باہر نکل کے پرانی انارکلی کے ایک ہوٹل میں دونوں نے دوپہر کا پرتکلف کھانا کھایا۔ یہاں بھی شہزاد کا انتخاب بہترین تھا۔ ہوٹل سے نکل کے شہزاد نے گاڑی کو پلازہ سینما کے راستے پر ڈال دیا۔ واپڈا ہاؤس سے دائیں جانب مڑتے ہوئے وہ سینما کی پارکنگ پر پہنچ گئے۔ فلم بہت رش لے رہی تھی۔ شہزاد کو بلیک میں دو ٹکٹیں خریدنی پڑیں۔ دونوں مسکراتے ہوئے دوسری منزل پر واقع گیلری کی طرف بڑھنے لگے۔

❀ ❀ ❀

سارا ہال اس دلچسپ اور سنسنی خیز سیکونس پر تالیاں بجانے لگا۔ شہزاد اور زمرد بھی بے حد محظوظ ہوئے۔ دونوں فلم دیکھ کر باہر نکلے تو شام ہو رہی تھی۔ اب شہزاد نے کار کو مال روڈ پر پی سی ہوٹل کے راستے پر ڈال دیا۔ پی سی ہوٹل نئی روشنیوں اور آرائشی ماحول کی وجہ سے کسی محل کی مانند جگمگا رہا تھا۔ جوان امنگیں عروج پر تھیں۔ امیر جوڑے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے اندر باہر آتے جاتے نظر آ رہے تھے۔

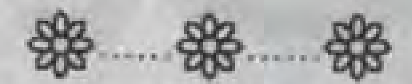
عمدہ اور لذیذ کھانے سے لطف اندوز ہو کر وہ نئے ڈانسنگ فلور پر جوڑوں کا رقص جلتی بجھتی روشنیوں میں دیکھتے رہے پھر باہر صحن میں نکل آئے یہاں سوئمنگ پول روشنیوں سے جگمگا رہا تھا اور شام کے وقت بھی نیم عریاں لڑکیاں تیراکی کے تختے پر رنگ برنگی پریوں کی مانند دکھائی دے رہی تھیں۔ ان سب کا میک اپ ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ کچھ نیم عریاں مرد اور عورتیں چھتریوں کے نیچے لیٹے اور میزوں پر بیٹھے چائے اور کافی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ بڑا خوش گوار

اور مانوس ماحول شہزاد زمرد سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا لیکن وہ چکنی مچھلی کی مانند پھسل پھسل جاتی تھی۔

شام کی چائے پینے کے بعد وہ تفریح سے لطف اٹھا کے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔ جب شہزاد نے وحدت روڈ کی طرف سے دوبئی چوک پر آتے ہوئے کار بغلی سڑک پر ڈالی تو عین اس وقت غزل ایک موٹر سائیکل رکشے پر سوار ان کے سامنے سے گزری نظریں چار ہوگئیں۔ شہزاد نے اسے دیکھا اور غزل نے بھی جلتی ہوئی نگاہ سے دیکھ لیا' غزل غصے سے سلگ اٹھی۔ رکشا نظروں سے اوجھل ہوکر اسکیم موڑ کی طرف نکل گیا۔ گاڑی گلشن بلاک میں داخل ہوگئی۔ اس وقت شہزاد کے موبائل کی بیل بجنے لگی۔ اس نے چونک کر فون اٹینڈ کیا تو دوسری طرف سے غزل کی سلگتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو مسٹر شہزاد' مہمانوں کے ساتھ نہیں بلکہ ایک خوب صورت مہمان کے ساتھ دل لگی کررہے ہو' ہماری کیا پروا ہوسکتی ہے۔''

''غزل ڈیئر! وہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور امریکا سے آئی ہے' لہٰذا میں اسے کمپنی دے رہا ہوں تم بالکل دل چھوٹا نہ کرو۔'' شہزاد نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''دیکھتے ہیں آئندہ کس کا دل چھوٹا ہوتا ہے۔'' غزل نے جھلا کر ذومعنی جملہ بولا اور موبائل آف کردیا۔



گاڑی گیراج میں پارک کرنے کے بعد شہزاد زمرد کو امی جان کے کمرے میں چھوڑ کر دوسری منزل پر واقع اپنی خواب گاہ میں آیا تو بڑے زور سے اچھلا۔ کمرے کا سارا سامان الٹ پلٹ ہوا پڑا تھا۔ گدے زمین پر پڑے تھے۔ میزوں کی درازیں باہر نکلی پڑی تھیں۔ صوفے الٹے ہوئے تھے۔ دیواروں پر موجود تصاویر کے فریم بھی فرش پر بکھرے ہوئے نظر آرہے تھے۔ وہ بے چینی اور اضطراب کے عالم میں اپنے کمرے کا حشر دیکھتے ہوئے سوچنے لگا یہ کس نے کیا اور کیوں انہیں کس چیز کی تلاش تھی۔ وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا پھر چونک کر اس نے ملازم غلام رسول اور مالی کرم دین کو بلوا کر سامان ٹھیک ٹھاک کیا اور والدین کو بے خبر رکھنا ہی بہتر سمجھا اور ملازموں کو بھی کہہ دیا کہ کسی کو نہ بتائیں۔ صرف اس نے زمرد کو باہر بلا کر صورت حال سے آگاہ کردیا اس نے بھی حیرت کا اظہار کیا لیکن کوئی واضح بات نہ کرسکی۔ شہزاد نے اسے اندر بھیج دیا اور کوٹھی کا مسلح دربان جو ڈینگی وائرس کے علاج کے بعد ابھی ابھی واپس ڈیوٹی پر پہنچا تھا' چوکنا ہوگیا کہ اردگرد اور آنے جانے والوں پر نظر رکھے۔ جیسے ہی وہ اندر آکے خواب گاہ میں موجود کمپیوٹر کی طرف بڑھا ایک عجیب سی آواز نے اس کے رونگٹے کھڑے کردیئے۔



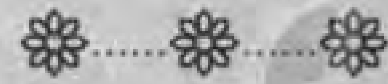
استاد گلبرگ بی کی ایک شاندار کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں اندھیرے میں کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ کمرے میں زیرو کے بلب کی مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی جس میں سر پر ہیٹ جھکائے ایک نصف دائرے کی میز کے پیچھے بیٹھے طویل القامت آدمی کے چہرے پر شدید غصے کے آثار تھے وہ شعلہ بار سرخ سرخ آنکھوں سے استاد کو گھور رہا تھا اس کے چہرے کے نقوش تاریکی اور ہیٹ کے جھکے ہوئے گوشے کی وجہ سے نظر نہیں آرہے تھے۔

''اب میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ جاؤ اور کسی بھی قیمت پر اس لالی کی بچی کو تلاش کرکے اسے میرے قدموں میں لاکر ڈالو تاکہ میں اس سے سرخ فائل حاصل کروں جو وہ میرے ہیڈ کوارٹر کے کمرے سے

اڑا کرلے گئی ہے مجھے کیا معلوم تھا کہ خودکشی کی غرض سے میری کار کے سامنے آنے والی لڑکی ملازمت حاصل کرکے میری ایک قیمتی فائل چرا کرلے جائے گی۔ مجھے وہ پولیس کی ایجنٹ معلوم ہوتی ہے۔'' لمبا آدمی غصے سے بل کھانے لگا۔

''باس میں اپنی پوری کوشش کررہا ہوں اس بار وہ آفت کی پرکالہ میرے ہاتھ سے نہیں بچے گی۔ جہاں اس نے پناہ لی ہے اس آدمی کے کمرے کی پوری طرح تلاشی لے لی گئی ہے لیکن سرخ فائل نہیں ملی۔''

''باتیں بعد میں کرنا فی الحال دفع ہوجاؤ۔'' لمبا آدمی غصے سے گرجا اور استاد اس کے تیور دیکھ کر تیزی سے دروازہ کی طرف بڑھ گیا۔ کوٹھی سے باہر کھڑی اپنی کار میں بیٹھ کر اس نے پھر اپنے ساتھیوں کو کال کی اور کسی طرف روانہ ہوگیا۔



شہزاد چند لمحے دہشت زدہ سے انداز میں کھلے دروازے سے باہر دیکھتا رہا پھر کمپیوٹر سے ہٹ کر باہر کی طرف لپکا وہ بھی بہادر اور دلیرانہ مزاج کا حامل نوجوان تھا۔ اس نے ٹرے سے پھل کاٹنے والی چھری اٹھالی تھی۔

چیخ کی کربناک مدہم آواز کوٹھی کے پائیں باغ سے ابھری تھی۔ ایسا محسوس ہوا تھا جیسے کسی کتے نے کرب کے عالم میں دم توڑا ہو۔ اس نے باغ کے مالی کو حفاظتی کتے بھی چھوڑنے کا حکم دے دیا تھا۔ جب سے اس علاقے میں چوری کی وارداتیں ہوئی تھیں۔ انہوں نے باغ میں رکھوالی کے لیے تین کتے بھی منگوا لیے تھے جن کی دیکھ بھال مالی کرم دین کے ذمے تھی۔ شہزاد راہداری میں سے گزرتا ہوا عقبی زینے کے پاس آیا اور پھونک پھونک کر قدم نیچے بڑھانے لگا جیسے ہی وہ نچلی سیڑھی سے اتر کر چند قدم چل کر

خوب صورت باتیں

☆انسان کو مرغابی کی طرح نہیں ہونا چاہیے جو ایک جگہ سے پانی ختم ہونے پر دوسری جگہ چلی جاتی ہے بلکہ ایسے کنول کی طرح ہونا چاہیے جو وہیں سوکھ کر مرجھا جاتا ہے۔

☆جو انسان اپنے خلوص کی قسمیں کھائے اس پر کبھی اعتبار نہ کرو۔

☆کسی کو اتنا نہ آزماؤ کہ وہ تنگ آکر تمہاری دوستی چھوڑ دے اور تم ایک اچھے دوست سے محروم ہوجاؤ۔

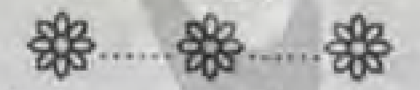
(صائمہ سعید......جھمرہ سٹی)

برآمدے میں پہنچا' عین اسی لمحے ایک پستول کی نال اس کے بالکل سامنے آگئی۔ وہ آدمی کافی لمبا اور لمبوترے چہرے والا تھا۔ اس کے ساتھ ہی استاد اور اس کے تینوں ساتھی بھی اس کے اردگرد آکر کھڑے ہوگئے۔ شہزاد نے چونک کر انہیں دیکھا اور پھر اس کی نگاہ برآمدے کے سامنے باغ میں بے ہوش پڑے دو کتوں پر پڑی تیسرا بلڈاگ اپنے خون میں نہایا ہوا برآمدے کی سیڑھی کے بالکل سامنے پڑا تھا۔ ''میں نے اسے بے آواز ریوالور سے ختم کردیا۔'' استاد نے اپنے پستول کو لہراتے ہوئے کہا۔ ''یہ بڑا خطرناک کتا تھا اس نے گوشت کے ٹکڑے کو سونگھ کر رد کردیا تھا جبکہ دوسرے دونوں کتے گوشت کے پارچے چٹ کرگئے۔''

''تم لوگ آخر چاہتے کیا ہو' تم نے میرے کمرے کا بھی حلیہ بگاڑ کے رکھ دیا ہے۔'' شہزاد نے استاد کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

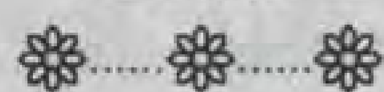
''ہم وہ امانت واپس چاہتے ہیں جو تمہارے پاس موجود لڑکی لالی نے ہمارے باس کے کمرے سے چرائی

ہے۔" استاد نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔
"اس کے پاس تو کوئی سرخ فائل نہیں' صرف ایک سرخ بیگ ہے جس میں معمول کی چیزیں ہیں۔" شہزاد نے استعجاب سے کہا۔
"اس نے فائل کہیں چھپادی ہوگی ہم اس سے اگلوالیں گے۔" پھر استاد نے پستول سے شہزاد کو خاموشی سے اوپر چلنے کا اشارہ کیا۔ شہزاد مجبوری کے عالم میں ان کے آگے اوپر کی طرف زینہ طے کرنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں موجود چھری استاد نے چھین کر ایک طرف حقارت سے پھینک دی تھی۔



ڈائننگ ہال میں آکر استاد نے رکتے ہوئے شہزاد سے کہا کہ اپنے والدین اور لالی کو بلوالو۔ مالی اور گارڈ کو تو ہم نے رسیوں سے جکڑ کر باغ میں ڈال دیا ہے۔ وہ گھریلو ملازم سالا کہیں نظر نہیں آیا۔"
"وہ باہر گیا ہوا ہے۔" شہزاد کے منہ سے نکل گیا۔ شہزاد نے ریوالور کا اشارہ دیکھ کر اپنی امی اور ابو کے کمرے کے دروازے کھٹ کھٹائے۔ جلد ہی اس کے امی ابو اور زمرد جسے وہ لالی کہہ رہے تھے ریوالوروں کے نرغے میں کھڑے تھے۔
"لالی سیدھی طرح وہ سرخ فائل ہمارے حوالے کردو اور اب فضول اچھل کود کرنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ میں بہت برا آدمی ہوں۔"
"استاد تم سمجھتے کیوں نہیں وہ کوئی اور لڑکی ہوگی ہوسکتا ہے مجھ سے ملتی جلتی ہو میرے پاس کوئی سرخ فائل نہیں' صرف یہ سرخ پرس ہے۔" لالی نے یہ کہہ کر پرس گھما کر استاد کے اوپر پھینک دیا۔ استاد نے اسے دبوچ کر کھولا اس کے اندر موجود اشیاء کو فرش پر پھینک دیا اور گرج کر بولا۔ "یہ نہیں لال گڑیا سرخ فائل۔"
"میرے پاس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔" زمرد نے بے خوفی سے گھورتے ہوئے کہا۔ استاد غصے سے کھول اٹھا۔ "ابھی تمہارا دماغ درست کرتا ہوں۔"
"مسٹر لامبا۔" استاد نے لمبے قد کے لمبوترے چہرے والے آدمی سے کہا۔ "کھانے کی میز گھسیٹ کر فانوس کے نیچے لاؤ اور اس پر کرسی رکھ کر رسی سے اس لال گڑیا کو فانوس کے ساتھ الٹا لٹکا دو۔ میں دیکھتا ہوں کتنا دم خم ہے ایک ایک کرکے چاقو سے اس کے کپڑے پھاڑوں گا اور پھر اس کے جسم کی باری آئے گی۔" استاد نے سرد لہجے میں کہا۔ شہزاد غصے سے سلگ اٹھا۔
"خبردار! ایسی کوئی غیر اخلاقی حرکت میرے سامنے نہ کرنا۔"
"تم جیمز بانڈ بننے کی کوشش نہ کرو ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔" استاد نے شہزاد کو گھورتے ہوئے کہا۔ لمبے قد والا آدمی ڈائننگ ٹیبل گھسیٹ کر فانوس کے نیچے لانے لگا پھر کرسی رکھ کر رسی لے کر زمرد کی طرف بڑھا اس کے بالکل قریب آکر رک گیا۔ اس نے رسی آگے بڑھائی۔
"مان جاؤ لال پری پھر ہم دونوں ایک اچھی رات گزار سکتے ہیں۔"
"ابے او اونٹ کی اولاد زبان سنبھال کے بات کر ورنہ کاٹ کے رکھ دوں گی۔" زمرد نے ہاتھ کو چھری کی مانند حرکت دیتے ہوئے کہا۔ لمبوترے چہرے والے کا رنگ غصے سے سرخ ہوگیا اس کا منہ اونٹ کے منہ کی طرح ہی لٹکا ہوا لمبا سا تھا۔ جیسے ہی وہ کچھ آگے بڑھا۔ عین اسی لمحے گھر کی لائٹ آف ہوگئی۔ سب کچھ اندھیرے میں ڈوب گیا۔
"ٹارچ نکالو۔" استاد نے اپنے ساتھی سے کہا۔ لیکن اس سے قبل ہی بجلی سی کوندگئی۔ زمرد نے اچھل کر ایک بھرپور مکا لمبے آدمی کی کنپٹی پر مارا اور وہ اوغ

کی آواز نکالتا ہوا ڈھیر ہوگیا۔ اس وقت زمرد نے راستے میں آنے والے دوسرے غنڈے کے کلیجے پر لات رسید کی اور وہ بھی دہرا ہوکر تڑپ اٹھا تیسرے کی تھوڑی پر زمرد نے فلائنگ کک رسید کی جو اسے دبوچنے ہی والا تھا۔ اس کے منہ سے خون کی دھار بہنے لگی اور دانت ٹوٹ گئے۔ وہ جبڑا پکڑے چیخنے لگا اور فرش پر بیٹھتا چلا گیا۔ اس وقت زمرد نے فرش سے اپنا سنہری قلم اٹھا کر اس کی کیپ ہٹا کر نب کی جگہ لگی چاقو کی نوک اچھل کر آگے بڑھتے ہوئے استاد کی گردن سے لگادی۔ تیز دھار نے استاد کے گلے کی کوئی رگ کاٹ دی اور خون تیزی سے اندھیرے میں اس کے کپڑے سرخ کرنے لگا۔ استاد سسکیاں سی بھرنے لگا۔ اس کے ہاتھ جو زمرد کے گلے پر تھے ڈھیلے پڑگئے۔ اس وقت مار کھانے والے تینوں غنڈے سنبھل گئے اور پستول نکال کے آگے بڑھے ایک غنڈے نے ٹارچ روشن کرکے روشنی استاد پر ڈالی تو جیسے اسے سکتہ سا ہوگیا۔ استاد کی گردن سے تیزی سے خون بہہ رہا تھا اور وہ کراہ رہا تھا۔ اس وقت زمرد کی آواز نے انہیں ہلا کر رکھ دیا۔ "استاد کے چیلو پستول پھینک دو ورنہ میں استاد کی گردن کاٹ کر رکھ دوں گی۔" استاد نے تکلیف سے سسکتے ہوئے انہیں پستول پھینکنے کا اشارہ کردیا۔
شہزاد نے زمرد کا اشارہ پاکر پستول اٹھالیے اور خنجر بھی ان کی جیبوں سے نکال لیئے۔ اب زمرد نے ایک پستول بھی دوسرے ہاتھ میں لے لیا اور شہزاد سے کہا کہ "لمبے آدمی کے ہاتھ جکڑ دو۔" شہزاد کسی مشینی روبوٹ کی مانند عمل کرنے لگا۔ وہ اب پھر زمرد کی بہادری' دلیری اور پھرتی سے بڑا مرعوب ہوچکا تھا۔
کچھ دیر بعد روشنی بحال ہوگئی تو پانچوں غنڈے رسیوں سے جکڑے پڑے تھے۔ اس وقت دروازہ کھلا اور ملازم غلام رسول بڑی شان سے اکڑتا ہوا اندر داخل ہوا۔ وہ چلتا ہوا شہزاد اور زمرد کے قریب چلا آیا۔ پھر غنڈوں پر ایک نگاہ ڈال کر بولا۔ "میں خطرہ محسوس کرکے چھپ گیا تھا۔ جب یہ لوگ گارڈ اور مالی کو باندھ کر آگے بڑھے میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے فیوز نکال کے بجلی گل کردی۔ پھر موبائل سے پولیس کو فون بھی کردیا ہے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اندھیرے میں دشمن آدھا ہوکر رہ جاتا ہے۔"
"بہت خوب' غلام رسول تم نے ایک کارنامہ انجام دیا ہے تمہیں انعام دیا جائے گا۔" شمشاد علی نے پر تحسین لہجے میں غلام رسول کو مخاطب کیا۔ کچھ ہی دیر بعد پولیس کی موبائل دروازے پر آکر رکی۔ تھانے دار نے اطلاعی گھنٹی بجائی۔ غلام رسول نے دروازہ کھولا۔ تھانے دار اور چھ عدد سپاہی اندر داخل ہوئے۔ ڈائننگ ہال میں آکر انہوں نے غنڈوں کو گرفتار کرکے ہتھکڑیاں لگادیں۔ شہزاد اور زمرد نے گول مول انداز میں واقعہ کو بیان کیا کہ غنڈے لوٹنے کے لیے آئے تھے لیکن ملازم غلام رسول کی عقلمندی سے ہمیں دو دو ہاتھ کرنے کا موقع مل گیا۔ تھانے دار اور سپاہی زمرد کو حیرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے غنڈوں کو لے کر روانہ ہوگئے۔



پولیس کی لمبی گاڑی بدمعاشوں کو لے کر دوبئ چوک تھانے کے پاس سے گزرتی چلی گئی۔ تھانے کی عمارت ایک کھنڈر کا منظر پیش کررہی تھی۔ دہشت گردوں نے بارود سے بھری گاڑی تھانے سے ٹکرادی تھی۔ چنانچہ دوبئ چوک تھانے کی دوبارہ تعمیر تک اس علاقے کا چارج وحدت روڈ تھانے کو دے دیا گیا تھا۔ پولیس کی گاڑی جس میں ڈرائیور کے

ساتھ تھانے دار اور باقی پانچ سپاہی پچھلے حصے میں بدمعاشوں کو بٹھا کر لے جا رہے تھے جیسے ہی وحدت روڈ قبرستان کے ساتھ ساتھ تھانے کی عمارت تک جانے والی سڑک پر آئے انہیں کچھ دور قبرستان کے اندر اگے ہوئے گھنے سنسان درختوں کے سائے میں ایک طویل القامت پولیس آفیسر کھڑا دکھائی دیا۔ وہ رات کے دو بجے شاید کسی مسئلے کا شکار تھا۔ لہٰذا لفٹ کے لیے ہاتھ ہلا رہا تھا۔

ڈرائیور نے اس کے قریب جا کر گاڑی روک دی۔ الیکٹرک پول پر دور لگے بلب کی مدھم روشنی میں وہ آفیسر بڑا باوقار دکھائی دے رہا تھا۔ دراز قد آفیسر دو قدم آگے بڑھ آیا۔ تھانے دار شوکت رضا نے سر کھڑکی سے نکالتے ہوئے پوچھا۔ ”سر آپ کون ہیں اور کیا مسئلہ درپیش ہے۔“ دراز قد آفیسر چار قدم اور آگے بڑھ آیا اور اس لمحے اس نے اپنے ہاتھ میں دبی کوئی گول سی شے کھڑکی کے راستے اندر پھینک دی۔ شوکت رضا کا ہاتھ ریوالور پر چلا گیا لیکن ایک خفیف سے دھماکے سے اشک آور بم پھٹ گیا جس سے فوراً ہی انہیں آنکھوں پر ہاتھ رکھ لینے پڑے۔ ان کا سانس رکنے لگا۔

آنکھوں میں شدید جلن اور تکلیف ہونے لگی۔ سفید دھوئیں کے مرغولے ہوا سے منتشر ہو کر گاڑی کے اطراف میں پھیل کر پچھلے حصے میں داخل ہو گئے اور نیچے اترتے پولیس کے دو جوان تکلیف سے دہرے ہو گئے۔ وہ مدہوش ہوتے چلے گئے۔ موبائل فون یا وائرلیس پر بات کرنے کی انہیں حسرت ہی رہ گئی۔ اس وقت لمبے قد کے پراسرار آدمی نے سیٹی بجائی اور قبرستان کے درختوں سے متعدد سیاہ لباس میں ملبوس آدمی چھلانگیں مارتے ہوئے نیچے سڑک پر آ گرے۔ وہ جھکی ہوئی شاخوں میں چھپے ہوئے تھے۔

”جاؤ جلدی سے ان بے وقوفوں کو پولیس کی گاڑی سے گھسیٹ کر باہر نکالو۔“ سیاہ لباس والے مشینی انداز سے آگے بڑھے۔ اس وقت لمبے پراسرار آدمی نے موبائل فون پر کسی کو وین اس طرف لانے کا حکم دیا۔ فوراً ہی قبرستان کے بالمقابل زیر تعمیر عمارت کے اندر چھپی ایک سفید وین حرکت میں آئی اور پولیس کی گاڑی کے پاس آ کر رک گئی۔ سیاہ لباس والوں نے آنکھوں پر ماسک چڑھا رکھے تھے۔ انہوں نے استاد اور اس کے ساتھیوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر وین کے پچھلے حصے میں ٹھونس دیا۔ اب وہ اگلے حصے میں سوار ہو گئے۔ ڈرائیور کے ساتھ لمبا آدمی بیٹھ گیا۔ وین حرکت میں آ گئی۔ پولیس والے سانس کی رکاوٹ اور گیس کے نتھنوں سے اندر جانے سے مدہوش پڑے تھے۔ ”باس آپ کی پلاننگ بہت عمدہ ہوتی ہے۔“ پچھلی نشست سے اس کے ایک ساتھی نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں ٹائیگر مجھے ہر لمحے ہر پل کی صورت حال سے نپٹنے کے لیے تیار رہنا پڑتا ہے۔ اگر یہ بے وقوف لاک اپ میں بند ہو جاتے تو کئی راز کی باتیں اگل دیتے۔ میں اپنے ورکروں کی پوری نگرانی رکھتا ہوں۔“ لمبے قد کے آدمی نے پراسرار لہجے میں کہا۔

پھر اس نے اپنے سوٹ کیس سے متبادل لباس نکال کے وین کی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے کپڑے اور حلیہ تبدیل کر لیا۔ اب اس نے گھنی داڑھی مونچھیں اتار کے بیگ میں رکھ دیں اور سر پر لگی گھنگھریالے بالوں والی وگ بھی اتار ڈالی۔ اب وہ ایک بالکل مختلف آدمی دکھائی دے رہا تھا۔ وین تیزی سے گلبرگ کی طرف سفر کرنے لگی۔

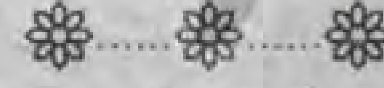


گلبرگ بی کی شاندار کوٹھی کے وسطی ہال میں اس وقت روشنی ہو رہی تھی۔ لمبے قد کا پراسرار باس ہال کے سرے پر بنے چبوترے پر کھڑا تھا۔ اس کے سامنے استاد اور اس کے ساتھی اور اونٹ کے منہ والا کھڑا تھا۔ ان کے سر جھکے ہوئے تھے۔ سیاہ لباس والے ہال کی دیواروں کے پاس مختلف جگہوں پر کھڑے باس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”تم سب بڑی بڑی تنخواہوں کے باوجود ناکارہ ثابت ہو رہے ہو۔“ لمبے آدمی نے استاد پر ایک جلتی ہوئی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

”باس ہم اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں مگر وہ کسی بھوت کی اولاد معلوم ہوتی ہے مگر اس مرتبہ......“ استاد نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

”بس رہنے دو اب مجھے خود تم لوگوں کی کمانڈ کرتے ہوئے میدان میں آنا پڑے گا۔“



شہزاد اپنی خواب گاہ میں لیٹ چکا تھا۔ وہ اس وقت بھی زمرد کی دلیری، پھرتی اور بہادری کے متعلق سوچ رہا تھا کہ کس قدر نڈر اور فولادی اعصاب کی مالک ہے۔ پھر اس پر مستزاد اس کا حسن جاں سوز بڑا دلنواز تھا۔ اس کے ہونٹ کتنی ہی تمناؤں کو جنم دینے والے تھے۔

شمشاد علی تھک کے اپنے کمرے میں سو چکے تھے۔ شہزاد کی والدہ بھی سو گئی تھیں۔ انہیں تو نیند کی گولی بے خوابی کی وجہ سے استعمال کرنا پڑی تھی۔

اس وقت زمرد بستر سے اٹھی وہ فرش پر بکھری اپنی اشیا، اکٹھی کر کے سرخ بیگ میں ڈال چکی تھی۔ بیگ اس وقت بھی اس کے ہاتھ میں جھول رہا تھا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی وہ کسی خیال کے تحت اماں جی پر ایک نگاہ ڈال کے کمرے سے باہر نکلی اور دوسری منزل کی سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگی۔ اوپر آ کے وہ دبے پاؤں شہزاد کی خواب گاہ والی راہ داری سے گزر کر آگے نکل گئی اور پھر چھت کا زینہ طے کر کے اوپر چھت پر نکل آئی۔ اس نے جنگلے کے قریب آ کر ادھر ادھر نگاہ ڈالی۔ کوٹھی کے سامنے کی طرف گلشن بلاک کی سڑک تھی۔ کوٹھی کے دائیں طرف ایک عمارت زیر تعمیر تھی۔ بائیں جانب اسی طرح کی ایک شاندار عمارت تھی۔ جس میں پرائیویٹ اسکول بنا ہوا تھا وہ دن کے وقت دیکھ چکی تھی۔ کوٹھی کا عقبی باغ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اس کی بیرونی دیوار کے پار ایک بڑا خالی پلاٹ تھا جس میں خاردار جھاڑیاں پودے اور لمبی لمبی گھاس دکھائی دے رہی تھی۔ شہزاد کے دونوں کتوں کی ایک جھلک بھی دور کے منظر میں دکھائی دی۔

عین اسی وقت چاند کی روشنی میں گرد و پیش کا جائزہ لیتی زمرد چونک اٹھی اور ایک ستون کی آڑ میں سرک گئی۔ ایک کار مکان کے سامنے گیٹ پر اور ایک عقبی جانب واقع خالی پلاٹ کے سرے پر آ کر رکی اور دونوں کاروں سے پولیس آفیسر وردیوں میں ملبوس باہر نکلتے دکھائی دینے لگے۔ گیٹ پر آنے والے آفیسر میں ایک لمبا دراز قد آدمی تھا جو بڑا بارعب دکھائی دیتا تھا۔

زمرد شبہے میں پڑ گئی وہ بڑبڑائی۔ ”کچھ گڑبڑ معلوم ہوتی ہے یہ گاڑیاں پولیس والے استعمال نہیں کرتے۔ یہ کہاں سے آ گئیں۔“ وہ چلتی ہوئی زینے کے پاس چلی آئی پھر کسی خیال کے تحت اس نے سرخ بیگ سے موبائل فون نکالا اور محکمہ سراغ رسانی کے ڈائریکٹر احسان رندھاوا سے بات کرنے لگی پھر وہ نیچے جھانکتے ہوئے سن گن لینے کی کوشش کرنے لگی پھر اس نے جنگلے کے ساتھ چھت کے پچھلے حصے کی طرف جانے آنے والوں کو دیکھا۔ وردیوں والے بغیر

اجازت دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہو چکے تھے۔ زمرد معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے پھر زینے کی طرف آ گئی۔ چند لمحوں بعد ہی زینے کا بلب نیچے سے روشن کر دیا گیا اور پھر اسے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ چند لمحوں بعد ہی ملازم غلام رسول کو آگے لگا کر چار پولیس والے اوپر آ گئے۔ وہ زینے کے اوپر آ کر رک گئے پھر ایک آفیسر مخاطب ہوا۔

"آپ نیچے تشریف لے آئیے' ڈی ایس پی صفدر جنگ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"رات کے اس وقت؟" زمرد نے حیرت کا اظہار کیا۔

"وہ آپ کو خود ہی بتا دیں گے۔ آپ لوگوں کی زندگی خطرے میں ہے۔" وہی آفیسر جلدی سے بولا۔

"ٹھیک ہے میں چل رہی ہوں۔" زمرد نیچے اترنے لگی۔ وہ پولیس والوں کے نرغے میں ڈائننگ ہال میں داخل ہوئی' یہ سب سے کھلی جگہ تھی۔ ہال روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ شہزاد اس کے والدین الجھن کے عالم میں پولیس والوں کو دیکھ رہے تھے۔ محکمہ سراغ رسانی کا ڈائریکٹر کولہوں پر ہاتھ رکھے اسے تیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ "فرمائیے جناب رات کے آخری پہر کیسے زحمت کی ہم لوگ سو رہے تھے؟" زمرد نے خشک لہجے میں کہا۔ جیسے وہ بالکل مرعوب نہ ہوئی ہو۔

"جن بدمعاشوں کو آپ نے گرفتار کروا کے تھانے روانہ کیا تھا' انہوں نے دھمکی دی ہے کہ وہ صبح کا سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے جیل سے رہا ہو جائیں گے اور ہمارا باس اس دھوکے باز لڑکی سے سرخ فائل بھی حاصل کر لے گا جو اس نے باس کے کمرے سے چرائی ہے۔ میں حفاظت کی غرض سے آپ کے گھر چلا آیا ہوں۔"

ڈی ایس پی صفدر جنگ نے اپنی بارعب آواز میں جواب دیا۔ اس کے لمبے چوڑے مضبوط وجود کی مانند آواز بھی بارعب تھی۔

"آپ کا عہدہ کیا ہے؟" زمرد نے سامنے آتے ہوئے پوچھا۔

"ڈی ایس پی۔" وہ مسکرایا۔

"میں آپ کا کارڈ دیکھنا چاہتی ہوں۔" ڈی ایس پی نے کارڈ جیب سے نکال کے زمرد کو تھما دیا۔ زمرد نے کارڈ واپس کرتے ہوئے آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ڈی ایس پی صاحب آپ کے کچھ ساتھیوں کو چوروں کی طرح کوٹھی کی عقبی دیوار پھلانگ کے اندر گھسنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"ایسی تو کوئی بات نہیں' ہو سکتا ہے وہ وہی مجرم ہوں جو آپ کو اغوا کرنا چاہتے ہیں۔" زمرد ہنسنے لگی۔

"آپ جعلی ڈی ایس پی ہیں۔"

ڈی ایس پی غصے سے تلملا اٹھا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ اچانک اس نے ہولسٹر سے پستول نکال کے زمرد پر تان دیا۔

"مکار لڑکی وہ سرخ فائل نکال کر میرے حوالے کر دو ورنہ تمہارا انجام بڑا بھیانک ہو گا۔ اس وقت کمرے میں کھڑے چاروں پولیس والے بھی پستول تانے آگے بڑھنے لگے۔

"خدایا رحم کرنا یہ میرے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔" شمشاد علی نے بڑبڑاتے ہوئے دعا کی۔ شہزاد بھی جھلایا ہوا تھا۔ وہ زمرد کی وجہ سے مصیبت میں پڑ گئے تھے۔ شہزاد کی ماں کا منہ بھی لٹکا ہوا تھا۔ غلام رسول بھی ناپسندیدگی سے ماحول کو دیکھ رہا تھا۔

پستول بردار پولیس والوں نے زمرد کو نرغے میں لے لیا۔ ڈی ایس پی اس کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ "گڑیا تم نے میرے کمرے سے ہی سرخ فائل چرائی تھی۔ اس سرخ فائل کی خاطر ہم مجبور ہوئے تو خون کے دریا بھی بہا سکتے ہیں۔" زمرد ان سے بے نیازی کے عالم میں سرخ بیگ گھما رہی تھی۔ لمبے آدمی نے آگے بڑھ کر اس کے بیگ والے ہاتھ کو پکڑ لیا اور منہ اس کے چہرے کے پاس لا کر سانپ کی مانند پھنکارا۔

"حرامزادی سرخ فائل کا پتا بتا دے ورنہ تیری بوٹی بوٹی الگ کر دوں گا۔" اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک چمکدار لمبا چاقو دکھائی دے رہا تھا۔ جس کی نوک پر خون جما ہوا تھا۔

"تم فائل کسی صورت بھی حاصل نہیں کر سکو گے۔" زمرد نے چٹانی لہجے میں کہا۔

"اچھا یہ بات ہے۔" لمبا آدمی غرایا اور چاقو کی نوک سے زمرد کے بازو سے کپڑے کا کچھ حصہ کاٹ کر نوک اس کے مرمریں سفید بازو میں گھونپنے لگا۔ پستول بردار بھی زمرد کو نشانے پر لیے ہوئے تھے۔ بڑا خطرناک لمحہ تھا۔ زمرد نے مضبوطی سے ہونٹوں کو دبا لیا اس کے چہرے پر کرب اور تکلیف کے آثار پھیل گئے پھر بازو سے خون نکلنے لگا۔ "بتاؤ' بتاؤ۔" لمبا آدمی گرجا۔

"نہیں...... نہیں...... تم کچھ بھی کر لو میں فولاد کی بنی ہوئی ہوں تم میری زبان نہیں کھلوا سکتے۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی زمرد نے چونک کر روشندان کی طرف دیکھا اور پھر اس کے منہ سے نکلا۔ "شاباش راجو فائر کر دو۔" لمبا آدمی اور پستول بردار سب ہی چونک کر روشن دان کی طرف دیکھنے لگے۔ زمرد کے لیے اتنا موقع کافی تھا۔ اس نے اس کے پستول والے ہاتھ پر زور سے لات ماری پھر چاقو والے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ دوسری لات لمبے آدمی کے نازک مقام پر پڑی اور وہ چیخ کر دہرا ہو گیا۔ ایک باوردی غنڈے نے فائر کیا لیکن زمرد غافل نہیں تھی وہ لڑھک گئی' گولی ضائع گئی۔

دوسرا غنڈہ نشانہ لینا ہی چاہتا تھا کہ شہزاد کی پھینکی ہوئی شیشے کی ایش ٹرے زور سے اس کے ہاتھ پر لگی وہ ہاتھ پکڑ کر رہ گیا۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ پہلے والا پھر زمرد پر فائر کرنے لگا۔ اس وقت غلام رسول نے اسٹیل کا بھاری جگ ڈائننگ ٹیبل سے اٹھا کر اس کے ہاتھ پر دے مارا۔ اس کے ہاتھ سے پستول نکل گیا۔

تیسرے نے فائر کرنا چاہا تو اس کے ہاتھ پر ویکیوم گلیز آ کر لگا جو شمشاد علی نے پھینک کر مارا تھا۔ وہ لوگ اہل خانہ کی طرف سے غافل ہو گئے تھے زمرد کی طرف متوجہ ہو کر اس کے ہاتھ سے بھی پستول نکل گیا۔ اس وقت زمرد نے فرش سے پستول اٹھانے کی کوشش کرنے والے آدمی کے ہاتھ پر قلم کے آگے لگا چاقو پھینک مارا اس کے ہاتھ سے خون کا فوارہ ابل پڑا وہ چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ اس وقت زمرد کے مکوں اور فلائنگ ککوں نے انہیں ادھ موا کر دیا۔ اس نے فرش پر پڑے لمبے آدمی کے سینے پر پاؤں رکھ دیا اور بولی۔

"اب بتاؤ کیا خیال ہے میرے متعلق۔" لمبا آدمی نڈھال سا اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے وہ اس دنیا کی مخلوق نہ ہو۔

اس وقت باغ کے راستے کوٹھی میں داخل ہونے والے پولیس مین اندر آئے لیکن زمرد نے فائرنگ کر کے ان کے پستول اڑا دیئے۔ وہ بوکھلا گئے۔ شہزاد نے انہیں رسی سے باندھ دیا۔

ابھی وہ اس ہنگامے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ محکمہ سراغ رسانی کے ڈائریکٹر احسان رندھاوا باجماعت اندر داخل ہوئے ان کے ساتھ دس پولیس والے تھے جن کا تعلق محکمہ خفیہ سے تھا۔ احسان رندھاوا نے دروازے میں رک کر ایک نظر ماحول پر

ڈالی بٹے ہوئے لوگ فرش پڑے کراہ رہے تھے کچھ خون فرش پر پھیلا ہوا تھا۔ ایک کھڑکی کا شیشہ گولی سے چور چور تھا۔ ڈائریکٹر باوقار قدموں سے چلتا ہوا زمرد کے سامنے آ کر رک گیا۔ زمرد نے مڑ کر دیکھا لمبا آدمی اب خوش خوش سا دکھائی دے رہا تھا۔ اچانک اس نے ڈائریکٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ڈائریکٹر صاحب یہ لڑکی چور اور مجرم ہے یہ میرے کمرے سے ایک سرخ فائل چرا کر بھاگی ہے۔ جس میں بہت اہم ملکی راز ہیں یہ دشمن ملک کی جاسوس معلوم ہوتی ہے۔ یہ بہت خطرناک ہے اس نے ہمیں بھی زخمی کردیا ہے۔ اس سے وہ سرخ فائل حاصل کرلیں۔" وہ چلا کر بولا۔

"تم نقلی ڈی ایس پی ہو۔" زمرد نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمہارے آدمی بھی جعلی ہیں۔"

"نہیں ہم اصلی پولیس والے ہیں۔" صفدر جنگ اکڑ کر بولا۔

"ہاں تو لڑکی وہ سرخ فائل میرے حوالے کردو جس میں ملکی راز موجود ہیں۔ اب میں آ گیا ہوں اب تمہیں کسی سے ڈرنے یا گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" ڈائریکٹر نے زمرد کے بالمقابل آتے ہوئے کہا۔

"سرخ فائل تو میں کسی ذمے دار بڑے آفیسر کو دے سکتی ہوں۔" زمرد نے ڈائریکٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"کیا میں بڑا اور ذمہ دار آفیسر نہیں ہوں۔" ڈائریکٹر نے اسے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے گھورا۔

"نہیں تم...... تم...... ذمہ دار نہیں ہو بلکہ تم تو......" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"تم کیا؟" ڈائریکٹر چونک کر بولا اور آتشی نظروں سے زمرد کو گھورنے لگا۔ سرخ فائل کے ذکر پر شہزاد اس کے والد، والدہ اور ملازم غلام رسول بھی چونک اٹھا اور عجیب سی نظروں سے وہ سب زمرد کو دیکھنے لگے جیسے وہ کسی دوسری دنیا سے آئی ہو۔ "میں اب خود سسپنس سے تنگ آ گئی ہوں اس لیے میں نے سرخ فائل کا اعتراف کرلیا ہے۔" زمرد نے لہجے کو دلچسپی سے بھرپور بناتے ہوئے کہا۔

"انسپکٹر صفدر۔" ڈائریکٹر نے اپنے قریب کھڑے انسپکٹر سے کہا۔ "اس لڑکی کی اچھی طرح تلاشی لو اگر فائل برآمد کرنے کے لیے اس کے کپڑے اتارنے پڑیں تو وہ بھی اتارو، وہ فائل درحقیقت میرے ہی دفتر سے چوری ہو کر دوسرے ہاتھوں میں پہنچی تھی اس میں کئی اہم ملکی راز ہیں۔ صفدر زمرد کی طرف بڑھنے لگا اس کے ساتھی آگے بڑھے تاکہ زمرد کو بازوؤں سے جکڑ لیں۔

"انسپکٹر صفدر اگر تم ترقی کرنا چاہتے ہو قدر و منزلت پانا چاہتے ہو تو اپنے آفیسر مسٹر احسان رندھاوا کو گرفتار کرلو یہ درحقیقت ملک کا غدار اور دشمن ملک کا جاسوس ہے۔ بدقسمتی سے یہ ہمارے ملک کے ایک بڑے عہدے پر فائز ہے۔ وہ سرخ فائل ایک غدار فوجی نے تیار کی تھی اس میں ملک کے فوجی ٹھکانوں کی مائکرو فلم محفوظ ہے۔ ملٹری پولیس والوں کی گولی سے وہ غدار زخمی ہو کر مسٹر احسان کی کوٹھی میں گھسنے میں کامیاب ہوگیا۔ مسٹر احسان نے اس سے سرخ فائل لے کر اپنے آفس میں رکھ لی اور پھر خود ہی اس فائل کے چوری ہونے کا ڈرامہ رچا دیا۔ میں اس وقت سمجھ گئی تھی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ پھر اس نے وہ فائل اس لمبے قد کے غیر ملکی جاسوس کو سرحد پار پہنچانے کے لیے دے دی تاکہ دشمن جب چاہے ہمارے فوجی ٹھکانوں کو آسانی سے نشانہ

بنانے میں کامیاب ہوجائے۔ میں اس وقت سے ہی احسان رندھاوا کی نگرانی کروا رہی تھی پھر میں لمبے قد کے جاسوس کو تلاش کرکے اس کی گاڑی کے آگے خودکشی کا ڈرامہ کرنے میں کامیاب ہوگئی اور اس طرح میں نے اپنے پیارے ملک کے فوجی ٹھکانوں کی مائیکرو فلم جو دشمن ملک کے حوالے کی جانے والی تھی حاصل کرکے محفوظ کرلی۔ اب اسے صرف ملٹری پولیس کے حوالے کیا جاسکتا ہے۔"

زمرد کے انکشاف سے کمرے میں موجود سب لوگ پھٹی پھٹی نظروں سے زمرد اور ڈائیرکٹر احسان اور لمبے قد کے جاسوس کو دیکھنے لگے۔ اس وقت احسان رندھاوا مسکراتے ہوئے بولا۔ "مسٹر صفدر یہ مکار لڑکی خود غیر ملکی جاسوس ہے اور الزام تراشیاں کرکے بھاگ نکلنے کی فکر میں ہے۔ تم اس کے نہیں میرے ماتحت ہو اسے گرفتار کرلو۔ اب ہم اس سے محکمہ خفیہ کے ٹارچر سیل میں اگلوائیں گے کہ اس نے سرخ فائل کہاں چھپا رکھی ہے جسے یہ خود سرحد پار پہنچانا چاہتی ہے۔" صفدر کشمکش میں پڑ گیا۔ پھر قانونی مجبوری کے تحت اس نے آگے بڑھ کر زمرد کے ہاتھوں میں آہنی کڑیاں ڈال دیں۔ زمرد اس وقت سرخ بیگ سے موبائل فون سے بات کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

"روکو...... روکو صفدر یہ اپنے خطرناک ساتھیوں کو بلا رہی ہے۔" صفدر نے آگے بڑھ کر موبائل چھین لیا۔ لیکن زمرد یہ کہنے میں کامیاب ہوگئی کہ آپ لوگ تشریف لے آئیں۔"

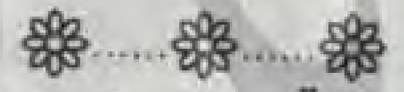
ڈی ایس پی اس کے ساتھیوں اور زمرد کو لے کر ڈائریکٹر باہر نکلنا ہی چاہتا تھا کہ اس وقت دروازہ زوردار طریقے سے کھلا اور وردی میں ملبوس ملٹری پولیس کے بااختیار آفیسر اندر داخل ہوئے۔ ملٹری پولیس کے چیف میجر عزیز نے صفدر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"مسٹر صفدر ہتھکڑی کھول کر احسان رندھاوا کے ہاتھوں میں ڈال دو۔ اس وقت ملٹری پولیس کے آفیسرز نے زمرد کو آگے بڑھ کر سیلوٹ کیا تو شہزاد تو اچھل ہی پڑا۔ باقی بھی حیرت زدہ نظروں سے یہ منظر ٹکر ٹکر دیکھنے لگے۔ صفدر نے ملٹری پولیس کی وردیاں اور کارڈ دیکھ کر احسان رندھاو کو گرفتار کرلیا۔ ملٹری پولیس ایک سپریم ادارہ تھا جسے بہت سے اختیارات حاصل تھے۔ اس وقت زمرد نے سب کو متوجہ کرتے ہوئے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

"بیٹی زرقا! اب وہ سرخ فائل میرے سپرد کردو۔" میجر عزیز نے مسکراتے ہوئے اس کے شانے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

"جی بہتر سر۔" زمرد نے کہا اور اپنے سرخ بیگ کو سب کی آنکھوں کے سامنے لا کر اس کی بیرونی دونوں دیواریں پاؤں کے نیچے دبا کر ایک جھٹکے سے اکھاڑ ڈالیں۔ پھر اس نے پرس کا لاک بھی مروڑ کر الگ کردیا۔ پھر اس نے دو سوراخوں میں انگلیاں پھنسا کر سرخ دیواروں سے دو سرخ جھلیاں اتار دیں اس کے بعد فائل کے دو حصے دکھائی دینے لگے۔ کاغذات بھی نظر آنے لگے۔ یہ ایک چھوٹی سی سرخ فائل تھی۔ زرقا نے فائل کے دونوں حصوں پر نیچے کی طرف ہک آپس میں پھنسا کر اسے ایک فائل کی باقاعدہ شکل دے دی۔ بیگ کی متفرق اشیاء نیچے فرش پر جا گری تھیں۔ زرقا نے سرخ فائل اپنے آفیسر میجر عزیز کو پیش کردی جس نے اسے دیکھ کر اپنی جیکٹ کی جیب کے اندر چھپا لیا۔ سب پھٹی پھٹی نظروں سے زمرد کی ذہانت آمیز ترکیب کو دیکھ رہے تھے۔ اس نے سرخ فائل سب کی آنکھوں کے سامنے رکھی اور کوئی اسے نہ پہچان سکا۔

''بہت خوب زرقا بہت ذہانت سے بھرپور ترکیب تھی۔ اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہوگی۔'' میجر عزیز کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ باقی سب بھی مرعوب ہو کر پھیلی ہوئی نظروں سے زرقا کو دیکھے جا رہے تھے۔ زرقا نے حاضرین کو بتایا کہ میرے اشارے پر اس کوٹھی کے ساتھ والی زیرِ تعمیر عمارت میں میرے سر میجر عزیز اور ان کے ساتھی میرے اشارے کے منتظر تھے۔ اس وقت زرقا نے شہزاد کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر شہزاد میں کل کسی وقت آؤں گی میرا انتظار کرنا۔''



شہزاد کو نیند کیا آتی وہ تو زرقا کے سحر میں مبتلا ہو چکا تھا وہ اس کے آئیڈیل سے بھی بڑھ چڑھ کر تھی۔ وہ بستر پر کروٹیں بدلتا رہا تھا۔ وہ رات کی بے آرامی کی وجہ سے دن کے گیارہ بجے تک بستر پر ہی رہا اور اس نے آفس منیجر کو فون کر دیا کہ وہ آج نہیں آسکے گا۔ وہ اپنے والد کا امپورٹ کا کاروبار سنبھال چکا تھا۔ اس کا آفس مال روڈ پر تھا وہ بینک کے ذریعے کاروبار کرتے تھے اور باہر سے کیمیکل اور مختلف اقسام کے رنگ منگوا کر ٹیکسٹائل ملز کو فروخت کرتے تھے۔

ٹھیک بارہ بجے اطلاعی گھنٹی دو تین بار زور زور سے بجی۔ شہزاد کی محویت ٹوٹ گئی۔ وہ زرقا کے خیالوں میں کھویا ہوا تھا اور اپنے آپ کو خوش قسمت تصور کرتا تھا کہ ملٹری پولیس کی ایک آفیسر نے اس کے گھر پناہ حاصل کی تھی۔

اس وقت غلام رسول دوڑا چلا آیا۔ ''صاحب، صاحب وہی میم صاحب آئی ہیں اور وردی میں ملبوس ہیں۔'' ملازم نے جلدی سے اطلاع دی۔ ''اوہ۔'' شہزاد کے منہ سے صرف اتنا ہی نکلا اور وہ اچھل کر بستر سے فرش پر آ گیا اور جلدی میں ننگے پیر ہی باہر بھاگا۔ پیچھے سے غلام رسول نے آواز دے کر روکا اور آگے بڑھ کر جوتا پیش کیا۔

شہزاد تیزی سے نیچے آیا۔ ڈرائنگ روم میں زرقا اسے دیکھ کر صوفے سے کھڑی ہوگئی۔ شہزاد ملٹری پولیس کی وردی میں اسے دیکھ کر پر مسرت انداز میں آگے بڑھا وہ بڑی پروقار دکھائی دے رہی تھی۔

شہزاد نے ہاتھ آگے بڑھایا جو زرقا نے مسکراتے ہوئے تھام کر شیک ہینڈ کیا۔ شہزاد کے اشارے پر ملازم نے جلد ہی میز پر چائے، کیک، بسکٹ اور نہ جانے کیا کچھ لا کر سجا دیا لیکن زرقا نے صرف چائے پر اکتفا کیا۔

''ہاں تو مسٹر شہزاد میں تمہارے اور تمہارے والدین کے تعاون کی بے حد مشکور ہوں۔ مجھے اس غدار ڈائریکٹر کو منظر عام پر لانے کے لیے یہ سارا چکر چلانا پڑا تھا ورنہ مجرموں کی گردن پر تو میں کسی وقت بھی ہاتھ ڈال کے انہیں گرفتار کروا سکتی تھی۔''

''ٹھیک ہے جو ہوا اچھا ہی ہوا ہے لیکن میں رات بھر تمہارے متعلق سوچتا رہا ہوں میری کئی لڑکیوں سے دوستی ہوئی لیکن کوئی بھی میرے دل میں نہ اتر سکی۔ صرف زرقا تم ایسی لڑکی ہو جس کی مہک میرے دل میں گھر کر چکی ہے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ اور میں ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہو جائیں۔'' شہزاد بے تابی سے حال دل کہتا چلا گیا۔ غلام رسول کو اس نے باہر بھیج دیا تھا اور اس کے والدین ابھی تک سو رہے تھے۔

''شہزاد صاحب! میں نے آپ کو ایک اچھے نوجوان کے روپ میں پایا ہے۔ محبت اور اس کی تکمیل فطری جذبات ہیں کوئی بھی انہیں دبا نہیں سکتا لیکن ابھی میرے ذمے دہشت گردوں کی کمر توڑنے کا مشن موجود ہے۔ تم آج صبح کا اخبار ہی دیکھ لو۔'' یہ کہتے ہوئے زرقا نے اخبار کا پہلا صفحہ جو تہ کر کے اس

نے جیب میں رکھ چھوڑا تھا نکال کے شہزاد کے سامنے پھیلا دیا۔ اخبار کی سرخیاں اور تصاویر دیکھ کر شہزاد دھک سے رہ گیا۔

''اف میرے خدا اس ملک میں کیسا خوفناک کھیل کھیلا جا رہا ہے۔'' اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ وہ مرنے والوں کی تصاویر دیکھنے لگا۔ لاہور سے کراچی جانے والی ٹرین کے کئی ڈبے دہشت گردی کا شکار ہوگئے تھے۔ انہیں طاقتور بم سے اڑا دیا گیا تھا۔ لاہور میں بھی دو تین معروف شاپنگ پلازوں میں تخریب کاری ہوئی تھی اور بہت سے بے گناہ لوگ ناحق مارے گئے تھے۔ بعض جگہ تو ابھی تک دھماکوں سے بھڑکنے والی آگ پھیلی ہوئی تھی۔ فائر بریگیڈ کا عملہ آگ بجھانے میں مصروف تھا۔ تصویروں میں سارے مناظر ہی خوفناک دکھائی دے رہے تھے۔ سیکڑوں گھرانے تباہ ہو کر رہ گئے تھے۔ لوگ پاگلوں کی طرح اپنے خون کے رشتوں کو ڈھونڈتے اور شناخت کرتے پھر رہے تھے۔

''شہزاد! ملک اس وقت تباہی سے دوچار ہے ہم دہشت گردوں کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں۔ اگر ہم دہشت گردوں کا صفایا کرنے میں کامیاب ہوگئے تو پھر میں خود وردی اتار کر ریٹائر ہو جاؤں گی اور پھر ہم دونوں ایک ہو سکیں گے۔ اس وقت ایسا کرنا اپنے ملک اور فرض سے غداری ہوگا۔'' زرقا نے شہزاد کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ڈیئر زرقا! دماغ تو تمہاری ساری باتیں مان رہا ہے لیکن اس دل کو کون سمجھائے یہ کسی طور بھی تمہاری یاد سے دستبردار نہیں ہو رہا۔ تمہارا تصور میرے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے۔ میں تمہارے سحر انگیز حسن و شباب کا اسیر ہو چکا ہوں۔ میرا کیا ہوگا؟ میں کس طرح زندگی بسر کر سکوں گا؟ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تمہاری ڈیوٹی کسی مرد کو سونپ دی جائے۔ کیا ضروری ہے کہ ایک لڑکی ہی اس فرض کو انجام دے۔'' شہزاد نے معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''شہزاد میں ملٹری پولیس کی کمانڈو ہوں اور دہشت گردوں کے خلاف کئی آپریشنز میں کامیابی سے حصہ لے چکی ہوں۔ میرے علاوہ دوسرے کمانڈوز اور فوجی اس مشن پر مصروف عمل ہیں۔ میرے والدین واقعی بچپن میں گزر گئے تھے۔ میرے چچا ریٹائرڈ فوجی تھے۔ انہوں نے میری تربیت فوجی ڈھنگ سے کی میرے اندر بھی لڑکپن سے ہی ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ میں اس وقت اس مشن کو ادھورا نہیں چھوڑ سکتی۔'' زرقا نے وضاحت کرتے ہوئے کہا اور پھر موبائل فون پر آنے والی کال سننے لگی۔ ''ٹھیک ہے میں پہنچ رہی ہوں۔'' زرقا نے جواب دیا اور فون بند کر دیا۔

''سوری شہزاد! اب میں مزید نہیں رک سکتی۔ مجھے ایک ضروری کام کے سلسلے میں بلا لیا گیا ہے۔'' زرقا دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ شہزاد برسوں کے بیمار کی مانند اسے ٹکر ٹکر جاتا ہوا دیکھنے لگا۔ وہ تھکے تھکے بوجھل قدموں سے بیرونی دروازے پر آیا، باہر زرقا ملٹری پولیس جیپ میں سوار ہو کر جانے والی تھی۔ ڈرائیور نے گاڑی کو اسٹارٹ کر دیا۔

شہزاد اس وقت تک گاڑی کو دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہوگئی۔ اس نے ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ ناشتہ کیا، شیو بنائی، کمپیوٹر پر کچھ ضروری کام کیا لیکن اس کا دل کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دہشت گردوں سے نپٹنے کا معاملہ بہت لمبا اور خطرناک ہے، اس کے خاتمے کا کچھ پتا نہ تھا۔ غزل کا پرشباب وجود دور کہیں لاشعور کے دھندلکے میں کھو کر رہ گیا تھا۔

اس وقت غزل موبائل پر بار بار شہزاد کو مس کال دینے لگی لیکن شہزاد نے رابطہ نہ کیا پھر غزل نے خود ہی کال کی اور دور دور رہنے کا سبب پوچھنے لگی۔ شہزاد نے کہا کہ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے باہر نہ نکل سکا۔ شہزاد سارا دن طبیعت کی خرابی کا عذر کر کے گھر میں ہی پڑا رہا۔ شام کو جب اس نے گاڑی باہر نکالی تو سامنے رکشے سے غزل اترتی ہوئی دکھائی دی۔ شہزاد نے رکشے والے کو بلا کر کرایہ خود ادا کر دیا۔ غزل دروازہ کھول کر کار میں شہزاد کے برابر آ گئی۔

''کیا بات ہے شہزاد تم بجھے بجھے اور پژمردہ سے دکھائی دے رہے ہو۔ پہلے تو تمہیں ایسا افسردہ اور ملول کبھی نہیں دیکھا۔'' غزل نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''رات نیند نہیں آئی اس لیے طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔''

''کچھ اور بھی ہے؟ تم اندرونی طور پر الجھے الجھے اور غیر حاضر سے معلوم ہو رہے ہو۔'' غزل نے پھر چونک کر استفسار کیا۔

''نہیں......اور کچھ نہیں۔''

شہزاد نے ٹالنا چاہا۔ ''تمہاری وہ لمبی سی کزن کہاں ہے جو اس دن تمہارے ساتھ گاڑی میں تھی۔'' غزل نے اسے ٹٹولا۔

''وہ دوسرے عزیز واقارب سے ملنے چلی گئی ہے۔'' شہزاد کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولا۔

''اوہ......تو شاید اس لیے اداس ہو۔'' غزل نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا لیکن شہزاد کی کیفیت میں کوئی تغیر واقع نہ ہوا۔

مختلف تفریحی مقامات پر سیر کرتے ہوئے غزل نے اس کی اداسی کا علاج کرنے کی کوشش کی لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی۔ آخر وہ جھنجلا کر دل میں یہ کہنے پر مجبور ہو گئی کہ اس لمبی چڑیل کا جادو اس پر پوری طرح حاوی ہو چکا ہے۔

❀......❀......❀

زرقا شہزاد کے گھر سے مین روڈ پر آ کر اقبال ٹاؤن میں واقع ملٹری پولیس کے ایک خفیہ ٹھکانے پر موجود تھی۔ ملٹری پولیس چیف اس کے سامنے موجود تھا۔ میٹنگ روم میں دوسرے بڑے آفیسرز اور وزیر اعلیٰ صاحب خود بھی سامنے اونچی کرسی پر براجمان تھے۔ سب کے چہروں پر فکرمندی کے آثار تھے اور سامنے تخریب کاری کی خبروں سے بھرے اخبارات میز پر بکھرے ہوئے تھے۔

وزیر اعلیٰ نے زرقا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ۔ ''بیٹی زرقا تم اس وقت لاہور میں دہشت گردی کے شعبے کی انچارج کے طور پر کام کر رہی ہو کسی نئے آدمی کو مامور کرنا مفید نہیں ہوگا۔ آج سے ٹھیک ایک ہفتہ بعد بروز پیر جیسا کہ اخبارات میں آ چکا ہے۔ دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس منعقد ہونے والی ہے۔ ہماری اطلاعات کے مطابق دہشت گرد اس کانفرنس کو نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ تم کانفرس سے قبل دہشت گردوں کی کمر توڑنے میں کامیاب ہو جاؤ گی۔ پھر وہ ناپاک جسارت نہیں کر سکیں گے۔ تمام محکمے تم سے تعاون کریں گے۔''

زرقا نے وزیر اعلیٰ کو یقین دلایا کہ وہ اپنی پوری کوشش کرے گی اور اپنی جان کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرے گی۔

کچھ دیر کے بعد میٹنگ برخاست ہو گئی۔

جب سب لوگ چلے گئے اور زرقا بھی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے موبائل کی بیل بجنے لگی۔ دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔

''زرقا باجی! میں جرنلسٹ شازیہ بول رہی

ہوں۔ آپ فوراً قصور جانے والی مین روڈ پر فیکٹری ایریا کے قریب آ جائیں میں وہیں آپ کو ملوں گی۔ یہاں ایک جلی ہوئی ویران عمارت میں دہشت گرد موجود ہیں۔ میں نے ایک مشکوک آدمی کا تعاقب کرتے ہوئے اپنی طاقتور دوربین میں نصب کیمرے سے اس عمارت کے کچھ فوٹو کامیابی سے اتار لیے تھے جو میں نے انسپکٹر شہباز کو دے دیئے۔ انسپکٹر شہباز کافی دیر سے اس عمارت میں داخل ہو چکا ہے لیکن وہ اور اس کا کوئی ساتھی بھی واپس نہیں لوٹا۔'' کرائم رپورٹر شازیہ نے پرتشویش لہجے میں زرقا کو صورت حال سے آگاہ کیا۔

''تم بالکل فکر نہ کرو میں پہنچ رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر زرقا نے فون بند کر دیا اور کار کی بجائے وین نکالتے ہوئے ضروری سامان کے ساتھ روانہ ہو گئی۔

کرائم رپورٹر شازیہ اور دلیر انسپکٹر شہباز اس کے ساتھی تھے جو مشکوک لوگوں کی تاک میں رہتے تھے۔ آخر میں زرقا ہر قسم کی صورت حال کو سنبھال لیتی تھی۔

مطلوبہ مقام پر آ کر زرقا نے شازیہ کے اشارے پر ماحول کا جائزہ لیا۔ یہ علاقہ ایک مرتبہ شدید آتشزدگی سے متاثر ہو گیا تھا اور کئی کارخانے' فیکٹریوں کی عمارتیں جل کر بوسیدہ اور ناکارہ ہو گئی تھیں۔ اس وقت انسپکٹر شہباز جس عمارت میں داخل ہوا تھا وہ مین روڈ سے دو فرلانگ دور ایک پرانے باغ کے کنارے واقع تھی۔ دوسری جھلسی عمارتیں اس عمارت کے قریب سے پھیلتی ہوئی دور نکلتی چلی گئی تھیں۔ یہ علاقہ منحوس سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا کوئی اس طرف نہیں آتا تھا۔ بعض ضعیف اعتقاد لوگوں کا خیال تھا کہ اس علاقے کو جنات نے آگ لگائی تھی۔ زرقا نے دوربین سے مشکوک عمارت تک جانے والے راستے پر نظر آنے والے درختوں کا چاند کی زرد روشنی میں جائزہ لیا پھر اس کے ہونٹوں پر

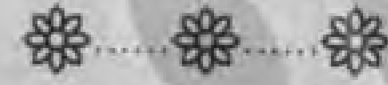
خطرناک مسکراہٹ رینگنے لگی۔ انہی درختوں کے قریب شہباز کے سپاہی مردہ پڑے تھے۔ زرقا کا خون کھول اٹھا۔ اس نے مشین گن اٹھا کر درختوں پر اندھا دھند فائر کھول دیا۔ مشین گن بے آواز تھی۔ چند لمحوں میں ہی شازیہ کے دیکھتے ہی دیکھتے باغ سے کچھ خوفناک چیخیں بلند ہوئیں اور پھر کچھ سرخ سرخ خون اگلتے لوگ نیچے زمین پر گر کر تڑپنے لگے۔ زرقا کی اندھادھند درختوں پر فائرنگ سے درختوں پر چھپے دہشت گرد مجرم ہلاک ہو ہو کر نیچے گرتے چلے گئے۔ جنہوں نے پولیس کے جوانوں کو موت کی نیند سلایا تھا۔

اب زرقا نے بلواپ گن میں ایک پٹرول بم لگا کے عمارت کے قریب پھینکا جہاں خشک جھاڑیوں اور زرد گھاس نے ایک دھماکے کے ساتھ آگ پکڑلی۔ آگ عمارت کی طرف بڑھنے لگی۔ اس وقت عمارت کے مختلف حصوں سے دہشت گرد آگے بڑھ بڑھ کے آتشزدگی کو دیکھنے لگے۔ اسی وقت زرقا کی مشین گن پھر گنگنا اٹھی اور ماحول پھر انسانی چیخوں سے تھرا اٹھا۔ عمارت کے مختلف مقامات پر خون اگلتے دہشت گرد گرتے ہوئے مرنے لگے۔

اب زرقا بلٹ پروف لباس پہن کر مشین گن کندھے سے ٹکائے عمارت کی طرف بھاگنے لگی۔ وہ عمارت کے مرکزی ہال میں بغیر کسی دشواری کے داخل ہوگئی۔ راستے میں جگہ جگہ مردہ جسم پڑے تھے۔

ہال کے وسط میں ایک شاندار منقش نشست پر ان لوگوں کا باس ایک نیم عریاں لڑکی کو بغل میں لیے سامنے فرش پر رسیوں سے بندھے انسپکٹر شہباز کے چہرے کو لمبی چھڑی کی مدد سے چھیڑ رہا تھا۔ اس وقت ادھر ادھر سے نکل کے مسلح محافظوں نے زرقا پر گولیوں کی باڑ ماری لیکن اس کا کچھ نہ بگڑا جواب میں زرقا نے بڑے اطمینان سے مشین گن گھما کر انہیں بھون کر رکھ دیا۔ اب باس چونک کر پھٹی پھٹی نظروں سے خونی ہنگامے کو دیکھ رہا تھا۔ نیم عریاں لڑکی کو اس نے پرے دھکیل دیا تھا۔ جو تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس وقت باس نے دانت پیستے ہوئے ایک لمبا پستول اٹھا کر زرقا کو نشانہ بنانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ زرقا کی مشین گن نے اسے بھون کر رکھ دیا۔

زرقا نے آگے بڑھ کر شہباز کو رسیوں سے نجات دلا دی۔ پھر انہوں نے اس عمارت کے تہ خانے میں موجود کچھ اور دہشت گردوں کو گرفتار کرلیا جو تہ خانوں میں بم اور بارودی جیکٹس کا ذخیرہ چھپائے ہوئے احکامات کے منتظر تھے۔



واپسی پر انسپکٹر شہباز نے زرقا کو بتایا کہ اس عمارت کے باس ٹائیگر کو میں نے کسی اور بگ باس سے بات کرتے سنا تھا اور وہ ہیڈ کوارٹر قصور میں کسی مقام پر موجود ہے۔ جہاں دھڑا دھڑ اسلحہ تیار ہو رہا ہے اور لاہور اور کراچی میں دہشت گردی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔"

زرقا نے شہباز اور شازیہ کو قصور بھیج دیا کہ وہ اپنے ساتھیوں کو پھیلا کر اس ہیڈ کوارٹر کا پتا چلائیں پیر سے قبل میں ان کا صفایا کر دینا چاہتی ہوں۔ چنانچہ انسپکٹر شہباز اور شازیہ قصور روانہ ہوگئے اور اپنے ساتھیوں کو بھی وہیں بلا کر پھیلا دیا۔ یہ لوگ مزدوروں بھکاریوں اور گڈریوں کے روپ میں بکھر گئے ان کے پاس موبائل فون اور وائرلیس سیٹ بھی تھے۔

21 نومبر 2011ء پیر کی صبح زرقا کو ہیڈ کوارٹر میں شازیہ اور انسپکٹر شہباز کا کامیابی سے بھرپور پیغام ملا کہ مجرموں کے خاص اڈے کا سراغ لگالیا گیا ہے لیکن ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ انسپکٹر شہباز نے چھپ کر ایک دہشت گرد کی گفتگو سنی تھی جس نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ پیر کی صبح گورنر ہاؤس کو قبرستان میں تبدیل کر دیا جائے گا۔

زرقا نے یہ اطلاع آفیسرز کے سامنے رکھی سب نے مل کر پہلے عام حملے کا حکم دیا اور زرقا کو پیچھے رکھ لیا کسی بگڑتی ہوئی صورت حال سے نپٹنے کے لیے۔

چنانچہ جیسے ہی زرقا لاہور سے قصور پہنچی اسے ایک افسوس ناک خبر کا سامنا کرنا پڑا۔ دہشت گردوں کا اڈہ بڑا منظم سائنسی آلات سے مزین تھا۔ یہ تاریخی عمارت قصور کی سرحد کے پاس آسیبی عمارت کے طور پر مشہور تھی۔ اس کی چھت سے لوگوں نے روحوں کو آسمان کی طرف اڑتے اور بھیانک چیخوں کی آوازیں بھی اکثر سنی تھیں۔ لوگ ادھر کا رخ کرتے کانپتے تھے۔ اس عمارت کے اردگرد جنگل نما ماحول پھیلا ہوا تھا۔ گھنی جھاڑیاں، ٹیلے، درخت اور ناہموار راستے تھے۔ اس عمارت کے عقب میں شمال کی جانب ایک بہت بڑا تالاب تھا جو کسی چھوٹی جھیل کا منظر پیش کر رہا تھا۔ شدید بارشوں کی وجہ سے پانی خوب بھرا ہوا تھا۔ یہاں بھی عام حملے میں شدید ناکامی ہوئی اور پولیس اور ملٹری کے بہت سے جوان عمارت کی طرف بڑھتے ہوئے اچانک عمارت سے ہونے والی خوفناک متواتر فائرنگ سے ہلاک ہو کر گرتے چلے گئے۔ انسپکٹر شہباز اور شازیہ نے زرقا کو بتایا کہ فائرنگ تاریخی عمارت میں مختلف مقامات پر نصب کیے جانے والے پانی کے پائپوں کے متحرک ہونے سے اچانک بارش کی صورت میں برسی تھی۔ جس نے تمام ہی جوانوں کو خاک و خون میں تڑپا کر رکھ دیا۔ اس کے بعد ایک فوجی ہیلی کاپٹر کو عمارت کی چھت کی طرف روانہ کیا گیا لیکن وہ عمارت کی چھت سے چند گز کے فاصلے پر پہنچا تو اچانک عمارت کی چھت کے ٹاور سے ایک راکٹ فائر ہوا اور ہیلی کاپٹر کے پرخچے اڑ گئے۔

شہباز دوربین سے زرقا کو مرے ہوئے فوجی اور تباہ شدہ ہیلی کاپٹر کے ٹکڑے دکھانے لگا۔ زرقا کو جھرجھری سی آگئی۔ ایک جگہ ہیلی کاپٹر میں مرنے والوں کے سر الگ ہو کر ایک جھاڑی میں اٹکے ہوئے تھے۔

زرقا نے خطرناک صورت حال کے پیش نظر افسران بالا اور فضائیہ کے کمانڈر سے رابطہ قائم کر کے انہیں مزید حملے سے روک دیا اور خود میدان میں کودنے کے لیے ہیلی کاپٹر کے ذریعے عمارت کی پشت پر واقع جھیل کے دوسرے کے سرے پر پرواز کر گئی۔ اس نے اپنا ضروری سامان ساتھ لے لیا تھا۔

ہیلی کاپٹر نے رسی کی سیڑھی کے ذریعے زرقا کو پہلے سے پانی میں موجود ایک بڑی سی لانچ پر اتار دیا پھر انہوں نے زرقا کے اشارے پر پچکے ہوئے غبارے جیسی بڑی سی شے بھی کشتی پر لٹکا کر پھینک دی۔ زرقا نے اس ربر جیسی شے کے درمیان میں موجود زپ کھول کے اس غبارہ نما شے کے وسط میں موجود ایک خوب صورت نشست پر بیٹھ کر سامنے نصب چھوٹے سے سفید کاؤنٹر پر بیٹھ کر ایک بٹن اور لیور دبایا اور ایک ہینڈل گھمانے لگی۔ جس کے نتیجے میں کسی جگہ بند گیس نکل نکل کر پھیلتے ہوئے ربر کے ٹیوبس میں بھرنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ غبارہ نما پچکی شے ایک بہت بڑی سرخ رنگ کی فٹ بال میں تبدیل ہوگئی جو چھ فٹ قطر کے حساب سے چاروں طرف برابر گول تھا۔ زرقا اس گولے کے اندر نشست پر براجمان کاؤنٹر پر سامنے لگے بٹن دبا رہی تھی۔ چند لمحوں میں ہی گیس بھرے ٹیوبس کے اندر گول دائرے کی شکل میں نصب گولے کو گھمانے والی مشینری کا میکنزم حرکت میں آ گیا اور گولے میں ہلکی

ہلکی حرکت پیدا ہوگئی لیکن نشست والا اندرونی حصہ تھما ہوا تھا۔
اب زرقا نے گولے کو اسٹارٹ کردیا جس کے نتیجے میں اس کے سوراخوں سے سرخ سبز زرد اور نیلے رنگ کے شرارے نچلے حصے سے خارج ہوئے اور وہ ایک جھٹکا کھا کر کشتی سے اچھل کر جھیل کے پانی میں لڑھک گیا اور پھر سطح آب پر بھاگتا ہوا لڑھک کر پراسرار تاریک عمارت کی طرف بڑھنے لگا جس کا عقبی حصہ کسی سیاہ دیو کی مانند معلوم ہو رہا تھا۔ چھت پر ایک انسانی بت بھی نصب تھا۔ زرقا گولے کے اندر نشست پر موجود کاؤنٹر کے اوپر ابھرنے والی اسکرین پر سامنے کا منظر بالکل واضح دیکھ رہی تھی۔
یہ حفاظتی گولا بڑا فٹ بال تھا جو اسے ڈاکٹر داور نے بنا کر دیا تھا جو ملک کے نامور سائنسدان اور اس کے چیف کے بھائی تھے۔ چونکہ آج کل دہشت گردوں کے پاس جدید ترین اسلحہ اور سائنسی آلات آچکے تھے لہٰذا ان کے مقابلے کے لیے حیرت انگیز اشیاء کی ضرورت تھی۔ گولا بنانے کا آئیڈیا ڈاکٹر داور کا ہی تھا جسے عملی شکل دینے کے بعد زرقا کے کارناموں کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر نے یہ حیرت انگیز لانچ گولا اس کے حوالے کردیا تھا۔ ڈاکٹر نے گولے کا خیال ایک جاسوسی ناول میں پڑھا تھا۔
سرخ گولا جیسے ہی بڑی شان سے سطح آب پر لڑھکتا ہوا عمارت سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر پہنچا' عمارت کے مختلف حصوں پر نمودار ہونے والے پائپوں سے اس پر زبردست فائرنگ ہوئی لیکن گولا بلٹ اور آگ پروف تھا اسے کوئی نقصان نہ پہنچا' اب دہشت گردوں نے اس پر میزائل فائر کیا' گولا آگے نکل گیا اور میزائل اس سے چند گز دور جا کر پانی میں پھٹا جس سے پانی میں زبردست ہلچل مچ گئی۔ گولا اوپر اچھلنے لگا۔ لیکن زرقا نے اضافی انجن اسٹارٹ کردیا۔ گولے کی طاقت بڑھ گئی اور وہ تقریباً اڑتا ہوا اچھلتی موجوں سے آگے جا نکلا۔
جیسے ہی سرخ گولا عمارت کے عقبی برآمدے کے سامنے پہنچا ادھر ادھر سے آنے والے مسلح افراد نے اس پر فائر کھول دیا۔ اس وقت موقع پا کر زرقا نے گولے کو سامنے سے شق کیا اور مشین گن باہر نکال کر گھماتے ہوئے گولیاں برسانے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے دہشت گرد خون اگلتے ہوئے مرنے لگے۔ ان کی چیخوں سے ماحول کانپ اٹھا۔ گولے کو کنارے روک کر زرقا مشین گن سنبھالے چھلانگ مار کر برآمدے میں چلی گئی اور پھر وہ اپنے قدموں تلے عمارت کے مختلف راستے روندنے لگی۔ وہ بلٹ پروف لباس میں ملبوس تھی۔ لہٰذا اس کے سامنے ادھر ادھر خون اگلتی انسانی لاشیں گرنے لگیں۔ چیخ و پکار سے بھگدڑ مچ گئی۔ ایک کار نما گاڑی تیزی سے اسے کچلنے کے لیے اس کی طرف آنے لگی۔ زرقا نے بڑی پھرتی اور دلیری سے دستی بم پشت پر موجود بیگ سے نکال کی اس پر کھینچ مارا۔ گاڑی کے پرخچے اڑ گئے۔ اسے بھی جھک کر ریزوں اور پرخچوں سے بچنا پڑا۔
وہ لمبی راہ داری میں بھاگتی ہوئی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ اچانک اس کے آگے کسی کمرے کا سفید دروازہ زوردار آواز کے ساتھ باہر کی جانب کھلا۔ دروازے میں ایک ہی بڑا سا پٹ تھا جو زرقا کو زور سے لگا اور وہ دھڑام سے فرش پر پیچھے کی طرف گر پڑی۔ اسے کچھ چوٹیں محسوس ہوئیں۔ اس وقت لمبا چوڑا ساڑھے چھ فٹ قد کا ایک سیاہ حبشی جو بے حد طاقتور دکھائی دیتا تھا ایک لمبا سا چمکدار خنجر لیے زرقا کی طرف بڑھا۔ زرقا جان بوجھ کر ساکت ہوگئی۔ جیسے ہی وہ حبشی اس پر جھکا زرقا نے زور سے دائیں

کک اس کے نازک مقام پر ماری وہ کراہ کر الٹ گیا پھر تڑپ کر سنبھلا اور خنجر لیے پھر حملہ آور ہوا۔ زرقا نے جھکائی دے کر اس کا خنجر والا ہاتھ پکڑ لیا اور جوتے کی ٹھوکر اس کے پیٹ میں ماری۔ وہ بٹن دبا کر جوتے کے آگے نکل آنے والا چاقو نکال چکی تھی۔ چنانچہ حبشی کی آنتیں کٹ گئیں اور وہ چاقو پھینک کر تڑپنے لگا۔ زرقا آگے بڑھ گئی۔ دو تین اور جھڑپوں کے بعد وہ عمارت کے مرکزی ہال کے سامنے پہنچ گئی۔ جس کی سامنے والی دیوار شیشے کی تھی۔ اس ہال میں وسطی مقام پر ایک سفید فام آدمی دو نیم عریاں لڑکیوں کے درمیان بیٹھا اسکرین پر گورنر ہاؤس لاہور کا منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے سرخ سرخ رنگ کے بٹن لگے ہوئے تھے۔ اسی لمحے ہال کے اوپر والے حصے سے جو ٹرانسپرنٹ نہیں تھا ایک لوہے کا بھاری جال زرقا پر آ گرا اور اس کے ساتھ ہی سفید فام باس صوفہ نما سیٹ گھما کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔
نیم عریاں لڑکیاں اس کی شاندار منقش نشست کی چوڑے چوڑے بازوؤں پر بیٹھی ہوئی تھیں وہ مستی میں چور تھیں۔
"بہت اچھل کود ہوگئی کمانڈو زرقا۔" باس سانپ کی مانند پھنکارا۔ زرقا نے مشین گن پھینک دی۔ گولیاں اور دستی بم بھی ختم ہوچکے تھے۔ اس وقت جال سمٹنے لگا اسے جھٹکے لگنے لگے پھر جال بلند ہونے لگا اور جس کرین سے جال منسلک تھا اس نے جال کو اندر ہال کے فرش پر سرنگ نما حصہ سے گزار کر اندر لا کر ڈال دیا۔ اس وقت باس شیطانی لہجے میں زرقا کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا۔
"بہادر گڑیا! میں اس ملک کا دشمن نمبر ایک ہوں اور ایک قریبی ملک سے تعلق رکھتا ہوں۔ ہمیں اس ملک کی ترقی ایک آنکھ نہیں بھاتی' ہم اس ملک اور مسلمانوں کو پسماندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ تمہارے ملک کے لوگوں نے مسلم ممالک کے سربراہان کو جمع کرلیا ہے لیکن ایک بھی بچ کر نہیں جائے گا یہ ملک دنیا میں ذلیل و رسوا ہو کر رہ جائے گا پھر کوئی ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔
گورنر ہاؤس میں سربراہان کی نشستوں کے سامنے موجود مائکوں میں جدید ترین ریموٹ کنٹرول بم قطار میں فٹ کردیئے گئے ہیں اور ان سب کے کنٹرول کا سسٹم یہ سرخ بٹن ہیں۔" دشمن ملک کے جاسوس نے قطار میں لگے سرخ بٹنوں کی طرف اشارہ کیا۔ "بس میں بٹن دباتا جاؤں گا اور ادھر کانفرنس روم میں نمائندوں کی گردنیں اڑتی چلی جائیں گی۔" وہ سفاک لہجے میں کہتا ہوا رک گیا۔
"جدید عکسی کیمرہ نظام بھی ہم فٹ کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ ہم غداروں کی مدد سے اس

اہمیت کتاب کی!

+ ۔خیالات کی جنگ میں کتابیں ہتھیاروں کے کام آتی ہیں۔
+ ۔جس گھر میں کتاب نہیں وہاں نیکی خاموش ہے انصاف اونگھ رہا ہے' سوچ گونگی ہے اور زندگی بے معنی ہے۔
+ ۔کتابیں وہ جہاز ہیں جو وقت کے وسیع سمندر میں چلتے ہیں۔
+ ۔آدمی مطالعے سے بیدار ہوتا ہے' مکالمے سے تمیز آتی ہے اور لکھنے سے اس کی شخصیت نکھر جاتی ہے۔
+ ۔کتاب وہ متحرک پارک ہے جسے تم اپنے ہاتھوں میں تھامے جہاں چاہے لے جا سکتے ہو۔

(عظمٰی محمود احمد' سرگودھا)

ملک میں کیا نہیں کر سکتے۔" وہ پھر باطنی خباثت سے غرا کر بولا۔

"ہاں تم دشمن ملک کے بہت خطرناک جاسوس ہو لیکن میں تمہارے عزائم کو خاک میں ملانے کے لیے آ چکی ہوں۔" زرقا نے پرطیش لہجے میں مٹھیاں دباتے ہوئے کہا۔

"تم نے جو کچھ کرنا تھا کر چکیں اب ہماری باری ہے۔" باس نے قہقہہ بلند کیا۔ "دیکھو اسکرین پر اسلامی نمائندے آنے شروع ہو گئے ہیں جیسے ہی تمام نشستیں پر ہوئیں میری انگلیاں بٹن دباتی چلی جائیں گی۔" وہ خوفناک لہجے میں بولا۔

"میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔" زرقا غرا کر بولی۔

"تم کئی من لوہے میں دھنسی ہوئی ہو کیا کر لوگی۔" باس نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔

"میں بہت کچھ کر سکتی ہوں اس عالم میں بھی ادھر دیکھو۔" زرقا نے چیخ کر اپنی جیکٹ کے بٹن کھول دیئے۔ باس چونک کر دیکھنے لگا۔ "میرے سینے پر ایک طاقتور بم نصب ہے یہ عمارت ابھی اڑ جائے گی۔" زرقا نے شیرنی کی مانند گرج کر کہا۔

باس اس سے باتیں کرتا ہوا پہیوں والی شاندار نشست پر بٹنوں سے کچھ دور زرقا کے پاس چلا آیا تھا۔ دونوں عیاش لڑکیاں زرقا کو فحش اشارے کر رہی تھیں۔ باس تیزی سے بٹنوں کی طرف کرسی کو دھکیلنے لگا۔ اسی لمحے کلمہ پڑھتے ہوئے زرقا نے نعرہ تکبیر بلند کیا اور بم کا بٹن دبا دیا۔ ایک خوفناک دھماکا ہوا اور ہال کے پرخچے اڑ گئے۔ زرقا کے چیتھڑے اڑ گئے۔ سائنسی آلات بھی پھٹ گئے، چھت اڑ گئی، دیواریں گر گئیں، آگ پھیلنے لگی۔ عمارت میں موجود دہشت گردی کے لیے رکھا گیا اسلحے کا اسٹاک بھی زد میں آ گیا اور بارودی کا مواد دھماکوں کے ساتھ پھٹنے لگا۔ عمارت کے مختلف مقامات کے ٹکڑے اڑنے لگے۔

❀......❀......❀

دور سے انسپکٹر شہباز، شازیہ اور دوسرے بہت سے آفیسرز آنکھوں میں آنسو لیے کھڑے تھے۔ زرقا نے اپنی گھڑی کا ایک ایمرجنسی بٹن دبا کر انسپکٹر شہباز کی گھڑی پر سرخ سگنل دے دیا تھا۔ جس کا مطلب تھا خدا حافظ۔

"اے وطن کی مجاہدہ خدا حافظ، خدا حافظ" شہباز اور شازیہ کے منہ سے رو دینے والے انداز میں نکلا۔

❀......❀......❀

اگلے دن کے اخبارات زرقا کے معرکہ اور شہادت کی خبروں سے بھرے پڑے تھے۔ صبح کے وقت ناشتے کی طرف بڑھتا شہزاد کا ہاتھ رک گیا۔ غلام رسول اس کے سامنے اخبار رکھ گیا تھا۔ شہزاد نے ہیجان کے عالم میں خبروں اور تصاویر پر نگاہ ڈالی اور اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے اور ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

"اے وطن کی مجاہدہ، اے وطن کی بیٹی زرقا تجھے وطن کی ہوائیں سلام کہتی ہیں۔"

❀......❀......❀

شہزاد نے فیصلہ کر لیا کہ وہ عمر بھر شادی نہیں کرے گا، اس کے والدین اور غزل نے بہت زور لگایا لیکن وہ اپنے ارادہ پر ڈٹا رہا۔ دنیا میں اب اس کے لیے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ اس نے غزل سے کہا۔

"غزل اس دنیا میں نہیں تو دوسری دنیا میں ہمارا ملاپ تو ہو ہی جائے گا۔"

❀

احمق

راحیلہ تاج

وہ ایک جلد باز اور عجلت پسند انسان تھا اور یہی بات اس کے حق میں بری ثابت ہوئی۔ اس کی بازی اسی پر الٹ گئی وہ ایسے جہاں میں پہنچ گیا جہاں سے غلطیاں درست نہیں کی جاسکتی تھیں۔

ایک عاقبت نااندیش انسان کا قصہ مختصر مگر پراثر کہانی

اسے تو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ وہ کتنے عرصے سے نوکری کر رہا ہے اور نہ ہی یہ یاد تھا کہ سر ایڈگر کا خادم خاص بنے ہوئے اسے کتنی مدت ہوئی ہے۔ وہ صرف یہ جانتا تھا کہ اس کا نام پیکر ہے اور اس کا کام جسٹس ایڈگر کی خدمت کرنا ہے۔

پیکر کی زندگی ابھی تک کامیاب نہ تھی یہ ضرور تھا کہ بچپن سے اب تک گھر کا کام کاج کرنے والے لڑکے، پھر چوکیدار اس کے بعد اردلی پھر شوفر اور اب خادم خاص کی حیثیت سے اس نے جو کچھ کمایا تھا وہ جمع ہوتا رہا تھا لیکن ابھی تک اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ رقم پس انداز کرنے کا مقصد کیا ہوتا ہے۔

لوگوں کی عام رائے یہ تھی کہ پیکر پیدائشی طور پر ناکارہ آدمی ہے۔ جسمانی طور پر وہ مختصر دبلا پتلا، سکڑا ہوا، منحنی، نحیف، زرد رو، گنجا، کبڑا اور ذہنی طور پر غبی، احمق، لالچی، حاسد اور عملی طور پر نکما اور نکھٹو تھا۔ اس کی ازدواجی زندگی تھی ہی نہیں اور اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ ازدواجی زندگی کی اصطلاح کیوں استعمال کی جاتی ہے۔

ان تمام خامیوں کے باوجود سر ایڈگر نے اسے ملازم رکھ لیا تھا۔ شاید وہ کوئی ایسا نوکر ہی چاہتے تھے جس میں یہ تمام خامیاں موجود ہوں لہٰذا پیکر کی خوش قسمتی تھی کہ ایڈگر کے وسیع و عریض محل میں اس کی یہ خامیاں خوبیاں بن گئی تھیں۔

ابتدائی دنوں میں تو پیکر کو یہ شک محسوس ہوتا رہا کہ سر ایڈگر کبھی لات مار کر اسے نوکری سے نکال دیں گے لیکن پھر جب مہینے سالوں میں بدلنے لگے تو اسے یقین ہو گیا کہ اب اپنی یا سر ایڈگر کی آخری سانس تک وہ یہیں کام کرتا رہے گا۔

جسٹس سر ایڈگر خاندانی اعتبار سے رئیس اور رنڈوے تھے۔ ان کے جسم پر گوشت کی تہیں تھیں اور انہیں شہر کے سماجی حلقوں میں اہم ترین مقام حاصل تھا۔

وہ نایاب پودوں اور نایاب جانوروں سے عشق کرتے تھے۔ کھانے میں انہیں مچھلیاں پسند تھیں اور وہ مچھلیوں کو پالنے کے بھی شوقین تھے۔

مزاج کے اعتبار سے وہ بہت غصیلے تھے بس غصہ ان کی ناک پر دھرا رہتا ہے اور جب بھی وہ کسی نایاب چیز کے اچھے دام لگانے کے باوجود اسے حاصل کرنے میں ناکام رہتے تھے تو سارا نزلہ پیکر پر گرتا تھا اور وہ بے چارہ اپنے گنجے سر کو کھجاتا ہوا کہیں چھپ جایا کرتا تھا۔

پیکر سر ایڈگر کی ڈانٹ کھا کھا کر اگر ڈھیٹ نہیں تو بے غیرت ضرور ہو گیا تھا۔ اسے کوئی گالی بری نہیں لگتی تھی۔ سر ایڈگر ہمیشہ اسے احمق پیکر کہہ کر بلاتے تھے اور شاید اس نے اس خطاب کو اپنے

نام کا قانونی حصہ تسلیم کرلیا تھا۔
اس کی زندگی میں روز ڈانٹ کھانا اسی طرح کا جز بن گیا تھا جیسے کپڑے بدلنا اور پانی پینا۔
ایک روز جب اس سے چائے کی پیالی گر گئی اور سرائیڈگر کی ایک آفس فائل بھیگ گئی تو انہوں نے اسے بے نقط سنا ڈالیں۔ انہوں نے اسے احمق، پاجی، الو اور گدھا کہا اور پھر جب بھی تسکین نہ ہوئی تو چڑی کا غلام بھی کہہ ڈالا۔ یہ نئی گالی تھی جو پیکر کو گھائل کر گئی۔ اس کے دل میں پہلی بار سرائیڈگر کے لیے نفرت کی چنگاری نے جنم لیا اور جب اگلے روز سرائیڈگر نے اسے دوبارہ یہی گالی دی تو اس چنگاری نے شعلے کی شکل اختیار کرلی۔
تب ہی پیکر نے فیصلہ کیا کہ سرائیڈگر کو مر جانا چاہیے۔
پیکر کے ساتھ سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ اسے اپنی خامیوں کا اچھی طرح علم تھا۔ اسے یہ بات معلوم تھی کہ وہ نااہل ہے اور کسی کو خراش بھی نہیں لگا سکتا۔
پھر بھی اس نے اپنے طور پر ایک منصوبہ تیار کیا اور اگلے روز ہی اس پر عمل کر ڈالا۔
مگر منصوبہ ناکام ہوگیا۔
''احمق پیکر۔'' انہوں نے وہسکی کے گلاس کو دیکھتے ہی گرج کر آواز دی۔ وہ کانپتا ہوا ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ''گلاس کی ڈھنگ سے صفائی بھی نہیں کر سکتے۔'' انہوں نے انگلی سے گلاس پر جمے ہوئے پاؤڈر کو صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم احمق نہ ہوتے تو میں یہی کہتا کہ تم نے مجھے قتل کرنے کی سازش کی ہے۔'' پھر انہوں نے گلاس پیکر کی گنجی چندیا پر خالی کر دیا۔
پیکر کی اگلی کوشش قدرے بہتر تھی۔ اس نے کہیں یہ پڑھ لیا تھا کہ سڑے ہوئے سرد گوشت میں زہریلے جراثیم پیدا ہوجاتے ہیں لہٰذا اس نے پہلے ایک گوشت کے پارچے کو اچھی طرح سڑنے دیا اور پھر اس کے کباب بنا کر سرائیڈگر کو سلاد کے ساتھ پیش کر دیے۔
''احمق پیکر۔'' سرائیڈگر نے میز پر زور سے گھونسا مار کر اسے لرزا دیا۔ ''کیا تم سونگھ بھی نہیں سکتے۔ یہ گوشت سڑا ہوا ہے۔ یہ اب تم ہی کھاؤ۔'' انہوں نے پیکر کا گریبان پکڑ کر اسے جھنجوڑ ڈالا اور بے چارے پیکر کو سارا گوشت خود کھانا پڑا۔ پھر وہ تین روز تک اپنے کمرے سے بیت الخلا اور بیت الخلا سے اپنے کمرے تک محدود ہوگیا۔
اس تجربے سے اسے اپنی نااہلی کا مکمل اندازہ ہوگیا وہ گوشت میں زہریلے جراثیم بھی پیدا نہ کرسکا تھا۔
اس واقعے کے بعد بھی اس نے دو کوششیں کر ڈالیں لیکن اسے ناکامی ہی ہوئی۔
ایک مرتبہ اس نے سوئمنگ پول کے قریب لکڑی کے زینے کا ایک تختہ نکال دیا لیکن پھر یہ بھول گیا کہ تختہ نکلا ہوا ہے اور تیزی سے اترنے کی کوشش میں خود ہی لڑھک کر زخمی ہوگیا۔
ایک روز اس نے دوسری منزل کی کھڑکی سے ایک بھاری گلدان پھینکا جو سرائیڈگر سے ایک گز دور گر کر چکنا چور ہوگیا۔
''پیکر احمق، کیا مجھے مار ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔'' سرائیڈگر گلا پھاڑ کر چلائے اور اسے یہ وضاحت کرنے میں بے حد دشواری ہوئی کہ وہ گلدان صاف کر رہا تھا کہ اچانک ہاتھ سے پھسل گیا۔
ایک اچھی بات یہ تھی کہ ابھی تک سرائیڈگر کو اس

پر شبہ نہیں ہوا تھا لیکن پیکر کو معلوم تھا کہ یہ سلسلہ زیادہ عرصہ تک نہیں چل سکتا۔ وہ کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگا جس سے مقصد جلد از جلد حاصل ہوجائے۔
ایک روز اس کی نظر اخبار میں شائع ہونے والے اشتہار پر پڑی تو وہ مارے خوشی کے اچھل پڑا یہ بزنس ایفی شنسی کنسلٹنٹ کا اشتہار تھا۔ پیکر کو اس روز پہلی بار یہ احساس ہوا کہ قدرت اس کا ساتھ دے رہی ہے۔
اگلے روز اسے نصف دن کی چھٹی ملی تو وہ ٹرین میں بیٹھ کر سیدھا شہر پہنچ گیا۔
''میں ایک ناول لکھ رہا ہوں جناب۔'' اس نے چیف کنسلٹنٹ سے کہا جو ایک نوجوان اور خاموش مزاج آدمی تھا۔ ''ناول کا اختتام ایک قتل پر ہوتا ہے اور میں آپ سے قتل کا ایسا طریقہ پوچھنے کے لیے آیا ہوں جو خطرناک نہ ہو؟''
''میں سمجھا نہیں۔'' چیف کنسلٹنٹ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
''میرا مقصد یہ ہے کہ قتل کے بعد قاری کو بھی یہ احساس نہ ہو کہ یہ قتل کی واردات تھی۔''
نوجوان ماہر چند لمحوں تک اسے بڑی دلچسپی سے گھورتا رہا۔ وہ خود بھی جاسوسی ناول پڑھنے کا شوقین تھا۔ ''قتل کا پس منظر تو بیان کریں۔'' اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔
پیکر نے سرائیڈگر کا نام لیے بغیر ان کی زندگی کا نقشہ کھینچ دیا۔ اس نے سرائیڈگر کی خوبیوں اور خامیوں کے بارے میں بھی سب کچھ بتا دیا اور ایک ایسے نوکر کا بھی تذکرہ کیا جو اپنے مالک کی خبیث عادتوں سے تنگ آ کر اب اسے قتل کرنا چاہتا ہے۔
''وہ اپنے ملازم کو ذرہ برابر بھی اہمیت نہیں دیتا اتنی بھی نہیں جتنی اپنی مچھلیوں کو دیتا ہے۔'' پیکر نے آخری جملہ ادا کرتے ہوئے بڑی نفرت سے کندھے سکیڑ لیے۔
''مچھلیاں......!'' نوجوان ماہر نے اچھل کر کہا۔ ''سنو، تم ناول میں مچھلیوں کے ذریعے ہی اسے قتل کرادو۔ جنوبی امریکا میں ایسی خون آشام مچھلیاں موجود ہیں جو بظاہر بے ضرر نظر آتی ہیں انہیں فائرن کہتے ہیں جن کا جھنڈ صرف بیس منٹ میں پوری گائے ہڑپ کرسکتا ہے۔''
''فائرن'' پیکر بھی اچھل کر بولا۔ ''اوہ میرے ناول میں مالک کا کردار ایسا ہی ہے جو مچھلیوں سے بہت محبت کرتا ہے مگر......!''
''ایسا کرو کہ کسی طرح ناول میں ان مچھلیوں کا ذکر کردو ایک پیراگراف یہ بڑھا دو کہ مالک نے فائرن مچھلیوں کا آرڈر دیا ہے۔''
''مگر اس سے کیا فرق پڑے گا۔ میں نے ناول میں دو سوئمنگ پولز کا ذکر کیا ہے جن میں سے ایک مچھلیوں کے لیے مخصوص ہے اور مالک صرف اس پول میں نہاتا ہے جس میں مچھلیاں نہیں ہوتیں۔''
''درست لیکن فرض کرو کہ نوکر فائرن مچھلیاں جان بوجھ کر اسی سوئمنگ پول میں ڈال دے جس میں مالک نہاتا ہے تب......!''
''آہ......!'' پیکر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''یہ بھی برا خیال نہیں ہے اس پر کام ہوسکتا ہے۔''
پیکر نے پہلی کامیابی بہت آسانی سے حاصل کرلی۔
اسے علم تھا کہ سرائیڈگر مچھلیوں کو اپنی نگرانی میں پول میں ڈلوائیں گے لہٰذا اس نے اس صورت

حال سے بچنے کے لیے از خود کمپنی کو فون کیا کہ مچھلیوں کی ڈیلیوری فوراً درکار ہے۔ اس وقت سر ایڈگر گھر میں موجود نہیں تھے۔

ان کی واپسی تک سوئمنگ پول میں خوں آشام مچھلیاں تیر رہی تھیں۔

''کیا آپ آج بھی سوئمنگ پول میں وقت گزاریں گے جناب۔''

پیکر نے بڑی عاجزی سے پوچھا۔

''ہاں' کیوں نہیں۔'' لیکن پہلے کافی پلا دو پھر بتاؤں گا۔'' وہ ٹرے لے کر سوئمنگ پول پر پہنچا تو سر ایڈگر صرف کاسٹیوم پہنے ہوئے تھے پیکر کے ایک کندھے پر بڑا سا تولیہ پڑا ہوا تھا۔

''لاؤ بھئی' کافی کو بہت دل چاہ رہا ہے۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر آگے بڑھ کر کافی پاٹ کا ڈھکنا اٹھا لیا۔ ''یہ کیا احمق یہ تو چائے ہے۔'' وہ غصے سے بل کھا کر بولے اور پھر انہوں نے کافی پاٹ دور پھینک کر پیکر کی گردن دبوچ لی۔ ''تو اس طرح اپنی حماقتوں سے باز نہیں آئے گا۔'' انہوں نے اسے جھنجوڑتے ہوئے کہا اور سزا دینے کے لیے پول میں دھکا دے دیا۔

وہ زور زور سے چلانے لگا۔ سر ایڈگر یہی سمجھتے رہے کہ وہ خنک پانی سے خوفزدہ ہے لہٰذا اس کی چیخوں کے جواب میں ان کے قہقہے ہی گونجتے رہے۔ پھر جونہی پیکر کی چیخیں تھم گئیں اور پانی سرخ ہو گیا تو وہ اچھل پڑے انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ پیکر کا بے جان جسم پول میں تیر رہا تھا اور مچھلیاں اس کا گوشت کھانے کے لیے ایک دوسرے پر پلی ہوئی تھیں۔



''سوال یہ ہے کہ مچھلیاں میری لاعلمی میں کس طرح آئیں اور انہیں ان کے پول کے بجائے میرے پول میں کیوں ڈالا گیا۔'' پولیس کو بیان دینے کے بعد سر ایڈگر نے پوچھا۔

''اس کا جواب وہی کمپنی بہتر طور پر دے سکے گی جس نے مچھلیاں فراہم کی تھیں جناب۔'' انسپکٹر نے بڑے احترام سے کہا اور جب کمپنی نے جواب دیا تو سر ایڈگر سر پکڑ کر رہ گئے۔ یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ پیکر نے ان کے قتل کی سازش کی تھی وہ اپنے ملازم کی موت پر بہت آزردہ تھے۔ اس رات وہ سو نہیں سکے صرف یہ سوچتے رہے کہ پیکر نے انہیں قتل کرنے کی سازش کیوں کی تھی۔ شاید اس نے میرا وصیت نامہ دیکھ لیا تھا۔ وہ سگریٹ سلگا کر بیٹھ گئے۔ جس میں' میں نے اپنی آدھی جائیداد اس کے نام پر کر دی ہے بے چارہ' جائیداد جلد از جلد حاصل کرنے کی ہوس میں مارا گیا بے چارہ......!

سر ایڈگر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''احمق پیکر' تمہیں اتنی جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے تھا۔''



قول مجبو

اسرار احمد

پہلی جنگ عظیم کے بعد جرمنی میں افراط زر کی تباہ کاریوں نے دنیا میں اپنے پر پھیلا دیئے تھے اور معاشی بحران نے لوگوں کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ بے روزگاری بڑھتی چلی گئی۔ فاقوں کی نوبت آنے لگی تو لوگوں نے بے دریغ اپنے اثاثے فروخت کرنے شروع کر دیے۔ پوری قوم کا معاشی نظام درہم برہم ہو گیا۔ بھوک سڑکوں پر رقص کرنے لگی۔

معاشی بحرانوں کی لپیٹ میں آنے والے ایک ملک کی حقیقی داستان

''پانچ ہزار وحشی افراد نے آہنی گیٹ توڑ دیا اور ہمارے محل میں گھس کر ہمیں تلاش کرنے لگے۔ ہم فرار ہونے کے لیے دیوانہ وار سنگ مرمر کے فرش والے کمروں کی طرف بھاگے۔''

بیرن فریڈرک میز کے اس پار بیٹھی حسین و جمیل اور جواں سال شہزادی کو گھورنے لگا۔ اسے شہزادی کی اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ''پانچ ہزار افراد......'' وہ بڑبڑایا۔

شہزادی نے زور زور سے سر ہلایا۔ وہ اسے اپنی طرف راغب کرنے کی بہت مایوس کن کوشش کر رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر یہ شخص اندر سے بھی اتنا ہی سرد مہر ہے جتنا بظاہر دکھائی دے رہا ہے تو بات یہیں ختم ہو جانی چاہیے۔ شہزادی کا خیال تھا کہ اس کے سامنے بیٹھا ہوا میں سالہ شخص ایک ایسی چٹان ہے جس پر برسوں سے پڑنے والی برف گر گر کر منجمد ہو چکی ہے اور محض اداؤں کی آنچ اس کے لیے ناکافی ہو گی۔

''ہاں......'' شہزادی نے بڑی شد و مد سے کہا۔ ''پانچ ہزار افراد......وہ ہماری ریاست کے زرعی غلام تھے لیکن ان کی وفاداریوں کا رخ بدل گیا تھا۔ جب کمیونسٹ جیت گئے تو انہوں نے ہمیں قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس وقت خان زادہ ایئر اسٹرپ پر ہمارا بے چینی سے منتظر تھا اور ہیلی کاپٹر کے پنکھے حرکت میں تھے۔ وہ پرواز کے لیے تیار کھڑا تھا۔''

بیرن نے اپنے کمرے کی کشادہ کھڑکی سے باہر گھورنا شروع کر دیا۔ اس طرف اس کے بینک کا مغربی شعبہ واقع تھا اور وہیں سے عمارت دریا کے کنارے کی طرف تھوڑا سا خم کھا کر گھوم جاتی تھی۔

''خانزادہ......'' اس نے شک آمیز لہجے میں دہرایا۔

''ہاں' میرا مطلب ہے' پرنس ایوان کا جہاز وہاں موجود تھا۔ باغی تیزی سے ہمارا تعاقب کر رہے تھے۔ وہ ہم تک پہنچ جاتے مگر خانزادے کے سپاہی ہماری حفاظت کر رہے تھے۔ وہ ہمارے ساتھ دوڑتے ہوئے پلٹ پلٹ کر گولیاں بھی چلاتے رہے تاکہ باغیوں کو زیادہ قریب آنے کا موقع نہ مل سکے۔'' شہزادی کی آواز میں کرب کی جھلک نمایاں ہو گئی اور گلا رندھ گیا۔ ''پرنس ایوان کو تو بس صرف میری ہی فکر تھی۔ اس نے کسی نہ کسی طرح دھکیل کر مجھے تو جہاز میں سوار کرا دیا لیکن خود سوار نہ ہو سکا اور باغیوں نے اسے قتل کر دیا۔ ذرا سی تاخیر اس کے لیے مہلک ثابت ہوئی تھی۔''

بیرن الجھن میں مبتلا ہو گیا۔ ''پرنس ایوان؟'' اس نے تصدیق کے لیے دہرایا۔

''ہاں' شہزادہ ایوان......میرا شوہر' میرا رفیق۔'' شہزادی کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ رندھی ہوئی آواز

کے باوجود اس کے لہجے میں اپنے خاوند کے لیے فخر شامل تھا۔ ''پرنس ایوان' جوزار کا دستِ راست تھا۔'' اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ ''میں اس کے بڑھاپے کا سہارا تھی۔ اس کی آخری بیوی۔''

بیرن کے چہرے پر شریر سے تاثرات پھیل گئے۔ ''وہ فوراً دفاعی انداز اختیار کرنے پر مجبور ہوگئی۔ اس کی آنکھوں سے اشتعال ظاہر ہونے لگا۔ جیسے اس کی سیاہ آنکھیں یکایک سلگ اٹھی ہوں۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ اسے جو مایوس کن صورتِ حال درپیش ہے کیا اس غیر مہذب شخص سے واسطہ رکھ کے وہ دور ہوسکتی ہے؟ ایک ایسا بے خبر آدمی جس نے بوتو خان کے سلسلہ نسب سے تعلق رکھنے والے شہزادے ایوان کا نام تک نہیں سنا؟ لیکن یہ خیال فوراً ہی اس کے ذہن سے محو ہوگیا کیونکہ وہ اپنی زندگی کے بدترین دور سے گزر رہی تھی۔ اسے ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو اسے تحفظ فراہم کرسکے۔ اس پر دوبارہ یاسیت چھا گئی۔ یاسیت اور انکسار۔ اس کی خوش نما آنکھوں سے موتیوں جیسے آنسو رخساروں پر بکھرنے لگے۔

''وہ بہت خوفناک مرحلہ تھا۔'' اس نے لرزتی آواز میں کہنا شروع کیا۔ ''جیسے ہی شہزادہ ایوان زخمی ہوکر گرا' اس نے مرنے سے قبل چیخ کر مجھ سے کہا۔ ''ہندا' میری جان' ہندا' میرے آدرشوں کا خیال رکھنا۔ میرے اصولوں کو ہمیشہ برقرار رکھنا۔''

شہزادی نے رومال سے آنسو خشک کیے۔ اسے بار بار احساس ہورہا تھا کہ اگر بیرن کا یہی عالم رہا تو وہ بے موت مرجائے گی' ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے گی۔ اس کی قسمت کا سورج کبھی طلوع نہیں ہوگا۔ اس نے مزید موثر انداز میں بات جاری رکھی۔

''جہاز کے پروں میں گولیوں سے کئی سوراخ ہوگئے تھے۔ اس لیے مجھے مجبوراً یہاں اترنا پڑا۔ لینڈ کرنے اور داخلے کی اجازت حاصل کرنے کے لیے مجھے اپنی تمام دولت سے ہاتھ دھونے پڑے۔ کمیونسٹ مجھے زندہ حالت میں پکڑنا چاہتے تھے اس لیے میں نے اپنے پاس موجود رقم بے دریغ استعمال کرڈالی اور بچ نکلی۔'' اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ ''پرنس ایوان کے اصولوں میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ اگر کبھی انسان نیلامی پر چڑھ جائے تو اسے خود اپنی ہی بولی لگا کر سب سے اونچی بولی دے کر اپنے آپ کو خرید لینا چاہئے۔'' اس کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

بیرن توجہ سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''میں نے خود اپنی ہی بولی لگائی اور سب سے اونچی بولی پر خود کو خرید لیا۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس وقت آپ کے سامنے زندہ بیٹھی ہوں۔'' اس کے پرکشش ہاتھوں پر کپکپاہٹ طاری ہوگئی۔ 'بیرن......'' وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میں زندہ تو ہوں لیکن تمہارے شہر استان ژولین میں میرا کوئی بھی دوست نہیں۔ میں ایک بے یارومددگار شہزادی ہوں۔''

بیرن فریڈرک پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھتا رہا۔ شہزادی کی نسوانی حس نے اسے بتادیا کہ وہ اس کے حسن و جمال کا جائزہ نہیں لے رہا بلکہ اس کی نظریں قیمتی ملبوس اور انگوٹھی کے بیش قیمت نگینے میں الجھی ہوئی ہیں۔ وہ ایک بینکار تھا اور اسے صرف ایسی ہی اشیاء سے دلچسپی تھی۔ ایک بار پھر شہزادی کو بیرن کی بے التفاتی سے اپنی توہین کا احساس ہوا۔ یقیناً اب وہ پہلے جیسی حسین اور پرکشش نہیں رہی۔ ایک دو برسوں میں وہ تیس سال کی ہونے والی تھی۔ وہ ایک سرد آہ بھر کر رہ گئی۔

''جب پرنس ایوان نے آخری وقت یہ کہا تھا کہ اس کے اصول برقرار رکھے جائیں تو اس بات سے درحقیقت اس کا کیا مطلب تھا؟''

شہزادی کے ہونٹ لرزنے لگے۔ ''پرنس ایوان ہر معاملے میں ٹھوس اصولوں والا آدمی تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ اگر مجھے موت آ گئی تو میری تین باتیں ہمیشہ ذہن میں رکھنا۔ ایک عورت کی حیثیت سے یہ تمہارے لیے بے حد اہم ہیں۔ صرف اسی طور تم دنیا میں خوشی حاصل کرسکوگی۔''

''اور وہ تین باتیں کیا ہیں؟''

''طاقت' درحقیقت زمین' عوام اور عورت کے آنسوؤں کا نام ہے۔'' یہ کہتے ہوئے شہزادی رو پڑی۔ ''کاشت کاروں کی دیوانگی نے مجھ سے میرا پرنس' میرے عوام اور میری زمین چھین لی ہے...... اب میرے پاس صرف آنسو رہ گئے ہیں۔ جو بے قیمت ہوگئے ہیں۔''

بیرن کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ دور کھیتوں کے اس پار دریائے امہاف نظر آرہا تھا۔ ''یور ہائی نیس۔ یہ استان ژولین میں موسم بہار کے میلے کا موقع ہے۔ ہماری فصلیں لہلہا رہی ہیں۔'' اس نے قدرے توقف کیا۔ ''لیکن بہار کی آمد کے ساتھ ساتھ ایک خوف ناک چیز اور بھی پیدا ہورہی ہے۔'' اس کے وجیہہ چہرے پر کرب کی علامات ظاہر ہوگئیں۔ ''جنگ کے بعد افراطِ زر ہمارے ملک کو تباہ و برباد کررہا ہے۔ ہمارے عوام کی زندگی اجیرن ہوتی جارہی ہے۔ ملک تباہی کے دہانے پر کھڑے ہوئے ہیں۔ سچ پوچھیے تو اب ہمارے پاس بھی آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں رہا شہزادی۔'' اس نے کندھوں کو خفیف سا جھٹکا دیا۔ ''ایک نسل پہلے جرمنی میں جو افراط زر پیدا ہوا تھا' یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ قابو سے باہر ہوتا جارہا ہو۔ جنگ ہارنا ایک بہت ہی ہول ناک تجربہ ہے لیکن افراط زر تو آسمانی عذاب کی مانند ہے۔ ہمارے سکے کی قیمت روز بہ روز گرتی جارہی ہے۔ حکومت جتنے زیادہ نوٹ چھاپ رہی ہے' اتنی ہی مہنگائی بڑھتی جارہی ہے۔''

شہزادی کے مغرور چہرے پر اذیت کی لہر سی دوڑ گئی۔

''تو شہزادی! کیا آپ کے پاس واقعی آنسوؤں کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہا؟''

''نہیں بیرن۔''

''کیا شہزادے ایوان کے نزدیک دولت کی کوئی اہمیت نہیں تھی؟''

شہزادی اس کے لہجے میں پوشیدہ طنز کا زہر محسوس نہ کرسکی اور ناامید نگاہوں سے بیرن کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''پرنس ایوان کا قول تھا کہ دولت کسی حسین غلام عورت کے سائے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ اگر قدر و قیمت ہے تو اس عورت کی ہستی کی ہے' دولت کی بہرحال کوئی قیمت نہیں۔ سچی قیمت صرف زمین کی ہے۔ عوام کی ہے یا پھر آنسوؤں کی۔ اگر کبھی دولت درکار ہو تو ان چیزوں کو آسانی سے دولت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ دولت اصل میں انہی چیزوں کا سایہ ہے۔''

بیرن کی سرد نگاہیں شہزادی پر مرکوز تھیں۔ ''میرا بینک آپ کی کیا اور کیسے مدد کرسکتا ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''بینک مجھے دولت فراہم کرسکتا ہے۔''

''لیکن میرا خیال تھا کہ......''

بیرن کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی شہزادی بول پڑی۔ اس کا لہجہ یاس آلود تھا۔ ''بیرن کمیونسٹوں کی دیوانگی میری زمین اور میرے عوام کو کسی سیلاب کی طرح بہا لے گئی ہے' مجھے زندہ رہنے کے لیے دولت کی ضرورت ہے۔'' اس کے انداز میں قدرے ہچکچاہٹ پیدا ہوگئی۔ ''اب سائے اصل چیزوں سے

زیادا اہم ہوگئے ہیں۔"

دفعتاً شہزادی کو بیرن کی نظریں اپنے گھنے بالوں سے الجھتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ اس کے تاتاری چہرے پر رخساروں کی نمایاں ہڈیاں اور اس کی آنکھوں کا خفیف سا ترچھا پن منگول حسن کا آئینہ دار تھا۔ شہزادی جانتی تھی کہ وہ ایک حسین عورت ہے۔ پرنس ایوان کی اس کے بارے میں یہی رائے تھی اور خواتین کے حسن پر شہزادے ایوان کی رائے حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی تھی۔ معاً بیرن کی تیز آواز سن کر وہ خیالوں سے چونک کر حقیقت کی دنیا میں واپس آ گئی۔

"آپ کیا چاہتی ہیں شہزادی؟"

"قرض...... بیرن فریڈرک' قرض۔"

"میں اسٹاک ہولڈرز کے مفادات کا نگراں ہوں۔ ہم غیر محفوظ قسم کے قرضے نہیں دیا کرتے۔ بغیر کسی جائیداد' زمین یا......"

شہزادی نے اپنے گلے پر یوں ہاتھ رکھ لیا جیسے خوف کی حالت میں عموماً عورتوں کا وتیرہ ہے۔ "اوہ تب تو یہ سراسر آنسوؤں کا معاملہ ہے۔"

"شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔"

اس بار بولنے سے قبل شہزادی کچھ دیر سوچتی رہی پھر گویا ہوئی۔ پرنس ایوان ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ دنیا میں آنسو دو قسم کے ہوتے ہیں' کبھی عورت کو ایک قسم کے آنسوؤں کی ضرورت پڑتی ہے اور کبھی اسے دوسری قسم کے آنسو درکار ہوتے ہیں۔ وہ اس سلسلے میں مجھ سے ہمیشہ مذاق کیا کرتا تھا۔" اس کے حسین لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "وہ اپنے اصولوں کے حوالے سے بھی مجھے تنگ کیا کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ عورت کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو زمین کا نمک ہوتے ہیں جبکہ دوسری قسم کے آنسوؤں کی پرورش سمندری نمک سے ہوتی ہے۔ ہر عورت کے پاس ان دونوں قسم کے آنسوؤں کا ذخیرہ ہونا چاہیے۔"

"پرنس ایوان کو پہیلیوں میں بات کرنے کی عادت تھی۔" بیرن نے خوش خلقی سے کہا۔

شہزادی نے وہ طلائی بکسوا کھولا۔ جس نے بروکیڈ کے کپڑے کی تھیلی کا دہانہ جکڑ رکھا تھا۔ اس نے تھیلی میز پر الٹ دی۔ تین بے ترتیب سی شکل کے سفید پتھر' صراحی سے ٹپکنے والے قطروں کی مانند لڑھک کر باہر آ گئے۔ کچھ دیر یہ پتھر میز کے محدود دائرے میں چکراتے رہے اور ساکت ہو گئے۔

بیرن کی چوکس آنکھیں ان ناتراشیدہ ہیروں پر جم کر رہ گئیں۔ تینوں ہیرے بالکل ایک جیسے تھے۔

شہزادی نے اپنی خوف زدہ نظریں اٹھا کر بیرن کی طرف دیکھا اور سرگوشی میں بولی۔ "یہ میرا آخری اثاثہ ہے۔ ان کے جاتے ہی میں گویا ختم ہو جاؤں گی۔"

بیرن نے گھنٹی کا بٹن دباتے ہوئے جواب دیا۔ "ہم نے بہت سے قرضے' ہیروں اور جواہر کی ضمانت پر بھی جاری کیے ہیں شہزادی مگر اس سلسلے میں ہمیں ڈاکٹر لیو بک کی تصدیق کی ضرورت پڑتی ہے۔" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ "بینکار اس معاملے میں بڑے ہی سرد مہر ہوتے ہیں اور وہ خواتین کے آنسوؤں کو بھی میکانکی انداز میں جانچنے پر مجبور ہوتے ہیں۔"

❀......❀......❀

ڈاکٹر لیو بیک قدیم دیو مالائی کرداروں جیسا آدمی تھا۔ مخصوص عدسے کی مدد سے ان ہیروں کا جائزہ لینے کے بعد اس نے بے ساختہ کہا۔ "خوب' بہت خوب۔ بالکل ایک ہی جیسے' مماثل' بے حد حسین۔" وہ شہزادی کے سامنے تعظیماً جھکا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ بیرن بھی اس کے ساتھ ہی باہر چلا گیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہونٹوں پر

مسکراہٹ تھی۔ "ہر ہیرا اسی ہزار کی مالیت کا ہے۔ ہم ان کی مجموعی قیمت کا پچاس فیصد آپ کو قرض دے سکتے ہیں یا پھر یوں سمجھ لیں کہ ہر ہیرے کے عوض چالیس ہزار......"

شہزادی کے حسین چہرے پر مایوسی نظر آنے لگی۔ "لیکن بیرن"

وہ قدرے تذبذب سے بولی۔ "پرنس ایوان کا کہنا تھا کہ اس قسم کے تین مماثل ہیرے کہیں نہیں مل سکتے۔ ہیروں کی یہ خصوصیت ہی ان کی قیمت دگنی کر دیتی ہے۔" اس نے اپنی تھیلی میں سے پینسل نکالی اور حساب کرنے لگی۔ "اگر ایک ہیرا اسی ہزار کا ہے تو تین یکساں ہیرے' پرنس ایوان کے اصول کے مطابق کم از کم چار لاکھ اسی ہزار کے ہونے چاہئیں۔ کیا ڈاکٹر لیو بیک نے آپ کو یہ نہیں بتایا' بیرن؟"

بیرن نے گھبراہٹ کے عالم میں کہا۔ "نہیں' اس نے یہ تذکرہ تو نہیں کیا۔" شہزادی سمجھ گئی کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے لیکن مشکل یہ تھی کہ اس کی تمام امیدیں اسی شخص سے وابستہ تھیں۔

"بینک آپ کو صرف ایک لاکھ بیس ہزار قرض دے سکتا ہے۔" وہ دھیمی آواز میں بولا۔

"اگر میں قرض ادا نہ کر سکی تو ان ہیروں کا کیا ہوگا؟"

بیرن نے بہ دقت یہ کہنے کی کوشش کی کہ ایسا خیال تو اس کے ذہن میں آنا ہی نہیں چاہیے۔

"میں معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ میرے ان ہیروں کا کیا ہوگا؟" شہزادی نے اصرار کیا۔ "یہی میرا اثاثہ ہیں۔ میری زندگی اور موت کے درمیان یہی حائل ہیں۔"

"زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ یہ ہیرے بینک کی مالیت بن جائیں' لیکن مجھے امید ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔" بیرن کے لہجے میں کسی تجربہ کار سفارت کار کی نرمی اور سنگ دلی تھی۔

شہزادی نے اپنی آواز میں انکسار برقرار رکھا۔ "میں یہ توقع ہرگز نہیں کر سکتی کہ آپ مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔" وہ مسکرانے لگی۔ "اگر آپ یہ سودا منصفانہ سمجھتے ہیں تو میں آمادہ ہوں۔"

بیرن نے نظریں جھکا کر کہا۔ "یہ ایک جائز اور معقول سودا ہے یور ہائی نیس!"

"اس یقین دہانی کے بعد میں یہ سودا منظور کر رہی ہوں بیرن' لیکن میں آج صرف ایک ہیرا گروی رکھواؤں گی۔"

شہزادی نے بیرن کے چہرے پر ایک رنگ سا گزرتے دیکھا۔ یہ اشتعال کی علامت تھی

"لیکن یور ہائی نیس! جب آپ کو تینوں ہیروں کے عوض خاصی رقم مل سکتی ہے تو اسے حاصل کیوں نہیں کر لیتیں؟ مستقبل کی کوئی بھی پیش گوئی نہیں کر سکتا۔ افراطِ زر ناقابلِ توجیہہ ہوتا ہے۔ یہ ہمیشہ اچانک وار کرتا ہے' ممکن ہے' صرف ایک ماہ بعد آپ کے یہ ہیرے بے قیمت ہو جائیں۔"

شہزادی کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ تذبذب میں مبتلا ہو گئی۔ پھر اس نے سر اٹھا کر بیرن کو دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا۔ "پرنس ایوان کا کہنا تھا کہ دولت بے قیمت ہوتی ہے۔ اس سے اشیا کے سائے ہی خریدے جا سکتے ہیں۔ دولت جمع کرنے کے لیے کبھی سارا اثاثہ فروخت نہیں کرنا چاہیے۔ فی الحال مجھے صرف چالیس ہزار کی ضرورت ہے۔ مزید رقم کی ضرورت ہوگی تو میں پھر آ جاؤں گی۔" اس نے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے بیرن کی طرف دیکھا اور حتمی لہجے میں بولی۔ "فی الوقت میں صرف ایک ہیرا گروی رکھواؤں گی۔"

❀......❀......❀

بیرن رسمی کارروائی میں مصروف ہو گیا۔ شہزادی

کے خیالات ادھر ادھر بھٹکنے لگے۔ اس سے قبل اس نے تنہا کبھی کوئی سودا نہیں کیا تھا۔ اس کی زندگی پہلے اپنے باپ خان کی رفاقت میں پھر پرنس ایوان کی نگرانی میں گزری تھی۔ اسے استان ژولین میں آئے ہوئے ابھی چند گھنٹے ہی ہوئے تھے لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کے بارے میں افواہیں گردش کرنے لگی ہیں۔ لوگوں نے یہ کہنا شروع کردیا کہ وہ ریسٹ ہاؤس کے قریب واقع ایک عظیم محل کرائے پر لے رہی ہے۔ یہ افواہ ایک طرح سے حقیقت ہی تھی۔ شہزادی اس اجنبی شہر اور یہاں کے لوگوں کے بارے میں سوچتی رہی۔ کچھ دیر بعد بیرن نے ایک سفید لفافہ اس کی خدمت میں احترام سے پیش کیا۔

"یور ہائی نیس۔" اس نے کہا۔ "آپ نے مجھے اور میرے بینک کو جو اعزاز بخشا ہے اس پر آپ کا ممنون ہوں۔"

شہزادی مسکراتی ہوئی کرسی سے اٹھ گئی۔



شہزادی کی آمد سے استان ژولین جیسے خوش حال شہر میں کوئی برقی لہر دوڑ گئی۔

تقریباً ہر شام اس کی دمکتی کار بیرن کی کھلی کھڑکی کے سامنے سے گزرتی تھی۔ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر چمک دار سرخ وردی والا شوفر دکھائی دیتا۔ شہزادی اس کی طرف دیکھتی اور خوش دلی سے ہاتھ لہراتی ہوئی نکل جاتی۔ بیرن بھی جواباً ہاتھ لہراتا۔ ایک بار شہزادی نے ہاتھ لہرانے کے بجائے اپنی دو انگلیوں کو ہونٹوں تک اٹھایا اور انہیں چوم لیا۔

بیرن ہنس پڑا۔ اس نے بھی جواباً ایسا ہی کیا۔ وہ ایک پروقار اور وجیہہ آدمی تھا۔ بالکل شہزادوں جیسا۔

ایک روز شہزادی نے اسے ڈنر پر مدعو بھی کرلیا۔ دربان نے بیرن کے لیے دروازہ کھولا۔ اس نے اندر قدم رکھا تو اس کی نگاہ شہزادی پر پڑی۔ وہ اس مشہور اور عظیم محل کے زینے پر کھڑی تھی۔

بیرن تعظیماً جھک گیا۔

شہزادی نے شاہانہ انداز میں ہاتھ آگے بڑھایا تو بیرن نے نرمی سے ہاتھ تھام کر بوسہ دیا۔ شہزادی کے ہونٹوں پر خوشگوار مسکراہٹ کھلی ہوئی تھی۔ یہ شخص شاہی آداب جانتا ہے۔

شہزادی کا نرم ونازک ہاتھ چھوٹا تھا اور اس کے ناخن سلیقے سے ترشے ہوئے تھے۔ اس کا ہاتھ دبیز تھا اور شہزادی کو احساس تھا کہ ایسے گداز ہاتھ مردوں کو بے حد پسند ہوتے ہیں۔ بیرن نے شہزادی کا ہاتھ دیر تک تھامے رکھا پھر وہ اچانک سیدھا ہوگیا۔ شہزادی کی بھویں سکڑ گئیں۔ جانے کیوں اسے یوں محسوس ہوا جیسے بیرن کے ذہن میں ایک کھڑکی کھلی تھی جو ہوا کے کسی تیز جھونکے سے بند ہوگئی۔

وہ ہنس پڑی۔ "آپ کے ہونٹ بہت سرد ہیں بیرن۔ پرنس ایوان کہا کرتا تھا کہ جس شخص کے ہونٹ سرد ہوں اس پر کبھی اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔"

"کیا واقعی، یور ہائی نیس؟" بیرن کسی قدر پشیمانی سے بولا۔

شہزادی نے بیرن کا ہاتھ تھام کر دبایا۔ "اوہ، میں دیکھ رہی ہوں کہ بحیثیت مرد بیرن فریڈرک ایک بینکار سے مختلف باتیں کرتا ہے۔ بیرن فریڈرک...... اپنے اسٹاک ہولڈرز کے مفادات کا محافظ۔"

وہ ٹہلتے ہوئے محل کے ہال میں داخل ہوئے جو اس وقت مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ شہزادی، بیرن کی طرف دیکھ کر فخریہ انداز میں مسکرائی۔ بیرن سنگ مرمر سے مزین استقبالیہ کمرہ دیکھ کر لڑکھڑا سا گیا تھا۔ وہاں سیکڑوں مومی شمعیں روشن تھیں۔ فرش پر بخارا کا سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ منگول طرز کے غالیچے بھی تھے۔

مخمور کن موسیقی نشر ہورہی تھی۔ خادموں نے مشرقی طرز کا لباس زیب تن کررکھا تھا۔ ان کی پگڑیاں سرخ اور زرد تھیں۔ ان کی پیٹیوں میں طلائی دستے والے خنجروں کی نیامیں تھیں۔ یہ مغربی محل اس وقت عہد قدیم کا ایک مشرقی محل بنا ہوا تھا۔

شہزادی نے تمکنت سے کہا۔ "تم نے دیکھا بیرن میں کس قدر خوش ہوں۔ پرنس ایوان کہا کرتا تھا کہ شیر اپنے جنگل ہی میں خوش رہ سکتا ہے۔"

بیرن تعریفی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شہزادی نے مشروب کا جام اٹھا کر اپنے ہونٹوں سے لگالیا۔ اس نے پیرس سے درآمدہ جدید ترین لباس زیب تن کررکھا تھا۔ اس وقت وہ ایک ایسی ہستی تھی جس پر زیادہ دیر تک نظریں جمائے رکھنا دشوار تھا۔

"پرنس ایوان کا قول تھا کہ لباس عورت کے حسن میں اضافہ کرتا ہے۔" اس کا لہجہ شوخ ہوگیا۔ وہ بیرن کی نظریں محسوس کرچکی تھی۔ "کیوں بیرن! کیا اس لباس نے میرے حسن میں کچھ اضافہ کیا ہے؟"

بیرن کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ "بدقسمتی سے میں ان آدمیوں میں سے نہیں ہوں جو پرنس ایوان کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔" اس نے گہری اور محتاط نظروں سے شہزادی کا جائزہ لیا۔ پھر رخ پھیر کر دھیمی آواز میں کہا۔ "ہاں! یہ لباس آپ کے حسن میں چار چاند لگا رہا ہے۔" جنگ سے پیدا ہونے والے افراط زر اور بحران کے باوجود شہزادی کے محل میں دیا جانے والا ڈنر ایک مثالی دعوت کا نمونہ تھا۔ سرخ پگڑیوں والے خدام چمچماتی شمشیروں پر بکرے کی بھنی ہوئی رانیں اٹھائے تقسیم کرتے پھر رہے تھے۔ بھنے ہوئے گوشت کی اشتہا انگیز مہک پورے کمرے میں پھیل رہی تھی۔

بیرن شہزادی کے ساتھ بیٹھا تھا۔

اس خیال آفریں ماحول نے اس پر گہرا اثر کیا تھا۔ شہزادی کی نرم وگداز انگلیاں اس کے ہاتھ میں تھیں اور وہ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہا تھا۔

"آپ شاید یہ سوچ رہے ہوں گے بیرن کہ بینک سے لی ہوئی قرض کی رقم بھاپ بن کر فضا میں تحلیل ہوتی جارہی ہے۔" شہزادی نے اچانک کہا۔

بیرن کا چہرہ ایک بار پھر خفت سے سرخ ہوگیا۔ لیکن اس نے جلد ہی سنبھل کے کہا۔ "نہیں شہزادی مجھے یقین ہے آپ ایک سلیقہ شعار خاتون ہیں۔"



اگلے روز شہزادی کی کار بینک کے دروازے پر آکر رک گئی۔ ایک باوردی شوفر نے اتر کر عقبی نشست کا دروازہ کھول دیا۔ شہزادی ایک ادائے دلبرانہ سے نیچے اتر آئی۔ اس بار وہ بیرن فریڈرک کے دفتر میں داخل ہوئی تو اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ "بیرن! میں اپنی توقع سے کہیں زیادہ تیزی سے رقم خرچ کرتی جارہی ہوں۔ مجھے مزید رقم کی ضرورت ہے...... افراط زر نے تو چیزوں کی قیمتوں کو آگ لگادی ہے۔"

اس نے اپنی بروکیڈ کی تھیلی سے دونوں ہیرے نکالے اور میز پر رکھ دیے۔ بیرن ایک بار پھر رسمی کارروائی میں مصروف ہوگیا۔ وہ ہیرے دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہورہا تھا۔ اس بار بیرن کو توقع تھی کہ شہزادی دونوں ہیرے ایک ساتھ دے جائے گی۔ "اس بار ہم آپ کو ایک ہیرے کے بدلے چار لاکھ کی رقم ادا کرسکیں گے۔" اس نے مسکراتے ہوئے انکشاف کیا۔

شہزادی کی آنکھیں روشن ہوگئیں۔ وہ پروقار شہزادی کے بجائے ننھی سی معصوم سی بچی نظر آنے لگی۔ "چار لاکھ......" اس نے ہانپتے ہوئے دہرایا۔ "پہلے سے دس گنا زیادہ۔ ان کی قیمت ایک دم

اتنی زیادہ کیسے ہوسکتی ہے؟"

بیرن نے بے چارگی سے اس کی طرف دیکھا اور دھیمی آواز میں بولا۔ "ان کی قیمت میں درحقیقت کوئی اضافہ نہیں ہوا...... بلکہ اگر دیکھا جائے تو ان کی قیمت کچھ کم ہی ہوئی ہے۔ دراصل ہمارے سکے کی قیمت تیزی سے گری ہے۔ افراطِ زر روز بہ روز قدر زر خاک میں ملاتی جارہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سامانِ تجارت اور دیگر اشیا کی قیمتوں کے بارے میں اب یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔"

شہزادی کے چہرے پر بے چارگی اور بے یقینی تھی۔ "میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آرہا۔ اگر پرنس ایوان زندہ ہوتا تو یقیناً اپنا کوئی نہ کوئی قول ضرور پیش کرتا۔"

"اس بار تو آپ باقی دونوں ہیرے رکھوا رہی ہیں نا؟"

"نہیں......" شہزادی نے کہا۔ "صرف ایک۔"

"اوہ......" بیرن نے میز سے ایک ہیرا اٹھالیا اور چار لاکھ کی رقم ادا کردی۔

شہزادی کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ بیرن کے وجیہہ چہرے پر فتح مندی کے تاثرات تھے۔ غالباً وہ دل ہی دل میں خوش ہورہا تھا کہ شہزادی کے دو نایاب اور بیش قیمت ہیرے بینک کی تحویل میں پہنچ چکے ہیں۔ جلد ہی تیسرا ہیرا بھی اس کے پاس پہنچ جائے گا۔ اس کے بعد شہزادی کوڑی کوڑی کو محتاج ہوجائے گی، پھر شاید مر جائے گی۔

شہزادی نے اپنی نظریں بیرن کے چہرے سے ہٹائیں اور کرنسی نوٹوں کی طرف دیکھنے لگی...... پھر اس نے رقم میں سے چالیس ہزار گن کر علیحدہ کیے اور چمکتی ہوئی سطح پر بیرن کی طرف کھسکا دیے۔

"میں اس ہیرے کے بدلے وصول کیا ہوا قرض واپس کررہی ہوں جو میں نے پہلے گروی رکھوایا تھا۔"

شہزادی نے آہستگی سے کہا۔

"لیکن یور ہائی نیس!" بیرن کا چہرہ یکا یک تاریک ہوگیا۔ "یہ تو بڑی عجیب سی بات لگتی ہے۔ اس کے علاوہ آپ کو سال ختم ہونے سے قبل ادائی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

شہزادی کی آنکھیں پرسکون رہیں۔ "ہاں......" اس نے سرگوشی میں کہا۔ "بات تو عجیب اور احمقانہ ہے لیکن میں اپنا پہلا ہیرا واپس لینا چاہتی ہوں۔ پرنس ایوان کہا کرتا تھا کہ دولت بے قیمت شے ہے، ڈھلکتا ہوا سایہ ہے۔ اس کی کوئی مادی اہمیت نہیں ہے۔ مجھے ایک ہیرے کے چار لاکھ مل رہے ہیں اور میں چالیس ہزار واپس کرکے اپنا ایک ہیرا واپس حاصل کرسکتی ہوں۔ پرنس ایوان میرے اس سودے کو یقیناً پسند کرتا۔ اس طرح میں تین لاکھ ساٹھ ہزار کا منافع حاصل کررہی ہوں۔"

"منافع؟" بیرن نے احتجاج کرنا چاہا۔ وہ بڑی الجھن میں مبتلا لگ رہا تھا۔ شہزادی بغور اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے چہرے کے تاثرات سے اس کے خیالات پڑھ سکتی تھی۔ شاید وہ سوچ رہا تھا۔ ہاں، یہ منافع ہے...... لیکن اگر یہ منافع ہے تو تین لاکھ ساٹھ ہزار کا نقصان کون اٹھا رہا ہے؟ میں...... اور میرے اسٹاک ہولڈر؟

وہ جانے کن سوچوں میں الجھا رہا۔ شہزادی اپنا ہیرا لینے کی مجاز تھی۔ وہ اصل رقم واپس کررہی تھی۔ اس لیے گروی رکھا ہوا مال اسے واپس کیا جانا چاہیے تھا۔ بیرن نے طوہاً و کرہاً ہیرا اسے واپس کردیا۔ اب اس کے پاس پھر ایک ہیرا رہ گیا تھا۔

شہزادی سمجھ گئی کہ بیرن کو اس نقصان کا شدید احساس ہوا ہے۔ وہ کھوئی کھوئی سی نظر آنے لگی۔ پھر اس نے کہا۔ "بیرن! میں ابھی تک پرنس ایوان

کے اصول نظر انداز کرنے کی مرتکب ہورہی ہوں۔ میرے پاس زمین کے نام پر ایک ٹکڑا بھی نہیں ہے۔ میں زمین خریدنا چاہتی ہوں۔"

بیرن کی آنکھوں میں ایک بار پھر تذبذب کی جھلک نمودار ہوئی۔ وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ "کیسا وقت آگیا ہے ہر کوئی اپنی زمین بیچنے پر تلا ہوا ہے۔ افراطِ زر سب کو بری طرح تباہ کررہا ہے۔ زمینوں کی قیمتیں ناقابل اعتبار ہوگئی ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ زمین کے سلسلے میں سرمایہ کاری کوئی مناسب اقدام ہوگا۔"

بیرن کی بات نے شہزادی کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس کا خاندانی پس منظر اسے یاد دلا رہا تھا کہ مرد کی بات قانون سمجھ کر قبول کرلی جائے لیکن اس کی عقل و فہم یہ کہہ رہی تھی کہ یہ ایک بالکل مختلف معاملہ ہے۔ اس شخص کا تعلق صرف بینک کے اسٹاک ہولڈرز سے ہے۔ یہ صرف انہی کے مفاد میں بہتر طور پر سوچ سکتا ہے، شہزادی کے لیے نہیں۔ شہزادی کے ہونٹوں کے گرد ایک لکیر سی پیدا ہوگئی۔ یہ اس کی ضد کا نشان بھی تھا، استقامت کی علامت بھی تھی۔

❁......❁......❁

جلد ہی ڈاکٹر لیوبیک کو شہزادی کے باقی ماندہ دو ہیروں کا جائزہ لینا پڑ گیا۔ افراطِ زر نے سارا ملک زیروزبر کردیا تھا۔ افراطِ زر میں ہر روز اضافہ ہو رہا تھا۔ اس صورتِ حال سے شہزادی کو اپنے گرم خون میں برف کی سی ٹھنڈک محسوس ہونے لگی تھی۔ افراطِ زر نے بڑے بڑے دانش وروں کی عقلیں خبط کردی تھیں۔ بینک کے اصول و ضوابط دھرے کے دھرے رہ گئے تھے اور کوئی بھی کاروباری اصول کارآمد ثابت نہیں ہورہا تھا۔

ڈاکٹر لیوبیک نے ہیروں کا جائزہ لینے کے بعد ان کی مالیت کا انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ "یور ہائی نیس! آپ کے ہیرے اس وقت آٹھ لاکھ......"

"ایک ہیرا یا دونوں؟"

"ایک ہیرا آٹھ لاکھ کی مالیت کا ہے۔"

"پہلی بار جو قیمت تھی اس سے دو ہزار فیصد زیادہ۔"

شہزادی نے حیرت سے زیرِ لب کہا۔ "ناممکن......"

ایک بار پھر بیرن کو افراطِ زر کی تکنیکی صورت حال واضح کرنی پڑی۔ "جب سکے کی قیمت گرتی ہے تو تجارتی اشیا کے دام ہمیشہ بڑھتے ہیں...... اور ہیرے خاص قسم کے تجارتی مال سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ جرمنی میں افراطِ زر کے زمانے میں اشیا کی قیمتیں کروڑ گنا بھی ہوچکی ہیں۔ دولت بالکل ہی بیکار سی چیز ہوکر رہ گئی ہے۔" اس نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔

شہزادی نے ایک ہیرا گروی رکھنے کا فیصلہ کرلیا۔

بیرن نے آٹھ لاکھ کے نوٹ اس کی طرف بڑھا دیے۔

شہزادی نے ان کی دو ڈھیریاں بنائیں اور ایک ڈھیری بیرن کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔ "یہ رہے چار لاکھ...... میں اپنا سابقہ ہیرا واپس لینا چاہتی ہوں۔ پرنس ایوان کا قول تھا کہ دولت صرف سایہ ہے اور......"

"میں جانتا ہوں۔" بیرن نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "دولت کوئی مادہ نہیں ہے۔" اس نے ہیرا واپس کیا تو اس کی آنکھوں میں بے بسی اور شکست تھی۔

شہزادی جانتی تھی کہ وہ دل ہی دل میں کیا سوچ رہا ہے۔ بے شک بیرن کو سوچنا چاہیے اس کے پاس وہی ایک ہیرا ہے پھر محل کا کرایہ کون ادا کررہا ہے؟ شہزادی جو زبردست پارٹیاں دے رہی ہے اس کے اخراجات کون برداشت کررہا ہے جو زمینیں خرید رہی ہے ان کی ادائی کون کررہا ہے؟ کون؟ آخر کون؟

شہزادی اور بیرن دونوں ایک دوسرے کو پلکیں جھپکائے بغیر دیکھ رہے تھے پھر جب بیرن رسمی کارروائیوں سے نمٹ کر دوبارہ شہزادی کی طرف متوجہ ہوا تب وہ سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ اگر پرنس ایوان بیرن کی جگہ ہوتا تو وہ کیا کرتا؟ زرد منگول آنکھوں اور ٹھوڑی کے گرد گھومی ہوئی مونچھوں والا پرنس ایوان...... وہ لرز گئی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا...... لیکن افراطِ زر کے سلسلے میں آخر وہ کیا کرسکتا تھا؟

شہزادی نے دو ہیرے اپنی بروکیڈ کی خوش نما تھیلی میں ڈالے اور نگاہ اٹھا کر بیرن کی طرف دیکھا۔

"میں پرنس ایوان کے اصولوں اور زریں اقوال کے بارے میں غور کر رہی تھی۔" اس کے منہ سے الفاظ اٹک اٹک کر ادا ہوئے تھے۔ جیسے وہ یہ سب کچھ ہچکچاتے ہوئے کہہ رہی ہو۔ "پرنس ایوان ہمیشہ سب سے پہلے زمین کا تذکرہ کیا کرتا تھا۔ میرا خیال ہے اگر وہ اس وقت زندہ ہوتا تو مجھے یہی مشورہ دیتا کہ میں اپنے آخری دونوں ہیرے بھی گروی رکھ دوں اور اس رقم سے زمین خرید لوں۔"

وہ رک کر بیرن کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی نسوانی حسیات نے بیرن کی پرسکون نیلی آنکھوں میں خوشی اور فتح کا جذبہ پھیلتے ابھرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ گہری توجہ سے اسٹاک ہولڈرز کے سب سے بڑے محافظ کو دیکھ رہی تھی۔ اس وقت وہ جو فیصلہ کرنے والی تھی' یہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا اور اہم ترین فیصلہ تھا۔ اس نے بروکیڈ کی تھیلی میں بند ہیرے دبا کر ان کی سختی محسوس کی۔ یہ آنسو نما ہیرے جادوئی پتھر جو باری باری آپس میں ایک دوسرے کو خرید رہے تھے اور اس کی زندگی پر دولت برسا رہے تھے' کیا ان کی یہ خصوصیت ہمیشہ برقرار رہ سکتی ہے؟ کہیں ان کا جادو ٹوٹ تو نہیں جائے گا؟ اگر ایسے میں وہ اپنے تینوں ہیرے گروی رکھوا دیتی ہے تو کہیں یہ آخری بازی اسے تباہ نہ کر ڈالے؟ بیرن کی اولین وفاداری اپنے اسٹاک ہولڈروں کے لیے وقف تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا اس وفاداری کا رخ بدلنا ممکن ہے؟ کیا وہ اسے اپنا وفادار بنا سکتی ہے۔ وہ اس سے دیانت داری پر مبنی مشورے کی طلب گار تھی۔

"مجھے کیا کرنا چاہیے؟" وہ ضبط نہ کرسکی تو چیخ پڑی۔

"اپنے تمام ہیرے گروی رکھ کر زمینیں خرید لیجیے۔"

وہ مایوسی کے عالم میں کھڑکی سے باہر دریا کے اس پار پھیلی ہوئی سرسبز و شاداب زمینوں کی طرف دیکھنے لگی جہاں گائیں اور بھیڑیں پھر رہی تھیں۔ مرد ہل چلا رہے تھے اور باڑوں میں عورتیں دودھ دوہ رہی تھیں۔ یکا یک اس نے ہیرے آگے دھکیل دیے "میں اپنا سب کچھ گروی رکھوانا چاہتی ہوں۔" اس نے چیخ کر کہا۔ "ہر وہ چیز جو میرے پاس موجود ہے۔" اس نے اپنی انگلی میں پہنی ہوئی بیش قیمت نگینے والی انگوٹھی اتاری اور اسے بھی ہیروں کے قریب کردیا۔ "فوراً ڈاکٹر لیوبیک کو طلب کرو بیرن! ابھی اسی وقت۔"

❀......❀......❀

افراطِ زر نے تقریباً ہر شخص کو تباہ و برباد کردیا تھا۔ سیکڑوں افراطِ زر سے دیوالیا ہوگئے تھے۔ کاروبار زوال پزیر ہوا تو بے شمار منصوبے رک گئے۔ بے روزگاری بڑھتی چلی گئی۔ فاقوں کی نوبت آنے لگی تو لوگوں نے بے دریغ اپنے اثاثے فروخت کرنے شروع کردیے۔ پوری قوم کا معاشی نظام درہم برہم ہوگیا۔ بیرن فریڈرک بھی پریشان تھا۔ بھوک سڑکوں پر رقص کرنے لگی۔ حکومت کے پریس کروڑوں کی کرنسی چھاپتے لیکن کرنسی کی قیمت جو پہلے ہر روز گرتی تھی اب ہر گھنٹے بعد گرنے لگی تھی۔

شہزادی کا تو ہم پرست ذہن پرنس ایوان کے اصولوں پر سختی سے کاربند ہوتا چلا گیا۔ وہ قراقرم کے صحرا میں نافذ ہونے والے منگول قوانین کی پاس داری کرتی رہی۔

وہ آنکھیں بند کرلیتی اور خواب دیکھنے لگتی۔

اسے ماضی کے صحرا سے ایک مانوس سی آواز سنائی دیتی۔ قراقرم کی فضاؤں میں گونجنے والی ہلکی ہلکی غراہٹیں اور کراہیں۔ وہ چشم تصور سے صحرائے قراقرم کی سیاہ ریت اڑتے ہوئے دیکھتی۔ اسے شہزادہ ایوان اپنی زرد آنکھوں سے گھورتا ہوا نظر آنے لگتا۔ اس کی خم دار شمشیر کے طلائی دستے کی چکاچوند سے اس کی آنکھیں خیرہ ہوجاتیں۔ وہ اسے اپنے اقوال سناتا اور ان پر کاربند رہنے کی تاکید کرتا۔ وہ الجھ جاتی تو انہیں تحریر کرنے بیٹھ جاتی۔ پھر وہ گھنٹوں غور کرتی کہ اس وقت وہ جس ماحول میں سانس لے رہی ہے' اس فضا میں ان قوانین کو کیسے عمل میں لائے۔

صنعت' تجارت اور بینک' سب کے سب ٹھپ ہو کر رہ گئے تھے۔ ایسے میں قدیم قوانین پر عمل کی دعوت دینا دیوانگی نہیں تو اور کیا تھی...... معاشیات کے پرانے اصولوں پر عمل کرنا دشوار تھا لیکن وہ انہیں نظر انداز بھی تو نہیں کرسکتی تھی۔

"آخر سکے کی قیمت اور کہاں تک گرے گی؟" لوگ ایک دوسرے سے دریافت کرتے۔ "پہلی جنگِ عظیم کے بعد جرمنی میں افراطِ زر کی تباہ کاری یہاں تک پھیل گئی تھی کہ دس لاکھ مارک سے کوئی انڈوں کی ایک ٹوکری بھی نہیں خرید سکتا تھا۔ اگر کسی نے آپ سے کوئی بڑی رقم قرض لے رکھی تھی تو سمجھ لیجیے کہ وہ سرے سے آپ کا مقروض ہی نہیں تھا۔"

ادھر بینکوں کی حالت روز بروز پتلی ہوتی جارہی تھی۔ بینکار کہتے تھے۔ "آخر ہم بینک کا کاروبار کیسے

جاری رکھ سکتے ہیں جب کہ وہ قرضے جو درحقیقت بینک کا اثاثہ ہیں' ان کی مالیت انڈوں کی ایک ٹوکری کے برابر بھی نہیں رہ گئی۔"

یہ الجھن اب عام ہوتی جارہی تھی۔

اس الجھن نے شہزادی کو بھی خوف زدہ کردیا تھا۔

"میری حالت تو میرے باپ کے اس خیمے جیسی ہوکر رہ گئی ہے جسے وہ صحرائے قراقرم کے کنارے ریت پر نصب کرنے سے پہلے یونہی بچھا دیتا تھا۔" وہ سرگوشی میں اپنے آپ کو مخاطب کرتی۔ "جب اس خیمے کو سہارا دینے کے لیے کوئی بانس نہ ہوتا تو وہ خیمہ بن ہی نہیں پاتا تھا۔"

ایسے میں وہ متوقع نظروں سے بیرن کی طرف دیکھتی اور غور کرتی کہ کسی مرد کو اپنا سہارا بنانا کس قدر خوش گوار خیال ہے۔ لیکن...... کاش! یہ شخص صرف اپنے اسٹاک ہولڈرز ہی کی طرف متوجہ نہ رہے۔ وہ ایک سرد آہ بھر کر رہ جاتی۔ اسے میرا محافظ ہونا چاہیے...... اسے میرا محبوب ہونا چاہیے۔

ان دونوں کے درمیان ایک لطیف سا جذبہ پروان چڑھ رہا تھا۔ دونوں میں ایک تعلق قائم ہوچکا تھا لیکن ابھی تک کسی ایک نے بھی اپنی زبان سے اس کا اقرار نہیں کیا تھا۔ ان دونوں کے درمیان اسٹاک ہولڈرز کسی آہنی دیوار کی طرح حائل ہوکر رہ گئے تھے۔

❀......❀......❀

ایک صبح شہزادی بیرن کے دفتر سے نکلی اور اپنی کار میں جاکر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر خوف کے ساتھ ساتھ ثابت قدمی کے بھی تاثرات تھے۔ کچھ ہی دیر قبل بینک نے اس کی تمام زمینوں کی دستاویزات گروی رکھ لی تھیں اور اسے پچھتر ملین کا قرض دیا تھا۔

بینک کی تاریخ میں یہ سب سے بڑا قرض تھا۔

بیرن اب بھی مطمئن تھا کہ وہ اپنے اسٹاک ہولڈرز کا سب سے بڑا خیر خواہ ہے جبکہ شہزادی سوچ رہی تھی کہ جب اس شخص کی فتح ہوتی ہے تو میں مات کھا جاتی ہوں...... جب یہ میرے ہیروں کو اپنے اسٹاک ہولڈرز کے مفاد کے لیے حاصل کرلے گا تو شاید اس کے دل کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ یہ دل کی آنکھوں سے مجھے دیکھے گا تو اس کے دل میں اپنے اسٹاک ہولڈرز کے بجائے میری محبت پیدا ہوجائے گی۔ یہ مجھے تحفظ دینے کے بارے میں سوچے گا اور اس کے نزدیک اسٹاک ہولڈرز پرنس ایوان کی ان دوسری بیویوں کی سی حیثیت اختیار کرلیں گے جنہیں وہ شہزادی ہندا کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں سمجھتا تھا۔

اربوں اور کھربوں کی مالیت کے کرنسی نوٹ چھاپے جاتے رہے اور لوگ یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ افراطِ زر کا یہ دور پہلے دور جیسا ہوکر رہ گیا ہے۔ دولت تیزی سے اپنی وقعت کھوتی جارہی تھی۔ انشورنس کے پریمیم بھی اب کرنسی کے بجائے اناج میں وصول کیے جانے لگے تھے۔

ایک روز شہزادی بیرن کے دفتر میں داخل ہوئی تو اس کا چہرہ دمک رہا تھا اور اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس کے ایک بازو پر کاشت کاروں کی ٹوکری تھی جس میں انڈے تھے اور سبزیاں بھری ہوئی تھیں۔ وہ بیرن کی طرف دیکھ کر خوش دلی سے مسکرانے لگی اور پھر اس نے اپنی ٹوکری کھول دی۔

"اس سے پہلے کہ ہم کوئی کاروباری بات کریں' میں چاہتی ہوں کہ تم ان اشیا کو دیکھو اور انہیں سراہو۔"

اس نے ٹوکری سے درجن بھر انڈے نکال کر میز پر رکھ دیے۔ بند گوبھی کے چار بڑے دانے' ایک درجن شلجم اور چھ گاجریں بھی نکال کر ان کے قریب سجادیں۔

"دیکھو! یہ کتنی بڑی اور صحت مند ہیں۔ خاص طور سے ان گاجروں کو دیکھو۔" وہ فخریہ لہجے میں بولی۔ "یہ

انڈے عام انڈوں سے ایک چوتھائی بڑے سائز کے ہیں۔ پرنس ایوان زندہ ہوتا تو وہ انہیں دیکھ کر یقیناً بے حد خوش ہوتا۔ وہ زمین میں پیدا ہونے والی چیزوں کو دیکھ کر ہمیشہ خوشی سے کھل اٹھتا تھا۔ گاجریں' بھیڑیں' گھوڑے' گندم اور آلو...... ہر وہ چیز جس کا تعلق زمین سے ہوا سے پسند تھی۔"

بیرن نے ایک انڈا بڑی احتیاط سے اٹھایا اور بغور اسے دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ "واقعی! یہ تو بہت بڑا اور بہت ہی اچھا ہے۔" اس نے اقرار کیا۔

وہ ہنس پڑی۔ "تم انڈوں کے بارے میں مجھ سے زیادہ نہیں جانتے بیرن۔" وہ بے تکلفی سے بولی۔ اس نے اپنی سرخ نوٹ بک نکال لی پھر وہ اس میں کچھ حساب لگانے لگی۔ "اب میں بینک کی پچھتر ملین کی مقروض ہوں۔ چھ ماہ کا سود اس کے علاوہ ہے جو اصل رقم کا بیس فیصد ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ میری طرف کل واجب الادا رقم بیاسی ملین اور پچاس ہزار ہے۔" اس نے نوٹ بک بند کرکے فخریہ انداز میں انڈوں اور سبزیوں کی طرف دیکھا۔ "میں ابھی سیدھی مارکیٹ سے بھاؤ معلوم کرکے آرہی ہوں۔ میری زمینوں پر پیدا ہونے والی اس بار کی فصل ایک سو بیس ملین کی ہے۔ یہ فصل دے کر اپنے تینوں ہیرے واپس لینا چاہتی ہوں۔"

بیرن اسے ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے وہ کوئی حسین شہزادی نہیں بلکہ چڑیل ہو۔ اس کا منہ پہلے تو ایک جھٹکے سے کھلا پھر سختی سے بند ہوگیا۔

"سبزیوں کی ایک فصل سے بینک کا قرض ادا ہو رہا ہے۔" وہ بڑے کرب سے بولا پھر زیرلب کہنے لگا۔ "بینک کی تاریخ کا سب سے بڑا قرضہ پچھتر ملین اور صرف ایک فصل سبزیوں کی۔"

شہزادی نے ٹوکری کی طرف دیکھا۔ "پرنس ایوان کہا کرتا تھا کہ دولت کسی حسین عورت کے سائے کی مانند ہوتی ہے۔ تم اس سائے سے کبھی لطف اندوز نہیں ہوسکتے۔"

بیرن اٹھ کھڑا ہوا۔

اس نے ٹوکری اٹھائی اور لڑکھڑاتے قدموں سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد شہزادی نے کانفرنس ہال سے آنے والی تیز آوازیں سنیں تو ہمہ تن گوش ہوگئی لیکن کوشش کے باوجود وہ کچھ سمجھنے سے قاصر رہی تاہم وہ سمجھ گئی کہ بحث بہت زوروں پر ہے۔

آخر دروازہ کھلا۔

بیرن کمرے میں داخل ہوا تو اس کے دائیں ہاتھ میں بروکیڈ کی ایک تھیلی دبی ہوئی تھی۔ شہزادی نے تھیلی اس کے ہاتھ سے لے کر میز پر الٹ دی۔ اس میں تین ہیرے اور نگینے والی انگوٹھی تھی۔ وہ انہیں چھو کر دیکھنا چاہتی تھی لیکن اس کے دونوں ہاتھ کانپ رہے تھے۔ بیرن اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

شہزادی نے فوراً محسوس کرلیا کہ بیرن صرف اس کے متعلق سوچ رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بیرن کے ذہن میں اس کے اثاثے بھی گردش کررہے ہوں گے۔ ایک شان دار محل' مارکیٹ' سیکڑوں فارم جو مضافات کے زرخیز ترین حصے میں واقع ہیں' ٹرکوں کا ایک بیڑا جو ہر روز اس کے کھیتوں سے سبزیاں' اناج' انڈے اور گوشت شہر میں پہنچاتا ہے' ہزاروں انڈے' گاجریں' شلجم' ٹماٹر اور مویشی...... کئی خادم جو اس کے حسابات رکھتے تھے۔ تین باورچی جنہیں دنیا کے بہترین پکوان پکانے میں مہارت حاصل تھی اور وہ ہزاروں افراد جو اس کے کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ اس کی نجی ریلوے کار' نجی ہوائی جہاز' ذاتی ہوائی اڈا اور اس کے گرد پھیلے ہوئے مسلح محافظ...... اور نہ جانے کیا کیا...... وہ پوری طرح انہیں شمار بھی نہیں

کرسکتی تھی۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ تین مماثل ہیرے اور نگینے والی انگوٹھی جو اس وقت اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

بیرن نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو انا کا بت پاش پاش ہوگیا۔ وہ شہزادی سے مخاطب ہوا تو اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ ''بینکنگ کے پرانے اصول اور قوانین دم توڑ چکے ہیں۔'' وہ رک رک کر کہنے لگا۔ ''ان کے ساتھ ہی ہمارا بینک بھی ختم ہوگیا.....اور تمام اسٹاک ہولڈرز بھی......'' اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ ''تمام احکام ختم ہوگئے افراطِ زر کے سامنے دنیا کی کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی۔''

''صرف......'' وہ پُروقار لہجے میں بولی۔ ''پرنس ایوان کے اقوال معتبر ہی اس کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔''

وہ جانتی تھی کہ بیرن کو مکمل طور پر شکست دینے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ وہ اب ہمیشہ کے لیے اس کا ہوکر رہ گیا ہے۔ بینک اور اسٹاک ہولڈرز دم توڑ چکے ہیں۔ اب وہ اس کے رقیب نہیں رہے لیکن اب اس بات کی زیادہ اہمیت بھی نہیں تھی۔ بیرن کی سرکشی دم توڑ چکی ہے اس لیے اسے کبھی اپنی مردانہ وجاہت اور طاقت کا گھمنڈ نہیں ہوگا۔ وہ جب بھی اسے نظر بھر کر دیکھا کرے گا اُسے اپنی شکست کا احساس ہوگا اور وہ اس کے حسن سے لطف اندوز نہیں ہوسکے گا۔ شہزادی کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ زمین اور عوام تو اس کی ملکیت بن گئے ہیں، سب کچھ اسے حاصل ہوگیا ہے لیکن وہ اس شخص کی موجودی میں آنسو بہانے اور ان سے لطف محسوس کرنے سے محروم ہو جائے گی۔ اس نے یکایک تمام خیالات اپنے ذہن سے جھٹک دیے۔ اسے بیرن کی شدت سے ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔

شہزادی کی منگول آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی اور وہ کسی قدر حسرت آمیزی سے بولی۔ ''میں امریکہ جارہی ہوں۔''

بیرن نے اس کی بات نہیں سنی۔ وہ وسیع و عریض کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ انداز ایسا تھا جیسے اسے سکتہ ہوگیا ہو۔

شہزادی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور قدرے بلند آواز میں بولی۔ ''پرنس ایوان کا قول تھا کہ کسی حسین اور جوان عورت کو تنہا سفر نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی اسے عدم تحفظ کا شکار ہونا چاہیے اسے چاہیے کہ کسی مضبوط آدمی کا سہارا لے جو اسے سفر میں پیش آنے والے خطرات اور مصائب سے بچا سکے۔'' آنسو اب بہہ بہہ کر اس کے رخساروں پر ڈھلکنے لگے تھے۔

''مجھے امریکہ اور وہاں کے لوگوں سے خوف محسوس ہوتا ہے۔ اگر تم میرے تحفظ کے لیے ساتھ چل سکو تو یہ میرے لیے بہت اعزاز کی بات ہوگی۔''

اچانک بیرن کے بازو اس کے گرد حمائل ہوگئے۔

شہزادی نے ایک طویل سانس لی اور آنکھیں بند کرلیں۔ دور کہیں بہت دور سے ایک آواز اس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ یہ صحرائے قراقرم کی سیاہ ریت کے اوپر بہنے والی ہواؤں کی آواز تھی۔ رفتہ رفتہ یہ آواز مدھم ہوتی گئی اور پھر ختم ہوگئی۔ اس بار وہ سرگوشی میں بولی مگر بیرن اس کے الفاظ اور ان کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہا۔ وہ کہہ رہی تھی......

''پرنس ایوان...... میرے آقا...... مجھے معاف کردینا۔ اس آخری اصول...... آخری قول کے سلسلے میں معاف کردینا۔''



قسط نمبر 23

گردش

شہناز بانو

دنیا میں فساد کا محرک زن، زر، زمین رہی ہے۔ دنیا کا پہلا قتل بھی عورت ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔ یہ سلسلہ وار ناول ہمارے موجودہ دور کی کہانی ہے۔ اس کے بیش تر کردار ابھی تک بقید حیات ہیں۔ کچھ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرچکے ہیں۔ جب کہ بعض کے دامن میں صرف پچھتاوے باقی رہ گئے ہیں اور وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ وقت کی گرد نے ان کی شناخت تک گم کردی ہے۔

اس داستان میں محبت اور نفرت کے تمام رنگ اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ کہیں مجبوری، بے بسی اور مفلسی کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں تو کہیں جابروں اور ظالموں کے سماعت شکن قہقہے گونجتے ہیں۔ کہیں قانون اپنے روایتی انداز میں مظلوموں کی عزت و جان سے کھیلتا نظر آتا ہے تو کہیں جابروں کی دہلیز پر ماتھا ٹیکتا دکھائی دیتا ہے۔

تحیر اور ایکشن پسند قارئین کے لئے نئے افق کی تحیر خیز سلسلے وار کہانی

آنکھ کھلتے ہی مجھے اپنا وجود کسی اور وجود کے نیچے دبا ہوا محسوس ہوا اور میں نے اس احساس کے بے دار ہوتے ہی اس وجود کو پوری طرح سے جکڑ لیا اور تیزی کے ساتھ کروٹ لے ڈالی۔

میرے کروٹ لیتے ہی وہ وجود میرے نیچے دب گیا اور میں اس پر حاوی ہوگیا۔ میں نے اس کے اوپر جھکتے ہوئے غراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''کون ہو تم؟'' جواب میں مجھے گہری گہری سانسیں سنائی دیں اور ایک نسوانی آواز سرسراتی ہوئی میرے کانوں میں آئی۔

''تمہارا انعام۔''

یہ سنتے ہی میں نے تیزی سے اپنا ایک ہاتھ اس کی کمر کے نیچے سے نکالا اور سامنے کے حصے پر پھیرا اور جھٹ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ میرا ہاتھ سوئچ بورڈ کی جانب بڑھا اور لمحہ بھر میں کمرے کا اندھیرا دور ہوکر روشنی میں نہا گیا۔ میری نگاہ اپنے بیڈ کی جانب اٹھی جہاں میں نے ایک نوخیز اور طرح دار لڑکی کو دیکھا۔

اس کی چمکیلی پشت میری جانب تھی اور لمبے بال ناگوں کی طرح بیڈ پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے بل کھا کر چمکیلی کمر کو گھما کر ایک ادا دلبرائی سے میری جانب دیکھا تو میں نے گھبرا کر جھٹ اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ میں چند لمحوں تک ساکت کھڑا رہا پھر آنکھوں میں ذرا سی جھری بنا کر اسے دیکھا وہ آہستہ آہستہ بیڈ سے اٹھ رہی تھی۔ رات کی اس خاموشی میں مجھے اپنی سانسوں کی آواز یا پھر اس کے کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ وہ بستر سے پھسلنے کے انداز میں اتری اور میرے سامنے آکر کھڑی ہوگئی ایک لمحے کے لیے مجھے ایسا لگا جیسے سفید دودھیا ایک تراشا ہوا مجسمہ میرے سامنے کھڑا ہے اس نے اپنے حسین اور خوب صورت جسم پر ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ بلاؤز برائے نام اس کے حسن کو چھپا رہا تھا ساڑھی کا طویل پلو زمین پر بکھرا ہوا تھا۔ وہ چند لمحے ساکت کھڑی رہی۔ پھر میرے نزدیک آئی اور آہستہ سے اپنا ہاتھ میرے سینے پر مارا۔ اسے لگا کہ میں کھڑے

کھڑے سو گیا ہوں اس نے ہاتھ مار کر مجھے جگا دیا۔ میں نے اپنی آنکھیں پوری طرح کھول دیں۔

پھر اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ وہ آہستہ آہستہ دائرے کی شکل میں گھومنے لگی اور اسی طرح کرتے ہوئے نجانے کیسے ساڑھی کے بل کھلنے لگے اور ذرا ہی دیر میں ساڑھی اس کے قدموں میں ڈھیر کی صورت بکھری پڑی تھی۔ نیچے اس نے منی اسکرٹ ٹائپ کی کوئی شے پہنی ہوئی تھی اس کے نیچے سے اس کی گوری شفاف اور سڈول ٹانگیں نمایاں تھیں۔

اس نے نشیلے انداز میں مسکرا کر میری جانب دیکھا اور ایسا کرتے ہوئے اس کے سفید موتیوں جیسے دانتوں کی لڑی نمایاں ہوگئی۔ میں نے دل ہی دل میں اس کی دل کشی کا اعتراف کیا اور خالق کی مدح سرائی کی۔ اس کی رنگت دیکھ کر لگ رہا تھا جیسے تخلیق کار نے میدہ اور شہد کی آمیزش سے اس کو بنایا ہے۔

وہ جس طرح اچانک رات کے اس سمے میرے کمرے میں آئی تھی اوپر سے اس کی بے حجابی اور قاتل ادائیں مجھے شدید ترین خطرے کا احساس ہونے لگا۔ مجھے لگا جیسے وہ نشہ بھی کیے ہوئے ہے۔ آہستہ سے وہ ڈولتے اور لچکتے ہوئے مزید میرے نزدیک آئی اور پھر جیسے مجھ پر چھا گئی۔

میں نے دل ہی دل میں اللہ سے پناہ چاہی۔ اس کے ارادے اور حسن و جوانی خطرناک تھی۔ اتنی کہ کسی زاہد کی توبہ بھی ٹوٹ جائے میں تو صرف ایک عام سا گناہ گار بندہ تھا۔

اس کا مچلتا، تڑپتا گرم اور گداز بدن کا لمس میرے لیے پل صراط ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے لاکھ توبہ کر لی تھی لیکن بہر حال میں ایک مرد تھا اور میرا متاثر ہونا فطری بات تھی۔ میں ذہنی طور پر کتنی ہی مزاحمت کر رہا تھا لیکن میرا جسم ردعمل دکھا رہا تھا لیکن جب معاملہ حد سے بڑھنے لگا تو میں جیسے چونک کر بے دار ہو گیا اور میں نے خود سے لپٹی ہوئی اس حسین ناگن کو ایک جھٹکے کے ساتھ خود سے دور کر دیا اور نہایت سخت لہجے میں ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔

"کون ہو تم؟ یہ آدھی رات کو میرے کمرے میں کیا کرنے کے لیے آئی ہو۔ ہوش میں آؤ۔"

"میں بہت پیاسی ہوں، تمہارے پاس اپنی پیاس بجھانے کے لیے آئی ہوں ڈارلنگ۔" اس نے نشیلے اور بہکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میرا خیال ہے تم اس وقت اپنے حواسوں میں نہیں ہو۔ تم نے شراب پی ہوئی ہے۔"

"شراب؟" اس نے اپنی نشیلی اور مدھر آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور غائب دماغی سے بولی۔

"شراب کیا ہوتی ہے...... او...... اچھا اب میں سمجھی...... ہاں، ہاں پی ہے میں نے......!" وہ کھڑے کھڑے جھوم رہی تھی بلکہ اس سے کھڑا ہونا دوبھر ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا بس اب گر پڑے گی۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھ کر اسے سنبھالا تو وہ پھر سے مجھ سے لپٹ گئی۔

اس مرتبہ میں پورے حواسوں میں تھا۔ اس لیے میں نے اس کی برہنہ باہوں کو سختی کے ساتھ پکڑ کر اور کھینچ کر خود سے دور کیا اور الٹے ہاتھ کا ایک تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ میں نے اپنا ہاتھ ہلکا ہی رکھا تھا۔ ورنہ اگر میں اپنی قوت سے اس کے منہ پر تھپڑ مارتا تو اس کے چہرے کا جغرافیہ ہی بگڑ جاتا۔

میرے اس تھپڑ نے کام دکھایا اور وہ جھٹکا کھا کر قدرے ہوش میں آ گئی اور زور زور سے پلکیں جھپکنے لگی پھر بولی۔

"تم نے میرے منہ پر تھپڑ مارا، کیوں؟ کیا میری اداؤں اور حسن نے تمہیں گھائل نہیں کیا تم کیسے مرد ہو...... اور مرد ہو بھی یا نہیں......!"

"تمہاری نگاہ میں کیا مرد صرف وہی ہوتا ہے جو ایک کمزور عورت کو زور وزبردستی پامال کر دے۔ اصل مرد تو دیکھو میرے جیسا ہوتا ہے جو تمہاری جیسی گھٹیا طوائفوں کی اداؤں سے بہکتا نہیں بلکہ انہیں دھتکار دیتا ہے۔" میں نے اس کی بات کے جواب میں بری طرح تپ کر کہا۔

"طوائف کی گالی مت دینا۔" وہ ناگن کی طرح بل کھا کر پھنکاری۔

"اچھا پہلے یہ ساڑھی اٹھاؤ اور اسے اپنے جسم پر لپیٹو، پھر بات کرنا۔" میں نے حقارت آمیز لہجے میں کہا تو وہ مجھے بری طرح گھورتی ہوئی نیچے جھکی اور ساڑھی اٹھا کر فٹافٹ اپنے جسم پر لپیٹ لی اور اس کا پلو اپنے سینے پر پھیلاتے ہوئے بولی۔

"قسم کھا کر کہنا کیا میں تمہیں اچھی نہیں لگی۔"

"بات اچھا یا برا لگنے کی نہیں ہے۔ میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں لیکن بات شروع کرنے سے پہلے آؤ ادھر اطمینان سے بیٹھو۔" میں خود بھی جا کر صوفے پر بیٹھ گیا اور اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی دوسرے صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔ ابھی تک اس کی آنکھوں میں میرے لیے حیرت اور تجسس تھا۔ صوفے پر بیٹھ کر وہ میری جانب دیکھنے لگی۔ تب میں نے اس سے پوچھا۔

"سب سے پہلے تو یہ بتاؤ کہ تم ہو کون اور یہاں میرے کمرے میں تمہیں کس نے بھیجا ہے؟"

"میں شاذی ہوں اور مجھے نواب سرکار نے بھیجا تھا یہ کہہ کر کہ میں تمہارا انعام ہوں اور تمہیں ہر طرح سے خوش کرنا ہے، تمہارا نام شمروز ہے نا، کیونکہ بقول ان کے کہ تم اس میدان کے بڑے ماہر کھلاڑی ہو، عورتوں کے رسیا ہو لیکن تم تو نہایت خشک اور بور انسان ہو اب بتاؤ میں نواب سرکار کو کیا جواب دوں۔ جب وہ مجھ سے پوچھیں گے کہ میں نے اپنا کام ٹھیک طریقے سے انجام دیا یا نہیں۔"

"تم کہہ دینا کہ تم نے اپنا کام بالکل ٹھیک طریقے سے انجام دیا تھا باقی تم مجھ پر چھوڑ دو بات ختم۔" میں نے کہا تو ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں حیرانی اتر آئی۔

"تم اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو مجھے، میں سچ کہہ رہا ہوں تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی تم اطمینان رکھو میں جو کہتا ہوں وہ کرتا بھی ہوں۔" میں نے اس کی تسلی کے لیے کہا۔

"مجھے یقین ہے تم ایسا ہی کرو گے لیکن میں حیران اس بات پر ہوں کہ نواب سرکار نے تمہارے بارے میں غلط کیوں کہا انہوں نے تو کہا تھا کہ تم......!"

"انہوں نے جو کہا وہ ٹھیک ہی کہا کیونکہ وہ مجھے ایسا ہی سمجھتے ہیں جبکہ میں ایسا بالکل نہیں ہوں۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"لیکن وہ تمہیں ایسا کیوں سمجھتے ہیں؟"

"اس لیے کہ میں نے اپنی ذات ایسی ہی بنا کر ان کے سامنے پیش کی ہے۔" میں نے کہا اور اٹھ کر ٹیبل سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر ایک سگریٹ نکال کر سلگا لی۔

"کیوں؟" اس نے شدید حیرت سے کہا۔

"چھوڑو اس بات کو یہ تمہارا دردسر نہیں ہے۔" میں نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیتے ہوئے کہا میں جو کبھی سگریٹ کو ہاتھ تک نہیں لگاتا تھا اور دوسروں کو بھی تمباکو نوشی سے پرہیز کرنے کے لیے کہتا تھا۔ اب بے تحاشا سگریٹ پینے لگا تھا۔

"تم ایک نہایت حیرت انگیز مرد ہو، میں نے اپنی لائف میں تمہارے جیسا مرد نہیں دیکھا۔" اس نے تحسین آمیز نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نواب صاحب کے ساتھ کب سے ہو؟" میں نے سگریٹ کا ڈھیر سارا دھواں چھوڑتے ہوئے کہا تو وہ سر جھکا کر اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑنے لگی۔ میں اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ چند لمحوں کی خاموشی اور اس کی جانب سے اپنے سوال کا جواب نہ آنے پر میں نے دوبارہ کہا۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔"

"ایک سال سے۔" اس نے سر کو جھکائے جھکائے دھیمے لہجے میں کہا۔

"اس سے پہلے کہاں تھیں؟" میں نے دوسرا سوال داغا۔

"اپنے گھر میں......!" اس کا سر بدستور جھکا ہوا تھا اور وہ سر جھکائے ہوئے میرے سوالوں کے جوابات دے رہی تھی۔

"گھر کے شریفانہ ماحول سے نکل کر اس جانب آنے کی وجہ؟" میں نے چونک کر اسے دیکھا اور تیزی سے پوچھا۔

"میری بدقسمتی اور کیا اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ یہ مجھے اب سمجھ میں آیا ہے۔" اس نے کہا اور پھر مجھے اس کی ہلکی ہلکی سسکیاں سنائی دینے لگیں تو میں اٹھ کر اس کے نزدیک چلا گیا اور اس کا جھکا ہوا سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے تیزی سے دوبارہ اپنا سر جھکا لیا۔

"تم اپنی بات کی وضاحت کرو گی۔" میں دوبارہ اپنی جگہ پر جا بیٹھا اور ختم ہونے والی سگریٹ کو ایش ٹرے میں بجھا کر ڈال دیا۔

"بس کسی لڑکے کے عشق میں مبتلا ہو کر گھر سے بھاگ نکلی۔ اس نے کچھ دن خود مفت میں مزے اڑا کر مجھے بیچ ڈالا۔ پھر قزلباش نامی شخص کے دربار میں میری حاضری ہوئی اور اس کے بعد میں نواب سرکار کی تحویل میں دے دی گئی۔ نواب صاحب بہت خاص خاص لوگوں کے پاس مجھے بھیجتے ہیں۔"

قزلباش کا نام سن کر میں چونک پڑا۔ پھر مجھے کنیز یاد آئی۔ وہ بھی اسی طرح اس کے پاس لائی گئی تھی اور پھر اپنی تصویروں کے ذریعے ان کے ہاتھوں بلیک میل ہوئی تھی اور بالآخر اپنے بدترین انجام کو پہنچ گئی اور موت کی گود میں جا سوئی۔

"اس کے پاس تمہاری برہنہ تصاویر بھی ہوں گی جن کی وجہ سے شاید بلیک میل ہو کر تم یہ قبیح کام کرنے پر آمادہ ہوئی ہو۔" میں نے کہا تو اس نے چونک کر تیزی سے سر اٹھایا اور بولی۔

"آپ کو کیسے پتا؟"

"اس قسم کے کیسوں میں ایسا ہی ہوتا ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی عورت اپنی مرضی سے خود کو اتنا زیادہ نہیں گرا سکتی۔ اس کے پس منظر میں یہی کہانی ہوتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم لڑکیوں کو کب اس بات کی عقل آئے گی کہ ان کے ماں باپ ان کے لیے جو سوچتے ہیں جو کرتے ہیں وہی بہتر اور باعزت ہوتا ہے۔ انڈین فلمیں اور ڈرامے دیکھ دیکھ کر تم لوگ خود کو ان ہیروئنوں کی جگہ سمجھنے لگتی ہو جو کسی نہ کسی لڑکے کی محبت میں مبتلا ہو کر ساری دنیا کو بھول کر اس کے ساتھ اپنے گھر کی دہلیز پار کر لیتی ہے۔ تم لوگ یہ کیوں نہیں سمجھتی کہ جو لڑکا تمہیں تمہارے ماں باپ کی عزت روند کر گھر سے بھگا کر لے جا رہا ہے وہ خود تمہاری عزت کبھی نہیں کرے گا اور آخر کار گھر سے بھاگی ہوئی لڑکیوں کا انجام کسی طوائف کا کوٹھا یا کسی پیشہ ور آنٹی کی کوٹھی ہی ہوتا ہے۔" میں نے زہر خند لہجے میں کہا تو وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر بری طرح رونے لگی۔

"اب رونے کا کیا فائدہ تمہیں اندازہ ہے کہ تمہارے گھر سے آنے کے بعد تمہارے ماں باپ کا کیا حال ہوا ہوگا وہ خود کتنا روئے ہوں گے اب تک رو رہے ہوں گے۔" میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا تو وہ اور بھی شدت سے رونے لگی۔ تب ہی ایک بار پھر اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے قریب جا کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

"اچھا اب چپ ہو جاؤ میں نے شاید تمہیں بہت زیادہ سخت الفاظ میں ڈانٹ دیا ہے۔"

"آپ یقین جانیں مجھے ذرا بھی برا نہیں لگا بلکہ میں بہت خوش ہوں کہ اب اس دنیا میں میرے لیے کم از کم ایک مرد تو ہے جس نے میرے وجود پر غلیظ نگاہ نہیں ڈالی بلکہ مجھ سے نفرت کا اظہار کیا ہے۔" وہ ایک دم سے کھڑی ہو گئی اور بولی۔

"میں نے تم سے نہیں تمہارے اس کام سے نفرت کا اظہار کیا ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ بہت اچھے ہیں کیا آپ مجھے اس گندگی سے نکال سکتے ہیں۔" اس نے امید بھرے لہجے میں کہا تو میں نے نفی میں سر ہلا دیا تو وہ ایک بار پھر رونے لگی۔

"تم پھر رونے لگیں اچھا یہ بتاؤ کہ تم یہاں سے نکل کر کہاں جاؤ گی ہے کوئی ٹھکانہ تمہارے پاس۔ یہاں سے نکلو گی تو کسی اور کے ہتھے چڑھ جاؤ گی تمہارا انجام یہی ہے جب تک تم بوڑھی نہیں ہو جاتیں اسی طرح پامال ہوتی رہو گی۔"

وہ کچھ دیر روتی رہی پھر خود ہی چپ ہو گئی۔ پھر اس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا اور اپنی ساڑھی کے پلو سے اچھی طرح اپنا چہرہ صاف کیا اور بولی۔

"آپ کون ہیں اور اس کوٹھی میں کیوں آئے ہیں۔ آپ اتنے اچھے ہیں تو ان لوگوں کے ساتھ کیوں ہیں؟"

"اگر میں تمہارے سوال کا جواب نہ دوں تو؟" میں نے کہا

"ہاں ضروری تو نہیں ہے لیکن نہ جانے مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ جیسے میں زبردستی ان لوگوں کے ساتھ مجبوری سے رہ رہی ہوں۔ آپ بھی کسی مجبوری کی وجہ سے یہاں ہیں۔ مگر برے آدمی نہیں ہیں۔"

اس کی بات سن کر میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کہا۔

"تم نے یہ کیسے اندازہ لگایا کہ میں برا آدمی نہیں ہوں؟"

"اس لیے کہ آپ عورت کی عزت کرنا جانتے ہیں اور حرام کو حرام سمجھتے ہیں۔ اس نے جھٹ کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ تم آج تک کس کس کے پاس گئی ہو ابھی تھوڑی دیر قبل تم نے بتایا تھا ناں کہ نواب تمہیں خاص خاص لوگوں کے پاس بھیجتا ہے۔" میں نے اس کی بات کو نظر انداز کر کے اپنے مطلب کا سوال پوچھا۔

"آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں۔ کیا آپ کا تعلق بھی پولیس سے ہے؟" اس نے سہمی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"بھی، سے تمہارا کیا مطلب ہے۔ کیا تم پولیس والوں کے پاس بھی جاتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"صرف ایک بار ایک آدمی کے پاس گئی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ پولیس میں ہے۔" اس نے کہا۔

"نہیں میرا تعلق پولیس سے نہیں ہے اچھا اور بتاؤ اور کن لوگوں کے پاس گئی ہو اور یہ اتنی ادائیں تم کو کس نے سکھائی ہیں یا یہ سارے حربے یعنی مردوں کو رجھانے والے اور ایک شرابی کی طرح بہکنے کی اداکاری یہ سب تمہیں کیسے آئیں۔" میں نے پوچھا۔

"آپ یہ سب مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟" اس نے کہا۔

"تم چاہتی ہو نا کہ تمہیں اس روز روز کے مرنے

کے عذاب سے نجات مل جائے تو ایک طریقہ ہے میرے پاس جس کے ذریعے سے تم ان سب چیزوں سے نجات حاصل کرلوگی اور تمہیں محفوظ ٹھکانہ بھی مل جائے گا۔" میں نے اٹھ کر ایک بار پھر سگریٹ نکال کر سلگائی تو وہ بولی۔ "آپ سگریٹ بہت پیتے ہیں۔"

"میرے سوال کا جواب دو۔" میں نے ایک بار پھر اس کی بات کو نظر انداز کر کے پوچھا۔

"آپ مجھ سے پکا والا وعدہ کریں پھر میں آپ کو بہت کچھ بتا سکتی ہوں۔" وہ اٹھ کر میرے نزدیک آ گئی اور اپنا سفید اور مخروطی ہاتھ میرے سامنے پھیلا دیا۔

میں نے ایک نگاہ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر ڈالی اور دوسری اس کے چہرے پر، پھر بے نیازی سے کھڑا ہوا سگریٹ کا ایک زبردست کش لگایا اور سارا دھواں اس کے منہ پر چھوڑتے ہوئے خونخوار لہجے میں کہا۔

"محترمہ شازلی بیگم! اگر تم نے میرے ساتھ چالبازی کرنے کی کوشش کی تو میں تمہارا وہ حشر کروں گا کہ تم اپنے منہ سے موت کی تمنا کرو گی اور میں تمہیں زندہ رکھوں گا۔"

"آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں میں کیا چالبازی کروں گی۔" وہ کسی چڑیا کی مانند سہم گئی۔

"کیونکہ میں تمہاری جیسی عورتوں کی رگ رگ سے واقف ہوں۔" میں نے کہا۔

"لیکن میں کوئی طوائف نہیں ہوں، میری رگوں میں شریف والدین کا خون ہے اور یہ جو میں بھگت رہی ہوں یہ میری غلط سوچ اور ایک غلط قدم کی سزا ہے۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"شازلی تمہارا حقیقی نام ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، میرا نام ماں باپ نے بلقیس بانو رکھا تھا گھر میں سے مجھے بلّو کہتے تھے شازلی نام تو اس خبیث قزلباش نے رکھا تھا۔ آپ جانتے ہیں اسے؟"

اس نے کہا تو میں نے صرف ہاں میں سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔

"آپ بتائیں نا کس طرح مجھے یہاں سے نجات دلائیں گے اور اس کا وعدہ بھی کریں وہ تو آپ نے مجھ سے کیا ہی نہیں۔" اس نے معصومیت سے پوچھا تو میں نے غور سے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور اس کی آنکھوں میں بھی مجھے وہی معصومیت دکھائی دی جو اس کے چہرے پر تھی۔ انسانی چہروں کی پہچان تھی مجھے، میں دوبارہ صوفے پر جا بیٹھا اور سوچوں میں گھر کر سگریٹ پیتا رہا میرا دماغ تیزی سے چل رہا تھا آخر میں ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

جتنی دیر میں خاموشی سے بیٹھا سگریٹ پیتا رہا وہ بھی خاموش بیٹھی رہی۔ کبھی سر جھکا لیتی کبھی سر اٹھا کر میری جانب دیکھنے لگتی۔ پھر میں نے کہا۔

"میں تمہیں یہاں سے اس طرح نجات دلاؤں گا کہ نواب سے تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنے لیے مانگ لوں گا۔ پھر میرا ایک فلیٹ ہے تمہیں وہاں چھوڑ دوں گا میں نواب سے یہی کہوں گا کہ تم میرا انعام ہو اور انعام دے کر واپس نہیں لیا جاتا۔"

"سچ......!" وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ "آپ واقعی ایسا کریں گے پکا وعدہ نا۔"

"بالکل پکا والا وعدہ لیکن تمہیں بھی میرے بہت سے سوالوں کے جوابات بالکل ٹھیک دینے ہوں گے لیکن یاد رہے مجھے جھوٹ اور دھوکہ سے شدید نفرت ہے نہ میں کسی کے ساتھ جھوٹ بولتا ہوں اور نہ دھوکا دیتا ہوں اور اپنے ساتھ ہی دونوں کام کرنے والوں کو کبھی نہیں بخشتا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں اللہ کو حاضر ناظر جان کر کہتی ہوں کہ جو کہوں گی سچ کہوں گی سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گی۔"

اس نے حلف لینے کے انداز میں ایک ہاتھ اٹھا کر پر مسرت لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے اب تم سونا چاہتی ہو تو سو جاؤ جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ، باقی باتیں دوسری ملاقات پر ہوں گی کیونکہ میں اب سونا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"میں یہیں سو جاتی ہوں صبح چلی جاؤں گی آپ اطمینان سے سو جائیں اب آپ کی نیند خراب نہیں کروں گی۔" اس نے کہا۔

"کیا تم اسی کوٹھی میں رہتی ہو؟" میں نے بیڈ پر لیٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" اس نے جواب دیا اور صوفے پر لیٹ گئی۔

میں تھوڑی دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا پھر سو گیا۔ صبح اٹھا تو وہ کمرے سے جا چکی تھی۔

......☆☆......

طارق سے بہت سی کارآمد معلومات حاصل کرنے کے بعد سفیان کو اب راجیش پٹیل المعروف اخوندزادہ ایاز خان کے پاس جانا تھا۔ یہ بات تو اس کے علم میں آ چکی تھی کہ طارق "را" کا ایجنٹ نہیں بلکہ ان لوگوں کا محض آلہ کار تھا جبکہ راجیش پٹیل "را" کا گھاگ ایجنٹ تھا اور پچھلے دس سال سے وہ پاکستان میں ایک مسلمان بزنس مین اخوندزادہ ایاز خان کے نام سے بزنس کر رہا تھا۔ بظاہر دیکھنے میں وہ ایک افغان دکھائی دیتا تھا۔

طارق کی فائل مکمل کرنے کے بعد سفیان نے راجیش پٹیل والے کمرے کا رخ کیا۔ جب وہ اس کے کمرے میں پہنچا تو وہ اس کو دیکھ کر چیخنے اور چلانے لگا۔ ساتھ ہی وہ اسے خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی دے رہا تھا۔ بقول اس کے اس کے بہت اوپر تک تعلقات ہیں اور یہ کہ وہ ایک شریف شہری ہے وغیرہ وغیرہ۔

سفیان پہلے کی طرح اپنے ساتھ جنید کو لے کر گیا جنید نے ایک ٹیپ ریکارڈ آن کر کے ٹیبل پر رکھ دیا اور سفیان ہی کی ہدایت پر کاغذ قلم بھی لے کر بیٹھ گیا۔

سفیان بہت خاموشی اور تحمل سے اس کی دھمکیاں سنتا رہا جب وہ بول بول کر تھک کر خود ہی خاموش ہوا تو سفیان اس کے قریب گیا اور الٹے ہاتھ کا ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارتے ہوئے بولا۔

"کر لی ساری بکواس مسٹر راجیش پٹیل، اسپیشل ایجنٹ آف را، تم کیا سمجھتے ہو کہ تمہیں یوں ہی اٹھا کر لے آئے ہیں۔ ہماری تو تمہارے اوپر نہ جانے کب سے نگاہ تھی۔ تمہیں بہت دیکھ بھال کر اور پورے اطمینان کے ساتھ یہاں لایا گیا ہے۔ رہی بات تمہاری دھمکیوں کی تو تم بھول جاؤ کہ اس بات کی کسی کو بھی خبر ہو گی کہ تم کہاں ہو اور وہ جن کی تم دھمکیاں دے رہے ہو بہت جلد وہ لوگ بھی تمہاری طرح ہماری گرفت میں تمہارے ساتھ ہوں گے۔

میری طارق سے گفتگو ہو چکی ہے اس نے تمہارا سارا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا ہے اور کیا نام ہے تمہارے اس دوست ڈی ایس پی بابر جمالی اور وہ تمہاری معشوقہ میڈم فیروزہ جلد ہی انہیں بھی ہم شرف میزبانی بخشیں گے۔

"تو بات یہ ہے مسٹر راجیش پٹیل اب تم فٹافٹ شروع ہو جاؤ اور اپنے سارے روابط کے بارے میں سیدھے طریقے سے بتا دو کہ تمہارے اور کتنے ساتھی ہیں اور وہ کن کن ناموں سے اور کہاں کہاں موجود ہیں۔"

"میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو کون راجیش پٹیل کون طارق میں تو ان میں سے کسی نام سے بھی واقف نہیں ہوں۔ میں تو......!"

"شٹ اپ۔" سفیان کا ہاتھ ایک بار پھر گھوما اور

راجیش پٹیل کے منہ پر جا پڑا سفیان کے زوردار تھپڑ کی وجہ سے راجیش پٹیل پیچھے کی جانب الٹ گیا اس کے دونوں ہاتھوں کو پشت کی جانب زنجیروں سے باندھا گیا تھا اور اسی طرح اس کی دونوں ٹانگیں الگ الگ مخالف سمتوں میں زنجیروں سے باندھی گئی تھیں۔

پیچھے گرتے ہی راجیش پٹیل کے منہ سے بے ساختہ ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس کے دونوں بازو اس کے بھاری جسم کے نیچے مڑ گئے تھے۔

سفیان نے اسے سر کے بالوں سے پکڑ کر سیدھا کیا تو وہ اپنی سرخ آنکھوں سے سفیان کو گھورنے لگا اور زمین پر زور سے آخ تھو کر کے نفرت انگیز لہجے میں بولا۔

''ہم نے تم سے پہلے تمہارا آدھا ملک چھینا اور تمہارے نوے ہزار فوجیوں کو اپنا قیدی بنایا ہم نے تمہاری کمر توڑ ڈالی تھی اور اب ہم یہ تمہارا بچا کچا پاکستان بھی تم سے چھین لیں گے۔''

غیظ اور غضب سے سفیان کا برا حال ہوگیا۔ اس نے سوچا کہ ہمارے اپنوں کی غداری کی وجہ سے 71ء کی شکست نے ہماری ہزار سالہ فتوحات اور حکمرانی کی دہشت کو پاش پاش کردیا ہے جو مسلمانوں نے کی تھی اس کا قومی غیرت کا خون جوش سے ابلنے لگا۔ اس کا دل چاہا کہ بناء کوئی بھی بات کہے ابھی اس ہندو کی اولاد کو جہنم واصل کردے لیکن مصلحت اور حصول مقصد کی خاطر وہ اپنے ابلتے ہوئے خون کو گھونٹ گھونٹ کر کے پی گیا۔

وہ ایک بار پھر شروع ہوگیا۔ اس مرتبہ اس نے پاکستانی حکومت ان کے وزراء اور پاکستانی عوام کو نشانہ بنایا استہزائیہ لہجے میں بولا۔

''تم لوگ جمہوریت کا راگ الاپتے ہو لیکن تمہارے ملک میں اس نام کی کوئی شے نہیں ہے۔ کوئی قانون نہیں ہے تم لوگ بھوکے ہو ننگے ہو چند ٹکڑوں کی خاطر اپنے وطن کا سودا آسانی سے کرلیتے ہو ہم تمہارے ملک میں کامیابی سے قدم جمانے میں اس لیے کامیاب ہوتے ہیں کہ تمہارے اپنے عوام نے ہمارا ساتھ دیا ہے۔''

اس کی یہ باتیں سفیان کے سینے پر خنجر کی طرح پیوست ہورہی تھیں وہ بول رہا تھا اور سفیان کو یوں محسوس ہورہا تھا جیسے وہ اسے آئینہ دکھا رہا ہو۔

آج اتنے سال گزرنے کے بعد بھی پاکستان بھی وہی ہے اور دشمن بھی وہی ہے اور دشمن کے عزائم بھی وہی ہیں۔ اس نے پرتھوی اور اگنی میزائل بنایا یہ اس کے جارحانہ عزائم کی عکاسی ہے تو یہ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے اب تک اس آدھے پاکستان کو اپنی پناہ میں لے رکھا ہے ورنہ ہم نے تو اپنی بربادی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے اس کا دل ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو دعائیں دینے لگا جنہوں نے پاکستان کی محبت میں اپنی انتھک محنت اور خوف کی پروا کیے بغیر اربوں ڈالر کی پیشکش کو مسترد کر کے پاکستان کو اٹامک پاور بنا دیا۔ پاکستان کے نیوکلیئر پاور بننے کی وجہ سے ہی بھارت تلملا رہا ہے۔

''کیا ہوا' جھانک لیا اپنے گریبان میں' ہمیں پکڑنے سے پہلے اپنے لوگوں سے نمٹو۔'' راجیش پٹیل نے اپنے منہ سے خون تھوکتے ہوئے کہا۔

''ہاں تو اب فٹافٹ اپنے لوگوں کے نام بتاؤ۔'' سفیان نے خون کا گھونٹ پیتے ہوئے پوچھا۔

''میں کسی اور کو نہیں جانتا میرے کسی اور سے رابطے نہیں ہیں۔'' اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''تم پر میں فضول میں وقت ضائع کررہا ہوں تم سے تو رستم خان ہی آ کر اپنی زبان میں بات کرے گا۔'' سفیان نے کہا پھر جنید کی جانب مڑتے ہوئے بولا۔

''جنید تم رستم خان کو بلا کر لاؤ اس سے کہنا کہ اپنے ساتھ ہیبت خان کو بھی لیتے آنا۔''

پھر وہ اپنے روم میں آ کر بیٹھ گیا۔ راجیش پٹیل کی کہی ہوئی باتیں اس کے دماغ میں گردش کررہی تھیں۔ اس نے بالکل ٹھیک کہا تھا اور یہی حقیقت ہے کہ اپنے ملک کے لوگ غداری نہ کریں تو دشمن کے یہ ایجنٹ کبھی بھی ہمارے ملک میں اپنی دکان سجا کر نہ بیٹھتے اور ان غداروں میں اوپری سطح سے لے کر نچلی سطح تک کے ہر شعبے کے لوگ ملوث ہیں۔ ایسا ملک کتنی مشکلات کا شکار ہوگا جس کے لوگ خود ہی اسے لوٹ کر کھا رہے ہوں۔

وہ ایک بار پھر راجیش پٹیل کی فائل کا مطالعہ کرنے لگا کچھ باتیں حکام بالا کے علم میں تھیں باقی کے بارے میں اس سے پتا کرنا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد رستم خان نے آ کر اطلاع دی کہ وہ شخص اپنی جگہ مضبوطی سے ڈٹا ہوا ہے اور تشدد کے باعث بے ہوش ہوچکا ہے۔

''اسے ہوش میں لاؤ اور اسے مجبور کرو کہ وہ سب کچھ بک دے۔ بس اس بات کا خیال رکھنا کہ وہ جان سے نہ مرے۔ میں بھی دیکھتا ہوں کہ یہ کب تک فولادی ثابت ہوگا۔'' سفیان نے اپنے دانتوں کو پیستے ہوئے کہا۔

اور پھر تھوڑی دیر بعد رستم خان پھر آیا اور اس نے خوش خبری سنائی کہ راجیش پٹیل آپ کو بلا رہا ہے شاید وہ کچھ بتانا چاہ رہا تھا۔

سفیان یہ سن کر رستم کے ساتھ اس سیل میں آیا جہاں راجیش پٹیل کی خاطر داری ہورہی تھی۔ اس وقت جس راجیش پٹیل پر سفیان کی نگاہ پڑی وہ راجیش پٹیل سے یکسر مختلف تھی جو کچھ دیر پہلے بڑی حقارت اور نفرت سے پاکستان اور پاکستانیوں کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ اس کا چہرہ سوجا ہوا تھا ایک آنکھ پھول کر باہر کو ٹپکی پڑ رہی تھی ایک بازو کندھے سے جھول رہا تھا اور پیشانی سے چند انچ کے قریب بال غائب تھے۔ جسم پر جگہ جگہ کرنٹ کی وجہ سے سیاہ داغ پڑے تھے۔

''تمہارا دماغ ٹھکانے آیا یا نہیں۔'' سفیان نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تو اس نے گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تکلیف کی شدت سے اس کے منہ سے بار بار سسکیاں نکل رہی تھیں۔ وہ منہ کھول کر بار بار گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

''اگر تم پہلی مرتبہ ہی سیدھے طریقے سے ساری بات بتا دیتے تو تمہارا یہ حشر نہ ہوتا۔'' سفیان نے کہا تو اس نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا پھر سر جھکا لیا۔

''ڈی ایس پی بابر جمالی کے بارے میں کچھ بتاؤ کیا وہ بھی انڈین ہے یا پاکستان میں تمہارا آلہ کار ہے؟'' سفیان نے پوچھا۔

''آپ تو کہہ رہے تھے کہ اس کے بارے میں سب جانتے ہیں۔'' اس نے اپنے جبڑوں اور آنکھوں کو زور سے میچ کر درد کی اٹھنے والی ایک تیز لہر کو برداشت کرتے ہوئے کہا۔

''تم سے صرف جو پوچھا جائے اس کے جوابات دو' آگے سے کوئی سوال مت کرو۔'' سفیان نے سخت لہجے میں کہا۔

''وہ' وہ......!'' سفیان کو لگا وہ جواب دینے میں ہچکچا رہا ہے پھر ایک دم بولا۔ ''وہ پاکستانی ہے اور ہمارا آلہ کار ہے۔''

سفیان کو اس کا یہ جواب مشکوک لگا اس لیے اس نے کہا۔ ''لگتا ہے تمہاری خاطر تواضع میں کچھ کمی رہ گئی ہے جنید ذرا رستم کو بلانا تو۔''

''نن......نہیں۔'' وہ تیزی سے بولا۔

''پھر میرے ہر سوال کا بالکل ٹھیک ٹھیک جواب دو یاد رکھو راجیش پٹیل ہمارے لیے یہ جاننا بالکل بھی مشکل نہیں ہے کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان اور اگر وہ ہندو نکلا تو پھر تم جانتے ہو کہ۔''

''وہ وہ ہے تو ہندو لیکن پاکستانی ہے اور ہمارے لیے کام کرتا ہے۔'' اس نے کہا۔

''میں پوچھ رہا ہوں وہ را کا ایجنٹ ہے یا نہیں۔ صرف ہاں یا ناں۔'' سفیان نے آگے بڑھ کر اس کے جھومتے ہوئے بازو پر ایک زور کا پنچ رسید کرتے ہوئے کہا۔ اس کی ایک زور کی چیخ نکل گئی اور اس کی گردن زور زور سے ہاں میں ہلنے لگی۔

''یعنی وہ بھی را کا ایجنٹ ہے۔'' سفیان نے پورا اطمینان کرنا مناسب سمجھا۔

''اچھا ٹھیک ہے اب ذرا اپنی اس معشوقہ فیروزہ کے بارے میں بتاؤ وہ بھی انڈین ہے اور ایجنٹ ہے نا؟'' سفیان نے پوچھا۔

''وہ بھی ہماری ساتھی ہے۔'' راجیش نے بمشکل کہا۔

''یعنی انڈین ایجنٹ ہے۔'' سفیان نے پوچھا اس مرتبہ بھی اس نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

''دونوں کے اصلی نام بتاؤ۔''

''بابر کا نام راہول شرما ہے اور فیروزہ کا نام سونالی ہے۔''

''یہ دونوں کتنے عرصہ سے یہاں کام کر رہے ہیں؟''

''بابر کو چار سال ہوگئے ہیں اور سونالی کو ساڑھے چار سال ہوگئے ہیں۔''

''اس سے پہلے کون لوگ تمہارا یہاں ساتھ دیتے تھے۔''

''وہ واپس جا چکے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد یہ لوگ آئے ہیں۔''

''راہول شرما تمہارے لیے کیا کام کرتا ہے؟''

''وہ پولیس کے محکمہ کی ہر انفارمیشن ہمیں دیتا ہے ہمیں اور ہمارے لوگوں کو تحفظ فراہم کرتا ہے بہت سے کام ہم اس کی پشت پناہی میں انجام دیتے ہیں اس کے علاوہ اگر ہمیں شک ہو جائے کہ ہمارا کوئی بھی بندہ پولیس کی نگاہوں میں مشکوک ہے تو وہ اپنے محکمہ کی تفتیش کا رخ غلط سمت پر موڑ دیتا ہے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کبھی کوئی بندہ ہمارے کام کے قابل نہیں رہتا تو راہول شرما اسے گرفتار کر کے یا پھر پولیس مقابلے میں مار کر اپنے نمبر بڑھا لیتا ہے بعض دفعہ اگر ہمارا کوئی بندہ گرفتار ہو جاتا ہے تو راہول شرما کسی اور بندے کا ان کاؤنٹر کر کے ہمارے بندے کو بچا لیتا ہے پھر پولیس کی نگاہوں میں آئے ہوئے اس بندے کو ہم واپس بھیج دیتے ہیں۔''

''سونالی عرف فیروزہ کے بارے میں بتاؤ اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں فحاشی کا اڈہ چلانے کے علاوہ۔''

''سونالی ہماری بہت زیرک ایجنٹ ہے لیکن میرے منظر سے غائب ہوتے ہی وہ محتاط ہو گئی ہوگی اب آپ کے ہاتھ نہیں آئے گی۔''

''یہ بات تو کسی کے بھی علم میں نہیں ہے کہ تم ہمارے پاس ہو پھر وہ کس طرح ہوشیار ہو گئی ہوگی۔'' سفیان نے تیزی سے پوچھا۔

''ہم زیادہ تر ایک دوسرے کے رابطہ میں رہتے ہیں ایک دو گھنٹوں کے وقفے کے بعد ہم ضرور رابطہ کرتے ہیں اور اگر بار بار رابطہ کرنے پر ہمارا رابطہ ایک دوسرے سے نہ ہو تو ہم محتاط ہو جاتے ہیں یہی سوچ کر کہ کہیں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے ہمیں آپ کے محکمہ پولیس سے تو کوئی خطرہ نہیں ہوتا لیکن ہم پاکستانی ایجنسیوں سے ہمیشہ خائف اور محتاط رہتے ہیں اب پورا ایک دن

اور ایک رات گزر چکی ہے اور میرا سونالی سے رابطہ نہیں ہوا ہے اس لیے وہ روپوش ہو گئی ہوگی۔''

''تمہارے خیال میں وہ کہاں گئی ہوگی؟'' سفیان نے پوچھا اور اس کے ساتھ ہی جنید کو ایک اشارہ کیا تو جنید فوراً ہی کمرے سے باہر چلا گیا۔

''مجھے نہیں معلوم۔'' اس نے سر کو جھٹک کر جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی سفیان نے اپنے بوٹ کا نوکیلا سرا جس پر فولادی پتری چڑھی ہوئی تھی راجیش پٹیل کے منہ پر زور سے مارا سفیان کی ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ بلبلا اٹھا اور بولا۔

''میں بھگوان کی سوگند کھا کر کہتا ہوں کہ اس طرح کے راز ہم ایک دوسرے کو نہیں دیتے اور وہ اس لیے کہ اگر ایک پکڑا جائے تو وہ دوسرے کے بارے میں کچھ نہ بتا سکے۔'' راجیش نے تکلیف کی شدت سے اپنا سر اِدھر اُدھر ہلاتے ہوئے کہا۔ پھر بولا۔ ''میں نے آپ کے ہر سوال کا جواب دے دیا ہے آپ کو آپ کے خدا کا واسطہ اب تو میری مرہم پٹی کر دیں مجھے کوئی پین کلر دے دیں یہ تکلیف اب مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی ہے۔''

''بس ابھی سے گھبرا گئے راجیش پٹیل تمہاری یہ تکلیف تو میرے ان لاکھوں پاکستانیوں کی تکالیف کے آگے کوئی حیثیت نہیں رکھتی جو تم ایک اکیلے نے انہیں پہنچائی ہے اور ابھی ساری تفتیش مکمل نہیں ہوئی ابھی تو تمہیں ہمارے بہت سے سوالوں کے جوابات دینے ہیں۔'' یہ کہہ کر سفیان اس کمرے سے باہر نکل آیا۔

اس نے ایک فون ملایا اور بولا۔ ''ہاں عادل کام ہو گیا؟'' پھر دوسری جانب سے چند لمحوں کی خاموشی کے ساتھ بات سنی پھر خوش ہو کر کہا۔ ''ویری گڈ۔ آج رات ان دونوں کو یہاں پہنچا دو ویل ڈن۔'' فون کرنے کے بعد وہ ایک بار پھر راجیش پٹیل کی فائل کی جانب متوجہ ہو گیا اور اس کے اندر کچھ تحریر کرنے کے بعد وہ کمپیوٹر کی جانب متوجہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر اس میں مصروف رہا پھر ایک خفیہ پاس ورڈ ڈال کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ایک بار پھر راجیش پٹیل کے روم کی جانب جا رہا تھا۔

وہ اندر گیا تو وہ ایک جانب گردن ڈالے نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑا تھا۔ سفیان اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا اور اس کی صورت دیکھتا رہا اس نے ایک بار پھر اپنے جوتے کی نوک اس کے شولڈر پر ماری تو وہ ہوش میں آ کر چلانے لگا۔

''تم مجھے ایک بار ہی کیوں نہیں مار دیتے یوں تڑپا تڑپا کر مجھے مارنے سے تمہیں کیا مل رہا ہے میں نے تو مسلمانوں کے بارے میں سنا ہے کہ وہ بہت رحم دل ہوتے ہیں اور تمہارے خدا اور رسول کا بھی یہی حکم ہے کہ انسانوں پر رحم کرو تم ان کا حکم بھی نہیں مانتے۔'' وہ تکلیف کی شدت سے اپنے حواس کھو رہا تھا اور جو منہ میں آ رہا تھا بول رہا تھا۔

''تجھے بہت پتا ہے مسلمانوں کے بارے میں اور ان کے اللہ اور رسول کے احکامات کے بارے میں لیکن شاید تجھے یہ نہیں معلوم کہ ان کا یہ حکم انسانوں کے لیے ہے تجھ جیسے سفاک درندوں کے لیے نہیں تو انسان ہے کہاں؟ انسان تو وہ ہوتا ہے جو دوسرے انسانوں کا درد اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔'' سفیان نے انتہائی نفرت انگیز لہجے میں کہا تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا وہ بہت بے چین ہو رہا تھا۔

''اچھا راجیش تم میرے چند سوالوں کے جوابات اور دے دو پھر میں ایک ڈاکٹر کو تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ وہ تمہیں انجکشن بھی دے گا اور تمہارے زخموں پر دوا بھی لگا دے گا اور تمہیں نیند کی گولی بھی دے دے گا تاکہ تم کھا کر کچھ دیر سو سکو۔''

سفیان کی بات سن کر راجیش نے متوحش نگاہوں سے اسے دیکھا اسے سفیان کی بات کا یقین نہیں آ رہا تھا اس کی آنکھوں میں بے یقینی دیکھی تو سفیان نے کہا۔

"تمہیں میرا یقین کرنا ہوگا راجیش، میں ایسا ہی کروں گا لیکن شرط وہی ہے کہ تمہیں اپنی زبان مکمل طور پر کھولنا ہوگی اور صرف سچ کے لیے اگر تم نے جھوٹ کا سہارا لیا تو آگے تم سمجھ دار ہو۔" سفیان نے معنی خیز لہجے میں کہا اور اس کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ آ گئی تو راجیش نے سر ہلا دیا۔

"تم نے ملک فیروز کو کیوں مروایا ہے؟" سفیان نے اس کی زخمی ٹانگ پر اپنا ایک پاؤں رکھتے ہوئے پوچھا۔

سفیان کے پاؤں رکھتے ہی جیسے اس کے جسم میں کرنٹ دوڑ گیا۔ درد سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"جواب دو راجیش، لیکن بالکل سچ۔" سفیان نے اپنے پاؤں کا دباؤ راجیش کے زخمی پاؤں پر بڑھاتے ہوئے کہا۔

"بتاتا ہوں لیکن بھگوان کے لیے اپنا پاؤں ہٹا دو۔" اس نے بلبلاتے ہوئے کہا تو سفیان نے اپنا پاؤں ہٹا لیا اور اس کی جانب جواب طلب نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"ملک فیروز بنیادی طور پر عورتوں کا رسیا اور عیاش فطرت آدمی تھا اس کی یہ کمزوری ہمارے ہاتھ آ گئی۔ پھر راہول شرما کے تعاون سے ایک نجی محفل میں جس میں ملک فیروز بھی مدعو تھا اور کنفرم خبر تھی کہ وہ آ رہا ہے تو ہم نے فیروزہ کو ایک حسین اور جوان لڑکی کے ہمراہ اسی محفل میں بھیج دیا۔ فیروزہ نے وہاں ملک فیروز سے تعلق پیدا کر لیا اس کے ساتھ آئی ہوئی لڑکی کا تعارف اس نے اپنی چھوٹی بہن کہہ کر کروایا اور یہ بھی بتایا کہ ہم آپ کے فین ہیں ہمارے ملک میں آپ جیسے زیرک اور عقل وفہم والے سیاست دان بہت کم ہیں وہ اپنی تعریف پر پھول گیا۔ اس لڑکی "خوشبو" کو دیکھ کر اس کی رال ٹپکی جا رہی تھی۔

بعد میں دو ایک دفعہ خوشبو اس کے خلوت کدے میں گئی اور اس کو نشے میں دھت کرنے کے بعد موبائل کیمرے سے برہنہ حالت میں وڈیو بنا لی۔ پھر کئی اور لڑکیاں بھی اس کے پاس گئیں اور اس کی کئی کمزوریاں ہمارے ہاتھوں میں آ گئیں اسی کے ذریعے ہمیں کچھ فوجیوں کے بارے میں بھی معلوم ہوا ہمیں کچھ خفیہ فائلیں درکار تھیں جو اس کے قبضے سے نکالنا تھیں۔

اور پھر ہم نے اسے اس کی وہ تمام وڈیوز بھیج دیں اور اس سے فائل کا مطالبہ کیا یہ کام میں نے کیا تھا ہمارے منصوبہ کے مطابق خوشبو بھی روتی پیٹتی اس کے پاس گئی اور کہا کہ اسے کسی کا فون آ رہا ہے اور پارسل کے ذریعے یہ وڈیو بھی ملی ہے۔

ملک فیروز پہلے تو چکر گیا پھر اس نے کہا کہ وہ اس معاملے کا کھوج لگائے گا کہ ایسا کون کر سکتا ہے میں نے اسے دھمکی دیتے ہوئے اس سے اس اہم فائل کا مطالبہ کیا لیکن ملک نے کہا کہ وہ انتظار کرے اور پھر ملک ہم تک پہنچ گیا اور ہماری انفارمیشن کے مطابق اگلے روز ہم پر ہاتھ ڈالنا تھا لیکن ہمارا اصول ہے کہ دشمن کو کوئی بھی موقع دیے بغیر اسے ہلاک کر دو۔ اسے میرے بارے میں معلوم ہو گیا تھا۔ اتفاق سے جس شادی میں وہ جا رہا تھا میں بھی مدعو تھا میں نے اس روز اس کو ختم کرنے کا پلان بنا لیا لیکن یہ میری بدقسمتی تھی کہ اس دن میں تمہارے ہتھے چڑھ گیا۔"

"کیا تم نے وہ فائل حاصل کر لی تھی؟" سفیان نے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے سر جھکا کر کہا تو سفیان نے ایک بار پھر اپنا پاؤں آگے بڑھایا تو وہ چیخ اٹھا۔ "بتایا تو

ہے کہ نہیں۔"

سفیان کے کان جیسے اس کی ہر چیخ ہر آہ وفغاں کو سننے کے لیے بہرے ہو چکے تھے۔ اس نے اپنا پاؤں اس کے زخمی پاؤں پر رکھا اور زور سے رگڑ ڈالا۔

"ہاں خوشبو اس فائل کو اڑا لانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔" اس نے ایک زوردار کراہ کے ساتھ جواب دیا۔

"تم کتے کی دم کی طرح ٹیڑھے ہی رہو گے کیوں بار بار اپنے آپ کو اذیت میں مبتلا کر رہے ہو جواب ٹھیک ٹھیک کیوں نہیں دیتے۔" سفیان نے کہا۔

"اب وہ فائل کہاں ہے؟"

"میرے بیڈ روم کی تجوری میں۔"

"فائل کا کیا کرنا ہے یہیں رہ کر کام کرنا ہے یا پھر اپنے باپ کے پاس بھارت بھیجو گے۔" سفیان نے دانت پیستے ہوئے پوچھا۔

"وہ انتہائی حساس نوعیت کی فائل ہے اسے آگے بھیجنا ہے۔"

"ابھی تک بھیجی کیوں نہیں تمہارے پاس کیوں ہے؟"

"وہاں سے ایک بندہ آ رہا ہے وہ لے کر جائے گا۔"

"کب آ رہا ہے، کیا نام ہے اس کا حلیہ بتاؤ۔" سفیان نے چونک کر تیزی سے پوچھا۔

"ابھی نہیں معلوم۔ وہ خود میرے پاس آ کر اپنے بارے بتاتا۔"

"تمہارا کوئی کوڈ تو ہوگا۔ وہ بتاؤ۔" سفیان نے پوچھا۔

اور وہ بتاتا گیا۔ سونالی عرف فیروزہ کے بارے میں بھی سفیان نے راجیش سے کافی ساری معلومات حاصل کر لیں اس کا بھی فائل میں اندراج کیا۔ پھر وہ اپنی اب تک کی کارکردگی کی رپورٹ کرنے اپنے ہیڈ آفس روانہ ہو گیا۔

☆☆

حشام کیا اسپتال سے گھر آیا میں پھر سے جی اٹھی۔ ڈاکٹر ذیشان نے مجھے حشام کے ساتھ رہنے کا حکم دیا تھا اس کے زخم خشک ہو چکے تھے جسمانی طور پر ابھی کمزوری باقی تھی۔ دوائیں جاری تھیں۔

گھر میں ہی ہم نے ایک چھوٹا سا جشن صحت منایا۔ شکرانے کے نوافل ادا کیے امی بھی حشام سے ملنے کے لیے آئی تھیں۔ البتہ اماں نہیں آ سکی تھیں۔ وہ عدت کے دن پورے کر رہی تھیں۔ انہوں نے حشام سے فون پر بات کی۔ اسے ڈھیروں ڈھیر دعائیں دیں۔ حشام نے بھی بابا کے انتقال پر افسوس کا اظہار کیا اور انہیں تسلی دی کہ آپ بابا کے جانے کے بعد خود کو تنہا مت سمجھیے گا ہم سب آپ کے ہیں اور آپ کے ساتھ ہیں۔ جواباً اماں نے حشام کو ڈھیر ساری دعائیں دیں۔

حشام کے کمرے میں جب میں اور حشام تنہا رہ گئے تو وہ شوخی سے میرا ہاتھ تھام کر بولا۔

"تم آج رات میرے کمرے میں ہی رہو گی نا۔"

"جی جناب لیکن ان دنوں میری حیثیت آپ کے لیے ایک نرس کی ہوگی۔" میں نے بھی شوخی سے کھلکھلاتے ہوئے جواب دیا۔

"سوچ لو پھر میں تمہیں بہت تنگ کروں گا۔" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"مثلاً!۔" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"مثلاً مثلاً یہ کہ نرس مجھے بستر سے اٹھا کر بٹھاؤ مجھ سے اٹھا نہیں جا رہا۔ نرس میرے سر میں درد ہو رہا ہے ذرا سر دبا دو۔ نرس میرا دل بہت گھبرا رہا ہے کوئی پیار بھری بات کرو وغیرہ وغیرہ۔"

"اچھا تو اسپتال میں آپ نرسوں سے یہ کام لیتے تھے۔" میں نے مصنوعی غصے کا اظہار کرتے ہوئے

آنکھیں نکالیں۔

"ارے ڈاکٹر ذیشان بھی بڑے ظالم تھے۔ انہوں نے میرے روم میں کسی نرس کی ڈیوٹی ہی نہیں لگائی۔ سارے میل نرس ہی آتے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ سرمئی نے منع کیا ہے کہ اسپتال کی کوئی بھی نرس اس کمرے میں آنے نہ پائے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے ہم تو اپنی سرمئی کی مرضی میں خوش ہیں۔" حشام نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

ہم باتیں کررہے تھے کہ خیال آیا کہ حشام کے لیے سوپ کا ٹائم ہوگیا ہے۔ میں نے آنٹی کو منع کردیا تھا کہ آپ تکلیف مت کیجیے گا حشام کے لیے سوپ میں خود بناؤں گی اس لیے حشام کے روکنے کے باوجود میں کمرے سے نکل آئی کچن میں آئی تو آنٹی وہاں پہلے سے موجود تھیں۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ کیوں کچن میں آئیں میں ہوں نا۔ تو وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

"میری جان ابھی تو تم اس گھر میں مہمان ہو۔ان شاء اللہ میرا احشام جلد ہی صحت یاب ہوجائے گا پھر میں تمہیں حشام کی دلہن بنا کر لے آؤں گی اور یہ سارا گھر تمہارے حوالے کرکے بےفکر ہوجاؤں گی۔"

آنٹی کی بات سن کر میں شرما گئی۔ حشام کی ساری شوخ باتیں میرے کانوں میں گونجنے لگیں۔ میرے چہرے پر شرم کی لالی دیکھ کر آنٹی ہنس پڑی اور محبت سے میری پیشانی چوم لی۔

اتنے میں طلال انکل بھی کچن میں چلے آئے۔ آنٹی کو اور مجھے دیکھا تو بولے۔ "بھئی اگر گرم چائے مل جائے تو بڑی مہربانی ہوگی۔"

"انکل آپ چلیں میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔" میں نے کہا۔

"نہیں بھئی چائے تو ہم تمہاری آنٹی کے ہاتھ ہی کی پیتے ہیں۔ چائے انہیں بنانے دو اور تم میرے ساتھ آؤ۔" انکل نے مجھے اشارہ کیا تو میں سمجھ گئی کہ وہ مجھ سے کوئی خاص بات کرنا چاہ رہے ہیں۔

"ٹھیک ہے انکل آپ چلیں میں سوپ چولہے پر رکھ کر آرہی ہوں۔" یہ سوپ مجھے اماں نے بنانا سکھایا تھا بہت لذیذ سوپ بنتا تھا۔

سوپ چولہے پر رکھ کر باہر آئی تو انکل نے اوپر سے آواز دی تو میں اوپر چلی گئی میں سمجھ گئی انکل اپنے اسٹڈی روم میں ہوں گے۔

وہاں کرنل مشتاق بھی موجود تھے۔ میں انہیں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ وہ جاچکے ہوں گے۔ مجھے حیران دیکھا تو بولے۔

"مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا تھیں اس لیے ابھی تک یہاں موجود ہوں۔"

"انکل آپ نے حشام کی سیکورٹی کا بندوبست تو اطمینان بخش کردیا ہے نا۔" میں نے پوچھا۔

"اس جانب سے تم بےفکر رہو اس کا خاطر خواہ انتظام ہے آصف کی ڈیوٹی بھی میں نے یہیں لگادی ہے عثمان البتہ تمہارے گھر پر ہی ہے۔"

"آصف کو آپ نے یہاں کیوں بلوالیا۔" میں نے پوچھا۔

"یہ اس کی خواہش تھی کہ تم جب تک یہاں ہو وہ بھی یہیں رہے گا بھئی تمہاری سیکورٹی اسے سونپی تھی اور پھر وہ تمہارا ڈرائیور بھی تو ہے۔" کرنل انکل نے ہنستے ہوئے کہا تو میں عجیب سی ہوگئی اور چھم سے میرے تصور میں آصف کی گہری اور بہت کچھ کہتی نگاہیں آگئیں۔ بے شک وہ میرا سیکورٹی گارڈ تھا لیکن مجھے اس کی موجودگی میں ایک الجھن سی رہتی تھی۔ وہ بہت گہری نگاہوں سے مجھے دیکھتا تھا اور ایک لڑکی ہونے کی حیثیت سے میں اس کی پیغام دیتی نگاہوں کا مفہوم سمجھتے ہوئے بھی انجان بنی رہتی۔ میرا خیال ہے کہ اسے اس بات کا اچھی طرح سے اندازہ تھا کہ میں حشام کے لیے کیا سوچتی ہوں۔ اس نے اس بارے میں ایک آدھ بار مجھ سے ایک دو سوال بھی کیے تھے جن کا جواب میں نے اسے نہیں دیا تھا اور اب کرنل انکل یہ بتارہے ہیں کہ وہ اپنی مرضی سے صرف میرے لیے یہاں آکر ٹھہر گیا ہے اور میں لاکھ چاہنے کے باوجود انہیں یہ کہہ نہیں سکی کہ آصف کو گھر واپس بھیج دیں۔

"کیا سوچ رہی ہو بیٹا۔" طلال انکل کی آواز میرے کانوں میں آئی تو میں اپنے خیالوں کے حصار سے باہر نکل آئی۔

"کچھ نہیں انکل ایسے ہی بس حشام کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ میں اس کے لیے سوپ چولہے پر رکھ کر آئی تھی وہ میرا انتظار کررہا ہوگا۔ آپ کوئی ضروری اور اہم بات بتانے والے تھے۔"

میں اپنے تمام تر خیالات جھٹک کر خیالات کی دنیا سے باہر نکل آئی۔

"میں نے ہی تمہیں طلال کے ذریعے بلوایا تھا وہ ضروری بات میں تمہیں بتانا چاہتا تھا۔ شمروز کے متعلق۔" کرنل انکل نے کہا تو میں پوری طرح ان کی جانب متوجہ ہوگئی۔

"جی...... جی...... بتائیے اور کیا اطلاعات ہیں ان کے بارے میں۔"

"شمروز دراصل ہم سب کو ڈبل کراس کررہا ہے تم تو جانتی ہو کہ میرا تعلق ایک حساس ایجنسی ہے اور میں اپنے اردگرد موجود لوگوں کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ جبکہ شمروز کے بارے میں تو ہمیں معلوم ہی تھا کہ وہ نواب سطوت کا بندہ ہے اور اس کے لیے کام کرتا ہے۔ معاف کرنا تمہیں شاید میری یہ بات اچھی نہ لگے کہ نواب سطوت چونکہ تمہارے والد ہیں اس لیے شاید تم نے اس انداز سے شمروز اور نواب سطوت کے بارے میں نہیں سچا کہ جس طرح میں نے سوچا۔"

کرنل انکل کا یہ جملہ سن کر میں بےچینی سے پہلو بدل کر رہ گئی۔ میں انہیں کچھ کہنا چاہتی تھی۔ چیخ چیخ کر بتانا چاہتی تھی کہ نواب سطوت کے لیے میرے دل میں ایک باپ کی حیثیت سے کوئی بھی نرم گوشہ نہیں ہے لیکن میں خاموش رہی اور ان کی بات کے مکمل ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"شمروز جس طرح ڈرامائی انداز میں تم سے آکر ملا حیرت کی بات یہ ہے کہ ایک خاتون کو جنہیں وہ ان کے دشمنوں سے بچانا چاہتا تھا ایک اجنبی ہوتے ہوئے تمہیں ہی کیوں اپنے پاس رکھنے کے لیے کہا۔ اتنے اہم کام کے لیے وہ ایک اجنبی شخص پر بھروسہ کیسے کرسکتا تھا۔ اس کا مطلب صاف ہے کہ وہ پوری پلاننگ کے ساتھ انہیں تمہارے سپرد کرکے گیا تھا پھر تمہارا بھائی بن گیا اور تمہیں اپنی نام نہاد مردہ بہن کا درجہ دے دیا اور تمہارے نزدیک آگیا۔ تمہارے دل میں اپنے لیے نرم گوشہ پیدا کردیا اور تمہارے ہی ذریعے اس کی رسائی حشام اور طلال تک ہوگئی۔"

"لیکن انکل اس شخص کی تصویر بھی شمروز بھائی نے ہی ہمیں دی تھیں جس نے حشام پر فائرنگ کی تھی۔" میں نے کہا۔

"تم خود سوچو اس کمرے میں جہاں نواب سطوت اور وہ شخص موجود تھا شمروز نے اس کی تصویر کس طرح کھینچ لی کیا نواب سطوت کو اور اس شخص کو اس بات کا علم نہیں ہوا ہوگا۔

اور اس کے ساتھ ساتھ وہ نواب سطوت کے بہت زیادہ اہم کام بھی انجام دے رہا ہے۔

میرے دست راست میرے دوست کرنل

احتشام نے مجھے شمروز کے بارے میں بتایا ایک مشکوک شخص ہے جس پر ہمیں شبہ ہے کہ وہ بھارتی لابی کے لیے کام کر رہا ہے اس کا نام قاری ممتاز ہے۔ وہ شخص ہندو ہے اور مسلمانوں کی مسجد میں امام بن کر بیٹھا ہے۔ اس مسجد کا پہلا امام پنجاب کے ایک شہر بھورے والا سے تعلق رکھتا تھا۔ اچانک وہ غائب ہوگیا اور اس کی جگہ اس شخص نے آ کر مسجد کا چارج سنبھال لیا یہ کہہ کر کہ وہ پنجاب جا کر بیمار ہوگیا ہے اور قاری ممتاز اس کا کزن ہے چند دنوں میں وہ صحت یاب ہو کر واپس آ جائے گا تو وہ واپس چلا جائے گا۔"

"تو کیا ہندو ہونے کے باوجود وہ شخص اسلام اور قرآن سے اس حد تک واقف ہے کہ مسجد میں امامت کر سکے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"مجھے حیرت ہے کہ تم یہ سوال پوچھ رہی ہو ہندوؤں کی بدنام زمانہ تنظیم "را" کے ایجنٹ ہمارے ملک کے تقریباً ہر شعبے میں گھسے ہوئے ہیں۔ وہ جس جگہ متعین کیے جاتے ہیں اس کی مکمل تعلیم ان کے پاس ہوتی ہے۔ کتنے ہی ہندو جو طالبان کے بھیس میں ہیں اور اسلام کے بنیادی عقائد کو اتنا سخت کر کے لوگوں کے آگے پیش کرتے ہیں کہ عام مسلمان بھی انہیں انتہا پسند اور برا کہتا ہے۔ یہ اس طرح کے جعلی دینی مدرسوں میں معصوم اور بے سہارا بچوں کا ذہن کسی سلیٹ کی طرح صاف کر کے ان کے ذہن میں یہ بٹھاتے ہیں کہ دنیا میں سارے لوگ گناہ کر رہے ہیں اور انہیں ان گناہ گار لوگوں کو مارنا ہے۔ چاہے ان کی جان چلی جائے اور اگر اپنی جان کا نذرانہ دے کر دنیا کے ان گناہ گاروں کو مار دیا تو وہ سیدھے جنت میں جائیں گے اور وہ معصوم ذہن خود کش بمبار بن جاتے ہیں ملک میں اس طرح کی دہشت گردی عام ہو چکی ہے۔"

"میں سمجھ گئی انکل، لیکن آپ شمروز بھائی کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے۔" میں نے ایک بار پھر بے چینی سے پہلو بدل کر پوچھا۔

"ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ قاری ممتاز پر ہماری ایجنسی کی نگاہ ہے ابھی چند دن قبل شمروز کو قاری ممتاز سے ملاقات کرتے اور اسے ایک لفافہ دیتے ہوئے دیکھا گیا ہے اور وہ وہ لفافہ قاری ممتاز کو دے کر فوراً آ گیا۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں اس کا تو صاف مطلب یہ ہوا کہ شمروز بھائی بھی......" میں بے قراری سے اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔

"کہو اسے بھائی، وہ تمہارا بھائی بننے کے لائق ہی نہیں ہے۔" کرنل انکل نے تیزی سے کہا۔

اس کے علاوہ تمہیں ایک اہم بات اور بتاؤں شمروز کے پیچھے بھی ہم نے اپنے بندے لگا رکھے ہیں۔ نواب کی کوٹھی کے علاوہ اس کا ایک ٹھکانہ اور ہے اس نے گلشن اقبال میں ایک فلیٹ کرائے پر لے رکھا ہے۔ قاری ممتاز سے مل کر وہ سیدھا اپنے اسی فلیٹ پر گیا تھا اس کے علاوہ اس نے سہیل ہاشمی کا قتل بھی کیا ہے اور اس بات کے تمام ثبوت بھی ہمارے ہاتھ لگ چکے ہیں۔"

کرنل انکل شمروز بھائی کے متعلق بہت کچھ بتا رہے تھے اور میرا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ میں شمروز بھائی کے متعلق ایسا سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ ملک دشمن عناصر کے ساتھ مل کر اس ملک کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔ کاش...... اے کاش کرنل انکل کو غلط فہمی ہوئی ہو۔ نہ جانے کیوں شمروز بھائی کے لیے میرے دل میں ایک حقیقی بھائی کے جذبات پیدا ہوگئے تھے۔ میں ان سے محبت کرنے لگی تھی اور پھر یکایک میرے دل میں ان کے لیے شدید نفرت کی لہریں اٹھنے لگیں اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تب کرنل انکل اٹھ کر میرے قریب آئے اور میرے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

"بیٹا! ہمیں اپنے ملک کی سلامتی کے لیے مل کر کام کرنا ہے تمہیں محبت اور نفرت کے ہر جذبے کو مٹا کر صرف اپنے ملک کے لیے سوچنا ہے۔ یہ ملک ہے تو ہم ہیں ورنہ یہ کچھ بھی نہیں۔"

"جی انکل۔" میں نے فوراً اپنا سر اٹھایا اور اپنے آنسو صاف کر لیے۔

شمروز بھائی کی اصلیت میرے لیے زبردست شاک کی کیفیت تھی۔ میں نے دل سے ان کو اپنا بھائی مانا تھا لیکن اب میں کیا کر سکتی تھی جو کچھ بھی کرنا تھا کرنل انکل ہی کو کرنا تھا۔ میں خاموشی سے اٹھ کر نیچے آ گئی کچن میں جھانک کر دیکھا آنٹی وہاں موجود نہیں تھیں۔ سوپ چولہے پر پک رہا تھا۔ یہاں آ کر میں نے جی بھر کر اپنے دل کی بھڑاس آنسوؤں کے ذریعے نکالی اور پھر ایک نئے عزم کے ساتھ اپنے آنسو صاف کیے اور کچن کی سنک میں جا کر اپنا چہرہ دھویا۔ دل میں شدت کے ساتھ دعا کی کہ شمروز بھائی کے ذریعے میرے حشام کو کوئی نقصان نہ ہو۔

سوپ تیار ہو چکا تھا میں نے پیالے میں نکالا اور چھوٹی ٹرے میں رکھ کر حشام کے کمرے کی جانب چل دی۔

اس وقت آنٹی اپنے کمرے میں نماز ادا کر رہی تھیں۔ میں سوپ لے کر پہنچی تو حشام بے قراری سے میرا منتظر تھا۔ مجھے دیکھ کر بچوں کی طرح منہ پھلا لیا کہ میں اتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں اور تم پتا نہیں کن کاموں میں بزی ہو۔

"میں سوپ تیار کر رہی تھی نا۔" میں نے سوپ کی ٹرے ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ اس کی نگاہ میرے چہرے پر پڑی تو بری طرح چونک پڑا اور بولا۔

"کیا ہوا ہے سرمئی؟"

"کیا مطلب، کیا ہوا ہے کچھ بھی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ تمہاری آنکھیں اور ناک کیوں سرخ ہو رہی ہیں ایسا لگ رہا ہے جیسے روتی رہی ہو۔" اس نے بغور میرے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے مشکوک لہجے میں کہا۔ "کیا کسی نے کچھ کہا ہے؟"

"میں کیوں روؤں گی اللہ نہ کرے۔ اب تو اللہ اللہ کر کے خوش ہونے کے دن آئے ہیں اور اس گھر میں جہاں ہر ایک کے دل میں میرے لیے صرف پیار، چاہت اور محبت ہے کوئی مجھے کیا کہہ سکتا ہے۔" میں نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اگر کسی نے کچھ نہیں کہا تو تمہارے رونے کی وجہ۔" اس نے اصرار بھرے لہجے میں پوچھا۔

"میں کیوں روتی پتا نہیں کیوں تمہیں یہ فضول خیال آ رہا ہے۔" میں نے دھیرے سے ہنستے ہوئے سوپ کا پیالہ اس کی جانب بڑھایا پھر بالوں کی ایک شریر لٹ جو بہت دیر سے مجھے تنگ کر رہی تھی اسے ہاتھ کی پشت سے پیچھے کرنے کی کوشش کی تو حشام نے ایک ہاتھ سے سوپ کا پیالہ تھام کر نیچے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے میرا ہاتھ تھام لیا پھر محبت بھری نگاہوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے اپنی انگلی کی پور سے میرے بالوں کی لٹ کو کانوں کے پیچھے کر کے مجھے کھینچ کر اپنے پاس بٹھا لیا اور بولا۔

"تمہارا چہرہ مجھ سے کہہ رہا ہے، تمہاری یہ جھیل جیسی متوالی آنکھیں کہہ رہی ہیں کہ جھیل سے بہت سا پانی بہا ہے۔ مجھے نہیں بتاؤ گی۔"

"ڈانٹو گے تو نہیں۔" میں نے جھٹ ایک بہانہ سوچ کر کہا۔ کیونکہ اصل بات میں فی الحال حشام کو بتانا نہیں چاہتی تھی۔

"نہیں۔" اس نے ایک محبت بھری دھیمی سی مسکان کے ساتھ کہا۔

"میں کچن میں کھانا بنانے لگی تھی پیاز کاٹی تھی اور وہاں گرمی بھی بہت تھی ان ہی ہاتھوں کو چہرے پر لگالیا تو مرچیں لگنے لگیں اور خود آنسو نکلے۔"

"تم کیوں کھانا بنانے لگی تھیں یہ تمہارا کام تھوڑی ہے خالہ زینب کہاں تھیں کیا آج وہ کام کرنے نہیں آئیں۔" اس نے پوچھا۔

"آئی ہیں بس میں کچن میں فارغ کھڑی تھی سوچا کچھ کام کرلوں۔" میں نے کہا۔

"ادھر آؤ بتاؤ کہاں کہاں مرچیں لگی تھیں۔" اس نے مجھے کھینچ کر خود سے قریب کرلیا اور میرے چہرے پر جھک آیا اس نے نرم اور گرم گرم لب میرے تپتے ہوئے چہرے پر محبت کی ٹھنڈی پھوار برسانے لگے۔ میں جیسے محبت کی اس برستی پھوار میں بے خودی ہونے لگی۔

اچانک ہی میں ہوش کی دنیا میں لوٹ آئی دروازے پر کھٹکا ہوا اور آنٹی اندر آگئیں۔ میں نے جھٹ سوپ کا پیالہ ہاتھ میں اٹھالیا اور حشام کی جانب چمچ بھر کر بڑھایا لیکن اس کی آنکھوں کا خمار دیکھ کر میری نگاہیں جھک گئیں اور چند لمحے کی کیفیت مجھے شرمسار کرگئی۔

"ارے یہ کیا بھئی اب تم اتنی بھی خدمت مت کرو۔ سوپ تو یہ خود پی لے گا۔ میری جان تمہیں بھی آرام کی ضرورت ہے دن رات بس حشام کی خدمت میں لگی رہتی ہو کہیں بیمار نہ پڑجانا۔" آنٹی نے کہا تو میں نے پیالہ حشام کی جانب بڑھادیا تو حشام میری جانب شوخ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"ممی آپ اس کو سمجھائیں یہ ایسی ایسی حرکتیں کیوں کرتی ہے۔ اس طرح تو میں بستر سے اٹھوں گا ہی نہیں۔"

"کیسی حرکتیں؟" میں نے بوکھلا کر کہا۔

"یہی تمہاری حد سے زیادہ خدمت گزاری اور کیا۔" آنٹی نے محبت سے کہا تو میں نے مصنوعی غصے سے حشام کو آنکھیں دکھائیں۔

"میرا خیال ہے بیٹا تم میرے کمرے میں جاکر تھوڑی دیر آرام کرلو۔ اتنی دیر میں حشام کے پاس بیٹھتی ہوں۔ زینب بی نے بھی کھانا تیار کرلیا ہے۔ وہ بھی نماز پڑھ لیں تو کھانا لگا دیتی ہیں کھانا کھا کر تم تھوڑی دیر سوجانا۔ پتا نہیں کتنی رات تک جاگتی رہی ہو بے آرامی کی وجہ سے تمہاری آنکھیں لال ہورہی ہیں۔" آنٹی نے کہا۔

"امی میں نے تو رات کو سرمئی کو نہیں جگایا بلکہ اس کی آنکھوں کی سرخی تو......!" حشام بولے تو میں نے جھٹ ان کی بات کاٹ کر کہا۔

"چھوڑیں نا آنٹی میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ نیند آئے گی تو جاکر سوجاؤں گی۔"

"جیتی رہو خوش رہو۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے میری جان کہ تمہاری موجودگی میرے لیے کتنی تقویت کا باعث ہے۔ حشام کی جانب سے تو میں بالکل بے فکر ہوں۔" آنٹی نے کہا اور پھر اٹھ کر چلی گئیں۔

سوپ پیتے ہوئے حشام مسلسل میری جانب شریر نگاہوں سے دیکھتے رہے اچانک ہی انہیں پھندا سا لگا اور وہ سوپ کا پیالہ رکھ کر کھانسنے اور سینے کو مسلنے لگے۔ میں گھبرا کر اٹھی اور حشام کا سینہ سہلاتے ہوئے روہانسے لہجے میں بولی۔

"کیا ہوگیا حشام گردن اوپر کریں۔"

اور حشام نے جھٹ میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مسکراتے ہوئے بولے۔ "گردن اوپر کیوں کروں تمہیں کیوں نہ دیکھوں۔"

ان کی آنکھوں میں شوخی اور شرارت دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ وہ ڈرامہ کررہے تھے لیکن مجھے ان کا اس وقت کا

یہ بے تکا مذاق بالکل بھی اچھا نہیں لگا اور میں نے آنسو بھری آنکھوں اور بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہ کیا حرکت کی ہے آپ نے اس طرح کھانسنے سے آپ کے زخموں کے ٹانکوں پر زور پڑ رہا تھا۔ اگر اللہ نہ کرے دوبارہ کچھ ایسا ویسا ہوجاتا تو۔" اور میری آنکھوں سے دو آنسو نکل پڑے۔

"ارے یہ کیا؟ میں مذاق کررہا تھا تمہیں اپنے نزدیک بلانے کے لیے۔" میرے اس طرح رونے سے حشام پریشان ہوگئے اور بیڈ سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے اور بولے۔

"دیکھو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میرے زخموں کے ٹانکے ہی بالکل خشک ہیں مجھے خود اپنا بہت خیال ہے۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ جلد از جلد اپنے سارے رکے ہوئے کام مکمل کرلوں۔ پھر بھی پلیز اگر تمہارا دل دکھا ہے تو پلیز مجھے معاف کردو۔" حشام نے میرے آگے اپنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے معصوم سی شکل بنا کر کہا تو مجھے ہنسی آگئی۔ میری کیفیت اس وقت کچھ اس طرح سے تھی کہ آنکھوں میں آنسو بھرے تھے اور لب مسکرا رہے تھے۔ حشام چند لمحے مجھے غور سے دیکھتے رہے پھر بولے۔

"اب تم خود ہی فیصلہ کرو اور پوری ایمانداری سے کہو اگر اس جیسا معصوم حسن ہر لمحے آنکھوں کے سامنے ہو تو بندہ کیا کرے۔ کس طرح اپنے جذبات پر قابو پائے۔" یہ کہتے ہوئے وہ بیڈ پر جاکر بیٹھ گئے اور میرا ہنس ہنس کر برا حال ہوگیا حشام مسکراتے رہے۔ ماحول پھر سے خوش گوار ہوگیا۔ تب حشام مجھے یکا یک بہت سنجیدہ دکھائی دیے اور بولے۔

"ہنسی مذاق اور دل لگی بہت ہوگئی سرمئی۔ میں اب ماشاء اللہ بالکل ٹھیک ہوں۔ پرفیکٹ ہوں میں نے تم سے اسپتال میں کہا تھا نا کہ مجھے تم سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔ میں نے اسی وجہ سے تم سے اسپتال میں رکنے کے لیے بھی کہا تھا لیکن پھر بابا کی ڈیتھ ہوگئی اور بات وہیں کی وہیں رہ گئی۔ آج جب میں بالکل ٹھیک ہوں تو تم سے بہت سی سنجیدہ باتیں کرنا چاہتا ہوں اور یہ امید بھی کرتا ہوں کہ تم میرے ہر سوال کا بالکل سچ سچ جواب دوگی مجھ سے کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہیں کروگی۔"

حشام کی باتیں سن کر میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور میں سمجھ گئی کہ وہ مجھ سے کون سی باتیں پوچھنے والے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں میں نے اس بارے میں طلال انکل سے بھی بات نہیں کی تھی کہ اگر حشام ابھی مجھ سے پوچھیں تو میں کیا جواب دوں۔ ہر بات انہیں بتانی تو تھی لیکن پتا نہیں یہ وقت ان باتوں کے لیے مناسب بھی ہے یا نہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ طلال انکل ابھی حشام کو ہر بات سے آگاہ کرنا مناسب سمجھتے بھی ہیں یا نہیں۔ میں خاموش بیٹھی تھی اور حشام غور سے میری جانب دیکھ رہے تھے مجھے سوچوں میں گم دیکھا تو بولے۔

"کیا مجھے سنانے کے لیے کوئی نئی کہانی کوئی نیا بہانہ تراش رہی ہو۔"

"نن...... نہیں تو...... مجھے کیا معلوم کہ آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں تو پھر یہ جانے بغیر میں کوئی بھی جھوٹ پہلے ہی سے کیسے گھڑ سکتی ہوں اور کیا آپ کو مجھ پر اتنا ہی اعتبار ہے کہ آپ مجھ سے کچھ پوچھیں گے اور میں آپ کے ساتھ غلط بیانی کروں گی۔" میں نے شکوہ کناں لہجے میں کہا۔

"تو پھر پوچھیں آپ کو کیا پوچھنا ہے۔" میں نے کہا۔ "بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ میں طلال انکل کو بلا کرلاتی ہوں بہتر یہی ہے کہ آپ ان ہی سے پوچھ لیں۔" میں نے اپنی جان چھڑانی چاہی۔

''اگر مجھے ان سے پوچھنا ہوتا تو پوچھ چکا ہوتا۔ میری یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ اگر تم لوگ مجھ سے ہر بات کس لیے چھپا رہے ہو۔'' حشام نے ہلکے سے برہم لہجے میں کہا۔

''آپ اسپتال میں تھے اور ڈاکٹر ذیشان کا یہ کہنا تھا کہ آپ سے کوئی بھی ایسی بات نہ کی جائے جس سے آپ کے ذہن پر زور پڑے۔ ہم تو آپ کی زندگی کی دعائیں مانگ رہے تھے حشام اور آپ ہماری اس وقت کی اذیت اور درد کا اندازہ کر ہی نہیں سکتے جو ہم نے گزاری ہے۔ ہمیں ہر شے سے بڑھ کر آپ کی زندگی عزیز تھی۔ ہر بات اور ہر کام کے لیے بہت وقت پڑا ہے زندگی باقی رہے تو سب کچھ ہو جاتا ہے۔'' میں نے ٹھہر ٹھہر کر حشام کو سمجھایا۔

''چلو مان لیتا ہوں کہ تم لوگوں نے جو کچھ بھی کیا ٹھیک کیا لیکن میں اتنا احمق نہیں ہوں کہ تم لوگوں نے مجھے لاعلم رکھا اور میں لاعلم رہا۔ میں سب کچھ دیکھ بھی رہا تھا اور سمجھ بھی رہا تھا لیکن اس کے باوجود بہت کچھ میری نگاہوں سے اوجھل ہے اب میں بالکل ٹھیک ہوں اور سب کچھ جاننا چاہتا ہوں۔ چلو شاباش اب تم مجھے شروع سے ہر بات بتاؤ۔'' حشام نے کہا اور اس سے پہلے کہ میں منہ کھولتی زینب بھی کمرے میں آ گئی اور بولیں۔

''چلیں سرمئی بی بی کھانا لگ گیا ہے آپ کھالیں سب آپ کا ٹیبل پر انتظار کر رہے ہیں۔''

''کرنل صاحب ہیں یا چلے گئے۔'' حشام نے زینب بی سے سوال کیا تو میں نے چونک کر حشام کی جانب دیکھا کہ انہیں اس بات کا علم کیسے ہوا کہ گھر میں کرنل مشتاق موجود ہیں۔ انہوں نے حشام سے ملاقات بھی نہیں کی۔

''وہ بھی ہیں صاحب نے انہیں کھانے پر روک لیا تھا۔ وہ کھانا کھا کر جائیں گے۔'' زینب بی نے جواب دیا اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔

''چلو میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔'' حشام نے بیڈ سے دونوں پاؤں نیچے اتارتے ہوئے کہا۔

''نہیں حشام آپ یہیں ٹھہریں کھانا کھانے کے بعد کرنل انکل کو آپ کے روم میں لے آؤں گی۔'' میں نے حشام کو روکتے ہوئے تیزی سے کہا۔

''تو پھر مجھ سے ایک وعدہ کرو کہ ڈیڈ یا انکل سے ابھی کوئی بات نہیں کرو گی۔'' حشام نے گہری سنجیدگی سے کہا تو میں نے وعدہ کر لیا اور پریشان ذہن کے ساتھ باہر نکل آئی۔

میں خاموشی سے آ کر ان سب کے درمیان بیٹھ گئی۔ میرا کھانے میں دل نہیں لگ رہا تھا سب ہی نے یہ بات محسوس کر لی۔ لیکن سوائے آنٹی کے کسی نے کچھ نہیں پوچھا۔ کھانا ختم ہوا تو آنٹی سبز چائے بنوانے کا کہنے کے لیے اٹھ کر کچن کی جانب چلی گئیں۔ تب انکل نے مجھے مخاطب کیا۔

''کیا بات ہے سرمئی بیٹی تم کچھ......!''

''انکل حشام ضد کر رہے ہیں کہ انہیں ہر بات تفصیل سے بتائی جائے میں ان سے وعدہ کر کے آئی ہوں کہ کھانے کے بعد میں آپ لوگوں کو ان کے کمرے میں لے کر آؤں گی۔'' میں نے انکل کا سوال سمجھتے ہوئے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے طلال کہ ہمیں اب حشام کو ساری باتیں بتا دینے میں کوئی حرج نہیں ہے وہ کوئی عام احمق انسان نہیں ہے جو سب کچھ جان کر بوکھلا جائے گا اور میں سمجھتا ہوں کہ جتنا بے خبر ہم اسے سمجھ رہے ہیں وہ اتنا بے خبر ہرگز نہیں ہے۔'' کرنل انکل نے طلال انکل سے کہا۔

''آپ بالکل ٹھیک سمجھے ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ حشام بہت کچھ جانتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

طلال انکل چند لمحے خاموشی سے سوچتے رہے پھر بولے۔ ''چلو ٹھیک ہے ہم حشام کے روم میں ہی چائے پیتے ہیں۔ پھر مجھ سے کہا کہ سرمئی تم خود چائے لے کر حشام کے کمرے میں آ جانا۔

''یار مجھے ایک ضروری میٹنگ میں شام چار بجے شرکت کرنی ہے۔'' کرنل انکل نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''تم نے مجھے زبردستی کھانے پر روک لیا تھا ورنہ میں جا چکا ہوتا۔''

''ارے آؤ نا یار ابھی ٹائم ہے تم چلے جانا فی الحال حشام کے پاس چلو۔ اگر تم نہیں گئے تو وہ پھر بے کار کا شک و شبہ کرے گا۔'' طلال انکل نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا تو کرنل انکل بھی اٹھ گئے اور یہ لوگ حشام کے کمرے کی جانب بڑھ گئے اور میں کچن میں چلی آئی زینب بھی چائے کے ٹی بیک پیالیوں میں ڈال کر گرم پانی ڈال رہی تھیں۔ میں نے جلدی جلدی لیمن کے پیس کاٹ کر پلیٹ میں رکھے اور چائے کی ٹرے سنبھال کر حشام کے روم میں آ گئی۔ ابھی تک کسی نے بات شروع نہیں کی تھی۔ ہم چائے کے ساتھ ساتھ ہلکی پھلکی باتیں کرتے رہے پھر میں نے جب بار بار حشام کی نگاہیں اپنی جانب اٹھتی ہوئی محسوس کیں تو کہا۔

''انکل حشام چاہتے ہیں کہ انہیں شروع سے لے کر آخر تک ہر بات تفصیل سے بتائی جائے۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' کرنل انکل جلدی سے بولے۔

''بیٹا وہ ڈاکٹر ذیشان۔'' طلال انکل نے اتنا ہی کہا تھا کہ حشام نے بے زار کن لہجے میں کہا۔

''میں، میں جانتا ہوں کہ آپ لوگوں کو ڈاکٹر ذیشان نے مجھے کوئی بھی ٹینشن والی بات کرنے سے منع کیا تھا لیکن اب تو میں گھر آ گیا ہوں۔ بالکل ٹھیک ہوں میں یہ بات جانتا ہوں کہ میرے جسم پر جو گولیاں لگی ہیں وہ اتفاقی حادثہ نہیں تھیں۔ بلکہ میں جو انتہائی حساس اور خفیہ رپورٹ تیار کر رہا تھا......!''

اتنا کہہ کر حشام رکے اور بولے۔ ''سرمئی تمہیں اور انکل آپ کو یقیناً ڈیڈی نے اس رپورٹ کے بارے میں بتا دیا ہوگا صرف اس کام سے مجھے روکنے کے لیے مجھے جان بوجھ کر نشانہ بنایا گیا تھا اور سرمئی مجھے امید ہے کہ تم نے اس بات کا بھی برا نہیں منایا ہوگا کہ میں نے اس رپورٹ کے بارے میں تمہیں نہیں بتایا۔ میں نے سوائے ڈیڈی کے کسی کو بھی نہیں بتایا تھا لیکن مجھے بہت سوچنے پر یہ شک ہوتا ہے کہ اس رپورٹ کے بارے میں رمضانی صاحب کو تھوڑا بہت علم تھا اور اس روز انہوں نے جان بوجھ کر صرف مجھے ہی کیوں اس مقام پر بھیجا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس روز کی وہ ویڈیو دیکھی جائے تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ مجھے جان بوجھ کر گولیوں کا نشانہ بنایا گیا ہے۔''

حشام خاموش ہوئے تو پھر طلال انکل، کرنل انکل اور میں نے باری باری ساری باتیں حشام کو بتا دیں۔ دوران گفتگو شمروز بھائی کا نام بھی آیا تب حشام نے چونک کر سوال کیا کہ شمروز بھائی کافی دنوں سے مجھ سے ملنے کے لیے بھی نہیں آئے تب کرنل انکل نے شمروز بھائی کی ساری باتیں بھی انہیں بتا دیں۔

اب تمام باتیں حشام کے علم میں آ چکی تھیں۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے سوچتا رہا پھر بولا۔

''مجھے بہت پہلے ہی نواب سطوت پر شک تھا کہ درپردہ یہ شخص را کے لیے کام کر رہا ہے یا پھر یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ لوگ کسی بھی طرح سے اس شخص کو استعمال کر رہے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رمضانی صاحب کو دھمکیاں دیں ہو یا پھر کوئی لالچ۔ انسان ہیں بہک گئے ہوں گے لیکن مجھے حماد کے بارے میں سن کر دکھ

ہوا مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ بھی رمضانی صاحب کے ساتھ مل کر یہ کام کررہا ہے۔"

"اب تم نے کیا سوچا ہے کیا کرو گے اپنی رپورٹ کو کمپلیٹ کرو گے؟" کرنل انکل نے پوچھا۔

"ظاہر ہے انکل! میں نے اس رپورٹ کو بنانے میں بہت محنت کی ہے اس کو یوں ہی ادھورا تو نہیں چھوڑا جاسکتا۔ لیکن شمروز بھائی جن سے مجھے امید تھی کہ وہ میرے بہت کام آسکتے ہیں لیکن آپ لوگ تو ان کے بارے میں کوئی اور ہی کہانی سنا رہے ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ اس دور میں انسان کس پر بھروسا کرے کسے اچھا سمجھے اور کسے برا۔ ویسے انکل شمروز کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے اسے اس طرح آزاد چھوڑ دیا جائے گا اور وہ نواب سطوت کے لیے کام کرتا رہے گا۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ آپ لوگ اس سے تعلق توڑ کر بڑی غلطی کررہے ہیں۔ ہم اس سے اس طرح ملتے رہیں گے جیسے پہلے ملتے تھے۔ یہ ظاہر ہی نہیں کریں گے کہ ہم اس کی اصلیت جان چکے ہیں اس طرح ہمیں اس کے ذریعے بہت سی کام کی باتیں معلوم ہوسکتی ہیں۔" حشام نے گفتگو کے دوران شمروز بھائی کے نام کے ساتھ لفظ بھائی کو ہٹا دیا۔ وہ صرف نام لے کر بات کررہا تھا۔

"تم یہ بات کیوں بھول رہے ہو کہ وہ ہمیں گمراہ بھی کرسکتا ہے بلکہ وہ ہمارے پاس آیا ہی اس لیے ہے کہ ہمیں غلط گائیڈ لائن مہیا کرے۔" کرنل انکل نے کہا۔

"اب یہ تو ہماری عقلوں پر منحصر ہے کہ ہم اس کی ہر بات پر آنکھیں بند کرکے نہ یقین کریں اپنی عقل اور اپنے ذرائع بھی استعمال کریں اور صحیح بات کی تہہ تک پہنچیں۔" حشام نے کہا۔

"تو پھر کیا کیا جائے۔" طلال انکل نے کرنل انکل کی جانب دیکھا اور پوچھا۔

"ابھی فی الحال جیسا چل رہا ہے چلنے دو۔ شمروز آج کل بڑے زور و شور سے نواب کے کام کررہا ہے ہم پوری طرح اس پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔" کرنل انکل نے کہا اور ایک بار پھر اپنی کلائی پر بندھی ہوئی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اچھا بھئی فی الحال آپ لوگ مجھے اجازت دیں۔ میں لیٹ ہورہا ہوں۔" اور وہ چلے گئے۔ تب طلال انکل مجھ سے مخاطب ہوئے اور بولے۔

"میرا خیال ہے سرمئی بیٹا آپ بھی کچھ دیر کے لیے آرام کرلو میں حشام کے پاس ہوں۔" میں سمجھ گئی کہ انکل حشام سے کچھ اور ضروری باتیں کرنا چاہ رہے ہیں۔ جن کے لیے شاید میری غیر موجودگی ضروری ہے۔ میں بنا تردد اٹھ کر جانے لگی تو انکل نے پیچھے سے آواز لگائی۔

"اپنی آنٹی کے کمرے میں جانا۔ ذرا ان کا بھی دل بہلا دینا۔" مطلب یہ تھا کہ فی الحال آنٹی کو بھی یہاں نہیں آنے دینا ہے۔ میں آنٹی کے پاس آگئی اور ان کے ساتھ بیڈ پر لیٹ کر باتیں کرنے لگی اور پھر خود بخود میری آواز دھیمی ہوتی چلی گئی اور میں نیند میں چلی گئی۔

......☆☆......

صبح حسب معمول میری آنکھ فجر کے وقت کھل گئی۔ میں نے گھڑی میں ٹائم دیکھا سورج طلوع ہونے میں ابھی تھوڑا ٹائم تھا۔ میں وضو کے ارادے سے بستر سے اترا اور اچانک ہی مجھے شازلی کا خیال آگیا میری نگاہ صوفے کی جانب اٹھی جو شازلی کے وجود سے خالی تھا۔

رات کو جو کچھ بھی ہوا مجھے خواب کی مانند معلوم ہو رہا تھا۔ بزرگ بالکل ٹھیک کہتے ہیں کہ اگر بندہ دل سے اپنے کسی گناہ کی سچی توبہ کرے تو اللہ پاک آئندہ اسے اس گناہ میں مبتلا ہونے سے ضرور بچاتا ہے اور

رات میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا کہ رات کو شازلی جو شیطانی ارادہ لے کر میرے پاس آئی تھی اس سے اللہ ہی نے مجھے بچایا۔ ورنہ میں تو ایک گناہ گار بندہ ہی ہوں۔ میں نے شازلی کے بارے میں رات ہی فیصلہ کرلیا تھا۔ فی الحال آج تو مجھے نواب کے ساتھ ہر جانی جانا تھا۔ وہ مجھے کسی سے ملوانا چاہتا تھا پتا نہیں کسی سے اور کس لیے۔

دن کی روشنی ہلکی ہلکی محسوس ہونے لگی تھی لیکن نماز فجر کا ٹائم باقی تھا میں نے فی الحال ہر قسم کے خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا اور وضو کے لیے باتھ روم کی جانب بڑھ گیا۔

نماز کے بعد میں نے پوری توجہ دعا کی جانب لگا دی۔ گڑگڑا کر اللہ سے اپنے کبیرہ گناہوں کی توبہ کی اور یہ بھی التجا کی کہ اللہ مجھے میرے نیک مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے۔

یہ حقیقت ہے دلوں کو سکون صرف اللہ کے ذکر ہی سے ملتا ہے۔ اس بات کا شدت کے ساتھ اب مجھے احساس ہوتا ہے کسی نے جب ایک عالم سے یہ سوال پوچھا کہ جناب جب ہمارے اوپر مصائب اور مشکلات پے در پے آنا شروع ہوجائیں اور ہم کسی طور ان سے نہ نکل پائیں تو کیا ہم یہ سمجھیں کہ یہ اللہ تعالیٰ ہمیں ہمارے گناہوں کی سزا دے رہا ہے یا پھر بعض اللہ کے نیک بندوں پر بھی مشکلات اور مصائب کے دروازے کھل جاتے ہیں تو کیا وہ ان کی آزمائش ہوتی ہے۔ عالم نے جواب دیا کہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ یہ بات سمجھنے کی ہے کہ ہم اس بات میں فرق کرسکیں کہ اللہ کا عذاب کیا ہے اور آزمائش کیا ہے تو سائل نے پھر پوچھا کہ حضرت ہم اپنے مصائب اور مشکلات میں گھرنے کے بعد کس طرح یہ معلوم کرسکتے ہیں کہ اللہ ہمیں عذاب یا سزا دے رہا ہے یا ہماری آزمائش کررہا ہے۔ تو عالم نے فرمایا۔ اگر بندہ مصائب میں مبتلا ہونے کے بعد اپنے رب کے مزید نزدیک ہوجاتا ہے اللہ سے توبہ کرتا ہے اسی سے مدد مانگتا ہے تو وہ مصائب اس کے لیے آزمائش ہیں اور اگر بندہ مصائب اور مشکلات سے گھبرا کر غیر اللہ یا شیطان کا دامن تھام لیتا ہے تو وہ اس کے لیے عذاب اور سزا ہے۔"

میں نے بھی جب اپنی سابقہ زندگی کا جائزہ لیا تو مجھے یہ دکھائی دیا کہ میں مصائب سے گھبرا گیا اور ان شیطان صفت لوگوں کے دامن میں پناہ ڈھونڈ لی اور یہ سمجھا کہ یہ لوگ میری مدد کریں گے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں مزید گناہوں کی راہوں پر چل نکلا وہ گناہ کبیرہ جن کا کبھی کرنے کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا مبتلا ہوگیا لیکن شاید یہ میری ماں کی کبھی دی ہوئی میرے لیے دعائیں ہی تھیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس بات کا احساس دلا دیا اور میں نے اس کی رحمت کا دامن تھام لیا۔

میرے لیے دونوں ہی طرح کی صورت حال رہی۔ عذاب بھی اور اب آزمائش اب میں اللہ سے دعا کرتا رہتا ہوں کہ وہ مجھے بچالے۔

میں نے چادر سمیٹ کر رکھی میرے پاس جائے نماز نہیں تھی اس لیے نماز کے لیے میں نے ایک صاف چادر رکھی ہوئی تھی۔ اسے بچھا کر نماز پڑھ لیتا تھا چادر میں نے الماری میں رکھی اور دوبارہ سونے کے لیے لیٹ گیا۔ دل اور زبان سے استغفار کا ورد کرتے کرتے نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

دن کے گیارہ بجے میرے فون کی بیل سے آنکھ کھلی۔ نمبر دیکھا تو نواب کا تھا۔ میں نے نیند کے خمار سے بوجھل بھاری آواز میں ہیلو کہا۔

"رات کا خمار لگتا ہے ابھی تک اترا نہیں سو رہے تھے؟" نواب کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''جی سر۔'' میں نے بلاسوچے سمجھے کہہ دیا۔

''کہو میرا تحفہ پسند آیا؟'' اس نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''انعام دینے والی جب آپ جیسی ہستی ہوگی تو انعام تو خود بخود قیمتی ہو جاتا ہے۔ بہت ہی نایاب ہیرا تھا میں نے ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔'' میں نے پوری طرح اپنے حواسوں میں آتے ہوئے کہا۔

''بہت اچھی بات ہے تم خوش ہوئے تو ہم بھی خوش ہیں۔'' اس نے دھیرے سے ہنستے ہوئے کہا نہ جانے کیا بات تھی کہ مجھے اس کا موڈ بہت ہی خوش گوار لگ رہا تھا۔

''تھینک یو سر۔'' میں نے جھینپی جھینپی ہنسی کے ساتھ کہا۔

''اچھا اب ٹافٹ تم بستر سے اٹھ کر فریش ہو جاؤ ناشتا کرو اور میرے روم میں آ جاؤ تمہارے پاس صرف آدھا گھنٹہ ہے میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' نواب نے جھٹ حکم صادر فرما دیا۔

''اوکے سر۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے شاور لیا اور باہر آیا تو میرا ناشتا ٹیبل پر رکھا تھا۔ میں نے ڈٹ کر ناشتہ کیا دو بوائل ایگ، لیے سلائس اور دودھ کا گلاس لیا۔ پھر میں نواب کے کمرے کی جانب چل دیا۔ میں نے اپنی تیاری میں صرف پچیس منٹ لیے تھے۔ رات کو نہ جانے نواب کس وقت کوٹھی میں آیا تھا تلاش کے مرحلے سے فارغ ہو کر میں نے نواب کے کمرے کے دروازے پر دستک دی اور اجازت ملنے پر اندر داخل ہو گیا۔ میری صورت دیکھتے ہی نواب چہک کر بولا۔

''بہت فریش لگ رہے ہو۔''

اب میں اسے کیا کہتا مسکرا کر سر جھکا لیا حالانکہ میرے چہرے پر اسے جو فریشنس دکھائی دے رہی تھی وہ میری پرسکون نیند پوری ہونے کی وجہ سے تھی۔

''تو پھر چلیں؟'' اس نے پوچھا۔

''آئی ایم ریڈی۔'' میں نے کہا اور اس کے ساتھ باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

میں پہلی مرتبہ نواب کے ساتھ اس کے برابر میں اس کی گاڑی میں بیٹھا تھا۔ راستے میں نواب ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا اس شخص کے متعلق اس نے کوئی بات نہیں کی جس سے ملوانے کے لیے وہ مجھے لے جا رہا تھا۔

ہم اس کے روحانی مرکز پہنچ گئے گاڑی نے ہمیں اسی خاص جگہ جا کر اتارا جہاں پہلے اس سے جا کر ملا تھا یہ اس وسیع و عریض چار دیواری میں بنا ہوا ایک بنگلہ تھا اور اس بنگلے میں صرف وہی شخص داخل ہو سکتا تھا جس کو نواب اجازت دے۔ حد یہ کہ یہاں کے ملازم اور گارڈز بھی بہت خاص تھے اور شاید نواب کے بہت قابل اعتماد بھی۔

ہم یہاں ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے تقریباً پانچ منٹ بعد ہی ایک جوان سا شخص تقریباً میرا ہم عمر روم میں داخل ہوا اور دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر اور سر کو تعظیماً نواب کے آگے جھکا کر اس نے پہلے نواب سے مصافحہ کیا پھر سیدھا ہو کر ایک جانب بیٹھ گیا۔ نواب نے میری جانب اشارہ کر کے اس شخص سے کہا۔

''یہی ہے وہ انمول ہیرا شمروز۔ جس کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا اور شمروز۔'' یہ کہہ کر وہ میری جانب مڑا اور بولا۔

''یہ ہیں میرے مرید خاص اور دوست بھی کہہ سکتے ہو رئیس خان صاحب۔ دبئی میں ان کا بہت بڑا کاروبار ہے لیکن پاکستان ان کا آنا جانا لگا رہتا ہے میں نے انہیں تمہارے بارے میں بتایا تو انہیں تم سے ملنے کا اشتیاق ہو گیا میں نے کہا کہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔''

نواب یہ کہہ کر خاموش ہوا تو میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ وہ بہت غور سے میری

جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھے اتنی غور سے دیکھ رہا تھا کہ اسے میرا بڑھا ہوا ہاتھ بھی دکھائی نہیں دیا۔

''مجھے آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔'' میں نے ذرا سا گلا کھنکار کر اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

''نواب صاحب نے مجھے آپ کے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے اور یہ بھی کہ آپ کوالیفائیڈ ڈاکٹر ہیں حیرت ہے۔ آپ ڈاکٹری جیسے معزز پیشے کو چھوڑ کر اس جانب کیسے آ گئے؟'' اس نے چونک کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا اور میرا بڑھا ہوا ہاتھ گرم جوشی سے تھام کر بولا۔

رئیس خان کے اس جملے پر میں نے نواب کی جانب کن اکھیوں سے دیکھا تو مجھے اس کے چہرے پر ہلکی سی ناگواری کے آثار دکھائی دیے۔

''دراصل نواب صاحب کی سحر انگیز شخصیت میں اتنی زیادہ کشش ہے کہ ہم بھی ان سے دور نہ رہ سکے اور کھنچے چلے آئے خود بخود۔'' میں نے نواب کی مسکا پاش کرتے ہوئے دھیرے سے ہنس کر کہا تو نواب کے لب بھی مسکرانے لگے۔

''یہ تو آپ نے بالکل بجا کہا اپنا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔'' اس نے کہا پھر مجھے اپنے ساتھ لیتے ہوئے دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد نواب نے کہا۔ ''شمروز رئیس خان صاحب تم سے کوئی کام لینا چاہتے ہیں اور انہیں امید ہے کہ جس طرح تم نے بہت احتیاط اور ہوش مندی سے میرے گزشتہ کام انجام دیے ہیں انہیں بھی اسی طرح ہوشیاری سے انجام دو گے بولو کرو گے ان کا کام؟''

نواب نے مسکراتے لبوں لیکن تیز نگاہوں سے میری جانب دیکھ کر کہا۔ اس کا لہجہ ایسا تھا کہ وہ مجھ سے میری مرضی پوچھ رہا تھا لیکن درحقیقت وہ مجھے حکم دے رہا تھا اور حکم بھی ایسا جس کی حکم عدولی ناممکن ہے۔

''آپ حکم کریں نواب صاحب، بندہ تو آپ کا بے دام غلام ہے۔ جو آپ کہیں جیسا آپ چاہیں۔'' میں نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی دل میں شدت سے اللہ کو پکارا کہ یا اللہ یہ شخص مجھ سے کسی اور شخص کی جان لینے کی بات نہ کرے۔

''دیکھا رئیس خان۔'' اس نے فخریہ لہجے میں رئیس خان کو مخاطب کیا۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ شمروز تمہارے کام کے لیے انکار قطعی نہیں کرے گا۔''

''کام کی نوعیت کیا ہے؟'' میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کہا۔

''یار اپنا ایک ساتھی یا دوست سمجھ لو اشرف علی نام ہے اس کا میرے ساتھ دبئی میں بزنس کرتا تھا پھر کسی کاروباری مسئلے پر ہمارا اختلاف ہو گیا۔ وہ مجھ سے ناراض ہو گیا۔ اب بزنس الگ کرنے کی بات کر رہا ہے اگر میں نے اس کا پیسا اپنے کاروبار سے نکال دیا تو میرا کافی نقصان ہو جائے گا اور میں چاہتا ہوں کہ وہ ایسا نہ کرے اس لیے میں نے اس سے ناراضی ختم کر کے ساری بات ختم کرنے کا کہا اور یہ بھی کہا کہ وہ بزنس سے علیحدگی اختیار نہ کرے لیکن اس پر تو علیحدگی کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔ اب جبکہ وہ سیدھی طرح نہیں مان رہا تو میں نے ذرا دوسرے طریقے سے اسے باز رکھنے کی کوشش کی ہے اس کی کچھ کمزوریاں ہیں میرے پاس۔ تمہیں صرف اتنا کرنا ہے کہ اسے جا کر ایک لفافہ دینا ہے اور اس سے صرف ایک جملہ کہنا ہے کہ ''کمل راؤ آج کل بہت بیمار ہے۔'' جواب میں وہ یقیناً تم سے کہے گا کہ ''کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤ وہ ہارٹ اسپیشلسٹ ہے۔'' بس پھر تم یہ لفافہ اس کے

حوالے کر دینا اور فوراً واپس آ جانا۔ لفافہ کھول کر جب وہ دیکھے گا تو فوراً مجھ سے رابطہ کرے گا۔

تمہارا کام صرف اتنا ہے مجھے امید ہے کہ اپنے گزشتہ کاموں کی طرح تم اس کام کو بھی بھول جاؤ گے۔"

"آپ کو یہ سب کہنے کی ضرورت نہیں ہے مجھے اچھی طرح سے معلوم ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے آپ بس اتنا بتادیں کہ لفافہ کب اور کس جگہ پہنچانا ہے۔" میں نے کسی کے قتل کا حکم نہ ملنے پر سکون کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"یہ کام تمہیں کل رات کرنا ہے ٹھیک رات گیارہ بجے تمہیں وہاں پہنچنا ہے لفافہ اسے دے کر تم اپنے فلیٹ پر چلے جانا لفافہ اشرف علی تک پہنچ گیا ہے یہ مجھے اس کے فون سے ہی پتا چل جائے گا۔" رئیس خان نے کہا۔

"یہ تو کوئی مشکل کام نہیں ہے آپ کسی اور کے ذریعے بھی یہ لفافہ اشرف علی کو پہنچا سکتے ہیں پھر اس کام کے لیے میرا ہی انتخاب کس لیے؟" میں نے کہا تو نواب نے مجھے تیز اور ناگوار نگاہوں سے گھورا پھر بولا۔

"شمروز تم بھول رہے ہو کہ میں نے تمہیں کسی بھی قسم کے سوال کرنے سے منع کیا ہے۔"

"سوری سر! بس ایسے ہی یہ میرے منہ سے نکل گیا۔" میں نے معذرت کی تو نواب اور رئیس خان ایک دوسرے کی جانب معنی خیز نگاہوں سے دیکھنے لگے تب میں نے کہا۔

"اچھا تو پھر وہ لفافہ آپ میرے حوالے کر دیں۔ میں ان شاء اللہ کل رات گیارہ بجے آپ کے مطلوبہ شخص کو پہنچا دوں گا اور ہاں آپ نے مجھے ایڈریس تو بتایا ہی نہیں۔" میں نے کہا۔

"وہ لفافہ کل رات تمہیں نواب صاحب دے دیں گے میں تو بس تم سے ملنا چاہ رہا تھا نواب صاحب نے تمہاری اتنی تعریف جو کی تھی۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو پھر مجھے اجازت ہے۔" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں تم جاسکتے ہو۔ پارکنگ ایریا میں محسن نامی ایک شخص ہے اس سے کہنا کہ تمہیں واپس جانا ہے تو وہ تمہیں چھوڑ آئے گا میں ابھی یہیں رکوں گا۔" نواب نے کہا۔

چلنے سے پہلے میں نے ایک بار پھر رئیس خان سے ہاتھ ملایا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ میں باہر آ کر چند قدم چلا اچانک میری چھٹی حس نے میرے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک دیا۔ میں نے لمحہ بھر میں نگاہیں دوڑائیں اور کمرے کے باہر موجود گارڈز کو دیکھا جو گیلری کے سرے پر موجود تھے گویا جس وقت روم میں نواب اپنے مہمانوں سے محوِ گفتگو ہو گارڈز بھی دروازے سے دور ہٹ جاتے ہیں۔

میں تیزی سے ساتھ پیچھے ہٹا اور دیوار کے ساتھ لگ کر زمین پر یوں بیٹھ گیا جیسے میرے جوتے میں کوئی پرابلم ہوگئی ہو میرے کان اندر سے آنے والی آوازوں پر لگے تھے۔

نواب اور رئیس خان باتیں کر رہے تھے میرے پاس بہت کم ٹائم تھا گارڈ مجھے پرابلم میں مبتلا دیکھ کر قریب آسکتا تھا اور اگر وہ آ کر مجھ سے کوئی سوال کرتا تو نواب اور رئیس خان کو پتا چل جاتا کہ میں دروازے کے باہر موجود تھا اور میں نے ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی ہے۔

میں نے اپنے جسم کے روئیں روئیں کو سماعت بنا دیا۔ دونوں کے درمیان انتہائی اہم بات ہوئی تھی اور

یہ میرے اللہ کا کرم تھا کہ اس نے مجھے یہ باتیں سنوادیں ورنہ تو مجھے رئیس خان کی بیان کردہ اس جھوٹی کہانی کا یقین آ گیا تھا۔

میں ابھی مزید آگے کی باتیں سنتا لیکن گارڈ کی نگاہ میرے اوپر پڑ گئی اور وہ میری جانب آنے لگا تو میں فوراً اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور تیز تیز قدموں سے اس کی جانب بڑھنے لگا۔ میں نے کوشش کی کہ میرے چلنے سے چاپ کی آواز نہ ابھرے۔

گارڈ نے جب مجھے آتا دیکھا تو وہ وہیں رک گیا نزدیک پہنچنے پر بولا کہ۔ "کوئی مسئلہ ہے کیا۔" میں نے چلتے ہوئے جواب دیا کہ جوتا پرابلم کر رہا تھا اور اپنی چال میں ذرا سی تبدیلی کرلی۔

پھر میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا پارکنگ ایریا میں آ گیا اور وہاں موجود ایک شخص سے محسن کے بارے میں پوچھا اس نے جواب دیا کہ وہی محسن ہے تو میں نے کہا کہ نواب صاحب کا حکم ہے کہ مجھے ان کی کوٹھی پر چھوڑ آؤ۔ اس نے کوئی سوال نہیں کیا اور سر ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ایک کرولا کار لے آیا اور میرے نزدیک لا کر روک دی۔ میں پچھلا دروازہ کھول کر اس میں بیٹھ گیا تو اس نے کار چلا دی اور میں نے اپنا سر سیٹ کی پشت گاہ سے ٹکا کر اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

ابھی کچھ دیر قبل میں نے نواب اور رئیس خان کی گفتگو سنی تھی اس نے میرا دل و دماغ اڑا کر رکھ دیا تھا۔ اگر وہ کمبخت گارڈ میری جانب نہ آتا تو میں مزید اہم باتیں سن سکتا تھا۔

اب میری سمجھ میں بہت کچھ آ رہا تھا۔ اس سے پہلے بھی نواب نے قاری ممتاز تک میرے ذریعے ایک لفافہ پہنچایا تھا اور اس کے ساتھ بھی کوڈ ورڈ کا تبادلہ ہوا تھا اب یہ ایک اور لفافہ مجھے دیا جا رہا ہے جو کسی اشرف علی نامی شخص تک مجھے پہنچانا تھا مجھے اس بات کا علم ہو چکا تھا کہ اشرف علی اس شخص کا اصلی نام نہیں ہے۔ کمل راؤ ہی اس شخص کا اصلی نام ہے اور یہی نام کوڈ ورڈ بھی تھا جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے کہ وہ شخص مسلمان نہیں ہے ہندو ہے اور کسی ہندو کے ساتھ اتنے خفیہ انداز میں کسی چیز کا لین دین اور پھر پاکستان میں تو ہر مذہب اور قوم کے لوگ رہتے ہیں۔ پھر اس شخص نے اپنی شناخت کیوں چھپائی۔ مجھے خیال آیا کہ قاری ممتاز بھی مسلمان نہیں ہوگا۔

یا اللہ یہ کون لوگ ہیں اور ہمارے ملک میں اپنی شناخت چھپا کر خفیہ طور پر رہنے کا ان کا کیا مقصد ہے؟ رئیس خان کون ہے؟ یہ ان کے لیے کس قسم کے کام کر رہا ہے۔ پھر مجھے شازلی کا خیال آیا پہلی بار اس کے منہ سے میں نے یہ نام سنا تھا نواب نے رئیس

عظمت

کوئی اپنے ساتھ شرافت اور ذلالت لے کر پیدا نہیں ہوتا۔ جسے جیسا ماحول ملتا ہے۔ وہ اس سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ پھر اگر برے اور بھلے میں فرق جاننے کے بعد برا شخص شریفانہ زندگی گزارنا چاہے تو کیا اسے اس کا حق نہیں پہنچتا یا جو برا ہے برا ہی رہے گا۔ ہم کیوں اپنی شرافت پر ناز کریں۔ جب ہمارے اندر یہ احساس بھی نہیں کہ کسی بگڑے ہوئے کو شرافت کا درس دیں یا کسی بھٹکے ہوئے کو راہ دکھائیں۔ پُرسکون لہروں پر تیرتی ہوئی کشتی کو تو سب ہی کناروں پر لے آتے ہیں مگر عظمت تو اسی میں ہے کہ بھنور میں ہچکولے کھاتی ناؤ کو ساحل پر لایا جائے۔

(مس ارم نور ارما...... کراچی)

خان کا دل بہلانے کے لیے ہی شازلی کو بھیجا تھا۔
میں بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ پرواز کرتے کرتے میری سوچ مہہ وش تک جا پہنچی اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا شوہر ایک بزنس مین ہے وہ دبئی سے کراچی اپنے روحانی باپ اور پیر سے ملنے کے لیے آیا ہے مہہ وش کو اس نے ہوٹل میں ٹھہرایا تھا جبکہ وہ خود اس پیر کے پاس گیا ہوا ہے۔
جس وقت مہہ وش مجھے یہ سب بتا رہی تھی اس وقت مجھے ایک لمحہ کو یہ خیال آیا تھا اور میں نے اس سے اس پیر کے بارے میں پوچھا تھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔
پھر میں دماغ پر زور دینے لگا کہ مہہ وش نے مجھے اپنے شوہر کے بارے میں بتایا تھا کہ نہیں پھر یاد آیا کہ اس نے اپنے شوہر کا نام بتایا تھا پھر مجھے یاد آ گیا......ہاں......!
اور میں ایک دم آنکھیں کھول کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا مہہ وش نے اپنے شوہر کا نام رئیس خان ہی بتایا تھا۔
او مائی گاڈ! میں نے اپنا سر اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ مہہ وش اس مشتبہ شخص کی بیوی ہے اس نے اس شک کا اظہار بھی کیا تھا کہ شاید وہ کچھ غیر قانونی کام کرتا ہے۔
میرا شدت سے جی چاہا کہ میں مہہ وش سے ملوں اور اس کے شوہر کے بارے میں مزید معلومات حاصل کروں۔ لیکن مہہ وش نے مجھ سے میرا نمبر تو لے لیا تھا لیکن اپنا نمبر نہیں دیا تھا اور اب تو میرا وہ نمبر بھی میرے پاس نہیں رہا اس کا مطلب تو یہ ہے کہ مہہ وش ایک بار مجھے مل کر دوبارہ مجھ سے گم ہو گئی ہے۔ کم از کم مجھے اتنی امید تو تھی کہ کبھی خود ہی وہ مجھ سے بات ضرور کرے گی لیکن اپنا نمبر مجھے نہ دینے کی احتیاط اس نے کس لیے کی۔ اسے رئیس خان سے کیا خطرہ تھا۔ میرے ذہن میں بہت سے سوالات آ رہے تھے لیکن جواب ایک کا بھی میرے پاس نہیں تھا۔
محسن کار ڈرائیور کرنے کے ساتھ ساتھ مسلسل مجھے واچ کر رہا تھا بے اختیار پوچھ بیٹھا۔
”کیا بات ہے صاحب! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“
”ہوں۔“ میں نے مختصر جواب دیا اور دوبارہ اپنا سر سیٹ کی پشت گاہ سے ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔
مجھے پتا ہی نہیں چلا اور نواب کی کوٹھی آ گئی کار جب رکی تو میں نے اپنی آنکھیں کھولیں اور خود کو کوٹھی کے گیٹ پر پا کر کار سے اتر آیا۔
اپنی شناخت کروا کر میں نے گیٹ کھلوایا اور اندر داخل ہو گیا۔ میں سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا۔ دروازہ بند کیا اور جوتوں سمیت بیڈ پر دراز ہو گیا۔ میں نے کمرے کی لائٹ آن نہیں کی کیونکہ میرا یہ ماننا ہے کہ باہر اگر اندھیرا ہو تو اپنے اندر کی آنکھ روشن ہو جاتی ہے اور وہ ہمیں وہ کچھ دکھاتی ہے جو عام طور پر لاکھ روشنی ہونے پر بھی ہم نہیں دیکھ پائے۔
میرا دماغ اور دل چیخ چیخ کر مجھ سے کہہ رہا تھا کہ رئیس خان اور نواب دونوں پاکستان میں سرگرم انڈیا کی دہشت گرد تنظیم را کے آلہ کار ہیں اور مجھے لاعلم رکھتے ہوئے ان لوگوں نے مجھے بھی اس کام میں ملوث کر لیا ہے۔
میں نے نواب اور رئیس خان کی جو گفتگو سنی تھی وہ یہ تھی۔ نواب نے رئیس خان سے پوچھا کہ ”کمل راؤ نے اس کام کے عوض کیا دینے کا کہا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ کیا معاوضہ طے ہوا ہے؟“ رئیس

خان نے جواب دیا۔
”دو کروڑ روپے نقد، اسلام آباد کا ایک ہوٹل اور پچاس ہزار ڈالر۔“
”گڈ۔“ نواب نے ایک سرمست قہقہہ لگایا۔
”اس میں میرا حصہ کتنا ہوگا۔“
”سر آپ اس میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیں باقی یہ سوچیں کہ خود میرا کتنا مال خرچ ہوا ہے۔ دوسری پارٹی پر بھی میرا ٹھیک ٹھاک پیسا لگ گیا ہے۔ بیس لاکھ تو اس الو کی پٹھی نے لیے ہیں۔ چالیس پچاس لاکھ اس بندے کے ہیں پھر میرا رسک بھی تو دیکھیں۔“ رئیس خان نے کہا۔
”اور میرا کوئی کام نہیں ہے ایک ان نون لیکن قابل اعتبار بندہ تمہیں دیا ہے نہ تو اسے شک ہوگا کہ اس کے ذریعے کیا کام کروایا گیا ہے اور نہ ہی خود اس کی ذات پر کسی کو شک ہوگا۔ اگر شمروز کو ان کا غذات کے بارے میں معلوم ہو گیا تو سوچو میں تو پھنس گیا نا گردن تک۔“ ویسے تم نے اس شخص کو چالیس پچاس لاکھ روپے کچھ زیادہ نہیں دے دیے میرا خیال ہے کہ اس سے کم میں کام چل جاتا۔“ نواب نے کہا۔
”کیا بات کر رہے ہیں نواب صاحب۔ اتنے پیسوں میں بھی وہ مشکل سے ہی راضی ہوا ہے۔ اس کی ڈیمانڈ تو ایک کروڑ تک کی تھی۔ آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ ہم نے اس سے ڈیمانڈ کیا کی تھی کہوٹہ پلانٹ کا نقشہ حاصل کرنا کوئی معمولی بات ہے اور پھر اس کے ساتھ کمل راؤ نے بھی بہت کچھ اور بھی مانگا تھا۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ مجھے اس کام کی کتنی ٹینشن ہے۔ یہ کام مکمل ہو جائے تو میں واپس دبئی جاؤں۔“
رئیس خان کی بات ختم ہوئی تو نواب کچھ کہنے لگا لیکن میری نگاہ سامنے سے آتے ہوئے گارڈ پر پڑی

دعا

اے اللہ! تو وہ ذات ہے کہ تیرے لیے سجدہ ریز ہے رات کی تاریکی اور دن کا نور، چاند کی روشنی، سورج کی شعاعیں اور بہتے پانی کا شور، درختوں کی سرسراہٹ۔ اے اللہ! تو وہ ذات ہے کہ تجھ جیسا کوئی نہیں تو ہر چیز پر قادر ہے۔
اے اللہ! تو نے مجھے پیدا کیا۔ اور نہیں تھی میں کوئی چیز، ظلم کیا میں نے خود پر اور مجھ سے گناہ ہوئے اور میں اپنے گناہوں کا اقرار کرتی ہوں۔
اے میرے رب! مجھے معاف کر دے۔ اگر کر دے تو مغفرت میرے لیے۔ اے میرے رب! پس نہیں کمی ہوگی تیری بادشاہت میں اور اگر تو مجھے عذاب دے۔ اے میرے رب! تو تیری سلطنت میں اضافہ نہ ہوگا کسی چیز کا۔ اے میرے رب! اور تیرے بغیر کسی سے میرے گناہوں کی مغفرت نہیں مل سکتی۔ اے میرے رب! پس مجھے بخش دے (آمین)۔
(ماخوذ ترجمہ دعائے قدح معظم)
(مریم شیرازی......گمبٹ سندھ)

تو میری توجہ اندر سے آنے والی آواز سے ہٹ گئی اور میں اٹھ کر وہاں سے چل دیا۔
میرے دماغ کی شریانیں جیسے پھٹی جا رہی تھیں۔ میں یہ کام ہرگز نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ کسی ایک شخص کی جان لینا اور بات ہے لیکن یہ تو میرے ملک کی سلامتی کی بات ہے۔
میں نے سوچا کہ میں اس کمل راؤ اور قاری ممتاز کا اپنے طور پر کھوج لگاؤں گا اگر یہ کام مجھ سے تنہا نہ ہو سکا تو گولی استاد کو اعتماد میں لینا ہی ہوگا۔ وہ بھی لاکھ برا آدمی سہی مجرم سہی لیکن اتنا گرا ہوا نہیں ہے۔
پھر مجھے خیال آیا کہ میں نے کچھ اہم چیزیں لے

کررکھی تھیں۔ وہ کس دن کام آئیں گی۔ میں نے ایک چھوٹا سانہایت طاقتور کیمرہ خریدا تھا۔ جیسے ہی وہ لفافہ میرے ہاتھ میں آئے گا میں ان تمام دستاویزات کی فوٹو کاپی اپنے پاس محفوظ کرلوں گا۔

مجھے ایک بار پھر سرمئی کا خیال آیا اور میں نے اس کا نمبر ملایا تاکہ اتنی اہم بات اسے بتاسکوں اور وہ کرنل مشتاق کو آگاہ کردے لیکن اس نے ایک بار پھر میرا فون اٹینڈ نہیں کیا اور میں نے غصے میں اپنا فون اٹھا کر زور سے بیڈ پر پٹخ دیا۔ میں اس وقت بہت زیادہ مجبور تھا کہ نواب کے اتنے اہم کام انجام دے رہا تھا اور اسی وجہ سے سرمئی کے گھر اس سے ملنے کے لیے نہیں جاسکتا تھا۔ سرمئی کے گھر جانا رسکی ہوسکتا تھا۔ یہ بہت ممکن تھا کہ ان دنوں نواب نے میرے اوپر پہرہ بٹھا دیا ہو۔ میں نے بڑی مشکل سے اس پر اعتماد حاصل کرسکا تھا اور اس اہم موقع پر وہ مجھ پر اس قدر اعتماد کرنے لگا تھا۔ میرا ایک بھی غلط قدم یا معمولی سی چوک بھی مجھے بہت بڑے نقصان سے دوچار کرسکتی تھی۔

میں نے گلشن اقبال والا وہ فلیٹ چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ کیونکہ یہ فلیٹ کچھ لوگوں کی نگاہ میں آچکا تھا۔ وہ کون تھے میں نہیں جانتا تھا سوائے اس کے کہ میں ان کے لیے ایک مشکوک شخص ہوں۔ وہ نہ جانے کس چیز کی تلاش میں بار بار میرے فلیٹ پر آرہے ہیں۔ وہ درست تو نہیں ہوسکتے۔ یقیناً ان کا تعلق میرے نادیدہ دشمنوں سے ہے۔

اس خیال کے آتے ہی میں فوری طور پر اٹھ کھڑا ہوا کہ گلشن اقبال جاکر اس اسٹیٹ ایجنسی والے سے ملوں جس کے تھرو میں نے وہ فلیٹ کرائے پر لیا تھا اور اس فلیٹ کا ایک سال کا کرایہ بھی میں ایڈوانس میں جمع کرواچکا تھا۔ کیونکہ میرے پاس اتنا ٹائم نہیں تھا کہ میں ہر ماہ اس بات کا خیال رکھوں اور پابندی کروں۔

میں اپنی کار میں گلشن اقبال آیا لیکن اسٹیٹ ایجنسی والے کے پاس جانے سے پہلے میں نے سوچا کہ فلیٹ میں موجود اپنا ضروری سامان یعنی گن اور دوربین وغیرہ اپنے قبضہ میں کرلوں۔ باقی سامان سمیت میرا ارادہ فلیٹ دینے کا تھا۔ فرنیچر تو اب کسی کباڑیے ہی کو پیش کیا جاسکتا تھا البتہ کچن کا سامان میں دوسرے فلیٹ میں لے جاسکتا تھا۔

میں نے اپنی کار کا رخ اس عمارت کی جانب موڑ دیا جہاں میرا فلیٹ تھا۔ اس وقت دوپہر کے ڈھائی بج رہے تھے۔ گرمی خاصی تھی اس وقت لوگوں کی چہل پہل بھی خاصی کم ہوجاتی ہے۔ میں تیزی کے ساتھ فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھنے لگا حالانکہ ہمیشہ کی طرح اس وقت میرا ٹکراؤ کسی شخص سے بھی نہیں ہوا لیکن نجانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے اس بلڈنگ کے ہر فلیٹ سے کچھ نادیدہ نگاہیں مجھے دیکھ رہی ہوں۔

میں نے دروازے کا لاک کھولا اور بہت محتاط انداز میں اندر قدم رکھا اور تیزی سے پیچھے گھوم گیا اپنا پستول میں پہلے ہی نکال کر ہاتھ میں لے چکا تھا۔ پیچھے میں اس لیے گھوما کہ اگر کوئی دروازے کے پیچھے چھپا ہوا ہو تو وہ مجھ پر اچانک حملہ نہ کرسکے اور میری نگاہوں میں آجائے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ یہاں کوئی نہیں تھا میں نے احتیاطاً تینوں کمروں کچن اور واش روم کا جائزہ لیا اور مطمئن ہوکر ڈرائنگ روم میں آگیا۔ میں بہت غور سے ہر چیز کا جائزہ لے رہا تھا اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا کہ میری غیر موجودگی میں کسی نے یہاں قدم رکھا ہے یا نہیں۔

میرا شک ٹھیک تھا ایک پھر میری غیر موجودگی میں

کوئی اس فلیٹ میں آیا تھا۔ میں جاتے ہوئے کچھ ایسی نشانیاں لگا کے گیا تھا جس کی وجہ سے مجھے یہ اندازہ ہوا۔ اس خیال کے آتے ہی کوئی یہاں آیا تھا۔ میں لپک کر اس صوفے کی جانب بڑھا جس کے اندر میں نے گن اور دوربین چھپائی تھی۔

اور صوفے کے اندر ہاتھ ڈالتے ہی میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ صوفہ میری مطلوبہ اشیاء سے خالی تھا میں نے بے تابی سے پھٹے ہوئے صوفے کو مزید پھاڑ ڈالا۔ اچھی طرح سے جائزہ لیا اگر وہ چیزیں وہاں ہوتیں تو مجھے ملتیں وہ لے جائی جاچکی تھیں۔

میرے منہ سے بے ساختہ گالیاں نکل گئیں۔ میں نے زور سے پھٹے ہوئے صوفے پر لات ماری اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

یہ بہت برا ہوا تھا ان چیزوں کو ان لوگوں کے ہاتھ نہیں لگنا چاہیے تھا۔ وہ آخر کون تھے؟

یہ سوال میرے دماغ میں مسلسل کسی ناگ کے ڈنک کی طرح لگ رہا تھا۔ کون دے گا مجھے اس بات کا جواب کس سے پوچھوں۔

اب میرا یہاں مزید رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا میں نے فی الحال اسٹیٹ ایجنسی جانے کا ارادہ موخر کیا اور سیدھا نواب کی کوٹھی پر آگیا یہاں کم از کم میں دوسرے تمام خطرات سے محفوظ تھا۔

رات تک میں اپنے کمرے میں موجود رہا کھانا بھی کمرے میں ہی منگوالیا مجھے پہلی مرتبہ خوف محسوس ہورہا تھا۔ کون تھا جو مسلسل میرے پیچھے لگا تھا۔ جس گن کی گولی سے سہیل ہاشمی کا قتل ہوا تھا وہ گن ان کے پاس چلی گئی تھی۔

اس رات میں سکون سے سو نہیں سکا بار بار گھبرا کر میری آنکھ کھل جاتی تھی۔ اگلے روز مجھے ایک اور اہم کام انجام دینا تھا۔

اے ابن آدم!

حضرت انسؓ سے روایت کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

"اے ابن آدم! تو نے جب بھی مجھے پکارا...... مجھ سے امید رکھی میں نے پوری کی۔ جو تجھ سے کوئی خطا ہوئی بخش دی۔ مجھے کوئی پروا نہیں۔"

"اے ابن آدم! اگر تیرے گناہ آسمان کے کنارے تک پہنچ گئے اور پھر تو نے مجھ سے مغفرت طلب کی۔ میں نے تجھے بخش دیا۔"

"اے ابن آدم! اگر تو میرے پاس زمین کے پاٹ کے برابر خطائیں لے کر آیا پھر تو ملا مجھے اس صورت میں کہ تو نے میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں ٹھہرایا تو میں نے تیری ساری خطاؤں کو بخش دیا۔"

(ترمذی)

(بشریٰ بدر گل...... کراچی

میری آنکھ کھل گئی تھی اور میں لیٹا ہوا اس بارے میں سوچ رہا تھا تب ہی میرے روم کا دروازہ آہستہ سے کھلا اور کوئی اندر آگیا میں بے ساختہ اچھل کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"جاگ رہے ہو؟" میرے کانوں میں نسوانی آواز آئی۔

"کون؟" میں نے پوچھا۔

"راکھی ہوں۔" اس نے کہا تو میں نے ایک گہری سانس لی اس وقت راکھی کی آمد مجھے بہت زیادہ کوفت میں مبتلا کرگئی۔

"لائٹ آن کردو راکھی۔" میں نے آواز پہچان کر کہا۔

"رہنے دو کیا ضرورت ہے یا پھر میری صورت دیکھنے کا دل چاہ رہا ہے۔" وہ دھیرے سے ہنسی۔

’’تم لائٹ آن کرو یار۔‘‘ میں نے بے زاری اور ناگواری سے کہا تو اس نے لائٹ آن کردی اور میرے نزدیک بیڈ پر آ کر بیٹھتے ہوئے میرے چہرے کی جانب حیرت سے دیکھتے ہوئے بولی۔
’’کیا بات ہے شمروز رات کے اس وقت تمہارا موڈ بہت آف ہے کیا ہوا ہے؟‘‘
’’کچھ نہیں تمہارے مطلب کی بات نہیں ہے۔‘‘ میں نے جھنجلا کر جواب دیا راکھی بھی ہندو تھی اور اس کا تعلق بھی بھارت ہی سے تھا میرا شدت سے دل چاہ رہا تھا کہ کم از کم اس کا ہی میں گلا دبا کر اس کو ختم کردوں۔
’’اچھا جی اتنی زیادہ غیریت سے جواب دو گے۔‘‘ پھر وہ دھیرے سے گنگنائی۔
کبھی تم بھی ہم سے تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
’’کیا بکواس ہے راکھی۔‘‘ میں نے غصے سے کہا۔
’’جو بات کرنی ہے کرو اور جاؤ یہاں سے مجھے بہت نیند آ رہی ہے۔
’’خوامخواہ میرے اوپر اتنا غصہ اب سمجھی۔‘‘ اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ’’جب نئے نوخیز ادھ کھلی کلی تمہاری آغوش کو گرما کر چلی گئی تو ہم میں کہاں سے کشش محسوس ہوگی۔‘‘
’’یہ بات نہیں ہے یار۔‘‘ میں نے کہا۔
’’اچھا قسم کھا کر کہو شازلی کے ساتھ رات نہیں گزاری تھی۔‘‘ وہ میرے نزدیک ہو کر بولی۔
’’میں نے اسے نہیں بلایا تھا نواب صاحب نے بھیجا تھا اور ویسے بھی اس رات میری طبیعت خراب تھی اس لیے اس کے آنے یا نا آنے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔
’’سچ کہہ رہے ہو؟‘‘ اس نے مشکوک لہجے میں کہا۔
’’کیوں تم کیا میری بیوی ہو جو تمہارے آگے صفائیاں پیش کروں۔‘‘ میں نے بدستور بگڑے ہوئے لہجے میں دیا۔
’’ہائے کاش ایسا ہوتا لیکن میرے ایسے نصیب کہاں۔‘‘ وہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔
’’اپنی آمد کا مقصد بیان کرو رکھی اور جاؤ۔‘‘ میں نے کہا تو سنجیدہ ہوگئی اور بولی۔
’’میں بھگوان کی سوگند کھا کر کہتی ہوں کہ میں تمہیں دل سے پیار کرتی ہوں اور ہمیشہ تمہارے بھلے کے بارے میں سوچتی ہوں۔ صرف اتنا خبردار کرنے کے لیے آئی تھی کہ اب تم نواب کی جانب سے بہت ہوشیار رہنا اس نے تمہارے آگے بہت بڑی ہڈی پھینکی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اس کو بھنبھوڑنے میں اتنے مصروف ہو جاؤ کہ تمہارا کام ہو جائے اور تمہیں پتا بھی نہ چلے۔‘‘
’’کیا مطلب؟‘‘ میں اس کی اس قدر سنجیدگی سے کہی گئی بات سن کر چونک پڑا۔
’’مطلب یہ ہے کہ شازلی کی آمد ہی خطرے کی گھنٹی ہے۔ وہ شکل سے جتنی معصوم دکھائی دیتی ہے اندر سے اتنی ہی شاطر اور مکار اور فریبی ہے اس سے ہوشیار رہنا اور کبھی اس کے بچھائے ہوئے جال میں دھوکے سے نہ پھنسنا۔‘‘
’’مثلاً۔‘‘ میں نے وضاحت چاہی۔
’’اچھا چھوڑو بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس کی جانب سے محتاط رہنا۔ دوسرے یہ کہ اب نواب تمہیں اپنے اہم اور بڑے بڑے کاموں کے لیے استعمال کرے گا اور اب تو تم لمحے بھر کے لیے بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکتے۔ نہ جانے کتنی آنکھیں تمہارا تعاقب کر رہی ہوں گی۔‘‘

’’شازلی کے بارے میں بتاؤ اس سے کس قسم کی احتیاط کرنی ہے اور بقول تمہارے وہ میرے لیے کس قسم کا جال بچھا سکتی ہے۔‘‘ میں نے تیزی سے پوچھا۔
’’یہی کہے گی کہ وہ بہت مظلوم لڑکی ہے۔ یہ کام کرنا نہیں چاہتی لیکن وہ نواب کی بہت بڑی جاسوس ہے۔‘‘
راکھی نے کہا تو میں سوچنے لگا مجھے سوچوں میں گم دیکھا تو راکھی میرے چہرے کی جانب غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔
’’لگتا ہے شازلی نے تمہیں چکر دے دیا ہے۔ کچھ الٹا سیدھا کہہ تو نہیں دیا تم نے۔‘‘
’’نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔‘‘ میں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے کہا۔
راکھی کی یہ باتیں سن کر میرا غصہ اور جھنجلاہٹ ختم ہو چکی تھی۔ اس لیے میں نے نرم لہجے میں اس سے معذرت کی تو وہ جھٹ سے میرے سینے سے لگ گئی اور بولی۔
’’تمہاری حفاظت میں چاہے میری جان چلی جائے میں وہ بھی دینے سے گریز نہیں کروں گی۔‘‘
’’تمہارا بہت شکریہ راکھی، میں آئندہ بہت محتاط رہوں گا۔‘‘ میں نے اسے خود سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔
’’تمہیں اگر کچھ ہو گیا تو کسی کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ ان کے پاس کام کرنے کے لیے دوسرے لوگ آ جائیں گے۔ لیکن میں اپنا محبوب کھو دوں گی۔‘‘ اس نے جذباتی انداز میں میرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔
میں نے آہستہ سے اپنی آنکھیں موندیں تو اس نے آگے بڑھ کر میرے چہرے کے بے تحاشا بوسے

لے ڈالے۔ میں نے اس کے کام میں قطعی مداخلت نہیں کی وہ اس سے آگے نہیں بڑھی اور نم ناک آنکھوں کے ساتھ پیچھے ہٹ گئی۔ پھر کھڑی ہوگئی جانے کے ارادے سے مڑ گئی پھر پیچھے پلٹی اور بولی۔

''میری باتیں ہمیشہ یاد رکھنا اور بہت احتیاط کرنا۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

میں نے اٹھ کر دروازہ اندر سے بند کر دیا اور لیٹ گیا میرا ذہن ایک بار پھر مختلف سوچوں کی آماجگاہ بن گیا۔

رات دھیرے دھیرے سے گزرتی جارہی تھی۔ حد یہ کہ فجر طلوع ہوگئی اور اذان کی آواز میرے کانوں میں آئی تو میں نماز کی ادائیگی کے لیے کھڑا ہوگا۔ نماز سے فارغ ہوکر گڑ گڑا کر اللہ سے اپنے لیے اور اپنے ملک کی سلامتی اور دشمنوں سے نجات کی دعا کی اور پھر مطمئن ہوکر دوبارہ سونے لیٹ گیا۔

اگلا دن میں نے اپنے کمرے میں ہی گزارا۔ میرے دل و دماغ کی حالت بہت عجیب ہورہی تھی کیونکہ میں یہ بات جان چکا تھا کہ میں کیا کام کرنے کے لیے جارہا ہوں لیکن پھر بھی میں نے اپنی تیاری مکمل رکھی ہوئی تھی میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ میں ان تمام دستاویزات کی نقل اپنے پاس ضرور رکھوں گا۔

شام کو 7 بجے نواب نے مجھ سے فون پر رابطہ کیا اور پوچھا کہ میں کہاں ہوں تو میں نے جواب دیا کہ میں کل سے کوٹھی پر موجود ہوں۔ نواب ابھی تک سرجانی ٹاؤن ہی میں تھا یہ بھی ہوسکتا ہے وہ کہیں اور ہو اس نے کہا کہ میں اس کا انتظار کروں وہ تھوڑی دیر میں آرہا ہے۔

رات کے آٹھ بجے اس نے مجھے اپنے روم میں طلب کیا کہ تم کھانا وغیرہ کھا کر فارغ ہو جاؤ اور نو بجے تک میرے پاس آؤ۔

میری بھوک پیاس سب اڑ چکی تھی۔ میرا دل بہت زیادہ گھبرا رہا تھا۔ میری چھٹی حس مجھے بار بار یہی کہہ رہی تھی کہ میں چاروں جانب سے خطروں میں گھر چکا ہوں اور اب میرے ساتھ کچھ بہت ہی برا ہونے والا ہے۔ لیکن وہ بہت برا کیا ہونے والا ہے یہ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

میں نے رات کا کھانا نہیں کھایا' طبیعت ہی نہیں چاہ رہی تھی نو بجے تو میں ایک بار پھر نواب کے کمرے میں پہنچ گیا۔

''آؤ شمروز تم نے کھانا کھالیا؟'' اس نے بہت خوش دلی سے میرا استقبال کیا۔

''نہیں سر' بھوک نہیں تھی۔ ویسے بھی جب میں کسی اہم کام کے لیے جاتا ہوں تو کھانے کی جانب دھیان نہیں دیتا۔ میری پوری توجہ اپنے کام پر ہی رہتی ہے۔'' میں نے اپنے آپ کو نارمل ظاہر کرنے کی کوشش کی لیکن میری مردہ دلی لہجہ میں ظاہر ہوگئی۔

''کیا بات ہے شمروز تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔'' اس نے بغور میرے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ٹھیک ہے بس ذرا سر بھاری ہورہا ہے۔ شاید رات کو ٹھیک طریقے سے سو نہیں سکا۔'' میں نے بے پروا لہجے میں جواب دیا۔

''ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ کام سے پہلے تم کھانا تک نہیں کھاتے پھر رات کو عیاشی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔'' نواب نے کٹیلے لہجے میں کہا تو میں چونک پڑا اور میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''جی سر۔''

''ہاں رات کو راکھی تمہارے کمرے میں کیا کرنے کے لیے گئی تھی؟'' نواب نے سابقہ لہجے میں پوچھا۔

''آپ ہمیشہ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی مرد اور عورت رات میں ملے ہیں تو وہ صرف عیاشی کے لیے ملے ہیں۔ کوئی اور وجہ بھی تو ہوسکتی ہے۔ بتانے والے نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ راکھی کو میں نے پندرہ منٹ بعد ہی اپنے کمرے سے چلتا کر دیا تھا۔'' میں بھی اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکا۔ اپنے آپ کو نارمل رکھنے کی کوشش کے باوجود غصہ اور تلخی میرے لہجے سے عیاں ہوگئی۔ نواب نے حیران نگاہوں سے مجھے دیکھا پھر بولا۔

''پندرہ منٹ بھی تو کافی ہوتے ہیں۔''

''تو۔'' میں نے تیزی سے کہا ''وہ صرف مجھ سے میری خیریت پوچھنے کے لیے آئی تھی اور بس۔''

''وہ الو کی پٹھی صرف رات ہی میں تمہاری خیریت کیوں پوچھنے کے لیے آتی ہے تم تو سارا دن یہیں پر تھے دن میں آجاتی۔'' نواب نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''آپ کو جو سمجھنا ہے سر وہ سمجھیں۔ میں ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ جو آپ سمجھ رہے ہیں ایسی کوئی بات ہمارے درمیان نہیں ہے۔'' میں نے جھنجلا کر جواب دیا مجھے آج بھی اپنے لہجے پر حیرت ہوتی ہے کہ میں نے اس وقت نواب سے کیسے اس لہجے میں بات کرلی تھی۔

''اچھا چلو چھوڑو اس بات کو ہم بھی کس فضول بحث میں لگ گئے۔ اب کچھ کام کے متعلق بات ہوجائے۔'' حیرت انگیز طور پر نواب نے میرے لہجے کو نظر انداز کر دیا اور نرم لہجے میں کہا۔

''جی فرمایئے۔'' میں پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔

پھر نواب نے مجھے اشرف علی کے بارے میں بتایا کہ وہ مجھے کس جگہ ملے گا۔ اس جگہ کا ایڈریس اچھی طرح سے سمجھایا اور کوڈ ورڈ ایک بار پھر دہرایا۔

جس وقت نواب کوڈ ورڈ دہرا رہا تھا میں نے نگاہیں اس کے چہرے پر جما دیں۔ مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ میری آنکھوں نے نواب سے کیا کہا کہ وہ دم گڑبڑا گیا اور بولا۔

''تم اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو میری طرف؟''

''کس طرح سر' میں تو آپ کی بات توجہ سے سن رہا ہوں۔ اشرف علی صاحب کے پاس جا کر یہی الفاظ دہرانے ہیں نا اور پھر اس کا جواب موصول ہونے پر آپ کا دیا ہوا لفافہ ان کے حوالے کر کے واپس آجانا ہے۔ میں نے تو آپ سے کیوں اور کیا کا کوئی سوال بھی نہیں کیا۔'' میں نے نہایت معصومیت سے کہا تو نواب نے کوئی جواب نہیں دیا۔

میں نے نواب کے ہاتھ سے وہ لفافہ لیا جس کو نواب نے ایک بلیک کلر کے بیگ میں رکھ کر میرے حوالے کیا اور بولا۔

''بی کیئر فل۔''

''اوکے سر' آپ فکر نہ کریں میں محتاط رہوں گا اور وہاں سے سیدھا اپنے فلیٹ پر ہی جاؤں گا۔'' میں نے اطمینان سے جواب دیا اور بیگ لے کر نواب کے کمرے سے نکل آیا۔ پیچھے سے نواب نے کہا کہ میری کال ملتے ہی تم کوٹھی سے باہر نکلنا۔ جواباً میں نے مڑ کر اثبات میں سر ہلایا اور آگیا۔

اپنے روم میں آکر میں نے بیگ کو کھولنے کی کوشش کی تو وہ نمبروں سے لاک کیا گیا تھا میرے بہت دماغ لڑانے پر بھی اس بیگ کو کھول نہیں پایا اور نواب کی کال آگئی کہ تم چلے جاؤ۔

مجھے نواب کی چالاکی پر بہت غصہ آرہا تھا میرا سارا پلان دھرا کا دھرا رہ گیا۔ میں یہ کام کسی طور نہیں کرنا چاہ رہا تھا کیا کروں' ان قیمتی اور اہم دستاویزات کو میں مکمل

راؤ عرف اشرف علی کے حوالے نہیں کرسکتا تھا کیا کروں اور کیا نہ کروں۔

مجھے اس بات کا پورا یقین تھا کہ نواب میری نگرانی کے لیے اپنے بندے میرے پیچھے ضرور بھیجے گا۔ وہ آج مجھ پر پوری طرح اعتماد نہیں کرسکا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں یہ دستاویزات لے جاکر کسی اور کے حوالے کردوں۔ کوئی ایسا شخص جو ملک کی سلامتی کے لیے کام کرتا ہو لیکن ایسا کون ہے یہاں تو چپے چپے پر ایسے لوگ بیٹھے ہیں جو چند ٹکوں کی خاطر اپنا دین و ایمان بیچ دیتے ہیں۔ میں کس پر یقین کروں اور کس پر نہ کروں۔

میں اسی گومگو کی کیفیت میں کار ڈرائیو کررہا تھا ابھی میں پنجاب کالونی تک ہی پہنچا تھا کہ اچانک ایک کار بہت تیزی سے میرے برابر سے گزری اور تیزی سے میرے آگے آکر گھوم کر آڑی ہوگئی۔ میں نے بہت تیزی کے ساتھ بریک لگائے۔ اگر میں لمحہ بھر بھی دیر لگاتا تو زبردست ایکسیڈنٹ ہوجاتا۔

میرے بریک لگاتے ہی سامنے والی کار سے چند افراد اتر کر میرے پاس آئے اور میری جانب کا دروازہ کھول کر ایک پستول میری کنپٹی پر لگا کر غراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"فوراً نیچے اتر آؤ۔"

اس کے ساتھ ہی دوسری جانب کا دروازہ کھول کر ایک دوسرا بندہ اندر آیا اور سب سے پہلے اس نے سیٹ پر رکھا ہوا سیاہ کلر کا بیگ اٹھا کر اپنے قبضہ میں کیا۔

میں اس اچانک صورتِ حال سے گھبرا گیا اور کہا۔ "آ...... آپ لوگ کون ہیں اور مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔"

"خاموش رہو۔" اس نے مجھے بری طرح ڈانٹ دیا۔ "تم خاموشی سے اتر کر ہمارے ساتھ چلو۔ جلدی کرو۔" اور اس سے پہلے کہ میں کوئی اور سوال کرتا اس نے بری طرح کھینچ کر مجھے کار سے اتارلیا۔

اس کے ساتھ ہی ایک اور بات ہوئی ہمارے پیچھے ذرا فاصلے پر ایک کار سے ہمارے اوپر فائرنگ کی گئی۔

مجھے پکڑنے والے بندوں نے نہایت پھرتی دکھائی اور اپنے سروں کو نیچے کرتے ہوئے اور ایک ہاتھ سے اس نے میرے سر کو بھی نیچے کیا اور میری کار کی آڑ لیتے ہوئے مجھ سمیت اپنی کار میں بیٹھ گئے کار اسٹارٹ تھی۔ ڈرائیور سیٹ پر الرٹ بیٹھا تھا۔ اس نے کار کو بھگانے میں ذرا بھی ٹائم نہیں لگایا۔

پیچھے والی کار سے ہماری کار پر مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ جواباً وہ لوگ بھی فائرنگ کرنے لگے اور بہت جلد ان کی رینج سے باہر نکل آئے میں دو افراد کے درمیان بری طرح دبا بیٹھا تھا۔ انہوں نے میرے دونوں ہاتھوں کو پشت پر مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا اور ایک ہاتھ سے میرا سر نیچے جھکایا ہوا تھا اور پھر ایک تیز خوشبو کا رومال میری ناک سے لگا اور میں اپنے ہوش و حواس سے بے گانہ ہوگیا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

نصیحت

گھر کی عزت جب باہر آجائے تو اس پر ہر خاص و عام کی نظر عنایت ہونے لگتی ہے۔ جب اس قدر توجہ ملنے لگے تو دماغ آسمان سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ خواب آنکھوں میں سجنے لگتے ہیں مگر جب حقیقت آشکار ہوتی ہے تو بہت دیر ہوچکی ہوتی ہے۔ ایسے ہی حالات کا شکار دو بہنوں کی داستان۔

مکار اور چالاک انسانوں کے چنگل میں پھنس جانے والی دو دوشیزاؤں کا احوال

ہر عورت کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا اپنا ایک گھر ہو اس کا شوہر اور بچے ہوں۔ یہ فطری خواہش ہے اور کوئی غلط خواہش بھی نہیں۔ ہر انسان کو شادی کرنا ہوتی ہے' مرد ضروریات زندگی پوری کرنے کو کما کر لاتا ہے جب کہ بیوی کے ذمہ خانہ داری اور گھریلو امور ہوتے ہیں۔ میں اور میری بہن عدیلہ کی بھی یہی خواہش تھی کہ ہماری شادی ہوجائے' اس مہنگائی کے دور میں غریب گھرانوں کی بیٹیوں کے رشتے طے ہوجانا اتنا آسان کام نہیں ہوتا۔ رشتوں کی امید پر لڑکیوں کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگتی ہے۔ بالوں میں سفیدی آتے ہی رشتوں کے انتظار میں شدت آجاتی ہے۔

ہمارے گھرانے کا تعلق بھی امیر طبقے سے نہیں تھا' ابا اور بھائی مل کر کماتے تھے پھر بھی گھر کا گزارا مشکل ہوتا تھا اکثر ابا اور اماں میں تلخ کلامی بھی ہوجاتی تھی جب بھی ابا تنخواہ اماں کے ہاتھ پر رکھتے تھے' وہ چراغ پا ہوجاتی تھیں۔

"مجھ سے اب اس تنخواہ میں گھر چلانا مشکل ہوگیا ہے۔"

"گھر چلانا مشکل ہی ہوا ہے ناممکن تو نہیں ہوا۔" ابا حسب عادت مسکراتے ہوئے کہتے۔

اماں دل کی بری نہیں تھیں' وقتی طور پر غصہ آجانے پر شور شرابہ کرتی تھیں مگر ہر کسی کا خیال رکھنا۔ ان کی ضرورتیں پوری کرنا ان کی اولین ذمہ داری میں شامل تھا۔

"تم ایسا کرو کہ یہ تنخواہ اپنے پاس ہی رکھو' گھر کا جو خرچہ ہے خود اٹھاؤ پھر تمہیں اندازہ ہوگا اس مہنگائی میں گھر چلانا کتنا مشکل ہوتا ہے۔"

"بیگم! ہم ٹھہرے بے پروا' ہمیں کیا پتا کہ کون سی چیز کتنے کی آتی ہے' لوگ ہمیں ٹھگ لیں گے تم جو کفایت شعاری سے پورا مہینہ چلاتی ہو' ہم مشکل سے ایک ہفتہ بھی گھر نہیں چلا سکتے۔" ابا بے پروائی سے کہتے۔

"بس رہنے دو' زیادہ مسکا مت لگاؤ۔" اماں دل ہی دل میں خوش ہوتیں۔

"بیگم! میں سچ کہہ رہا ہوں' جھوٹی تعریف نہیں کررہا۔ تم نے شروع سے ابھی تک گھر داری نبھائی ہے' ہر عورت ایسا نہیں کرتی' عورتیں پندرہ دن گزرنے پر ہی رقم کا مطالبہ کرنے لگتی ہیں لیکن میری حسرت ہی رہی کہ تم بھی دوسری عورتوں کی طرح وقت سے پہلے رقم کا مطالبہ کرو' سچ پوچھو میں تمہاری وجہ سے کسی کا قرض دار نہیں ہو ورنہ میں دیکھتا ہوں لوگ رات دن محنت کرنے کے باوجود لوگوں کے قرض دار رہتے ہیں۔"

"اللہ تعالیٰ نہ کرے کہ تم کسی کے قرض دار ہو' ہم ایک دن کا فاقہ کرلیں گے لیکن کسی کا تمہیں مقروض نہیں ہونے دیں گے۔" اماں کہتیں۔

"ماشاء اللہ کاشی بھی ہر ماہ کچھ رقم لے ہی آتا ہے۔" ابا نے کہا۔

"ہاں یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے اس کی وجہ سے گھر کا خرچہ چلانے میں بڑی مدد ملتی ہے۔"

"بیگم! اس کم بخت بڑھاپے نے کہیں کا نہیں چھوڑا ہے جو کام میں جوانی میں ہنستے کھیلتے کرلیا کرتا تھا وہ اب نہیں ہوتا۔ جسم میں وہ جان ہی نہیں رہی۔"

"اس لیے کہتے ہیں کہ بڑھاپا دراصل براپا ہے جو انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتا۔ اللہ تعالیٰ تمہاری عمر دراز کرے کچھ دن کی بات ہے پھر بچے ہی اس قابل ہوجائیں گے کہ گھر میں جو تنگی ہے وہ نہیں رہے گی۔" اماں مسکراتے ہوئے ابا کی طرف دیکھنے لگیں۔

اماں کو مسکراتا دیکھ کر ابا بھی مسکرادیے تھے۔ اس طرح کی گفتگو تقریباً ہم ہر ماہ ہی سنتے تھے' میرے ابا منصور احمد کی آواز میں اتنی مٹھاس تھی کہ اماں ان کی باتیں سن کر سخت غصے کے باوجود موم کی طرح پگھل جاتی تھیں۔

ایک روز ابا خوش خوش گھر میں داخل ہوئے۔

"کیا کوئی بانڈ کھل گیا ہے جو اتنے خوش نظر آرہے ہو۔" اماں نے انہیں خوش دیکھ کر چھیڑا۔

"بیگم نصیبو! ہمارے اتنے اچھے مقدر کہاں کہ پرائز بانڈ کھل جائے۔"

"پھر اتنا خوش ہونے کی وجہ؟"

"ہم غریب لوگوں کے لیے چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہی بڑی خوشیاں ہوتی ہیں۔"

"پھر بھی پتا تو چلے کہ آخر ایسی کیا بات ہے جو تم گھر میں خوش خوش داخل ہوئے ہو۔"

"مینیجر صاحب نے مجھے آج بلایا تھا وہ کہہ رہے تھے کہ فیکٹری میں دولڑکیوں کے کام کی جگہ نکلی ہے اگر تم اپنی بچیوں کو کام پر لگاؤ تو میں اچھی تنخواہ دلوادوں گا۔"

"پھر تم نے کیا سوچا؟"

"فیکٹری کا ماحول اچھا ہے کسی اور فیکٹری میں کام کرنے کی بات ہوتی تو میں منع کردیتا لیکن اس فیکٹری میں کام کرتے ہوئے وہ میری نظروں کے سامنے رہیں گی اور انہیں جو تنخواہ ملے گی وہ جہیز کی تیاری میں کام آئے گی۔" ابا نے کہا۔

"بات تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو ان کے جہیز کے لیے میں بہت کفایت شعاری سے کام لیتی ہوں پھر بھی کچھ تیاری نہیں کرپاتی۔ کچھ معقول رقم ملنے سے جہیز تیار ضرور ہوجائے گا اور ان دنوں کراچی میں رشتے کہاں ملتے ہیں۔ فیکٹری میں لڑکیاں کام کریں گی تو ضرور فیکٹری میں کام کرنے والے مزدوروں میں کسی نہ کسی کام کرنے والے نوجوان کا رشتہ آہی جائے گا۔" اماں نے کہا۔

"بیگم نصیبو تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو' میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں' جن لڑکیوں کے ڈھونڈھنے سے رشتے نہیں ملتے تھے ان کے فیکٹری میں کام کرنے سے رشتے طے ہوکر وہ اپنے گھر کی ہوگئیں۔" ابا نے کہا۔

"پھر تم سوچنے میں دیر کیوں کررہے ہو' کل فوراً ہی مینیجر کو ہاں کہہ دو۔" اماں نے کہا۔

"بیگم! تم سے مشورہ کرنا ضروری تھا' تم نے ہاں کہہ دی ہے میں بھی کل جاکر ہاں کردوں گا۔"

فیکٹری میں سینئر ہونے کی وجہ سے ابا کی بڑی عزت تھی' فیکٹری میں کام کرنے والا ہر آدمی ان کی عزت کرتا تھا۔ ہم دونوں کو فیکٹری میں کام مل گیا تھا کام بھی زیادہ مشکل نہیں تھا۔ ہم دونوں بہنوں کو الگ الگ ڈیپارٹمنٹ میں جو سوئٹر بنتے تھے انہیں چیک کرنا ہوتا تھا کہ ان میں کوئی نقص وغیرہ تو نہیں ہے۔ فیکٹری کے دونوں ڈیپارٹمنٹ کا ماحول بھی اچھا تھا لڑکے اور لڑکیاں مل جل کر اپنا اپنا کام کرتے تھے۔ ابا کی وجہ سے سب لوگ ہم دونوں بہنوں کی بہت عزت کررہے تھے' ایک ہفتہ گزر جانے پر ابا نے ہم دونوں سے پوچھا۔

"کام پسند آیا؟"

"ابا! کام کیا پسند کرنا' صرف سوئٹر دیکھنا ہی ہوتا ہے یہ تو کوئی بھی چیک کرسکتا ہے۔"

"بیٹی! بظاہر یہ کام بہت آسان لگتا ہے لیکن بہت ذمہ داری کا کام ہے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"ہماری فیکٹری کو مختلف ممالک سے بہت آرڈر ملتے تھے ان آرڈرز کی ہمیں بروقت تکمیل کرنا ہوتی ہے اگر غلطی سے کوئی ایک سوئٹر جس میں معمولی نقص ہو مال کے ساتھ چلا جانے پر پورا آرڈرز کینسل ہوجاتا ہے اور پیسے بھی ضبط ہوجاتے ہیں۔" ابا نے کہا۔

"کیا ایسا بھی ہوتا ہے۔" میں چونکی۔

"ہاں بھئی باہر والوں کے بڑے نخرے ہوتے ہیں۔ ذرا ذرا سی غلطی پر معاہدہ منسوخ کردیتے ہیں اس لیے تمہیں جو کام دیا گیا ہے اس کے لیے قابل اعتماد و بھروسہ کے لوگوں کو لگایا جاتا ہے تاکہ کوئی نقصان نہ ہو اور کام چلتا رہے۔" ابا نے بتایا۔

"اچھا ہوا آپ نے ہمیں بتادیا اب ہم اور زیادہ توجہ سے یہ ذمہ داری نبھائیں گے۔" میں نے کہا۔

"فیکٹری میں تمہیں کوئی تنگ وغیرہ تو نہیں کرتا۔" ابا نے پوچھا۔

"نہیں کوئی بھی ہمیں تنگ نہیں کرتا بلکہ آپ کی وجہ سے سب عزت کرتے ہیں۔"

"کوئی بھی تنگ کرے یا کوئی اور پریشانی ہو مجھے فوراً بتادینا۔"

"جی ابا۔" ہم دونوں بہنوں نے کہا۔

ہماری بات سن کر ابا خوش ہوگئے۔

اس فیکٹری میں اندرونِ سندھ کے دولڑکے نور محمد بھٹی اور ہاشم بھٹی بھی کام کرتے تھے' وہ بہت محنتی تھے جب سے ہم دونوں بہنیں اس فیکٹری میں آئی تھیں ان کی ہم دونوں پر نظریں لگی ہوئی تھیں۔ ان کی نگاہوں میں ہوس نہیں بلکہ چاہت جھلکتی تھی یہ انسانی فطرت ہے کہ اسے کوئی چاہے جانے کی نظر سے دیکھے تو جواب میں سامنے والے سے بھی اسے محبت ملتی ہے۔

یہی کیفیت ہماری بھی تھی' ابتداء میں معاملہ صرف دیکھنے کی حد تک ہی رہا پھر کام کے بہانے سے بات چیت کا سلسلہ چل نکلا۔ اکثر کھانے کے وقفے کے دوران وہ جلد ہی کھانا کھا کر آجاتے تھے اور ہم دونوں سے مختلف موضوعات پر بات چیت ہونے لگتی۔ دونوں طرف سے اظہار محبت نہیں ہوا تھا لیکن دل میں ایک دوسرے کے لیے محبت کی شمع روشن ہوچکی تھی ویسے بھی بقول اماں کے ان دنوں رشتے فیکٹری میں کام کرنے والوں کے جلدی طے پاجاتے ہیں۔ قسمت ہمارا ساتھ دے رہی تھی کہ اتنی جلدی ہمیں فیکٹری میں محبت کرنے والے مل گئے تھے' ہم انجام سے بے پروا انجانی راہوں پر چل پڑے تھے۔

ایک دن نور محمد نے موقع دیکھ کر مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"راحیلہ! ہم دونوں بھائی تم دونوں بہنوں کی محبت میں گرفتار ہوچکے ہیں اور چاہتے ہیں شادی کے بندھن میں بندھ کر ایک ہوجائیں۔ تم اس بارے میں کیا کہتی ہو؟"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں تمہاری اچھی سوچ ہے انسان کو ہمیشہ مثبت سوچ رکھنی چاہیے۔" میں نے کہا۔

"کیا تمہاری بہن عدیلہ میرے بھائی ہاشم سے شادی کے لیے تیار ہوجائے گی؟" اس نے پوچھا۔

"نیک کام سے وہ کیوں انکار کرے گی۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میرے پوچھنے کا مقصد یہ ہے کہ کہیں وہ کسی اور کو پسند تو نہیں کرتی۔" نور محمد نے پوچھا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے' ہم دونوں نے تم لوگوں کی آنکھوں میں پسندیدگی کا احساس بہت پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔"

"پھر تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"ارادہ کیا ہے یہ معاملات والدین کی مرضی سے

ہوتے ہیں تم اپنے والدین کو ہمارے گھر بھیجو پھر جو بڑے فیصلہ کریں ہمیں منظور ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”ہم اپنے والدین سے بات کرلیتے ہیں تم اپنے والدین سے بات کرو تمہارے والدین کے تیار ہوجانے پر ہی ہم اپنے والدین کو بھیج سکتے ہیں۔“ نور محمد نے کہا۔

”ہاں یہ بھی ٹھیک ہے میں امی سے رات ہی بات کرلوں گی۔“ میں نے کہا۔

رات جب میرے امی کو بتانے پر ابا سے امی نے رشتے کے سلسلے میں بات کی وہ خوش ہونے کی بجائے فکر مند ہوگئے انہیں فکر مند دیکھ کر اماں نے پوچھا۔

”گھر میں بچیوں کے لیے رشتہ آیا ہے اور تم بجائے خوش ہونے کے فکر مند ہوگئے ہو۔“

”بات ہی ایسی ہے ہم ان دونوں لڑکوں کے خاندان کے بارے میں بالکل نہیں جانتے کہ وہ کیسے لوگ ہیں شادی ہونے پر وہ ہماری بچیوں کے ساتھ کیسا سلوک کریں۔ کراچی سے تعلق ہونے پر ہم ان کے خاندان کے بارے میں کسی نہ کسی ذرائع سے معلومات حاصل کر ہی لیتے۔“ ابا نے کہا۔

”مجھے تمہاری یہ عادت بڑی خراب لگتی ہے کہ ان لوگوں سے ملاقات کی نہیں اور پہلے ہی ان کے بارے میں غلط رائے قائم کرلی۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اچھے لوگ ہوں جیسا تم سوچ رہے ہو ویسا نہ ہو۔“ اماں نے انہیں سمجھایا۔

”فرض کرو وہ اچھے لوگ ہوں بھی تو ہم اتنی جلدی شادی نہیں کرسکیں گے۔ ہماری جہیز کی بالکل بھی تیاری نہیں ہے ہم بچیوں کے لیے اتنی جلدی کہاں سے جہیز تیار کریں گے۔“ ابا نے کہا۔

”ہاں یہ بات تو ہے کہ فوری جہیز کا انتظام ہمارے لیے ممکن نہیں ہے ہم ان سے مہلت مانگ لیں گے۔“

”بیگم تم بعض اوقات بہت بھولی بن جاتی ہو دو بچیوں کا جہیز بنانا اتنا آسان نہیں ہے اور پھر لڑکی کی بات طے کردی جائے تو لڑکے والوں کا اصرار بڑھ جاتا ہے فوری طور پر شادی کرو ورنہ ہم کہیں اور رشتہ طے کردیں گے۔“

”اس طرح پھر دونوں بچیوں کے رشتے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔“

”بیگم نصیبو! جوڑے آسمان پر بنتے ہیں ہماری بیٹیوں کا جہاں رشتہ ہونا ہے وہاں طے ہوکر رہے گا کوئی رکاوٹ درمیان میں نہیں آئے گی ویسے بھی ہمیں بچیوں کی شادی کرنے سے کم از کم دو سے تین سال لگ جائیں گے ابھی تم ان کی شادی کے لیے اتنی فکر مند نہیں ہو۔“ ابا نے کہا۔

”اس کا مطلب ہے ابا ہم دونوں کی شادی کرنے کے موڈ میں نہیں ہے۔ میں نے ابا کی گفتگو سن لی ہے اب ہم کیا کریں عدیلہ!“ میں نے اس سے پوچھا۔

”ہم لڑکی ذات کر بھی کیا سکتے ہیں سوائے صبر کے گھونٹ پینے کے۔“

”عدیلہ تم سمجھ نہیں رہی ہو ہمارے لیے یہی سنہرا موقع ہے پھر پتا نہیں موقع ملے یا نہیں۔“ میں نے کہا۔

”یہ باتیں ہمارے سمجھنے کی نہیں بزرگوں کے سمجھنے کی ہوتی ہیں۔“ عدیلہ نے کہا۔

قصور اس کا نہیں میرا تھا کیونکہ میں شروع ہی سے جذبات رہی ہوں جو چیز پسند آجائے اسے فوراً حاصل کرنے کی جستجو کرنا شروع کردیتی ہوں۔ نور محمد بھٹی کے معاملے میں کچھ ایسا ہی تھا میں اس کی محبت میں گرفتار ہوچکی تھی اور اسے ہر قیمت پر فوری حاصل کرنا چاہتی تھی۔ ابا اور اماں کی باتیں سن کر مجھے بے حد مایوسی ہوئی تھی اور مجھے یہ یقین ہوچلا تھا کہ یہ رشتہ طے نہیں ہوسکے گا۔ اس لیے میں عدیلہ کو بغاوت پر اکسا رہی تھی۔ وہ ابتداء سے ہی ٹھنڈے مزاج کی تھی ہر معاملے میں بے پروا سی تھی جو مل جاتا اس پر قناعت کرلیتی تھی۔ عدیلہ کو ہاشم بھٹی سے محبت تھی اور وہ والدین کی مجبوری کو سمجھتے ہوئے خاموش تھی مجھے اندازہ ہوگیا تھا یہ رشتہ طے نہیں ہوسکے گا اسی لیے باغی ہوچلی تھی۔ میری عمر ۲۸ سال ہوچکی تھی رشتہ داروں میں سے کوئی امید نہیں تھی کہ رشتہ آجائے وہ سب مال ڈھونڈتے تھے ہم غریبوں کے پاس مال کہاں سے آئے گا اسی لیے رشتہ کی امید پر میں ۲۸ اور عدیلہ ۲۵ سال کی ہوچکی تھی جیسے جیسے دن گزر رہے تھے نا امیدی بڑھ رہی تھی میں برے انجام سے بے پروا دل ہی دل میں فیصلہ کرچکی تھی کہ چاہے کچھ بھی ہو والدین کے انکار پر کورٹ میرج کرلوں گی۔ اس لیے میں عدیلہ کو بغاوت پر اکسا رہی تھی کہ وہ میرا ساتھ دے میری کوشش رنگ لائی اور وہ بھی میرا ساتھ دینے پر تیار ہوگئی تھی۔ نور محمد کو جب میں نے والدین کی بات چیت اور اپنے فیصلے سے آگاہ کیا وہ بھی اس بات پر آمادہ ہوگیا۔

”راحیلہ تم نے بالکل درست سوچا ہے۔“ نور محمد نے کہا۔

”کیا تمہارے والدین اس شادی کو قبول کرلیں گے۔“ میں نے بے یقینی کے انداز میں پوچھا۔

”راحیلہ تم بھی سمجھ دار لڑکی ہو کورٹ میرج کسی کے بھی والدین قبول نہیں کرتے تھوڑا بہت ناراضگی ضرور دکھاتے ہیں مگر پھر راضی ہوکر گھر بلا لیتے ہیں۔“

”ہاں یہ بات ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ میں نے کہا۔

”راحیلہ کورٹ میرج کرلینے پر ہم اس فیکٹری میں کام نہیں کرسکیں گے۔“ نور محمد کہا۔

”ہاں ہمیں اس نوکری کی قربانی دینی پڑے گی۔“ میں نے کہا۔

دو دن گزر جانے پر نور محمد نے مجھے یہ خوش خبری سنائی کہ اس کے گھر والے اس شادی پر تیار ہیں۔ ہم کورٹ میرج کرکے گھر پہنچیں گے وہاں ہمارا شاندار استقبال ہوگا۔ یہ خوش خبری سن کر میں بہت خوش ہوگئی تھی مجھے پورا یقین تھا کہ ہماری کورٹ میرج پر اماں اور ابا وقتی ناراض ضرور ہوں گے لیکن پھر مان جائیں گے۔ میں نے عدیلہ کو بھی یہ خوش خبری سنادی جسے سن کر وہ مطمئن ہوگئی تھی ورنہ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر لڑکوں کے والدین نے قبول نہ کیا تو ان کے لیے زندگی گزارنا مشکل ہوجائے گی۔

پیر کے دن ہمیں کورٹ میرج کے لیے کورٹ جانا تھا۔ طبیعت کی خرابی کا بہانہ کرکے ہم دونوں گھر میں رک گئی تھیں اور ابا کے چلے جانے پر اسپتال سے دوائی لانے کے بہانے ہم دونوں گھر سے نکلیں باہر مقررہ مقام پر ہمیں نور محمد اور ہاشم مل گئے۔ ہم سیدھے کورٹ پہنچے جہاں وکیل ہمارا انتظار کررہا تھا۔ سول کورٹ میں ہم دونوں کا حلفیہ بیان ریکارڈ ہوا اور پھر ہم نے سول کورٹ سے باہر نکل کر نکاح خواں کے روبرو گواہان کی موجودگی میں نکاح پڑھوالیا۔ نکاح ہوجانے پر نور محمد نے چند دن اپنے دوست رفیق کے گھر پر رکھا پھر وہ ہم دونوں کو والدین سے ملاقات کرانے کے لیے گاؤں لے گئے۔

گاؤں میں ہماری خوب آؤ بھگت ہوئی میرا خیال تھا کہ نور محمد اور ہاشم کے والدین اس رشتے پر خوش نہیں ہوں گے اور وقتی طور پر دکھاوے کے لیے رشتے کی ہاں کردی ہوگی اور شادی ہونے پر ہم پر ظلم و زیادتی کا سلسلہ شروع ہوجائے لیکن وہاں ایسی کوئی بات دیکھنے میں نہیں آئی تھی وہ ہم سے ایسے ہی پیش آرہے تھے جیسے ان کی مرضی سے شادی ہوئی ہو۔

شہر کے مقابلے گاؤں میں آزادی نہیں تھی جیسا ہم نے سنا تھا کہ گاؤں میں عورت کو گھر کی زینت بنا کر رکھا جاتا ہے باہر نکلنے نہیں دیا جاتا وہاں وہی حالات تھے ہم دونوں بہنوں کو گھر سے باہر نکلنے کی آزادی نہیں تھی کچھ دن ہم نے یہ سوچ کر وہاں رکنے کا فیصلہ کرلیا تھا کہ جب ہم کراچی جائیں گے پھر ایسی سختی وہاں نہیں ہوگی۔ گاؤں میں پندرہ دن کیسے

گزرے یہ ہمیں ہی معلوم تھا' سخت بوریت رہی۔
"نور محمد ہم کراچی کب چلیں گے؟" میں نے رات نور محمد کے گھر آنے پر پوچھا۔
نور محمد دن بھر باہر ہی رہتا تھا' مغرب کے بعد ہی گھر میں داخل ہوتا تھا۔
"ابھی ہم لوگوں کا کراچی جانے کا پروگرام نہیں ہے۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔
"کیوں؟" میں نے پوچھا۔
"بابا کوشش کر رہے ہیں کہ ہم دونوں کو گاؤں میں ہی کوئی نوکری مل جائے' اس طرح کراچی جانے سے بھی نجات مل جائے گی اور ہم گھر میں ہی رہیں گے۔" نور محمد نے کہا۔
اس گاؤں میں ہمارا دل نہیں لگتا' بس تم واپس کراچی چلو ہم وہاں ہی رہیں گے۔ ہم دونوں مل کر فیکٹری میں کام کریں گے' اس طرح گھر کا خرچہ چل جائے گا۔" میں نے کہا۔
"بے وقوف عورت! ہماری برادری میں عورتیں شہروں میں جا کر کام نہیں کرتیں۔ ان کے لیے گھر کا کام ہی بہت ہوتا ہے۔" نور محمد بھٹی نے سختی سے کہا۔
اسے غصے میں دیکھ کر میں اس وقت خاموش ہوگئی لیکن دل میں تہیہ کرلیا کہ چاہے کچھ بھی ہو میں نور محمد کو شہر چلنے کے لیے تیار کرکے ہی رہوں گی۔
گاؤں میں عورتوں کو جانوروں کی طرح سمجھا جاتا تھا میں ہرگز بھی اپنی اس طرح تذلیل نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ عدیلہ کو بھی گاؤں کا ماحول پسند نہیں آیا تھا وہ دبے لفظوں میں اس کا اظہار مجھ سے کرچکی تھی۔ میں نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کردیا تھا کہ وہ بے فکر رہے ہم ضرور گاؤں سے چلے جائیں گے۔
ان دنوں ایک واقعہ نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہوا یوں کہ نور محمد کے کزن عارب نے اپنی ساس' سسر اور بیوی کو بس اسٹاپ پر گولی چلا کر زخمی کردیا۔ ساس موقع پر ہی ہلاک ہوگئی تھی جب کہ سسر اور بیوی شدید زخمی ہوگئے تھے پورے گاؤں میں اس واقعہ کا تذکرہ تھا' پڑوس میں دینو بٹی گوری سے میری دوستی ہوگئی تھی' وہ اکثر مجھ سے ملنے آجاتی تھی۔ اسے شہر کے بارے میں اور شہریوں سے متعلق جاننے کا بہت شوق تھا' وہ جب بھی آتی تھی اس قسم کی بات چیت اس سے ہوا کرتی تھی' میں اکثر اسے سمجھاتی تھی کہ وہ شہر سے محبت نہ کرے جسے شہر میں رہنے کی عادت پڑ جائے پھر وہ گاؤں میں نہیں رہ پاتا۔ شہر میں آزادی ہے گاؤں اسے قید لگے گا' میری بات پر وہ ہنس پڑتی۔
"میں شہر کے بارے میں ایسے ہی پوچھتی ہوں' میرا منگیتر بھی گاؤں میں رہتا ہے شادی ہونے پر اس کے ساتھ ہی رہنا ہے۔" وہ کہتی۔
"پھر انسان کا دل چاہتا ہے کہ وہ کچھ وقت کو ایک ایسی دنیا میں کھو جائے جو اس نے نہیں دیکھی ہو۔"
گوری شہر میں بہت کشش ہوتی ہے جو ایک بار شہر کی ہوا کھالے پھر وہ گاؤں آنا پسند نہیں کرتا۔" میں کہتی۔
میری بات پر وہ کچھ دیر کو خاموش ہوجاتی تھی پھر ہم دوسرے موضوعات پر باتیں شروع کردیتے تھے۔
آج جب گوری دوپہر میں آئی تو میں نے عارب کی ساس کے قتل' سسر اور بیوی کو زخمی کردینے کا ذکر چھیڑ دیا۔
"یہ جنگلی لوگ ہیں بظاہر انسان دکھائی دینے والے یہ لوگ حیوان سے بدتر ہیں۔" گوری نے کہا۔
"گوری یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" میں نے کہا۔
"میں سچ کہہ رہی ہوں دیکھو کتنی معمولی بات پر اس نے اپنی ساس کو قتل اور سسر اور بیوی کو زخمی کردیا۔"
"قصہ کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔
"معمولی سی بات تھی عارب کی بیوی تمنا اپنے میکے جانا چاہتی تھی اس کے ماں باپ اسے لینے آئے تھے' عارب کے والدین نے ان کے آنے پر خوشی خوشی تمنا کو جانے کی اجازت دے دی تھی لیکن عارب بیوی

کو میر پور خاص بھیجنا نہیں چاہتا تھا۔ عارب کام پر گیا ہوا تھا جیسے ہی اسے اطلاع ملی کہ تمنا کو اس کے والدین نے جانے کی اجازت دے دی ہے وہ غصے میں بھرا گھر پہنچا وہ گھر سے جاچکے تھے وہ اسٹاپ پہنچا اور ان پر فائرنگ کردی ہے جب اس کے والدین نے اجازت دے دی تھی پھر اسے کیا ضرورت تھی ان پر جا کر فائرنگ کرنے کی۔" گوری نے کہا۔
"گوری بات تم نے بالکل درست کی' یہ واقعی جہالت والی بات ہے۔" میں نے اس کی بات کی تائید کی۔
"عارب کا بھائی ناصر بھٹی اس سے بھی بڑا جاہل ہے۔" گوری رازدارانہ انداز میں بولی۔
"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔
"ناصر نے حیدرآباد میں اپنی پسند کی شادی کرلی تھی اور اپنی بیوی رخسار کو گاؤں لے آیا تھا وہ کئی ماہ گاؤں میں رہی پھر جب اس کو والدین کی یاد ستائی اور اس نے حیدرآباد جانے کی خواہش کی تو ناصر نے منع کردیا' جب اس کا میکے جانے کا زیادہ تقاضہ بڑھا تو ناصر نے اس پر تشدد شروع کردیا' معمولی معمولی بات پر روئی کی طرح دھنک دیتا تھا وہ بھی کب تک ظلم و ستم برداشت کرتی' ایک دن وہ خاموشی سے گھر سے نکل گئی وہ راستے میں تھی کہ ناصر کو خبر ہوگئی اور وہ پہنچ گیا۔ اس نے کوسٹر سے اسے نیچے اتار لیا اس کے ساتھ اس کے کئی دوست بھی تھے جو مسلح تھے اس لیے کسی کو ان کے معاملے میں بولنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ راستے میں تھانہ پڑتا تھا رخسار نے بچاؤ' بچاؤ کا شور مچادیا' تھانے سے پولیس باہر آگئی اور انہیں تھانے کے اندر لے گئے پولیس کو دیکھ کر رخسار کی ہمت بڑھ گئی تھی۔
"تھانیدار صاحب مجھے ان جنگلی انسانوں سے بچالو میں ان کے ساتھ نہیں جانا چاہتی۔" رخسار نے کہا۔
"کیوں بھئی کیا معاملہ ہے؟" ایس ایچ او نے ناصر بھٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"یہ میری بیوی ہے' بیوی گھر سے بھاگے تو میں اسے گھر لے جا کر رکھ نہیں سکتا۔"
"بیوی کو رکھ سکتے ہو اگر وہ تمہارے ساتھ رہنا چاہے۔" ایس ایچ او نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔
انہیں تھانے میں آئے کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ گاؤں کا وڈیرا بھی آگیا۔ وڈیرے کو دیکھ کر ایس ایچ او کا دم خشک ہوگیا' وڈیرے کے کہنے پر ایس ایچ او نے رخسار کو ناصر کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ رخسار ایس ایچ او کے پاؤں پڑتی رہی کہ اسے ان کے ساتھ جانے نہ دو' یہ مجھے قتل کردیں گے لیکن ایس ایچ او کی کیا مجال تھی کہ وڈیرے کے سامنے کچھ کہہ سکتے جانتی ہو پھر ناصر نے کیا' کیا؟" گوری نے پوچھا۔
"کیا کیا؟" میں نے پوچھا۔
"گھر پہنچ کر رخسار کو رات کی تاریکی میں قتل کرکے گھر کے صحن میں گڑھا کھود کر دفن کردیا۔ یہ کام بہت ہوشیاری سے کیا گیا تھا لیکن سال دو سال گزرنے پر گاؤں کے لوگوں کو پتا چل ہی گیا اس لیے انہیں کوئی پسند نہیں کرتا' نور محمد اور ہاشم کو بھی گاؤں میں کوئی لڑکی دینے کو تیار نہ تھا' اس لیے انہوں نے شہر جا کر نوکری کرنے کا ڈرامہ کیا اور تم دونوں سے شادی کرکے یہاں لے آئے ہیں۔" گوری نے کہا۔
"گوری تم ہوش میں یہ بات کر رہی ہو' نا۔" میں نے اس کے شانے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔
"ہاں ہاں میں ہوش میں ہوں لیکن یہ بات تم کسی سے نہ کہنا کہ یہ بات میں نے تمہیں بتائی ہے ورنہ یہ ہمارے دشمن ہوجائیں گے ان کی دوستی اور دشمنی دونوں ہی بری ہیں۔" گوری کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔
"گوری تم نے میرا دماغ الجھا کر رکھ دیا ہے' میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ ایسے لوگ

ہیں۔" میں نے کہا۔

"تم خود سوچو کہ کیا انہیں شہر جا کر کام کرنے کی ضرورت ہے ان کی اپنی زمینوں پر ڈھیروں کام کرنے والے مزدور ہیں۔"

"گوری مجھے نور محمد بتا رہا تھا کہ اس کے بابا ان کی نوکری کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"گاؤں میں کون سی فیکٹری یا آفس ہے کہ انہیں وہاں نوکری ملے گی' یہ سب ایسے ہی ڈرامہ باز ہیں۔" گوری نے کہا۔

وہ جا چکی تھی مگر اس کے انکشافات نے میرا دماغ الٹ کر رکھ دیا تھا' جلد بازی میں ہم دونوں بہنیں پھنس چکی تھیں۔ ابا کا موقف درست تھا' گاؤں کے لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتے ہیں' معلومات نہ ہونے پر ہمارے ساتھ دھوکہ ہو گیا تھا یہاں ہم مختصر عرصے میں اکتا گئے تھے۔ پوری زندگی یہاں گزارنا ہمارے لیے بہت دشوار تھا ویسے بھی نور محمد اور ہاشم کا جو ہمارے ساتھ رویہ تھا وہ تبدیل ہو چکا تھا' وہ گاؤں کے روایتی شوہر بن چکے تھے' ہمارے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کرنے لگے تھے ایک دن میں نے نور محمد کا موڈ اچھا دیکھ کر کہا۔

"نور محمد مجھے کتنے دن ہو گئے ہیں گاؤں میں رہتے ہوئے لیکن ہمیں اتنی بھی آزادی نہیں ہے کہ محلے میں کسی گھر میں جا سکیں۔"

میں نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ نور محمد کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور اس نے جوتا نکال کر مجھ پر جوتوں کی بارش کر دی۔ وہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا' میرے شور کرنے پر میری ساس اور نندیں کمرے میں آ گئیں۔ انہیں دیکھ کر وہ غصے سے باہر چلا گیا' انہیں دیکھ کر میں رو پڑی' میرے تفصیل بتانے پر ساس الٹا مجھ پر برس پڑیں۔

"تمہیں ضرورت ہی کیا تھی ایسا کہنے کی' تم یہ آئے دن کراچی جانے کی ضد چھوڑ دو' گھر سے بھاگ کر شادی کرنے والی لڑکیوں کو ان کے گھر والے' خاندان والے منہ نہیں لگاتے پھر تم کس کے پاس جاؤ گی' یہاں کیا دکھ ہے تمہیں' بولو جو تم اوٹ پٹانگ ضد کرتی رہتی ہو۔ محلے میں ہم کسی کے یہاں آنا جانا پسند نہیں کرتے اس لیے تم اپنے دل سے محلے والوں سے راہ رسم بڑھانے کا نکال دو۔"

"ایسے تم لوگوں کے کیا راز ہیں جو محلے والوں سے ملنے پر ظاہر ہو جائیں گے۔" میں نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔ جوتے مجھے زور کے لگے تھے اور مجھے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔

"زبان سنبھال کر بات کر آئندہ ایسی بات کرنے پر تیری گدی سے زبان کھینچ لوں گی۔" میری ساس طیش میں آتے ہوئے بولی۔

اسے غصہ میں دیکھ کر میں نے اپنی بہتری اس میں جانی کہ خاموشی اختیار کر لوں۔ عدیلہ بھی شور سن کر کمرے میں آ گئی تھی' وہ کچھ دیر مجھے غصے سے گھورتی رہیں میری خاموشی پر وہ جیسے کمرے میں آئی تھیں چلی گئیں۔

"باجی ان جنگلی لوگوں کے منہ نہ لگا کریں انہیں کہاں تمیز کہ انسانوں سے کیسے بات کی جاتی ہے۔" عدیلہ بولی۔

"ہاں یہ واقعی جنگلی ہیں جو ظلم سہہ لے پھر اس پر اور زیادہ ظلم کرتے ہیں۔"

"باجی اس طرح کام نہیں چلے گا' ہمیں یہاں سے فرار حاصل کرنی ہو گی۔"

"فرار ہو کر کہاں جائیں' ہمیں کون قبول کرے گا۔" میں نے کہا۔

"باجی میرے ذہن میں یہ بات آئی ہے کہ فی الحال ہم حیدرآباد چلتے ہیں' وہاں میری سہیلی انیلا رہتی ہے اس کے گھر چلے جاتے ہیں جب وہاں ذہن آزاد ہو گا پھر سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے۔" عدیلہ نے کہا۔

"بات تمہاری ٹھیک ہے انیلا بہت اچھی لڑکی ہے وہ ہماری ضرور مدد کرے گی۔" میں نے کہا۔

"باجی یہ کرنا بہت ضروری ہو گیا ہے ورنہ ہم یہاں گھٹ گھٹ کر مر جائیں گے۔" عدیلہ نے کہا۔

گوری سے میں باتوں باتوں میں پہلے ہی معلومات حاصل کر چکی تھی کہ بس اسٹاپ سے گاڑی کس وقت تک آتی ہے' ہمیں بہت ہوشیاری سے کام لینا تھا۔ ذرا سی بھی بے احتیاطی ہمیں مشکل میں ڈال سکتی تھی۔

ایک دن نور محمد کسی کام سے شہر گیا تھا' رات میں اس کی واپسی ممکن نہیں تھی کیونکہ جس کام سے وہ شہر گیا وہ کام ہوا نہیں تھا اس لیے وہ وہاں رک گیا تھا۔ آج کی رات میرے لیے بہت اچھی تھی یہ سوچ کر میں کمرے میں جا کر جلدی لیٹ گئی اور بہانہ کیا کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ عدیلہ نے باہر جاسوسی کا کام سنبھال لیا تھا وہ مجھے پل پل کی خبر دے رہی تھی' صحن کا راستہ صاف ہونے پر عدیلہ میرے کمرے میں آئی۔

"باجی راستہ صاف ہے' سب ٹی وی والے کمرے میں بیٹھے ڈرامہ دیکھنے میں مصروف ہیں۔"

"مجھے اس موقع کا انتظار تھا۔" میں نے کہا۔

میں نے ذرا بھی تاخیر نہیں کی اور بستر میں تکیے اس طرح لگائے کہ سو رہی ہوں۔ یہ کام کر کے میں نے صحن میں جھانکا' صحن میں سناٹا تھا۔

"عدیلہ تم بہانے سے صحن میں بیٹھ جانا' کوئی میرا پوچھے تو یہی کہنا کہ میں سو رہی ہوں' تمہارے یہاں موجود ہونے کی صورت میں انہیں کسی طرح بھی شک نہیں ہو سکے گا اور میں آسانی سے شہر پہنچ جاؤں گی' تم سمجھ رہی ہو نا میری بات۔" میں نے عدیلہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"جی باجی۔"

"شہر پہنچ کر ہی میں اس پوزیشن میں آ سکتی ہوں کہ تمہیں یہاں سے چھڑا کر لے جاؤں۔" میں نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے بڑی سی چادر میں خود کو لپیٹا اور بغیر آواز پیدا کیے گھر سے نکل گئی' سچ تو یہ ہے کہ میں گھر سے باہر نکل آئی تھی میرا دل بری طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ رات کی تاریکی میرا حوصلہ بڑھا رہی تھی کہ کچھ نہیں ہو گا۔ بس اسٹاپ پر آخری وین شہر جانے کو تیار تھی میرے وین میں بیٹھتے ہی وہ چل پڑی۔ میں دل ہی دل میں قرآنی آیات کا ورد کر رہی تھی اور یہ نیت بھی کر لی تھی کہ شہر خیریت سے پہنچ کر دو رکعت نفل ضرور پڑھوں گی۔ راستے میں جب بھی کوئی سواری اترتی تو دل زور سے دھک دھک کرنے لگتا۔ سواری کے اترنے پر جب وین چل دیتی اس وقت مجھے اطمینان ہو جاتا۔ میں وقفے وقفے سے پیچھے کی طرف بھی دیکھ رہی تھی لیکن رات کی تاریکی میں پیچھے کا منظر نظر نہیں آ رہا تھا۔ شہر آنے پر میں نے سکھ کا سانس لیا' میں سیدھی انیلا کے گھر پہنچی اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے۔ انیلا رات میں مجھے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی وہ مجھے اپنے کمرے میں لے کر چلی گئی۔ گھر کے افراد نے مجھ سے رسمی ملاقات کی اور سونے کو چلے گئے۔ وہ جلدی سو جانے کے عادی تھے آج اتفاق سے اتنی دیر تک جاگے ہوئے تھے۔ رات دیر تک میں اور انیلا باتیں کرتے رہے' میں نے اسے اپنی ساری روداد سنا دی۔ اسے ہماری شادی کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں تھا' اسے ہمارے بارے میں معلومات جان کر بڑی حیرت ہوئی تھی موقع کی نزاکت ایسی تھی کہ ہمیں فوری کارروائی کرنی تھی گڑبڑ ہو سکتی تھی ممکن تھا کہ وہ عدیلہ کو جانی نقصان پہنچا سکتے تھے۔ انیلا کے بھائی قاسم کا ایک دوست عباس علی ایڈووکیٹ تھا' اس طرح کے معاملات سلجھانے میں وہ ماہر تھا' انیلا نے ناشتے کی ٹیبل پر اپنے بھائی سے بات کی جس پر اس نے اپنے صبح کے کام چھوڑے اور مجھے لے کر کورٹ پہنچا اس وقت حبس بے جا کی درخواست تیار کی گئی اور سیشن جج کی عدالت میں داخل کر دی گئی۔

عدالت نے سول جج کو ریڈ کمشنر مقرر کر کے عدیلہ کو بازیاب کرنے کا حکم دے دیا۔ سول جج نے جس وقت ریڈ کیا عدیلہ پر تشدد کیا جارہا تھا، آج عدیلہ کو عدالت میں پیش کردیا گیا تھا۔ عدیلہ کے جسم پر چوٹ کے نشان اس بات کی نشاندہی کررہے تھے کہ یہ لوگ کس قدر ظالم ہیں۔" میں نے عدیلہ کے جسم پر چوٹ کے نشان کورٹ رپورٹر کو دکھاتے ہوئے کہا۔

"راحیلہ واقعی تمہارے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے، والدین اپنی اولاد کا بھلا ہی چاہتے ہیں مگر اولاد سمجھتی ہے کہ وہ ان کا برا کررہے ہیں۔"

"خلیل جبار تم یہاں سیشن کورٹ میں ہو اور میں تمہیں سول عدالتوں میں ڈھونڈ رہا ہوں۔" استاد پیارے نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آج سیشن کورٹ میں بڑی اچھی خبر ہے اس لیے میں یہ خبر لینے کو رک گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اچھا اچھا یہ تم نے بہت اچھا کیا کہ یہ خبر لے لی ہے، مجھے تم سے بہت امیدیں وابستہ ہیں۔ کورٹ کی خبروں میں ایک دن تم ضرور نام پیدا کرو گے۔" استاد پیارے نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

استاد پیارے خواتین کو دیکھ کر بہت خوش ہوجاتا ہے ان کا اخبار خواتین کی خبروں کو بہت ہی شاندار طریقے سے لگاتا تھا اور ان کا اخبار بھی خاص کر ۵۰ سے ۶۰ سال کی عمر کے لوگوں میں بڑا مقبول تھا وہ اخبار کی خبروں کو بڑے چسکے لے کر پڑھتے تھے اور آفس میں ہونے پر وہ اخبار آفس میں ہی اور اگر بس میں ہیں تو بس میں ہی چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ ان کے اس اقدام سے ایسا لگتا ہے کہ وہ اکیلے ہی اخبار پڑھ کر اپنی تسکین کرنا چاہتے ہیں۔

"استاد پیارے یہ خبر تمہارے اخبار میں بڑی اچھی لگے گی۔" میں نے استاد پیارے کے قریب آنے پر کہا۔

عدالت نے دونوں کا بیان لے کر انہیں اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کی اجازت دے دی تھی۔ نور محمد اور ہاشم کو دونوں بہنوں کو ہراساں نہ کرنے کی تنبیہہ کردی گئی تھی۔

"عباس علی ایڈووکیٹ صاحب اب اس مقدمے میں مزید کارروائی کیا ہوگی؟" استاد پیارے نے پوچھا۔

"درخواست میں ہم نے یہی موقف اختیار کیا تھا کہ عدالت عدیلہ کو بازیاب کرکے دونوں بہنوں کو قانونی تحفظ فراہم کیا جائے اور ملزمان کو ہراساں کرنے سے روکا جائے، اس پر عدالت نے کارروائی مکمل کرکے درخواست نمٹادی ہے۔"

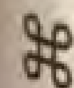
"ایک مسئلہ ابھی باقی ہے کہ ملزمان حق زوجیت کا دعویٰ کرسکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں ایسا ہوسکتا ہے لیکن ہم اس سے پہلے ہی سول کورٹ میں خلع کی درخواست داخل کردیں گے۔ کورٹ کے ذریعے خلع ہوجانے پر دونوں بہنیں مکمل طور پر آزاد ہوکر اپنی زندگی گزار سکیں گی۔"

"راحیلہ اب تم کیا کرو گی؟"

"ہم اپنے والدین کے گھر واپس جائیں گے وہ وقتی طور پر غصہ کریں گے جو ان کا حق ہے لیکن وہ اتنے ظالم نہیں ہیں کہ ہمیں زمانے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں وہ ہمیں اپنی پناہ میں ضرور لیں گے۔ اس واقعہ سے ہمیں یہ نصیحت ضرور ہوگئی ہے کہ والدین جہاں چاہیں گے وہیں شادی ہوگی۔ ان کی خوشی میں ہی ہماری خوشیاں پوشیدہ ہیں۔" راحیلہ نے اپنی آنکھوں میں آئے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

خبر مکمل ہوچکی تھی اس لیے میں نے اپنی نوٹ بک بند کرلی۔



عبرت مقام

دوسروں کا حق مارنا اور اس مال پر اپنا حق جتانا مسلمانوں کا شیوہ نہیں اور اسلام نے بھی اس بارے میں سخت احکامات دیئے ہیں مگر ہم نے دنیا کو اپنا اصل مقام سمجھ لیا ہے۔ اس لیے ہر وہ کام کرنے میں ہمیں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی جس کے لیے سختی سے منع کیا گیا ہے۔

پاکستان بننے سے قبل کے ایک سچے واقعہ کا احوال

"کیا بات ہے گنگا رام جی! کس چنتا میں ڈوبے ہیں؟" چونی رام نے گنگا رام کو دکان کے سامنے بنے چبوترے پر کسی گہری سوچ میں گم بیٹھا دیکھ کر رک کر پوچھا۔ وہ گنگا رام کی دکان کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ اس کی نظر ان کے غمگین اور متفکر چہرے پر پڑی، جبھی رک کر وجہ پوچھ لی۔

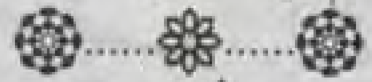
"کچھ نہیں چونی رام جی!" گنگا رام اداس لہجے میں بولا اس کی آواز پست تھی۔

"کوئی بات تو ہے بتائیے کیا سمسیا ہے؟" چونی رام نے گنگا رام کے قریب چبوترے پر بیٹھ کر اپنا داہنا ہاتھ اس کے کاندھے پر رکھا اور ہمدردانہ لہجے میں بولا۔ اس کی بات پر گنگا رام نے سر نفی میں ہلایا، اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

"گنگا رام جی! آپ اس بڑھاپے میں کب تک تنہائی اور اکیلے پن کے ساتھ گھٹ گھٹ کر جئیں گے۔ میری مانیے تو بیٹے اور بہو کے پاس چلے جائیں، یہاں آپ کا کون ہے جو آپ کی سہائتا کرے گا۔" چونی رام اپنے قیاس کے مطابق گنگا رام کو تسلیاں دینے لگا۔

"چونی رام جی! اتنا آسان نہیں ہوتا اپنے پرکھوں کے بنائے آشیانوں کو غیروں کے حوالے کرنا۔ آپ تو جانتے ہیں ان مسلمانوں کی ہماری زمین جائیداد، یہ دکان یہ مکان خریدنے کی ہستی ہی نہیں، یہ سب یونہی تو چھوڑ کے نہیں جایا جاسکتا ناں۔" گنگا رام بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"پر گنگا رام جی! میں نے کئی مسلمانوں کے منہ سے آپ کے بیٹے کشن بابو اور بہو کے ہندوستان چلے جانے کا سنا ہے اور جلد یا بدیر یہ لوگ ایک ایک ہندو اور سکھ کو چن چن کے یہاں سے نکال باہر کریں گے۔ بٹوارہ ہوچکا اب زمین جائیداد کی فکر چھوڑ کر اپنی چنتا کریں۔ اس بڑھاپے کے ساتھ آپ اکیلے ان کا مقابلہ کیسے کرپائیں گے۔ ہم بھی دو ایک دن میں کچھ نہ کچھ کرکے اپنے دیش جانے کی کریں گے۔ اب یہ ہمارا دیش ہے نہ یہاں کے باسی ہمارے درد......" چونی رام بھویں سکیڑ کر بولا۔ اس کی بات پر گنگا رام سر ہلا کر رہ گیا۔



اگلے دو دنوں میں چونی رام اور اس کے ساتھ کے تمام ہندوؤں کو پاکستان کی حکومت کے حکم کے مطابق سرکاری کارندے سرکاری گاڑیوں میں لینے نکلے، کچھ بلا حیل و حجت، کچھ تھوڑی بہت مزاحمت کے بعد اور کچھ زبردستی سرکاری گاڑیوں میں سوار ہوگئے مگر گنگا رام نے کسی بھی قیمت پر کسی بھی صورت اپنا سب کچھ چھوڑ کر جانے سے انکار کردیا۔ کافی منت ترلوں اور دھمکیوں کے باوجود گنگا رام جب کسی صورت نہ مانا تو مجبوراً حکومت کے کارندوں نے اسے زبردستی گاڑی میں بٹھالیا۔ گنگا رام نے کافی مزاحمت کی، خوب واویلا مچایا مگر اس کی ایک نہ چلی اور اس کی ہٹ دھرمی کے باعث حکومتی کارندوں نے اسے خالی ہاتھ ہی دھرلیا۔ اس کا گھر بار، دکان اور سارا ساز و سامان وہیں رہ گیا۔ یہاں تک کہ اس کو گھر بند کرنے تک کی مہلت نہ ملی اور آناً فاناً سب ہوگیا۔

۞......۞......۞

اگلے دن حکومت کی طرف سے کچھ لوگ گنگارام کے گھر اس کا سازوسامان اٹھانے آئے شاید گنگارام نے اپنے گھربار اور سامان کی بابت وہاں بھی شور مچایا ہوگا۔ اسی کی ایجاد پر اس کا سامان وغیرہ اٹھائے جانے کے لیے ہی وہ لوگ آئے مگر یہاں آ کر دیکھنے پر سارا گھر اور دکان خالی پڑے ملے ایک تنکا برابر کوئی چیز کہیں نہ مل پائی۔

اردگرد بسنے والے مسلمان خاندانوں سے پوچھ گچھ کی گئی مگر سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

"صاب...... امام علی کا گھر گنگا بھائی کے گھر کے ساتھ ہے آپ ان سے پوچھیں وہ ضرور جانتے ہوں گے کہ سامان وغیرہ کہاں گیا۔" کرم دین نے کہا۔

"چلیے انہی سے چل کر پوچھتے ہیں۔" ان میں سے ایک شخص بولا اور سب امام علی کے گھر کی طرف چل دیئے۔ اس بستی کے لوگ بہت پسماندہ زندگی گزار رہے تھے۔ پاکستان بننے سے قبل ان علاقوں اور بستیوں میں ہندو، مسلمان شیروشکر ہو کر رہتے تھے۔ کہیں کسی کے دل میں کوئی تفرقہ، بغض، تعصب یا کسی طرح کی تنگ دلی کا ہلکا سا شائبہ تک نہ تھا۔ کرم دین اور اس جیسے، بہت سے مسلمان گھرانوں کے گنگارام اور دیگر ہندو باشندوں کے ساتھ بہت گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ سب ہی ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں برابر شریک ہوتے، سادہ لوح لوگ تھے۔ سچائی ان کے چہروں سے جھلک رہی تھی، تفتیشی ٹیم کے لوگوں کو ان کے اندازِ گفتگو اور چہروں کے تاثرات سے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ گنگارام کے سامان کے متعلق واقعی کچھ نہیں جانتے۔ اس لیے وہاں موجود تقریباً سبھی لوگ گنگارام کے گھر سے متصل امام علی کے گھر کی طرف چل دیئے دروازہ بجانے پر امام علی کا بیٹا فضل باہر آیا۔

"ہمیں امام علی سے ملنا ہے، کیا وہ گھر پر ہیں؟" حکومتی کارندوں میں سے ایک نے بارعب انداز میں کہا۔

عجیب بات تھی کہ امام علی کے گھر کے بالکل قریب اتنے سارے لوگ جمع ہو کہ گفت وشنید کر رہے تھے۔ علاقے کے تقریباً تمام مرد اور بچے گنگارام کے گھر کے سامنے جمع تھے مگر امام علی کے گھر کا دروازہ بند رہا نہ ہی کسی نے گھر کے باہر ہونے والی کارروائی کے متعلق جاننے کی کوشش کی اور نہ گھر سے باہر جھانکا تھا۔

"جی...... وہ...... ابا جی سو رہے ہیں۔" فضل نے اٹک اٹک کر کہا۔

"جگایئے انہیں، ہمیں ضروری بات کرنی ہے۔" حکومتی کارندے نے کہا۔

"جی......" یہ کہہ کر فضل اندر چلا گیا، جلد ہی ایک اونچا لمبا سا مرد باہر آیا۔

"بھئی کیا بات ہے؟" اس نے بھاری آواز میں کہا۔

"نمبردار جی! یہ حکومت کے بھیجے لوگ ہیں، گنگارام کا سامان لینے آئے مگر گنگارام کا گھر کھلا ہے اور ان کا سارا سامان غائب ہے۔ آپ نے رات کسی کو گنگارام کے گھر میں داخل ہوتے اور سامان لے جاتے دیکھا ہے؟"

"نہیں تو ہمیں کیا معلوم......" امام علی نے اکھڑ لہجے میں کہا۔

"نمبردار صاحب! ہم سب سے پوچھ پڑتال ہو رہی ہے، آپ علاقے کے نمبردار ہیں اور دوسری بات آپ کا گھر گنگارام کے گھر سے بالکل قریب ہے تو......" ایک بزرگ انہیں سمجھانے کے لیے آگے بڑھے۔

"تو...... کیا کروں میں کہ میرا گھر اس ہندو کے گھر کے پاس ہے تو......" امام علی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ بزرگ سر جھکا کر پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے سب ہی چپ ہو گئے۔

"دیکھیے ہمیں آرڈر ہوا ہے کہ گنگارام کا سامان لے کر آئیں اب سامان غائب ہے تو ہمیں پنچایت بٹھانی ہوگی۔ یہاں موجود تمام لوگوں سے حلفیہ بیان لیا جائے گا۔" حکومت کے کارندوں نے گویا فیصلہ سنا دیا، وہاں موجود سبھی نے اتفاق کرتے ہوئے سر ہلا دیا جب کہ امام

علی پہلو بدل کر رہ گیا۔ پنچایت اگلی صبح بلائے جانے کا طے ہوا اور چند ہی لمحوں میں بھیڑ چھٹ گئی اور حکومت کی طرف سے آئے لوگ بھی واپس چل دیئے۔

۞......۞......۞

1947-48 کا عرصہ جہاں ہندوستان کو دو حصوں میں بانٹ گیا، وہیں پر چند ماہ برسوں سے ایک ساتھ بسنے والے لوگوں کے دلوں کو بھی دو حصوں میں بانٹ گیا۔ پہلے جہاں اخوت و بھائی چارے کے مظاہرے ہوتے تھے اب ان لوگوں کے دلوں میں بھی تعصب کی آگ بھڑکنے لگی تھی، ان چھوٹی چھوٹی بستیوں میں جہاں لوگوں کو بھوک اور افلاس سسک سسک کر جینے پر مجبور کیے ہوئے تھی، وہاں ان بستیوں کے باسیوں میں ہندو و مسلم تفرقے اور مذہبی اختلافات کا احساس تک نہ تھا۔ احساس تھا تو بس ایک دوسرے کے دکھ درد کا، انسانیت کا، بنا کسی رنگ، نسل، مذہب اور قوم کے اختلاف اور جھگڑے کے یہ تمام لوگ مل جل کر رہتے تھے۔

تقسیم کے بعد چند ہفتوں میں ہی سب کچھ الگ ہو کر رہ گیا۔ لوگوں کو مذہب اور قوم کا فرق نظر آنے لگا اور یہ فرق انسانیت پر حاوی ہو گیا۔ ایک دوسرے کے دکھ درد کا احساس مٹ گیا، گنگارام اور کرم دین دریا کے دو الگ الگ کناروں پر جا کھڑے ہوئے، جن کا ملنا ناممکن ہو، کچھ بے ایمان اور کم ظرف لوگوں کی وجہ سے دونوں طرف ایسی لوٹ مار شروع ہوئی کہ کسی کے پاس کچھ نہ بچا۔ گنگارام اپنے سازوسامان اور زمین جائیداد کو روتا پیٹتا ہندوستان روانہ کر دیا گیا اور ادھر سے مسلمان اپنا سب کچھ گنوا کر خالی ہاتھ اپنی دھرتی اپنی سرزمین پر آ کے سجدہ ریز ہو گئے۔ وقت نے آہستہ آہستہ زخم مندمل کرنا شروع کر دیئے، کچھ کو ان کے صبر اور قربانیوں کے عوض قدرت نوازنے لگی اور کچھ پر قدرت کا مکافاتِ عمل شروع ہوا۔

۞......۞......۞

بھائی کرم دین! ذرا فرصت ملے تو قبرستان جا کے اپنے والد کی قبر دیکھ لینا، مجھے زیادہ پہچان تو نہیں پر شاید وہ تمہارے والد ہی کی قبر ہے، جس پر بے شمار سوراخ ہوئے ہیں اور ان میں سے......" رک کر مولا بخش نے شرمسار سا ہو کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"کیا بات ہے بھائی بخشو! ان میں سے کیا......؟"

کرم دین تیزی سے بولا اس کا دل دہل کر رہ گیا۔

"او...... کچھ نہیں یار کرمو! بس تُو جا کے چاچے کی قبر دیکھ بھال لینا۔" فیض الٰہی نے مصالحانہ انداز میں کہا۔ کرم دین متفکرانہ انداز میں سر ہلا کر تیزی سے گھر کی طرف چل دیا۔

"حیاتی...... او حیاتنے!" گھر میں داخل ہوتے ہی کرم دین اپنی بیوی کو آواز دینے لگا۔ حیاتی آٹے میں لتھڑے ہاتھوں کے ساتھ بدحواس ہو کر رسوئی سے نکلی۔

"خیر تو ہے کرم دین؟" وہ پریشان آواز میں بولی۔

"ہاں...... بس تُو جلدی سے میرے ساتھ قبرستان چل۔" کرم دین نے بے تابی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"یا اللہ کیا ہوا ہے، قبرستان کیوں جانا ہے۔" حیاتی کلیجہ تھام کر بولی۔ اس کی باتوں نے کرم دین کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا۔

"او کیا پتا مجھے کیا ہوا ہے۔ تُو زیادہ سوال مت کر بس چل میرے ساتھ۔" اس نے تپ کر کہا تو حیاتی سر ہلا کر اندر بھاگی۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں قبرستان کی طرف جا رہے تھے، ان کے قدم تیز چلنے سے لڑکھڑا رہے تھے جلد ہی وہ دونوں قبروں پر سے گزرتے نظام دین کی قبر پر پہنچ گئے۔ قبر صحیح سلامت دیکھ کر بے ساختہ کرم دین کے منہ سے کلمہ شکر ادا ہوا۔ آتے ہوئے راستے میں اس نے حیاتی کو بھی اپنے قبرستان آنے کی وجہ بتائی تھی، وہ بھی سخت متفکر تھی مگر قبر کو ٹھیک اور اچھی حالت میں دیکھ کر دونوں کے سینوں میں اٹکے سانس بحال ہوئے تھے۔ کرم دین نے فاتحہ کے لیے ہاتھ بلند کیے ہی تھے اس کی نظر اپنے والد کی پائنتی کی طرف ان کی قبر کے ساتھ والی قبر پر پڑی تو اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ حیاتی کی نظر اس قبر پر پڑی تو

بے ساختہ "ہائے او میرے ربا!" کہتی بھاگتی ہوئی قبر سے دس قدم دور جا کر کھڑی ہوئی اور خوف زدہ نظروں سے قبر کی جانب دیکھنے لگی۔ کرم دین بھی اپنے سامنے کا پلو منہ پر رکھ کے قبر سے دور ہو گیا۔

"کرم دینے...... یہ تو چاچا نمبردار کی قبر ہے۔" حیاتی سہمی ہوئی آواز میں بولی۔

"بس ربّ سوہنے کا انصاف ہے اللہ ہمیں ایسے گناہوں اور اپنے عذاب سے بچائے۔" کرم دین رندھی ہوئی آواز میں بولا۔

"میرے ربّ تُو ہم گناہ گاروں کو معاف کرنا، ہم پر رحم کرنا۔" دونوں لرزتی آوازوں میں اپنے ربّ سے التجائیں کرتے واپس پلٹ گئے۔ حیاتی کو گھر کی طرف روانہ کر کے وہ نمبردار امام علی کے گھر کی طرف چل دیا۔ ان کے گھر پہنچ کر قدرے جھجکتے ہوئے اس نے صورت حال نمبردار کے بیٹے فضل اور اس کی بیوی کے گوش گزار کی۔

"بکواس بند کر واوئے کرمو! ایسی ہی سنی سنائی اڑانا تو تم کم ذات کمیوں کا شیوہ ہے۔" فضل کی بیوی کڑک کر بولی۔

"جناب! مجھے کفن نصیب نہ ہو مرنے کے بعد جو اگر میری بات جھوٹ ہو۔ آپ خود جا کے اپنی نظروں سے دیکھ لیں۔" کرم دین ٹھوس لہجے میں بولا اور سر جھٹک کر باہر نکل آیا۔

گھر پہنچ کر وہ تپا ہوا سا چارپائی پر آ بیٹھا اور منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگا۔

"کیا کہا ان لوگوں نے؟" حیاتی پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھا کر بولی۔

"کیا کہنا ہے ان لوگوں نے' پیسے اور نمبرداری کا رعب۔ اونہہ! اور پیسہ بھی کیسا لوٹ کی دولت اور جھوٹ کی شان۔"

"سارا گاؤں جانتا ہے امام علی نے پنچائیت میں قرآنِ پاک کی جھوٹی قسم کھائی تھی' چند برس بعد ہی ان لوگوں نے گنگا رام کا سامان برتنا شروع کر دیا تھا۔ سارا گاؤں اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔"

"او عقل کے اندھے نہیں ہیں لوگ' بڑی آئی چوہدرائن! ہم کمی کمین ہیں پر حق حلال کی کھاتے ہیں۔ ربّ سوہنا معاف کرے' دیکھا کر دیا ناں ربّ سچے نے انصاف۔ دیکھا ناں تُو نے......" کرم دین بولا۔

"ٹھیک کہتا ہے تُو کرم دینے! ربّ چاچا امام علی کی مغفرت کرے۔" کہتے ہوئے حیاتی کانوں کو ہاتھ لگانے لگی۔

توبہ توبہ......" دونوں افسوس سے سر ہلانے لگے۔

❁......❁......❁

فضل کے ساتھ اس کے گھر کے سب افراد قبرستان میں جمع تھے' اس کے گھر کی عورتیں قبر پر مٹی گارے کی لپائی کر رہی تھیں' لپائی کا مرحلہ بہت تکلیف دہ اور کٹھن تھا مگر جیسے تیسے تکمیل کو پہنچا تو فضل اور اس کے اہلِ خانہ نے سکون کا سانس لیا اور گھر کی طرف چل دیئے۔ اگلی صبح فضل دوبارہ قبر کا جائزہ لینے کے لیے قبرستان پہنچا مگر لپائی کے باوجود قبر کی وہی حالت دیکھ کر اس کا پسینہ چھوٹ گیا۔ قبر میں سے وہی کالے' موٹے اور بھدے' خوف ناک مکوڑے تیزی سے نکل رہے تھے۔ جنہوں نے قبر کو چھلنی بنا کے رکھ دیا تھا۔ بڑے بڑے سوراخوں میں سے نکلتے وہ خوفناک مکوڑے عجیب دہشت ناک منظر پیش کر رہے تھے۔ فضل دہل کر الٹے پاؤں قبرستان سے باہر کی طرف بھاگ اٹھا۔

☯

وجود محبت

محبت ایک لازوال جذبہ ہے۔ یہ جس کے دل میں پیدا ہو جائے اسے دنیا و مافیہا سے بے گانہ کر دیتی ہے۔ محبت چاہے کسی کی بھی ہو وہ اسے باغی بنا دیتی ہے اور یہ جذبہ اس سے صحیح و غلط کی تمیز چھین لیتا ہے۔ مگر کہتے ہیں کہ قدرت کی لاٹھی بے آواز ہے۔ جب چلتی ہے تو اچھے اچھوں کے دماغ ٹھکانے لگا دیتی ہے۔

بیٹی کی محبت میں گرفتار ایک باپ کا قصہ عجب

اس رات میں گاؤں سے ابھی نکلا ہی تھا کہ زوروں کی بارش شروع ہو گئی مگر چونکہ میں گھر سے کافی دور نکل آیا تھا اس لیے میں نے سوچا کہ گھر واپس جانے سے بہتر ہے کہ ڈیرہ ہی چلا جاؤں۔ یہ رات کے کوئی دس بجے کا عمل تھا سردیوں کی راتیں تھیں جب بارش شروع ہوئی تو اس کے ساتھ ہی تیز سرد ہوا بھی چلنے لگی بارش کافی تیز تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں کچے راستے میں پانی کھڑا ہونے لگا۔ میں نے جوگر پہنے ہوئے تھے۔ میں جو پہلے ہی بارش دیکھ کر کافی تیز چل رہا تھا۔ بارش کے تیز ہوتے ہی دوڑنے لگا۔ اس تیزی میں میرے گر جانے کا خطرہ ضرور تھا مگر میں جلد اپنی منزل پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔

میں دوڑتا ہوا جا رہا تھا کہ اچانک بجلی چمکی اور بادل زور سے گرجے اور اس کے ساتھ ہی اولے پڑنے لگے اور کسی نے میرا نام لے کے مجھے پکارا۔ میں بھاگتے بھاگتے اچانک رکا' ادھر ادھر دیکھا' جس راستے پر میں جا رہا تھا اس کے دونوں طرف کماد کے کھیت تھے۔ رات اندھیری تھی بارش زور و شور سے جاری تھی اور میں تقریباً سارا ہی پانی میں شرابور ہو چکا تھا۔ بجلی بار بار چمک رہی تھی اور بادل گرج رہے تھے۔ میں نے آواز دینے والے کو ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کی مگر مجھے کوئی نظر نہ آیا۔ میں نے اس بات کو اپنے ذہن کا واہمہ سمجھا اور وہاں سے نکلنے کی کوشش کی مگر اس دفعہ واضح طور پر کسی نے کماد کے کھیت میں سے مجھے میرے نام سے پکارا اور اس آواز سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ کسی لڑکی کی آواز تھی۔ رات کے اس پہر' تیز بارش میں یہ کون جو مجھے پکار رہی تھی؟ اور حد تو یہ کہ وہ میرا نام بھی جانتی تھی۔

ایک دفعہ تو مجھے یوں لگا کہ جیسے یہ میرا واہمہ ہو اسی وقت ایک دفعہ پھر بجلی چمکی اور بادل زور سے گرجے تو میں نے کسی لڑکی کو کماد کے کھیت میں کھڑے ہوئے دیکھا' اجلی سفید رنگت' لانبی گھنیری پلکیں' مدھ بھری آنکھیں اور آنکھوں میں کاجل' ہلکا سا میک اپ کیے اور ہاتھ میں پرس لیے یوں کہ جیسے کوئی حسینہ رات کے وقت لاہور کے مال روڈ پر سیر کرنے کے لیے نکلی ہو یا پھر کوئی حور آسمان سے اتر کے اس وقت بارش کا مزہ لے رہی ہو مگر اس وقت جب سارا گاؤں سو رہا تھا اور میں کسی مجبوری کی وجہ سے ڈیرے پر جا رہا تھا۔ بارش زوروں پر تھی اور سونے پر سہاگہ یہ کہ اس وقت اولے بھی پڑ رہے تھے اور ایسے ماحول میں کسی ماڈرن شہری لڑکی کا یہاں پائے جانے کا تصور ہی محال تھا۔ کجا یہ کہ وہ حقیقت میں موجود تھی۔ میں کسی خیال کے تحت واپس گاؤں کی طرف بھاگا۔

مگر میرے بھاگنے کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا کیونکہ میرے پیچھے ہی وہ بھی بھاگ رہی تھی اور میرا نام لے کر مجھے اپنی طرف بلا رہی تھی۔ اس کی اس بات نے میرے یقین کو اور بھی پختہ کر دیا ہو نا ہو یہ کوئی اوپری مخلوق ہی تھی اور اس یقین نے مجھے اور تیز بھاگنے پر مجبور

کر دیا مگر شاید وہ مخلوق بھاگنے میں بھی مجھ سے تیز تھی اس نے اچانک پیچھے سے میری گرم چادر پر ہاتھ ڈالا جو کہ اب بارش کے پانی میں بھیگ چکی تھی۔ میں نے جلدی سے گرم چادر کی بکل اپنے آپ سے اتار کر پھینک دی مگر وہ مخلوق شاید اس پر بھی راضی نہ ہوئی اور اچانک اس نے میرے کالر کو پیچھے سے پکڑ کر کھینچا اور مجھے زمین پر گرا دیا اور میرے زمین پر گرتے ہی وہ میرے اوپر آن گری اور ہم دونوں پانی اور کیچڑ میں کافی دور تک گھسٹتے چلے گئے اور اچانک میرا سر کسی سخت چیز سے ٹکرایا جس نے میرے چودہ طبق روشن کر دیے۔ اب وہ مخلوق مجھے چھوڑنے والی کہاں تھی۔ اس نے گرتے ہی میرے دونوں بازو مضبوطی سے پکڑ لیے تھے اور جونہی ہم رکے اس نے زور سے مجھے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔

☆☆......☆☆

یونیورسٹی میں ہم دونوں کلاس فیلو تھے۔ ساری یونیورسٹی میں ہمارا معاشقہ زبان زد عام تھا۔ سارے اسٹوڈنٹس ہمیں لیلیٰ مجنوں کی جوڑی سے تشبیہ دیتے تھے گو کہ میں ایک چھوٹے سے زمین دار گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور وہ ہمارے ملک کے ایک بہت بڑے سرمایہ دار باپ کی بیٹی تھی، میں نے اسے کئی دفعہ اپنی اوقات کے بارے میں بتایا بھی مگر زندگی کے بارے میں اس کا فلسفہ ہی کچھ عجیب تھا اور میں آپ کو اس کا فلسفۂ زندگی بتا کر آپ کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔

ہم دونوں علمی مباحثوں میں ایک دوسرے کے مخالف کھڑے ہوتے تھے اور خوب ایک دوسرے کے خلاف بولتے مگر اسٹیج سے اترتے ہی ہم دونوں پھر سے واپس اپنی دنیا میں لوٹ جاتے اور پھر جب ہمارا یونیورسٹی میں آخری مباحثہ تھا اور میں جان بوجھ کر وہ مباحثہ ہار گیا تھا جس کی وجہ سے وہ مجھ سے کافی ناراض ہوئی۔ اس نے مجھ سے کئی دفعہ پوچھا بھی کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ میں اسے کیا جواب دیتا کیونکہ میں اسے وہ سب کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ پچھلے کچھ عرصہ سے اس کے والد صاحب میرے ساتھ کیا کھیل کھیل رہے تھے۔

زرمین سیٹھ جہانگیر کی اکلوتی اولاد تھی اور وہ اپنی بیٹی کو اپنے کسی ہم پلہ خاندان میں بیاہنا چاہتے تھے مگر بیچ میں ایک جاہل پینڈو آ گیا تھا اور وہ اس سے اپنی بیٹی کی جان چھڑوانا چاہتے تھے اور وہ جاہل پینڈو میں تھا۔ میرا نام کامران ہے اور میرے دوست احباب مجھے پیار سے کامی کہتے ہیں۔ میرے والد صاحب گاؤں شاہین نگر کے ایک چھوٹے سے زمین دار ہیں۔ اکیس ایکڑ رقبہ کے مالک اور ہم چار بہن بھائی ہیں، میں سب سے چھوٹا ہوں، مجھ سے دو بڑے بھائی پاکستان آرمی میں ہیں، میری بڑی بہن شادی شدہ ہے وہ اپنے سسرال میں خوش ہے۔ دونوں بھائی بھی شادی شدہ ہیں، والد صاحب نے انہیں اپنی حویلی ہی میں علیحدہ پورشن بنا کر دے دیے ہیں جب کہ گھر میں مشترکہ خاندانی نظام موجود ہے ایک ہی جگہ کھانا پکتا ہے اور سبھی اخراجات میرے والد صاحب ہی برداشت کرتے ہیں اور ساری آمدنی بھی انہی کے پاس ہوتی ہے۔

میری والدہ میرے بچپن میں ہی فوت ہو چکی تھیں۔ گھر میں سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے میں سب کی آنکھ کا تارا تھا اور ابو کی تو گویا مجھ میں جان تھی۔ ابو مجھے دوسرے بھائیوں کی طرح خود سے جدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں پڑھ لکھ کر وکیل بنوں اس لیے انہوں نے مجھے بی اے کے بعد یونیورسٹی میں داخل کروا دیا تا کہ میں ایم اے سیاسیات کر سکوں اور یہیں میری ملاقات زرمین سے ہوئی اور پھر ہم اکثر ایک دوسرے سے ملنے لگے پھر جانے کب ہم دونوں میں پیار ہوا ہمیں پتا ہی نہیں چلا۔

میں زرمین کے ساتھ کئی دفعہ ان کے گھر جا چکا تھا، اس کے والد صاحب سے بھی مل چکا تھا۔ زرمین کے سامنے تو وہ مجھ سے کافی اچھے اخلاق سے پیش آتے تھے مگر زرمین کی غیر موجودگی میں وہ کئی دفعہ میرے بارے میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر چکے تھے مگر میں نے اس بارے میں کبھی زرمین سے ذکر نہ کیا کیونکہ جب انسان کو کسی سے پیار ہو جاتا ہے تو دنیا میں اسے سوائے اپنے محبوب کے کچھ نظر نہیں آتا اور جب اسے کچھ نظر آتا ہے تو وہ اپنے محبوب کے علاوہ کچھ دیکھنے کے قابل ہی نہیں رہتا۔ پیار چیز ہی ایسی ہے میری اس بات کی حقیقت سے وہی لوگ واقف ہو سکتے ہیں جو اس راہ سے کبھی گزرے ہوں۔

میں آپ کو بتا رہا تھا کہ زرمین کے والد صاحب مجھے زرمین کے راستے کا کانٹا سمجھتے تھے اور مجھے راستے سے ہٹانا چاہتے تھے۔ اس کے لیے وہ مجھے کئی دفعہ لالچ بھی دے چکے تھے مگر ایک رات تو انہوں نے حد ہی کر دی انہوں نے مجھے وہ کچھ کہا جو یہاں بیان کرنے کے لائق نہیں۔ ہم گاؤں کے لوگوں کی ایک ہی کمزوری ہوتی ہے اور وہ ہوتی ہے عزتِ نفس۔ اس رات زرمین کے والد نے مجھ سے کہا کہ میں اس کی بیٹی سے پیار نہیں کرتا بلکہ میں اس کی بے انتہا دولت سے پیار کرتا ہوں، اس بات کا سننا تھا کہ میں زرمین کو بتائے بغیر ان کے گھر سے چلا آیا۔

میرے اندر ایک آگ سی جل رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا چیز ہے یہ دولت جسے دنیا والے زندگی کی اساس بنائے بیٹھے ہیں، آج میرا کہیں بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔ جانے رات کیسے گزر گئی اور کب دن ہوا مجھے کچھ پتا نہیں چلا پھر میں جان بوجھ کر اس دن مباحثے میں ہار گیا۔

ویک اینڈ پر ہمیشہ میں گھر جایا کرتا تھا اور پھر ویک اینڈ پر مجھے گھر جاتے ہوئے اغوا کر لیا گیا۔ جہاں مجھے اغوا کر کے لے جایا گیا وہ ایک بند فیکٹری تھی۔ میری آنکھوں سے بندھی پٹی کھولی گئی تو میں نے اپنے آپ کو زرمین کے والد صاحب کے روبرو پایا۔ میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور میں پکے فرش پر پڑا تھا۔ زرمین کے والد صاحب نے مجھے حقارت سے پاؤں کی ٹھوکر ماری اور کہا۔

"میں نے تمہیں سدھرنے کے کئی چانس دیے مگر تم نے سبھی ضائع کر دیے۔ اب بولو تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟"

میں نے کہا۔

"سر! میں آپ کا بہت زیادہ احترام کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔ آپ جو چاہیں مجھ سے سلوک کریں مگر خدارا! مجھ سے میری زرمین کو نہ چھینیں۔"

"بکواس بند کرو الو کے پٹھے! اب اگر تمہاری زبان پر اس کا نام بھی آیا تو تمہاری زبان جڑ سے اکھاڑ کر تمہاری ہتھیلی پر رکھ دوں گا، سمجھے؟ لگتا ہے تمہیں عزت راس نہیں آئی۔" یہ کہہ کر اس نے کسی کو آواز دی۔ "اوئے جبار خان! ادھر آؤ۔ ذرا اس کو بات کرنے کی تمیز سکھاؤ۔"

پھر جبار خان آیا اور اس کے ساتھ ہی دو ہٹے کٹے بندے بھی اندر آ گئے اور انہوں نے آتے ہی میرے منہ میں کپڑا ٹھونسا اور مجھ پر لاتوں اور گھونسوں کی برسات کر دی الغرض میرے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں انہوں نے ضرب نہ لگائی ہو پھر جانے کب میں بے ہوش ہو گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں اسی کمرے میں پڑا تھا۔ میرے جسم کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ میری آنکھیں سوج چکی تھیں، ہونٹ پھٹ چکے تھے اور منہ سے ہلکا ہلکا خون جاری تھا۔ اب پتا نہیں کہ کوئی دانت ٹوٹ چکا تھا یا پورا جبڑا ہی بیکار ہو چکا تھا؟

اور پھر جونہی ان لوگوں نے مجھے ہوش میں دیکھا دوبارہ میری دھنائی شروع کر دی اور مجھے اس وقت تک مارتے رہے جب تک میں دوبارہ بے ہوش نہیں ہوا۔

اس کے بعد میرے ساتھ یہ سلوک جانے کتنی بار ہوا۔ وہ لوگ مجھے زندہ رکھنے کے لیے کھانا وغیرہ بھی کھلاتے رہے اور میرے زخموں پر مرہم بھی رکھتے رہے اور جب میں تھوڑا سا ریلیکس ہونے لگتا تو وہ مجھے نئے زخم لگاتے اور جب میں بے ہوش ہو جاتا تو وہ لوگ مجھے کمرے میں پھینک کر چلے جاتے اور جہاں تک کمرے کی صفائی کا تعلق ہے تو وہ جائے ضرور یہ کے لیے بھی باہر نہیں جانے دیتے تھے۔ میرے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ چکے تھے اور میرا پورا جسم نئے اور پرانے زخموں سے چور چور تھا۔ کسی زخم پر کھرنڈ آچکا تھا تو کوئی ابھی نیا تھا۔ میری نیند کا تو یہ عالم تھا کہ مجھے نہیں پتا تھا کہ میں کب آرام کی پرسکون نیند سویا تھا اور جہاں تک درد کی بات ہے تو میرے خیال میں لوگوں نے صرف اس کا نام سنا تھا اس کی حقیقت سے واقف نہیں تھے اور جو لوگ اس کی حقیقت سے واقف تھے شاید وہ ہی میرا حال جان سکتے تھے یہ درد ایسا درد تھا کہ جسے بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں تھے۔ اس درد کو سہنا انسان کے بس کی بات نہیں اور میں جانے کیسے یہ درد سہہ رہا تھا۔ آسان لفظوں میں اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ درد کیا ہے تو میں اس کو بتاؤں کہ وہ اک نظر میرا وجود دیکھ لے۔

پھر ایک دن مجھے نیم بے ہوشی کے دوران سیٹھ جہانگیر کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ سیٹھ جہانگیر نے کسی سے پوچھا۔

''ہاں بھئی اس کی طبیعت صاف ہوئی ہے کہ نہیں۔''

اس شخص نے جواب دیا۔

''سر! مجھے یقین ہے کہ اس کی طبیعت صاف ہوگئی ہوگی اور اگر اب بھی اس کی طبیعت صاف نہ ہوئی تو پھر اس دنیا میں کسی کے پاس بھی اس کا علاج موجود نہیں پھر ہمیں مجبوراً اسے ساتویں آسمان پر اس کے معالج کے پاس بھیجنا پڑے گا۔''

''ویری گڈ مسٹر جبار خان! مجھے تم سے یہی امید تھی۔'' یہ کہہ کر سیٹھ جہانگیر نے مجھ سے پوچھا۔

''ہاں تو مسٹر کامران! کیا خیال ہے تمہارا مسٹر جبار خان سچ کہہ رہے ہیں؟''

میں اس وقت نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھا مگر میں ان کی بات سمجھ رہا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ مسلسل تشدد نے میری قوت گویائی پر بہت برا اثر ڈالا تھا اور میں اس وقت بولنے سے قاصر تھا۔ میں نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا جس کا مطلب وہ جانے کیا سمجھے۔ سیٹھ نے جبار خان سے پوچھا۔

''جبار خان یہ تو بولتا ہی نہیں، کیا ہوا ہے اسے؟''

جبار خان نے کہا۔

''سر! اگر آپ اس کی آواز سننا چاہتے ہیں تو اسے کم از کم ایک ہفتہ لگے گا کیونکہ ہمارے پیار کی شدت نے اس کی قوت گویائی سلب کر لی ہے۔''

''تو پھر لے جاؤ اس کو اور جب یہ بولنے لگے تب اسے میرے پاس لانا۔ ایسے کیا خاک مزہ آئے گا اس سے بات کرنے کا۔ جاؤ اسے لے جاؤ اور جب یہ اچھی طرح بولنے لگے تب لانا۔'' سیٹھ جہانگیر نے مجھے ایک ناروا گالی سے نوازتے ہوئے کہا۔

پھر وہ لوگ مجھے واپس اسی جگہ پر لے آئے جہاں سے لے کر گئے تھے مگر میرے آنے تک تمام کمرے کی صفائی ہو چکی تھی اور کمرے میں ایک آرام دہ بیڈ لگ چکا تھا۔ ایک ڈاکٹر بھی وہاں موجود تھا سب سے پہلے انہوں نے مجھے گرم پانی اور ڈیٹول سے نہلایا اور اس کے بعد مجھے نئے کپڑے پہنائے اتنی دیر میں ڈاکٹر ایک ڈرپ تیار کر چکا تھا جو اس نے مجھے بیڈ پر لٹاتے ہی لگا دی اور دو ہفتے ڈاکٹر کی لگاتار محنت سے میں اس قابل ہو چکا تھا کہ سیٹھ جہانگیر سے آسانی سے بات کر سکوں گو کہ بات کرتے کرتے اب بھی میرا سانس

پھول جاتا تھا مگر میں بات کر سکتا تھا اب میں کچھ چلنے پھرنے کے قابل بھی ہو گیا تھا مگر اس کے لیے مجھے کسی کے سہارے کی ضرورت تھی اور ان لوگوں نے مجھے لے جا کر ایک مرتبہ پھر سیٹھ جہانگیر کے سامنے پیش کر دیا۔ جبار خان نے کہا۔

''سر! اب آپ کامران صاحب کی مدھر آواز سن سکتے ہیں اگر اب بھی کامران صاحب کی آواز آپ کے کانوں میں رس نہ گھولے تو پھر میرے ساتھ دو ماہر لسانیات موجود ہیں جو اس کے ساؤنڈ سسٹم کو ایک منٹ کے اندر اندر درست کر دیں گے۔''

''جبار خان! تمہاری یہی باتیں تو مجھے اچھی لگتی ہیں اب تم ذرا مہربانی کرو اور تھوڑی دیر کے لیے باہر چلے جاؤ میں اس کے ساتھ تنہائی میں دو چار باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' سیٹھ جہانگیر نے کہا۔

''کیوں نہیں سر! میں دروازے کے باہر موجود ہوں اگر میری ضرورت پڑے تو آپ مجھے آواز دے کر بلا لینا۔'' یہ کہہ کر جبار خان چلا گیا۔

سیٹھ جہانگیر کمرے میں موجود واحد کرسی پر براجمان تھا اور میں دیوار سے ٹیک لگائے اپنے موجودہ حالات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میرے نزدیک زرمین سے جدائی کا مطلب اپنی زندگی سے جدا ہونا تھا۔ سیٹھ جہانگیر کو شاید معلوم نہیں تھا کہ زرمین میرے لیے کیا تھی۔

''کن خیالوں میں گم ہو گئے ہو شہزادے! کہو عشق کا بھوت سر سے اترا یا نہیں؟'' سیٹھ جہانگیر نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

میں نے سیٹھ جہانگیر کی طرف غور سے دیکھا اور بھولنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کس عشق کی بات کر رہے ہیں سر! میں سمجھا نہیں؟''

''کیا مطلب؟'' سیٹھ جہانگیر نے حیرانی سے کہا۔

''سر جی! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں مطلب کو بھی نہیں جانتا آپ بے شک اس بھائی سے پوچھ لیں جو مجھے آپ کے پاس چھوڑ کر گیا ہے اور جہاں تک عشق کا تعلق ہے تو میں نے بچپن میں اپنی دادی ماں سے سنا تھا کہ یہ کسی بھوت کا نام ہے جو بچوں کو ورغلا کر دور کہیں کسی دیس میں لے جا کر قید کر لیتا ہے اور یہ ایسا ظالم بھوت ہے جو ایک بار اس کی قید میں چلا گیا مر کر بھی رہا نہ ہوا۔ سر جی! آپ بھی اس سے بچ کر رہنا کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ آپ کو بھی چمٹ جائے۔''

''ارے واہ بھئی واہ! تم تو کافی سیانے ہو گئے ہو لگتا ہے جبار خان کی سنگت نے تم پر جادو کر دیا ہے۔''

''یہ جادو کیا ہوتا ہے سر جی!''

یہ بھی ہوتا ہے شہزادے!'' اس کے بعد اس نے کافی سوالات کیے مگر میں نے سیٹھ جہانگیر کو کسی بھی سوال کا سیدھا جواب نہ دیا اور میرے جوابوں نے اسے پریشان کر کے رکھ دیا اور یہی میں چاہتا تھا۔ اس نے ہر طرح سے تسلی کی کہ کہیں میں ڈرامہ تو نہیں کر رہا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ میں واقعی پاگل ہو چکا ہوں اور بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہوں تو اس نے مجھ سے پوچھا۔

''کیا تم زرمین کو بھی نہیں جانتے جو تمہاری کلاس فیلو تھی اور جس سے تمہیں عشق تھا؟''

''سر جی! آپ بھی کمال کرتے ہیں زرمین تو میں خود ہوں اور آپ یہ کیا پاگلوں جیسی باتیں کر رہے ہیں آپ نے پھر عشق کا نام لیا میرے سامنے۔ سر جی! خدا کی قسم! جتنا میں اسے جانتا ہوں اسے کوئی نہیں جانتا ہوگا کیونکہ پچھلے کچھ عرصے سے جب سے آپ نے مجھے ان لوگوں کے حوالے کیا ہے مجھ پر یہ راز کھلا ہے کہ عشق بیگانے لوگوں سے ہوتا ہے اپنوں سے نہیں ہوتا اگر پھر بھی آپ کو یقین نہیں آتا تو آپ اس بارے میں جبار خان سے کیوں نہیں پوچھ لیتے؟ کیونکہ وہ اس بارے میں مجھ

سے بھی بہتر جانتا ہے۔"

یہ سن کر سیٹھ جہانگیر نے جبار خان کو آواز دی اور جبار خان تیزی سے اندر آیا۔

"جی سر جی!" اس نے کہا۔

"اوئے تم لوگوں نے کامران کے ساتھ کیا کیا ہے؟ یہ تو کسی بات کا سیدھا جواب ہی نہیں دیتا۔"

"سر! ہم نے آپ کی ہدایات کے مطابق اسے سیدھا کر دیا ہے اور اسے ان رنگوں سے روشناس کروا دیا ہے جو کہ دنیا کے حقیقی رنگ ہیں اور مجھے امید ہے کہ زندگی بھر یہ ان رنگوں کے سحر سے نکل نہیں پائے گا۔"

"اوکے مسٹر جبار خان! اب آپ جا سکتے ہیں آپ کی محنت کا معاوضہ آج ہی کسی وقت آپ کے بینک اکاؤنٹ میں پہنچ جائے گا۔"

یہ سننے کے بعد جبار خان نے سیٹھ جہانگیر کا شکریہ ادا کیا اور چلا گیا۔

اس کے بعد سیٹھ جہانگیر نے موبائل پر کسی سے کال ملائی اور رابطہ ہونے پر حال چال دریافت کرنے کے بعد کہا۔

"آپ کی دریافت واقعی پرفیکٹ ہے ستیش! ان لوگوں نے کام میری سوچ سے بھی بڑھ کر کیا ہے بندہ واقعی لائن پر آ گیا ہے مگر میری بیٹی زمین اس کو کسی بھی حال میں چھوڑنا گوارہ نہیں کرے گی لہٰذا اسے چند سالوں کے لیے انڈیا کی کسی بھی جیل میں بھجوانے کا بندوبست کرو تا کہ ادھر پاکستان میں اس کا کسی کو پتا بھی نہ چلے۔ اس عرصے میں، میں زمین کی شادی کہیں اور کر دوں گا۔ جب اس کے دو چار بچے ہو جائیں گے تو وہ سب کچھ بھول جائے گی۔"

اس کے بعد دوسری طرف سے کسی نے کچھ کہا تو سیٹھ جہانگیر نے کہا۔

"ویری گڈ! یہ تو بہت بہتر ہو گیا۔ انہیں ابھی بھیجو کہ وہ ابھی آ کر اسے لے جائیں...... ہاں ہاں کم از کم پانچ یا چھ سال تو ضرور ہونی چاہیے...... نہیں نہیں قتل کرنے کی ضرورت نہیں مگر جب یہ واپس آئے تو کسی کو کچھ بتانے کے لائق نہیں ہونا چاہیے۔ میں اسے نشان عبرت بنانا چاہتا ہوں۔ اوکے اینڈ آل۔"

میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ان کی سبھی باتیں سن رہا تھا اور سمجھ بھی رہا تھا مگر حقیقت یہ تھی کہ میں ابھی تک چلنے پھرنے کے لائق بھی نہیں تھا۔ مکمل ہوش و حواس میں آنے اور مکمل صحت یاب ہونے کے لیے مجھے کچھ وقت درکار تھا شاید پھر بھی ایسا ہو پاتا یا نہیں، کچھ بھی یقینی نہیں تھا۔ اتنا مجھے پتا تھا کہ یہ لوگ مجھے زمین سے جدا کرنے کے لیے یہ ساری تگ و دو کر رہے ہیں مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ مجھے جیتے جی اس سے جدا کر پاتے کیونکہ زمین تو میرا اپنا وجود تھی۔

گو کہ مجھے پتا تھا کہ میں اٹھا تو میں گر جاؤں گا مگر پھر بھی میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر جونہی میں اٹھا تو مجھے ایک زبردست چکر آیا اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر گر گیا۔

اس کے بعد مجھے جب ہوش آیا تو میں کسی تھانے کی حوالات میں بند تھا۔ میرے ساتھ کچھ اور بندے بھی حوالات میں بند تھے۔ میں تھوڑا سا کسمسایا تو میرے ساتھ بیٹھے ہوئے کسی شخص نے دوسرے بندے سے کہا۔

"ہوش میں آ رہا ہے شاید۔" اتنے میں حوالات کے باہر سے کسی سپاہی نے اندر جھانکا اور اس شخص سے پوچھا۔

"کیا اسے ہوش آ گیا ہے؟ صاحب بے تابی سے اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔"

حوالات کے اندر سے کسی نے کہا۔

"سر جی! ابھی تک تو اسے ہوش نہیں آیا جونہی اسے ہوش آیا ہم آپ کو اطلاع کر دیں گے۔"

"چلو ٹھیک ہے جونہی یہ سالا ہوش میں آئے ترنت مجھے بتانا۔"

"جرور سر جی جرور!"

یہ سننے کے بعد سنتری چلا گیا مگر وہ سبھی لوگ میرے ارد گرد جمع ہو گئے۔ ایک دبنگ سے نظر آنے والے شخص نے کسی سے کہا۔

"اوئے رامو! تم ذرا باہر کا خیال رکھنا۔ سنتری کو جونہی ادھر آتے دیکھو تو مجھے بتا دینا۔"

"اوئے طیفے! تم گھڑے میں سے ٹھنڈے پانی کا گلاس لے کر آؤ اور اسے پانی پلاؤ ذرا۔" تھوڑی دیر میں ان لوگوں نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا اور پانی پلایا۔ میں نے پانی پی کر خدا کا شکر ادا کیا اور ان لوگوں سے پوچھا کہ میں کہاں ہوں؟

دبنگ سے نظر آنے والے شخص نے کہا۔

"آپ کلکتہ کے تھانہ رام پور کی حوالات میں ہو۔"

"یہ تو بہت اچھا ہو گیا مگر میرے پاس میرے بھائی افلاطون کے کچھ ایٹمی سائنسی فارمولے تھے، وہ کہاں گئے؟" میں نے کہا

"ابے تم کیا بک بک کر رہے ہو۔ تمہیں پتا بھی ہے کہ تم کس بدنام زمانہ تھانے میں آ گئے ہو۔ یہاں کا انچارج دیا شنکر مہا حرامی ہے سالا۔ نوٹوں کی زبان کے علاوہ اسے دنیا کی کسی زبان کی سمجھ نہیں آتی اور تم یہ کیا کہہ رہے ہو کہ افلاطون کے بھائی ہو۔ میرے علم کے مطابق تو اسے مرے ہوئے بھی صدیاں بیت گئیں۔"

"یہی تو تم لوگوں کا المیہ ہے کہ جو لوگ زندہ ہیں تم انہیں مردہ کہنے لگتے ہو اور شمشان گھاٹ کے باسی تمہیں زندہ نظر آتے ہیں۔"

ابھی میں یہ کہہ ہی رہا تھا کہ حوالات کے دروازے پر کوئی سنتری آ کر رک گیا اور اس نے غصے سے کہا۔

"اوئے حرامیو! تمہیں کہا بھی تھا کہ جونہی یہ بندہ ہوش میں آئے مجھے اطلاع کر دینا مگر تم لوگ خود ہی اس کا انٹرویو کرنے لگے۔" اس نے وہیں سے کھڑے ہو کر کسی کو آواز دے کر بلایا اور تھوڑی دیر بعد تین چار سنتری آئے اور انہوں نے مجھے حوالات سے نکالا۔ دو سنتریوں نے مجھے کندھوں سے سہارا دے رکھا تھا وہ مجھے ایک کافی بڑے کمرے میں لے گئے اور فرش پر دیوار کے ساتھ بٹھا دیا ابھی انہوں نے مجھے وہاں بٹھایا ہی تھا کہ ایک کالا بھجنگ سا مکروہ صورت شخص کمرے میں داخل ہوا۔

"ہوش آ گیا اسے؟"

"جی سر! ابھی ہوش آیا ہے اسے بڑی مشکل سے ادھر لے کر آئے ہیں سر جی! اس سے تو چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔"

"یہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کیوں بیٹھا ہوا ہے اسے کھڑا کرو۔" اس نے مجھے ایک ناروا گالی دیتے ہوئے کہا۔

"سر! اس کی حالت بڑی خراب ہے۔ ہم اسے کھڑا تو کر دیتے ہیں مگر جلد ہی یہ بے ہوش ہو جائے گا اور آپ کی پوچھ تاچھ ادھوری رہ جائے گی۔" یہ سن کر اس نے اپنے ماتحتوں کو جھڑک دیا مگر دوبارہ اس نے مجھے اٹھانے کے لیے کسی سے نہ کہا، وہ مجھ سے انتہائی غصے سے مخاطب ہوا۔

"مجھے دیا شنکر کہتے ہیں اور پورے انڈیا میں مجھ سے سخت بندہ کوئی نہیں ہے۔ جو کچھ میں پوچھوں وہ سچ سچ بتا دینا اگر جھوٹ ہوا تو میں تمہاری کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گا، سمجھے؟"

میں جو پہلے ہی صورت سے کافی مسکین نظر آ رہا تھا میں نے اپنے لہجے میں مزید مسکینی سموتے ہوئے کہا۔

"حجور! آپ کے سامنے میں جھوٹ کیوں بولوں گا۔ میں نے کون سا کوئی جرم کیا ہے، میں تو خود آپ سے ملنے کے لیے آپ کے پاس آ رہا تھا مگر جانے کیسے مجھے حوالات میں پہنچا دیا گیا اور میرے پاس موجود میرے

بھائی افلاطون کے تمام ایٹمی سائنسی فارمولے بھی کوئی چرا کے لے گیا۔"

"کیا بک رہے ہو تم؟" دیا شنکر نے غصے سے کہا۔

"میں کیوں بکوں گا سر جی! آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ نے مجھے حوالات میں کیوں بند کیا ہے؟ آپ کو پتا ہی نہیں کہ میں کون ہوں جب آپ کو یہ پتا چلے گا کہ میں کون ہوں تو آپ مجھے خود امریکہ جانے والے طیارے میں بٹھا کر آئیں گے۔" اب میں نے انتہائی غصے سے کہا۔

دیا شنکر حیران و پریشان میری صورت تک رہا تھا۔ اس کا شاید ایسی باتوں سے کبھی واسطہ ہی نہیں پڑا تھا اس نے حیران ہوتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"امریکہ میں کون ہے تمہارا؟"

"میں لیڈی ڈیانا کا خاوند ہوں۔ لیڈی ڈیانا کو تو جانتے ہی ہو گے تم؟ اب یہ نہ کہنا کہ تم لیڈی ڈیانا کو ہی نہیں جانتے۔"

"ہاں میں جانتا ہوں۔" دیا شنکر نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ "مگر میں نے تو سنا تھا کہ اس کی شادی شہزادہ چارلس سے ہوئی تھی؟"

"یہ سب بکواس ہے اور بی بی سی کی پھیلائی ہوئی افواہ ہے اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو بے شک ابھی لیڈی ڈیانا سے رابطہ کر کے پوچھ لیں اگر وہ کہے کہ اس کا خاوند رام دیال ملہوترا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ بے شک مجھے پھانسی لگا دینا۔"

میری اس بات کا دیا شنکر پر انتہائی خوشگوار اثر ہوا اور وہ بے اختیار ہنسنے لگا اور اس کو ہنستا دیکھ کر سنتری بھی ہنسنے لگے۔

"رام دیال ملہوترا صاحب! آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں گے اتنی سی بات پوچھنے کے لیے اب ہم انہیں کیوں تکلیف دیں گے۔ اچھا آپ یہ بتائیں کہ آپ رہنے والے کہاں کے ہیں؟"

"میں وطن اور شہر کی قید سے آزاد اس زمین کا باسی ہوں۔" میں نے فخریہ انداز میں کہا۔

"تم شہزادہ چارلس کو جانتے ہو؟" دیا شنکر نے طنزیہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں وہ میرا رقیب روسیاہ ہے مگر لیڈی ڈیانا میرے ساتھ سات پھیرے لے چکی ہے اور اس کے گلے میں میرے نام کا منگل سوتر ہے۔ اس لیے مجھے اس سے کوئی خطرہ نہیں۔"

اتنے میں دیا شنکر نے سنتریوں کو اشارہ کیا اور انہوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کیا اور لوہے کی ایک کرسی پر بٹھا دیا میرے ہاتھ پاؤں میں تو پہلے ہی جان نہیں تھی پھر بھی انہوں نے میرے ہاتھ اور پاؤں کرسی کے ساتھ رسی سے کس کر باندھ دیے اور اس کے بعد میرے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور پھر بجلی کے پہلے ہی جھٹکے نے مجھے ہر احساس سے بیگانہ کر دیا کتنا پرسکون احساس ہے ہر احساس سے بے نیاز ہونا۔ درد جب حد سے گزرتا ہے تو دوا بن جاتا ہے۔

اور یہی وہ احساس تھا جس نے مجھے پچھلے کچھ عرصہ سے ہر چیز سے بیگانہ کر دیا تھا اور میں نے ہنسی خوشی اپنے آپ کو حالات کے حوالے کر دیا تھا مگر ایک لاوا میرے اندر پک رہا تھا۔ میں کچھ بہتر حالات کا منتظر تھا اور جونہی مجھے موقع ملتا میں ان لوگوں سے ہر اس دکھ کا بدلہ لیتا جو انہوں نے مجھے دیا تھا اور ان شاء اللہ وہ وقت کبھی نہ کبھی ضرور آنا تھا جب ان لوگوں کو میرے ساتھ کی گئی تمام زیادتیوں کا حساب دینا تھا۔

اس کے بعد جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو اسپتال کے بیڈ پر پایا اور جب میں کچھ بولنے اور چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو ان لوگوں نے مجھے عدالت میں پیش کر دیا مگر اس سے پہلے وہ مجھے کچھ ایسی دوائیں دے چکے تھے جن کے استعمال نے مجھے ہر احساس سے

عاری کر دیا تھا۔ مجھے نہیں علم کہ مجھ سے کیا پوچھا گیا اور میں نے کیا بتایا اور پھر تین چار پیشیوں پر یہی ڈرامہ کھیلا گیا اور اس کے بعد ان لوگوں نے مجھے جیل میں بھیج دیا۔ جیل میں مجھے کسی نے بتایا کہ مجھے پانچ سال کی سزا دی گئی تھی۔

☆☆......☆☆

میرا نام نرمین ہے۔ لاہور میرا آبائی شہر ہے۔ میں اپنے والد کی اکلوتی اولاد ہوں میرے والد اور میری والدہ مجھ سے بہت زیادہ پیار کرتے ہیں زندگی میں کبھی انہوں نے مجھے ہر خوشی دی۔ میں نے جو بھی مانگا یا جس چیز کی بھی فرمائش کی میرے والدین نے پوری کی یہاں تک کہ جب یونیورسٹی میں ایک پینڈو لڑکے کامران سے مجھے پیار ہوا تو انہوں نے ہنسی خوشی مجھ سے کہا۔

"بیٹا! ہمیں تمہاری خوشی ہر حال میں عزیز ہے۔"

یونیورسٹی میں ہمارے فائنل ائیر کے ایگزام ہونے والے تھے کہ ایک دن وہ مجھے کافی افسردہ نظر آیا میں نے اس سے بہت پوچھا مگر اس نے مجھے کچھ بھی نہ بتایا۔ میں اس کی حالت دیکھ کر بہت زیادہ پریشان تھی اور اس سے اگلے دن میں اس سے بات کرنا چاہی تھی۔ اس دن ویک اینڈ تھا اور کامران نے اس دن گھر جانا تھا اس دن میں نے دیکھا کہ اس کی ذہنی حالت کافی خراب تھی۔ وہ بالکل کھویا کھویا لگ رہا تھا میں نے اس دن اس سے کئی دفعہ پوچھنے کی کوشش کی مگر وہ ہنس کر میری باتوں کو ٹالتا رہا اور مجھ سے کہا کہ مجھے وہم ہو گیا ہے ورنہ وہ تو بالکل فٹ ہے اور وہ اگلے ویک اینڈ پر اسے اپنے ساتھ گھر لے کر جائے گا اور اپنے گھر والوں سے ملوائے گا۔ اس بات سے میں بہت خوش ہوئی کیونکہ یہ میری دیرینہ خواہش تھی۔

مگر اس دن وہ گھر گیا تو واپس لوٹ کر نہیں آیا میں نے اس کے موبائل پر کال کی مگر اس کا نمبر بند جا رہا تھا اس کے بعد میں نے اس کے دیے ہوئے گھر کے نمبر پر کال کی تو اس کے ابو نے بتایا۔

"کامران تو اس ویک اینڈ پر گھر ہی نہیں آیا۔" میں نے انہیں بتایا۔

"وہ یہاں سے تو گھر ہی گیا تھا تو پھر وہ گھر کیوں نہیں پہنچا؟"

انہوں نے کہا۔

"پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا اور کامران تو آج تک مجھے بتائے بغیر کہیں نہیں گیا۔ آپ نے تو یہ بات بتا کر مجھے بھی پریشان کر دیا ہے اور مجھے تو اس کے دوستوں کا بھی نہیں پتا...... بیٹی! آپ کون ہو؟"

"انکل! میں ان کی کلاس فیلو ہوں اور کامران نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس ویک اینڈ پر مجھے آپ سب سے ملوائے گا مگر وہ خود ہی نہیں مل رہا اس کا نمبر بھی بند جا رہا ہے۔"

"بیٹی! میں خود بھی اس کی وجہ سے پریشان ہوں میں آج ہی اس کے بھائیوں کو فون کرتا ہوں۔ وہ خود ہی اس کا پتا کریں گے اور آپ کو بھی اگر اس کے بارے میں کوئی اطلاع ملے تو فوری طور پر مجھے ضرور اطلاع کرنا۔"

"ٹھیک ہے انکل! اگر آپ کو کامران کے بارے میں کوئی اطلاع ملے تو آپ بھی مجھے میرے اسی نمبر پر اطلاع کر دینا۔"

"اچھا ٹھیک ہے بیٹی! اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ انکل!"

یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

میں کامران کی وجہ سے بہت زیادہ پریشان تھی اور میری یہ پریشانی گھر والوں سے زیادہ دیر چھپی نہ رہ سکی۔ امی نے مجھ سے پوچھا۔

"بیٹا! کیا مسئلہ ہے" میں نے امی کو ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا انہوں نے اسی وقت ابو کو کال کی اور ابو یہ سنتے ہی دفتر سے گھر چلے آئے اور مجھے تسلی تشفی

دی پھرانہوں نے میرے سامنے ہی آئی جی پنجاب سے فون پر بات کی اور ان سے ذاتی طور پر اس بارے میں تعاون کی درخواست کی۔

دوسرے دن صبح صبح انہوں نے مجھ سے کامران کے گھر کا پتا دریافت کیا۔ میں نے پتا بتایا تو انہوں نے امی اور مجھے تیار ہونے کو کہا اور ہمیں بتایا کہ ہم ابھی کامران کے گاؤں ان کے گھر چل رہے ہیں۔ میں اور امی تیار ہو کر نکلے تو ابو بھی تیار ہو چکے تھے۔ ہم ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھے تو ابو نے ڈرائیور کو میرا دیا ہوا پتا سمجھایا اور اس سے چلنے کے لیے کہا۔

ہم دوپہر کے وقت کامران کے گھر پہنچ گئے کامران کے ابو ہم سے بڑے ہی اچھے طریقے سے ملے۔ گھر میں کامران کی بھابھیاں موجود تھیں۔ وہ بھی بہت اچھے اخلاق سے پیش آئیں۔ کامران کے ابو کے بے حد اصرار پر ہم نے وہ رات ان کے گھر میں ہی گزاری۔ میں نے وہ کمرا بھی دیکھا جہاں کامران رہتا تھا کامران سے متعلقہ چیزوں کو دیکھتے ہی میری حالت غیر ہونے لگی۔ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکلنے لگے۔ میرے ساتھ کامران کی دونوں بھابھیاں تھیں وہ میری حالت دیکھ کر ہی سمجھ گئی تھیں کہ میرا کامران سے کیا تعلق تھا۔ انہوں نے مجھے تسلی دی مگر ایک دفعہ جب میرے آنسو نکلے تو تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ میں کامران کی ایک ایک چیز کو سینے سے لگاتی اور روتی رہی کافی دیر بعد جب میری حالت کچھ سنبھلی تو انہوں نے مجھے زبردستی کامران کے کمرے سے نکالا اور اپنے ساتھ کچن میں لے گئیں رات کو ہم سبھی لوگ بڑے کمرے میں اکٹھے ہوئے۔ ابو اور امی نے جب کامران کا ذکر چھیڑا تو میں کامران کی بھابھی کے ساتھ اس کے کمرے میں چلی گئی۔

☆☆......☆☆

صبح جب ناشتے کے بعد ہم گاؤں سے نکلنے لگے تو ایک بار پھر میری حالت غیر ہونے لگی۔ کامران کے ابو آگے بڑھے اور انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔

''بیٹی! تم کیوں روتی ہو ان شاء اللہ کامران مل جائے گا اور اب ہم نے ساری باتیں طے کر لی ہیں کامران کے ملتے ہی ہم اپنی بیٹی کو اپنے گھر لے آئیں گے۔ یہ میرا وعدہ ہے؟''

کامران کا بھتیجا شامی جو رات میرے ساتھ ہی سویا تھا وہ میرے گلے لگ کے خوب رویا اور کہنے لگا۔

''اب آپ آنا تو کامران چاچو کو ساتھ لے کر آنا میری امی کہہ رہی تھیں کہ وہ مجھ سے روٹھ گیا ہے اس لیے اس بار گھر نہیں آیا۔ ان سے کہنا کہ میں اسے بہت زیادہ یاد کرتا ہوں اگر وہ اس ہفتے بھی مجھ سے ملنے نہ آیا تو انہیں بتا دینا کہ میں بھی ان سے روٹھ جاؤں گا۔ ہاں اور چاچو سے کہنا کہ اب میں بالکل اچھا بچہ بن گیا ہوں۔ اب میں امی کو بالکل بھی تنگ نہیں کرتا کیوں امی؟'' اس نے اپنی ماں کی طرف دیکھ کر کہا۔ اس کی ماں نے شامی کو میری گود سے لے لیا اور کہا۔

''بیٹا! تم سے کہا تو ہے کہ اس ہفتے چاچو آجائے گا جب وہ آئے گا ناں تو پھر ہم اس سے ڈھیر ساری باتیں کریں گے اب تم آنٹی کو جانے دو انہیں دیر ہو رہی ہے۔'' شامی کی باتیں سن کر میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور میری آنکھوں سے ایک بار پھر بے اختیار آنسو چھلک پڑے۔

☆☆......☆☆

ہم لاہور واپس آ گئے تھے میرے ابو اور امی کامران کے ابو سے تمام باتیں طے کر آئے تھے ہمارے آنے کے دو دن بعد ہی کامران کے والد اور بڑا بھائی ہمارے گھر آئے۔ ابو اور امی ان سے انتہائی اچھے اخلاق سے ملے رات کا کھانا کھانے کے بعد ابو انہیں لے کر آئی جی پنجاب کے پاس ان کے گھر گئے اور انہیں ساری

صورت حال سے آگاہ کیا انہوں نے متعلقہ ایس ایچ او سے اسی وقت موبائل پر بات کی۔ الغرض ابو نے متعلقہ تھانے میں کامران کی گمشدگی کے بارے میں پرچے کا اندراج کروا دیا۔ متعلقہ ایس ایچ او نے مکمل تعاون کی یقین دہانی کروائی کامران کے ابو اور بھائی ہمارے پاس رات گزار کر صبح میرے ساتھ یونیورسٹی گئے اور انہوں نے اپنے طور پر کامران کے دوستوں سے اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کی مگر کسی سے کچھ حاصل نہ ہوا تھک ہار کر وہ عصر کے وقت گھر چلے گئے۔ میں نے انہیں روکنے کی کافی کوشش کی مگر جانے کیوں وہ لوگ نہیں رکے یا پھر ہو سکتا ہے وہ ہمارے پاس ہمارے گھر میں زیادہ دیر ٹھہرنا نہیں چاہتے ہوں۔

کامران کی گمشدگی ایسی تھی جس نے میری زندگی کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا کسی کام میں میرا دل نہیں لگتا تھا۔ ایم اے فائنل ائیر کے امتحان سر پر تھے مگر مجھے کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ ابو بار بار مجھے تسلی دیتے مگر کہاں......دل تھا کہ کامران کے بغیر جیسے دھڑکنا بھولتا جا رہا تھا اک عجب سی بے کلی اک عجب سی بے چینی مجھے ہر وقت گھیرے رہتی۔ میری وجہ سے سب سے زیادہ پریشان میری امی تھیں وہ بھی حتی المقدور میرا دل بہلانے کی کوشش کرتیں مگر کامران کا ہجر ایسا تھا کہ گھن کی طرح مجھے اندر ہی اندر سے کھائے جا رہا تھا میں کسی کو بتاتی بھی تو کیا؟ مجھے اکثر محسوس ہوتا تھا کہ جیسے میرے سبھی رشتے اور ناتے کامران سے شروع ہوتے اور کامران پر ہی ختم ہو جاتے تھے جب کامران میرے ساتھ تھا تو دنیا کی ہر چیز مجھے حسن کا مرقع نظر آتی تھی اب کامران نہیں تھا تو دنیا کی ہر چیز مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی۔

ایم اے فائنل ائیر کے پیپر شروع ہوئے مگر میں اس امتحان میں شامل نہ ہو سکی۔ ابو اور امی نے مجھے امتحان دینے کے لیے راضی کرنے کی سر توڑ کوششیں کیں مگر وہ میری نہ کو ہاں میں نہ بدل سکے۔ میرا ایک ہی جواب تھا کہ اگر کامران نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں۔ میرا تو جینا مرنا ہی اس کے ساتھ ہے یہ تو پھر ایم اے فائنل ایئر کا امتحان ہے۔ میرے ابو کئی بار کامران کے کیس کے بارے میں متعلقہ ایس ایچ او سے بات کر چکے تھے۔ ایس ایچ او پر آئی جی پنجاب کی طرف سے بھی کافی پریشر تھا مگر پولیس کی سر توڑ کوششوں کا نتیجہ بھی صفر رہا اور کیس وہیں کا وہیں تھا جہاں سے شروع ہوا تھا۔ میں دن میں ایک دو بار کامران کے گھر بھی فون کرتی رہتی تھی مگر کہیں سے بھی کوئی خوشی کی خبر نہیں مل رہی تھی۔ میری صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ میری آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ چکے تھے اور میرا بدن ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آنے لگا تھا۔ میری خوراک نہ ہونے کے برابر ہو چکی تھی اور یہ بھی امی کی مجھ پر بے انتہا محنت تھی کہ وہ مجھے تھوڑا بہت کھانے پر مجبور کرتی رہتی تھیں۔

کامران کی گمشدگی کو پورے چھ ماہ ہو چکے تھے ابو نے میرے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے امی سے کہا۔

''ہمیں کامران کے انتظار کے بجائے ہوش مندی سے کام لینا چاہیے اور میری شادی کر دینی چاہیے۔'' امی بھی میری حالت سے کافی دکھی تھیں انہوں نے سوچا کہ شاید شادی کے بعد ہی میری حالت میں کچھ بہتری آئے۔ اس لیے انہوں نے بھی ابو کی ہاں میں ہاں ملا دی۔

پھر ایک دن انہوں نے کافی گھما پھرا کے مجھ سے اس بارے میں بات کی تو مجھے امی کی اس بات نے بہت دکھ دیا۔ ایک ماں کا رشتہ تھا جو کہ اس دنیا میں اب میرا واحد غمگسار رہ گیا تھا یا پھر کبھی کبھار میں کامران کے ابو سے بات کر کے اپنے من کا بوجھ ہلکا کر لیا کرتی تھی مگر ماں سے مجھے ایسی امید نہ تھی۔ ماں تو میرے دل کا ہر دکھ سمجھتی تھی وہ تو میرے ہر درد سے آشنا تھی اسے کیا ہو گیا

تھا؟ کیا اب انہیں میری ذات بوجھ لگنے لگی تھی شاید لڑکیاں ماں باپ پر بوجھ ہی ہوتی ہیں۔ اس دن میں خوب روئی۔

شام کو جب ابو گھر آئے تو میں ان کے پاس ان کے کمرے میں چلی گئی وہ شاید کسی سے فون پر بات کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے فون پر کسی سے کہا۔

''اچھا میں بعد میں تمہیں کال کرتا ہوں۔''

ابو کھڑے حیرانی اور خوشی سے مجھے تک رہے تھے انہوں نے کہا۔

''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے آج میری بیٹی خود چل کر میرے پاس آئی ہے۔ خیریت میری جان! کیسے آنا ہوا؟''

''ابو! میں آپ سے ایک انتہائی ضروری مسئلے پر بات کرنے آئی ہوں۔'' میں نے ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں کہو میری جان!'' ابو نے کہا۔

''ابو! کیا میں آپ پر بوجھ ہوں یا پھر اب میں آپ کو اس گھر میں بڑی اچھی نہیں لگتی؟''

''پگلی! کبھی بیٹیاں بھی ماں باپ پر بوجھ ہوتی ہیں بھلا اور آپ سے کس نے کہہ دیا کہ خدانخواستہ تمہارا وجود اس گھر میں مجھے اچھا نہیں لگتا؟''

''تو پھر ابو آپ نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ میں کامران کے علاوہ کسی اور سے شادی کرنے پر راضی ہو جاؤں گی؟'' میں نے دکھ بھرے انداز میں ابو سے کہا۔

''میری جان شاید تمہیں میری بات بری لگی ہے مگر میرے پاس اس کے علاوہ کوئی حل بھی تو نہیں ہے۔ میں تمہارا باپ ہوں تمہیں روز روز یوں مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا شاید اسی میں کوئی بہتری ہو۔''

''بہتری اگر شادی میں ہے تو وہ صرف اور صرف کامران سے شادی کرنے میں ہے اور اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں کچھ غلط کہہ رہی ہوں تو ابو آپ مجھے اس گستاخی پر معاف کر دیں۔ اس سے زیادہ میں آپ سے کچھ نہ کہوں گی اور اگر پھر بھی آپ کو میرے مردے سے بو آنے لگی ہے اور آپ مجھے قبرستان بھیجنا ہی چاہتے ہیں تو آپ اپنا شوق پورا کر سکتے ہیں۔''

میں نے یہ کہا اور روتے ہوئے ان کے کمرے سے نکل گئی۔ اس سے بہتر انداز میں شاید میں انہیں جواب دے بھی نہیں سکتی تھی اور اس کے بعد اتنا ہوا کہ ابو نے دوبارہ مجھ سے شادی کا نہیں کہا مگر اس کے بعد ابو چپ چپ رہنے لگے تھے یوں لگتا تھا کہ جیسے انہیں کوئی پریشانی ہو۔ امی مجھے روز ان کے بارے میں بتاتی رہتی تھیں اور ابو خود بھی روزانہ مجھ سے میرے کمرے میں ملنے آتے رہتے تھے اور مجھ سے گپ شپ بھی کرتے رہتے تھے مگر اس دن کے بعد میں نے ان کے چہرے پر کبھی سچی خوشی نہیں دیکھی میں اتنی خود غرض بھی نہ تھی کہ ابو کی پریشانی کو محسوس نہ کرتی آخر کو وہ میرے والد تھے انہوں نے ہر دکھ سکھ میں میرا ساتھ دیا تھا اور کامران کے سلسلے میں بھی انہوں نے کیا نہیں کیا تھا۔ اب یہ میرا نصیب تھا کہ میرے مقدر میں ہی دکھ لکھے تھے تو وہ بے چارے کیا کر سکتے تھے۔

ایک دن ابو میرے کمرے میں آئے تو میں نے دیکھا کہ وہ پہلے کے معاملے میں آج کافی زیادہ پریشان تھے ان کی صحت بھی روز بروز بگڑتی جا رہی تھی آج مجھے اپنے ابو کو دیکھ کر یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں ان کی مجرم تھی۔ میں پہلے ہی کافی دنوں سے اس سلسلے میں ان سے بات کرنا چاہ رہی تھی مگر آج میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں نے ابو سے پوچھا۔

''ابو کیا مسئلہ ہے آج آپ بیمار بیمار اور کافی پریشان نظر آ رہے ہیں؟''

ابو ہلکا سا مسکرائے اور کہنے لگے۔

''آج ہماری بیٹی کو کیسے خیال آ گیا ہمارا؟ اس کا مطلب ہے ہمیں کافی پہلے بیمار ہو جانا چاہیے تھا کم از کم آپ ہمارا حال تو پوچھ لیتیں۔''

''ابو ایسی بات تو میں نے کبھی سوچی بھی نہ تھی آخر کو آپ میرے والد ہیں میں بھلا آپ سے غافل کیسے ہو سکتی ہوں؟ اگر آپ میری شادی کی وجہ سے پریشان ہیں تو مجھے بتائیں؟''

''بیٹی! وہ پریشانی تو اپنی جگہ پر موجود ہے مگر یہ پریشانی کچھ اور ہے جو میں ابھی آپ کو بتانا نہیں چاہتا اور رہی آپ کی شادی تو وہ کامران سے ہی ہوگی اور مجھے یقین ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن ہمیں ضرور مل جائے گا۔''

''ابو! آپ نے یہ کہہ کر میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اتار دیا ہے۔ مجھے بھی یقین ہے کہ کامران ایک نہ ایک دن ضرور ہمیں ملے گا۔''

''بس بیٹا! آپ میرے لیے دعا کرو کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں۔''

اس کے بعد ہمارے درمیان کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں اور ابو چلے گئے اور اس ملاقات کے بعد ان سے میری بات نہ ہو سکی کیونکہ صبح جب وہ آفس گئے تو واپسی پر ان کی گاڑی کا ایک تیز رفتار ٹرک کے ساتھ ایکسیڈنٹ ہوا اور وہ موقع پر ہی اللہ کو پیارے ہو گئے ان کی لاش جب گھر لائی گئی تو گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔

ابو کی بے وقت موت نے مجھے ہلا کر رکھ دیا وہ ہمارے ملک کے بہت بڑے بزنس مین تھے بہت سے لوگ ان کے جنازے میں شریک ہوئے۔ تمام رشتہ دار جمع تھے۔ امی کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ حالت تو میری بھی ٹھیک نہ تھی مگر ان حالات میں مجھے مجبوراً بستر چھوڑنا پڑا۔ میں کمر کس کے میدان عمل میں اتر آئی۔ میں نے امی کو سہارا دیا اور ابو کی تمام رسومات کو پورا کیا۔

چہلم کے بعد میں نے بزنس میں دلچسپی لینا شروع کی اور ایک میٹنگ میں سبھی لوگوں کو بلا کر ان سے ابو کے پورے ملک میں پھیلے ہوئے کاروبار کے بارے میں مکمل تفصیلات حاصل کیں قصہ مختصر یہ کہ میں نے ابو کا کاروبار سنبھال لیا۔ اب میں صبح گھر سے نکلتی تو شام گئے گھر لوٹتی مگر میرا کوئی بھی لمحہ ایسا نہ گزرتا تھا جس لمحے میں مجھے کامران کی یاد نہ آتی ہو اب میں نے پانچ وقت کی نماز باقاعدگی سے شروع کر دی تھی، ہر نماز کے بعد میں کامران کے لیے دعائیں کرتی، اللہ سے رہنمائی کی مدد مانگتی پھر ایک دن میری دعائیں رنگ لے آئیں۔

کامران کی گمشدگی کو تقریباً ڈیڑھ سال ہو چکا تھا۔ ایک دن میرے دفتر میں ایک اجنبی شخص کی آمد ہوئی جس کے بارے میں میرے اسسٹنٹ نے بتایا کہ ایک بندہ آیا ہے وہ آپ سے کسی اہم سلسلے میں ملنا چاہتا ہے میں نے اس سے بہت پوچھا ہے کہ وہ کس سلسلے میں آپ سے ملنے کا خواہش مند ہے مگر وہ مجھے نہیں بتا رہا اس کا کہنا ہے کہ وہ جس مسئلے کے حل کے لیے آیا ہے وہ مسئلہ کسی اور کو بتانا نہیں چاہتا اگر آپ کی اجازت ہو تو اسے آپ کے پاس بھیج دیا جائے؟

''او کے! آپ اسے ٹھیک دو منٹ بعد بھیج دیں۔'' میں نے کہا۔

ٹھیک دو منٹ بعد ایک سوٹڈ بوٹڈ شخص میرے کمرے میں داخل ہوا میں نے کہا۔

''تشریف رکھیے اور ذرا مختصراً بتائیے کہ آپ کس سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

اس نے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکال کر مجھے دینے کے بعد کہا۔

''میڈم! میں انڈیا سے آیا ہوں آپ کے والد صاحب سے کسی گمنام شخص کی ڈیل ہوئی تھی جس کا میں ضامن تھا ڈیل مکمل ہوئے تقریباً دو ماہ ہو چکے ہیں مگر پارٹی کو مطلوبہ رقم ابھی تک نہیں ملی اس سلسلے میں ان

لوگوں نے جب مجھ سے رابطہ کیا تو میں نے یہاں آپ کے والد صاحب کے موبائل نمبر پر رابطہ کرنا چاہا تو وہ بند جا رہا تھا میں نے کافی کوشش کی مگر رابطہ نہ ہوسکا اس نمبر کے علاوہ میرے پاس ان سے رابطے کا کوئی ذریعہ نہ تھا اتفاق سے انہوں نے مجھے کسی بھی ایمر جنسی کے لیے اپنا ایڈریس بھی دے رکھا تھا اور ایک رقعہ بھی دیا تھا کہ خدانخواستہ اگر انہیں کچھ ہوجائے تو میں آپ سے آکر مل لوں اور وہ رقعہ آپ کو دکھادوں تو آپ اس سلسلے میں مجھ سے ہر ممکن تعاون کریں گی اس لیے میں خود یہاں چلا آیا کیونکہ یہ مسئلہ ہی ایسا تھا کہ مجھے یہاں آنا پڑا مگر یہاں آکر مجھے آپ کے اسسٹنٹ نے بتایا کہ ان کا تین ماہ پہلے انتقال ہوچکا ہے۔ بہت افسوس ہوا یہ سن کر۔"

ابو کے ذکر نے مجھے افسردہ کردیا مگر یہ سب خدا کی رضا تھی اور خدا کی رضا میں کون دخل دے سکتا تھا۔ میں نے اس شخص کا دیا ہوا لفافہ کھولا۔ اندر سے ابو کے ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر برآمد ہوئی لکھا تھا۔

"پیاری بیٹی! اب جب تم یہ تحریر پڑھ رہی ہو تو شاید میں اس جہان میں موجود نہیں ہوں۔ آپ نے اس شخص کو پانچ کروڑ کی رقم ادا کرنا ہے۔ لازمی بات ہے تم سوچو گی کہ کیوں؟ اس کیوں کا جواب کچھ طویل ہے جو کہ آپ کو میرے اسٹڈی روم کی سیف الماری میں پڑی کتاب بانگ درا میں رکھے ہوئے میرے خط کو پڑھنے سے مل جائے گا۔ اس سیف الماری کی چابی تمہاری والدہ کے پاس موجود ہے۔ رقعہ لانے والے شخص کو جواب مت دینا رقم کافی بڑی ہے لہٰذا تمہیں انتظام کرتے ہوئے کچھ دیر لگ جائے گی اگر کیش کا آج ہی ارینج ہوسکے تو اسے آج ہی دے دو مگر اس سے پہلے تم ڈیلیوری کا کنفرم کرلو ڈیلیوری نہ ملے اسے رقم کی ادائیگی مت کرنا اور جب تمہیں ڈیلیوری ملے گی تو میرے خیال میں تمہارے سارے شکوک دور ہوجائیں گے' والسلام!

آپ کا والد جہانگیر۔" نیچے ابو کے سائن موجود تھے۔ خط میں کسی قسم کے شک کی گنجائش موجود نہ تھی۔ میں ابو کی تحریر کو پہچانتی تھی۔ ابو کے سائن بھی اصلی تھے مگر ڈیلیوری کیا تھی؟ اس کا مجھے کوئی علم نہ تھا اور جانے ابو نے اس خط میں کیا لکھا تھا جو کہ ان کے اسٹڈی روم میں موجود تھا میں نے اس شخص سے پوچھا۔

"آپ تو کہہ رہے ہیں کہ آپ کی پارٹی نے ڈیلیوری کردی ہے جب کہ میرے والد صاحب کے رقعے میں لکھا ہے کہ ڈیلیوری کنفرم کیے بغیر آپ کو رقم کی ادائیگی نہ کی جائے۔ آپ کیا کہتے ہیں اس بارے میں؟"

"بات تو آپ کی بھی درست ہے اور غلط ہم بھی نہیں ہیں۔ کیا آپ کا یہ دفتر رازداری کی گفتگو کے لیے موزوں ہوگا؟"

"بالکل! آپ تسلی سے بات کرسکتے ہیں بلکہ ایک منٹ ٹھہریئے' آپ چائے پئیں گے یا کافی؟"

"کافی ہی منگوالیں میڈم!"

میں نے یہ کہہ کر اپنے اسسٹنٹ اختر چشتی سے انٹرکام پر کہا۔

"چشتی صاحب! دو بلیک کافی بھیج دو اور اس کے بعد جب تک میں نہ کہوں کوئی اندر نہ آئے اور نہ ہی کوئی کال مجھے ٹرانسفر کرنا اور کافی ذرا جلدی بھیج دیں۔"

دو منٹ میں گرما گرم کافی دفتر میں میری ٹیبل پر موجود تھی۔ ملازم کافی رکھ کر چلا گیا تو میں نے اس شخص سے کہا۔

"کافی پیجیے بعد میں تسلی سے بات کرتے ہیں۔" کافی پینے کے بعد میں نے کہا۔ "جی اب فرمایئے' آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"میڈم! مجھے زیادہ معلومات تو نہیں ہیں کیونکہ میں نے صرف رقم کی ضمانت دی تھی اور وہ بھی کسی کے کہنے پر اور جس شخص نے مجھے ضمانت دینے کے لیے کہا

تھا میں اس کا نام یہاں ظاہر نہیں کرنا چاہتا آپ کے والد کا پارٹی سے کیا معاملہ تھا۔ اس کا مجھے زیادہ تو نہیں معلوم لیکن اتنا مجھے معلوم ہوا تھا کہ انڈیا کی کسی جیل میں موجود دو قیدیوں کو نکالنے کے لیے ان کا کنٹریکٹ ہوا تھا۔ جس کے لیے ان کا دس کروڑ میں سودا ہوا تھا۔ پانچ کروڑ آپ کے ابو نے پیشگی مجھے ادا کردیے تھے جو کہ میں نے پارٹی کو اسی وقت دے دیے تھے جب کہ بقیہ پانچ کروڑ کی میری ضمانت تھی اب پارٹی کا کہنا یہ ہے کہ اس نے دونوں قیدیوں کو پاکستان میں ان کے بتائے ہوئے پتے پر دو ماہ پہلے بھیج دیا ہے لہٰذا ان کی رقم ادا کردی جائے۔ اس کے لیے آپ قیدیوں کے گھروں سے ان کا پتا کرواسکتی ہیں۔"

"میرے بھائی! میں ان قیدیوں کا کیسے پتا کرواسکتی ہوں جب کہ اس بارے میں مجھے کچھ معلوم ہی نہیں۔ جب آپ کی پارٹی نے قیدیوں کو ان کے گھروں میں بھیجا تھا تب ہی مجھے بتاتے آپ انتہائی عجیب بات کر رہے ہیں؟" میں نے انتہائی حیرت سے کہا۔

عجیب چکر تھا جہاں تک مجھے معلوم تھا۔ انڈیا سے ہماری کمپنی کچھ چیزوں کا لین دین تو کرتی تھی مگر یہ قیدیوں والا معاملہ سمجھ سے باہر تھا جب کہ ابو کے ہاتھ کی تحریر بھی اوریجنل تھی پانچ کروڑ کی رقم کے لیے کسی کا بھی ایمان خراب ہوسکتا تھا۔ آج کل دنیا میں لوگ طرح طرح کے فراڈ کررہے تھے اور یہ شخص کتنے دھڑلے کے ساتھ میرے ہی آفس میں بیٹھ کر مجھے ہی چونا لگانے آیا تھا مگر ایک بات جو مجھے کھٹک رہی تھی وہ اس بندے کا حد سے بڑھا ہوا اعتماد تھا اور دوسری بات اس رقعے میں اس خط کا ذکر تھا جو کہ ابو کی تحریر کے مطابق اسٹڈی میں علامہ اقبال کی کتاب میں رکھا تھا میں نے پرسوچ نگاہوں سے اس شخص کو دیکھا اور کہا۔

"آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟"

"میڈم! میں یہ بات آپ کو نہیں بتا سکتا اور میری درخواست ہے کہ آپ یہ جاننے کی کوشش نہ ہی کریں تو اچھا ہے ویسے آپ کی تسلی کے لیے عرض کردوں کہ میں قانونی طور پر یہاں موجود ہوں۔"

"آپ مجھے دو دن کا وقت دیں۔ آپ کو بھی پتا ہے کہ میرے والد صاحب فوت ہوچکے ہیں اور انہوں نے ہی آپ لوگوں سے ڈیل کی تھی مجھے تھوڑی سی اپنی تسلی کر لینے دیں۔ آپ پرسوں آجائیں ان شاء اللہ ہم اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکال لیں گے۔" میں نے نرمی سے اس شخص کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اوکے میڈم! مجھے یقین ہے کہ آپ سے جب دوبارہ ملاقات ہوگی تو آپ کے تمام شکوک وشبہات دور ہوچکے ہوں گے۔"

☆☆......☆☆

اس شخص کے دفتر سے نکلتے ہی میں نے گھر کا رخ کیا دوپہر کا وقت تھا امی گھر میں ہی موجود تھیں۔ وہ مجھے آج غیر متوقع طور پر گھر میں دیکھ کر پریشان ہوئیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ آج دفتر میں کام نہیں تھا اس لیے میں نے سوچا کہ آج گھر ہی چلا جائے اس کے بعد میں نے امی سے چابیاں لیں اور اسٹڈی کا رخ کیا۔

جلد ہی مجھے مطلوبہ کتاب مل گئی اور اس میں واقعی ابو کے ہاتھ سے لکھا ہوا خط موجود تھا میں نے وہیں ایک صوفے پر بیٹھ کر خط پڑھنا شروع کیا' لکھا تھا۔

"جان سے پیاری بیٹی! میں تمہارا اور کامران کا مجرم ہوں میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہاری کامران سے شادی ہو اسی لیے میں نے خود ہی کامران کو اغوا کروایا تھا اور انڈیا کی جیل میں بھجوانے کا بندوبست کیا تھا میں نے کامران کے ساتھ بہت ظلم کیا۔ میری آنکھوں پر خود غرضی کی پٹی بندھی ہوئی تھی میں نے سوچا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تمہاری محبت میں کمی آتی جائے گی مگر جب

میں نے دیکھا کہ وقت کی رفتار نے تم پر الٹا اثر کیا ہے تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ یہ احساس اس وقت شدت اختیار کر گیا جب مجھے کامران کے اغوا کے سلسلے میں بلیک میل کرنے کی کوشش کی گئی اور مجھ سے کچھ ایسے کام کروانے کی کوشش کی گئی جو کہ میرے وطن کی سالمیت کے خلاف تھے اور میں نے تو کبھی ایسا سوچا بھی نہ تھا۔ یہی میری پریشانی کی سب سے بڑی وجہ تھی کامران کے اغوا والا کام کرواتے ہوئے مجھے یہ پتا نہ تھا کہ ستیش جس سے میرے کاروباری روابط تھے وہ انڈیا کی بدنام زمانہ تنظیم ''را'' کا ایجنٹ ہے اور ان لوگوں نے کامران کے ساتھ میرے مظالم اور گفتگو کی وڈیو بنالی تھی اور اب وہ مجھے اسی وجہ سے بلیک میل کر رہے تھے انہوں نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے ان کی بات نہ مانی تو وہ میرا سارا کچا چٹھا تمہارے سامنے کھول دیں گے تمہیں علم نہیں انہی دنوں میں نے تمہارے کمرے سے پی ٹی سی ایل سیٹ اٹھوالیا تھا اور کمپیوٹر بھی غائب کروادیا تھا یہاں تک کہ میں نے چپکے سے تمہارا موبائل بھی اٹھا کے اس کی سم چینج کردی تھی مگر تم تو ان دنوں اپنے آپ سے ہی بے خبر تھیں اس لیے تم نے کسی بات کا کوئی نوٹس نہیں لیا مگر میں تمہیں کب تک ان باتوں سے بے خبر رکھ سکتا تھا ابھی میں نے انہیں صاف جواب نہیں دیا تھا اور جب میں انہیں جواب دے دیتا تو میرے لیے کئی مسائل کھڑے ہوسکتے تھے اس لیے میں نے ہمت سے کام لیا اور آئی جی پنجاب کے ذریعے پاکستانی خفیہ ایجنسی کے کچھ ذمہ دار لوگوں سے رابطہ کیا اور انہیں تمام حقائق سے آگاہ کردیا اور ان لوگوں نے میرے تعاون سے ستیش سمیت کئی لوگوں کو گرفتار کرلیا۔

ہماری خفیہ ایجنسی کا ایک بندہ انڈیا کی جیل میں قید تھا اور وہ لوگ اسے چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے میں نے ان سے کامران کے بارے میں بات کی ہمارے ملک کی طرح ان کے ملک میں بھی بکاؤ لوگوں کی کمی نہیں۔ اس لیے خفیہ ایجنسی کے کارکن کے ساتھ ہی کامران کی بات بھی دس کروڑ میں طے ہوگئی اور دس کروڑ کی ادائیگی میں نے بخوشی اپنے ذمے لے لی۔

کچھ مشکوک قسم کے لوگ آج کل مجھے اپنے اردگرد نظر آنے لگے ہیں۔ ہماری خفیہ ایجنسی آج کل بحران کا شکار ہے کافی لوگوں کو ملازمت سے ڈسمس کیا جارہا ہے انہی لوگوں میں میرے خیر خواہ بھی شامل ہیں۔ میرا ان سے کوئی رابطہ نہیں ہو پارہا اور پولیس پر مجھے یقین نہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ میرے ساتھ کسی بھی وقت کچھ بھی ہوسکتا ہے اس لیے میں نے انڈیا میں موجود اس ڈیل کے ضامن تک اپنا رقعہ پہنچادیا ہے تفصیل کے لیے یہ خط بھی لکھ رہا ہوں اگر ہوسکے تو کامران سے مجھ سے ہونے والی زیادتیوں پر مجھے معاف کردینا اور کامران سے بھی کہنا گو کہ میں اس قابل نہیں ہوں پھر بھی میں اس سے اپنے کیے کی دست بستہ معافی مانگتا ہوں کیونکہ میں یہ اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ میرے مقابلے میں کامران کا ظرف کہیں زیادہ ہے۔ تمہارے کے بہتر مستقبل کے لیے دعا گو تمہارا گناہ گار باپ' جہانگیر!''

خط ختم ہوچکا تھا مگر مجھے اس میں لکھی ہوئی باتوں پر اب بھی یقین نہیں آرہا تھا میرے ابو ایسے نہیں ہوسکتے تھے۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے کافی دیر بعد جب میری طبیعت کچھ سنبھلی تو میں نے سوچا اگر یہ سب کچھ سچ ہے تو اس کے مطابق کامران کو گھر آئے ہوئے دو ماہ ہو چکے تھے اور اگر وہ دو ماہ سے اپنے گھر موجود تھا تو اس نے مجھے اب تک فون کیوں نہیں کیا؟ وہ مجھ سے ملنے کے لیے کیوں نہیں آیا پھر میں نے سوچا کہ شاید وہ گھر میں میرے والد کی وجہ سے نہیں آیا ہوگا مگر کچھ بھی تھا اسے مجھے فون تو کرنا چاہیے تھا میری اور اس کی محبت تو ان تمام باتوں سے پاک تھی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

آخر کار تھک ہار کر میں نے کامران کے گھر کا نمبر ملایا مگر وہ بند تھا میں ایک عزم سے اٹھی میں نے گھر سے نکلتے ہوئے امی سے اتنا کہا کہ میں کسی سہیلی کی شادی میں جارہی ہوں۔ ہوسکتا ہے میں آج گھر نہ آسکوں۔ امی نے سہیلی کا پوچھنا چاہا تو میں نے کہا کہ میں ابھی جلدی میں ہوں وہاں سے واپسی پر آکے بتاتی ہوں۔

میں نے گھر سے گاڑی نکالی تو شام ہوچکی تھی لاہور شہر سے نکلتے نکلتے مجھے ایک گھنٹہ لگ گیا ابھی چھ بجے تھے یہاں سے کامران کے گاؤں کا سفر زیادہ سے زیادہ چار گھنٹے کا تھا میں کم از کم نو بجے تک وہاں پہنچ ہی جاتی کامران کا گاؤں مین روڈ سے ہٹ کر تھا اور کچھ فاصلہ مجھے کچی سڑک پر طے کرنا تھا جو کہ کافی زیادہ خراب تھی اور رات کے اس وقت یہ سفر انتہائی خطرناک تھا مگر مجھے اس وقت کامران کے علاوہ کچھ نظر نہیں آرہا تھا پورے پونے دو سال کے جاں گسل ہجر کے بعد اس کے آنے کی خوشخبری ملی تھی میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اڑ کر اس تک جا پہنچوں انتہائی تیز رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے میں کامران کے گاؤں جانے والے لنک روڈ تک پہنچی اس دوران آسمان پر گھنے بادل چھا چکے تھے اور بادلوں کو دیکھتے ہوئے لگتا تھا کہ کسی بھی وقت بارش شروع ہوسکتی تھی۔ آج سردی بھی کافی زیادہ تھی راستہ بالکل سنسان تھا گاؤں میں تو سر شام ہی لوگ سو جاتے تھے اس لیے اس وقت اس راستے پر کسی شریف آدمی کا پایا جانا محال تھا۔

لنک روڈ ختم ہوا تو کچا راستہ شروع ہوگیا یہ راستہ انتہائی خطرناک تھا سڑک کے دونوں اطراف گھنے درخت اور سرکنڈے اگے ہوئے تھے گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں اونچے نیچے راستے کے درمیان کہیں کہیں گڑھے بھی نظر آرہے تھے میں ان سے گاڑی کو انتہائی مہارت سے بچاتے ہوئے گزر رہی تھی کہ اچانک گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔

جانے گاڑی کے ساتھ کیا مسئلہ ہوگیا تھا میں گاڑی سے باہر نکلی اور بونٹ اٹھا کر انجن کو چیک کرنا چاہا تو مجھے یاد آیا کہ گاڑی میں سی این جی کافی دیر پہلے ختم ہوگئی تھی اور میں نے گاڑی پٹرول پر کردی تھی بعد میں مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ گاڑی میں سی این جی بھی ڈلوانا تھی۔ رات کے اس پہر اس کچی سڑک پر کسی پٹرول پمپ کے بارے میں تو سوچنا ہی محال تھا دن ہوتا تو شاید کہیں سے ارینج بھی ہوسکتا تھا میں نے گاڑی کی ہیڈ لائٹس بند کر کے اسے لاک کردیا اور خود اللہ کو یاد کرتے ہوئے پیدل ہی گاؤں کی طرف چل دی۔

ابھی گاؤں کافی دور تھا اور مجھے نہیں پتا تھا کہ پیدل چل کر میں کتنی دیر میں گاؤں تک پہنچتی سرد ہوا چل رہی تھی کبھی کبھی گیدڑوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا نظر آرہا تھا ابھی میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک بادلوں کی زوردار گڑگڑاہٹ کے ساتھ بارش شروع ہوگئی سڑک کے دونوں طرف کماد کے کھیت نظر آرہے تھے ماحول انتہائی خوفناک ہوتا جارہا تھا۔

بارش میں گاؤں کی طرف سفر کرتے ہوئے مجھے ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ اچانک بجلی چمکی اور میں نے گاؤں کی طرف سے کسی کو بھاگ کر اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ رات کے اس پہر یہ کون ہوسکتا تھا۔ میں خاموشی سے کماد کے کھیت میں داخل ہوگئی اور دیکھنے لگی کہ یہ بندہ گزر جائے تو میں بھی گاؤں کی طرف بڑھ جاؤں۔ میرا دھیان گاؤں کے راستے پر ہی تھا بجلی بار بار چمک رہی تھی اور اس روشنی میں گاؤں سے آنے والے بندے کے خدوخال مجھے کچھ جانے پہچانے سے لگ رہے تھے اور میں اسے کیسے بھول سکتی تھی یہ تو میرا کامران

تھا گوکہ اس کی شکل وصورت میں کافی تبدیلیاں تھیں اور پہلے کی نسبت وہ کافی کمزور بھی لگ رہا تھا مگر میں تو اسے اس کی خوشبو سے پہچانتی تھی یہ پہچان صورت کی محتاج نہ تھی اس پہچان کی مثال ایسے تھی کہ جیسے آپ کے وجود کا حصہ، جب تک وہ آپ کے وجود کا حصہ ہے آپ اسے کیسے بھول سکتے ہیں؟ اور کامران میرے وجود کا حصہ نہ تھا وہ تو میرا پورا وجود تھا۔ میں نے اسے آواز دی۔

☆☆......☆☆

مجھے پتا نہیں تھا کہ یہ کونسی جیل تھی اور میں کہاں تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں اپنی ذات سے ہی بے خبر ہو چکا تھا مجھے کہاں لے جایا جا تا رہا مجھے کچھ پتا نہ تھا مجھ سے کسی نے کیا پوچھا اور میں نے کیا جواب دیا مجھے کچھ خبر نہ تھی اور پھر ایک دن شاید خدا کو مجھ پر ترس آ گیا جیل کے اسپتال میں موجود ایک لیڈی ڈاکٹر جو کہ نئی نئی یہاں آئی تھی اس کی کوششوں سے مجھے اسپتال میں داخل کرلیا گیا اس مہربان ڈاکٹر کا نام گیتا دیوی تھا اس نے میرا علاج شروع کیا اس سے یہ ہوا کہ کم ازکم میں جسمانی طور پر تھوڑا بہت چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا مگر ذہنی طور پر مجھے کچھ یاد نہ تھا میں اپنی پہچان بھول چکا تھا۔

کچھ عرصے بعد ان لوگوں نے مجھے ایمبولینس میں ڈالا اور ایک ڈاکٹر نظر آنے والے شخص نے مجھے کوئی انجکشن لگایا اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ ہوش آیا تو مجھے بتایا گیا کہ میں پاکستان میں ہوں اور پھر وہ لوگ مجھے ایک گاؤں میں چھوڑ گئے وہاں ایک حویلی میں کچھ لوگوں نے میرا زبردست استقبال کیا یہاں کے لوگ کہتے ہیں کہ میں ان کا اپنا ہوں اور میرا نام کامران ہے۔

☆☆......☆☆

میرے سر میں لگنے والی چوٹ نے مجھے اپنی شناخت سے روشناس کروادیا میں نے دیکھا کہ اس تیز بارش اور بادلوں کی گھن گرج میں زمین مجھ پر جھکی ہوئی تھی ہم دونوں پانی اور کیچڑ میں لت پت تھے اس نے مجھ سے کہا۔

"کیا تم مجھے بھول گئے ہو کامران؟"

"زمین! کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں تمہیں بھول جاؤں میں تو اپنے وجود کے نہاں خانوں میں کہیں چھپ کے بیٹھا تم سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا میری جان! اگر تم اس سے پریشان ہوگئی ہو تو آئندہ نہیں کھیلوں گا، توبہ کرتا ہوں۔" میں نے یہ کہہ کر کانوں کو ہاتھ لگایا اور شرارت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"تمہاری یہ عادتیں کب چینج ہوں گی۔ تم ہمیشہ مجھے تنگ کرتے رہتے ہو اور تم کب آئے پاکستان، مجھے خبر تک نہیں کی؟ مجھے تمہارے بارے میں کبھی رپورٹس مل گئی ہیں۔ بدھو تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟ خود ہی سارا عذاب جھیلتے رہے اور تم نے......" اور شاید وہ اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔

"رات بہت ہوگئی ہے اور آسمان کو دیکھا ہے شاید ہمارے ملن کی خوشی میں روئے جا رہا ہے اور اس سے پہلے کہ تمہیں سردی لگے اور کڑوی کسیلی دوائیں مجھے کھانی پڑیں آؤ گھر چلتے ہیں۔"



تماش بین

زر، زن اور زمین کی جنگ ازل سے ہی اور ابد تک رہے گی۔ زیر نظر کہانی زن سے تعلق رکھتی ہے ایک ایسی عورت کا احوال جسے ہمارے معاشرے میں ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے سماج میں ایسے لوگ ناسور سمجھے جاتے ہیں۔ مگر جیسے ہاتھ کی پانچ انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اسی طرح لوگ بھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔

ایک سچی تفتیشی کہانی، اس دور کی پولیس کا احوال جب جدید آلات ایجاد نہیں ہوئے تھے۔

بازار حسن کی موشگافیاں، سطر بہ سطر دلچسپ کہانی

کبھی کبھی سرپرائز دینے میں لطف آتا ہے۔ اس بار میں آپ کو ایک سرپرائز دے رہا ہوں۔ میں ساری سروس ایک تھانے میں تو رہا نہیں تھا۔ زیر نظر کہانی میرے نئے تھانے کی ہے۔ پہلے میں آپ کی خدمت میں نئے تھانے کا محل وقوع پیش کردوں۔ یہ ایک بڑے شہر کا تھانہ تھا۔ مجبوری کی وجہ سے شہر کا نام نہیں لکھوں گا۔ اس شہر کی حدود میں کئی تھانے اور چوکیاں تھیں۔

ہمارے تھانے کی حدود میں بازار حسن بھی تھا۔ ایک بڑی منڈی تھی۔ زیادہ نہیں بتاؤں گا ورنہ شہر کا نام چھپانے کا مقصد فوت، بلکہ ہمارے لفظوں میں قتل ہو جائے گا۔ عملے میں دو ایس آئی (شاہد اور ابرار) دو ہیڈ کانسٹیبل (صفدر اور اعظم) تھے۔ باقی عملے کا تعارف مختلف کہانیوں میں آتا رہے گا۔

وہ کہتے ہیں نہ کہ سر منڈھواتے ہی اولے پڑے۔ ابھی مجھے اس تھانے کا چارج سنبھالے ہوئے چند دن ہی ہوئے تھے کہ بازار حسن سے دو بندے یہ اطلاع لے کر آئے کہ نیلم بائی قتل ہوگئی ہے۔

اطلاع دو پہلوان نما بندے لے کر آئے تھے۔ ان کا تعارف کرانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ طوائفوں کے کوٹھوں پر ایسے بندے ہوتے ہیں۔ یہ بدمعاشی سے لے کر ہر قسم کا کام کرنے میں ماہر ہوتے ہیں۔

اور اس قسم کے آدمی رکھنا ان طوائفوں کی مجبوری ہوتی ہے۔

بہر حال میں نے ان سے ابتدائی معلومات حاصل کر کے ان کو رخصت کردیا۔ اور کہا۔ "ہم آرہے ہیں۔"

اے ایس آئی شاہد میرے پاس بیٹھا تھا۔

میں نے اسے ضروری تیاری کا حکم دیا اور خود بھی جلدی جلدی ضروری ڈاک نمٹانے لگا۔

ایک گھنٹے بعد ہم نیلم بائی کے کوٹھے پر موجود تھے۔ میرے ساتھ ہیڈ کانسٹیبل اعظم اور سپاہی بشارت تھا۔

گولی سینے میں لگی تھی اور میری تجربہ کار نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ گولی قریب سے ماری گئی ہے۔ اس نے موسم کے لحاظ سے گلابی شلوار قمیص زیب تن کی ہوئی تھی۔ بال کھلے ہوئے تھے۔ اور ان کو گھٹاؤں سے تشبیہہ دی جاسکتی تھی۔

بحیثیت مجموعی وہ زندگی میں لاکھوں میں نہیں تو ہزاروں میں ضرور ایک رہی ہوگی۔ لیکن اس وقت موت کی زردی اس کے چہرے پر رقصاں تھی۔

اس وقت صبح کے آٹھ بج چکے تھے۔

وہ غالباً جون کا مہینہ تھا۔ سورج جلدی نکل آتا تھا۔

علاوہ ازیں یہ وہ وقت تھا جب بازار حسن میں ہو کا عالم تھا۔ یہاں راتیں جاگتی اور دن سوتے ہیں۔

میں نے ضروری کاغذات تیار کرنے کے بعد لاش

پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوادی۔ سپاہی بشارت کو میں نے ساتھ روانہ کردیا تھا۔

یہاں اس بات کی وضاحت کردوں کہ یہ کوٹھا دو کمروں پر مشتمل تھا۔ جس کمرے میں نیلم بائی کی لاش ملی تھی وہ اس کی اور بڑی بائی ریشم کی خواب گاہ تھی۔

دوسرا کمرہ مجرے کے لیے مخصوص تھا۔ اور دن کو اس کوٹھے سے متعلق مرد یہاں سوتے تھے۔ یہ بازار حسن کا آخری کونا تھا اور یہاں سے دکانیں ذرا دور تھیں۔ ایک تنگ سی گلی میں یہ کوٹھا تھا۔

یہ ساری معلومات مجھے اطلاع کنندہ (دو بندوں) نے دی تھیں اور اس وقت ان ساری باتوں کا ہم عملی طور پر جائزہ لے چکے تھے۔

پولیس کو دیکھ کر کچھ بندے ضرور کوٹھے کے نیچے جمع ہوگئے تھے۔ جنہیں ہم نے اوپر آنے سے منع کردیا تھا۔

ہیڈ کانسٹیبل اعظم کو میں نے نیچے کھڑا کردیا اور خود مجرے والے کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔

میرے لیے ایک کرسی یہاں رکھوادی گئی تھی۔

یہاں ایک بات کی وضاحت کردوں کہ بڑی بائی ریشم کی طبیعت برسوں سے خراب تھی اور اسے ایک قریبی اسپتال میں داخل کروادیا گیا تھا۔ دونوں بندوں کا نام اکرم عرف اکو اور رشید عرف شیدا تھا۔

دو راتوں سے مجرا نہیں ہوا تھا۔

اور رات نیلم بائی اکیلی سوئی تھی۔

بقول دونوں بندوں کے رات نیلم بائی نے کہا تھا کہ اسے صبح سات بجے جگادیا جائے۔ اس نے اسپتال جانا تھا۔

جب صبح اکرم عرف اکو نے خواب گاہ والے کمرے کے دروازے پر دستک دی تو اندر سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ اس نے یہ عمل تین چار بار دہرایا پھر جونہی اس نے دروازے پر ذرا سا دباؤ ڈالا وہ یکا یک کھل گیا۔

یعنی اندر سے اسے بند نہیں کیا گیا تھا۔ یہ ایک انہونی اور اچنبھے والی بات تھی۔

اکو نے دو تین بار بائی جی بائی جی کہہ کر پکارا لیکن جواب ندارد۔ وہ دوسرے کمرے سے رشید عرف شیدے کو بلا لایا۔

اور جب دونوں کمرے میں داخل ہوئے تو انہوں نے نیلم بائی کو خون میں لت پت دیکھا۔ کمرے میں ایک ڈبل بیڈ بچھا ہوا تھا۔ لیکن......!

نیلم بائی نیچے فرش پر پڑی تھی۔

میں نے بیڈ کا معائنہ کیا تھا...... وہاں یہ بات تو ثابت تھی کہ یہاں رات کوئی سویا یا سوئی تھی۔

زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ نیلم بائی یہاں سوئی تھی۔ کیونکہ کسی مرد کا سونا ثابت نہیں ہوا تھا...... آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے۔

یہ ساری باتیں یا معلومات تو میں نے تھانے میں اکو اور شیدے سے حاصل کرلی تھیں۔

”ہاں تو اکو اور شیدا صاحب اب جو سوال میں آپ سے پوچھوں گا اس کا بالکل سچا اور کھرا جواب دینا ہے۔“

میں نے اپنے سامنے نیچے بیٹھے ہوئے دونوں بندوں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”جناب...... ہماری تو کمر ٹوٹ گئی...... ہمارا ککھ نہیں رہا ہے۔ یہ کوٹھا ویران ہوگیا ہے۔“ شیدے نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

میں نے اکو کی طرف دیکھا۔ وہ بھی ہاتھ مل رہا تھا۔

”دیکھو...... جوانوں ہاتھ ملنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ میں نے قاتل کو پکڑنا ہے۔ اس لیے......؟“ میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”پوچھیں جناب، ہم حاضر ہیں۔“

”سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ یہاں صرف مجرا ہوتا

ہے یا دوسرا دھندہ بھی ہوتا ہے اور کیا یہاں اور عورتیں اور لڑکیاں بھی آتی ہیں۔ یہ سوال میں نے اس مقصد کے لیے پوچھا تھا کہ اس دور میں عصمت فروشی کا دھندا عروج پر تھا۔ ایسے الگ تھلگ کوٹھوں پر ادھر ادھر سے عصمت فروش عورتیں آتی تھیں۔

چھاپے پڑتے تھے...... لیکن قابو پانا مشکل تھا۔

اور یہ دھندا کروانے والیاں اثر ورسوخ والی تھیں۔

”جناب...... ہماری بڑی بائی اس دھندے کو اچھا نہیں سمجھتی ہیں۔ اس لیے یہاں صرف مجرا ہی ہوتا ہے۔ جب نیلم بائی گھنگھرو باندھ کر تماش بینوں کے سامنے آتی تھیں تو......“

شیدے نے ایک آہ بھر کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”لیکن شیدا اور اکو یہاں استاد ٹائپ بندے نظر نہیں آرہے۔ کیا تم ہی یہ ساز وسامان بجاتے ہو۔“

میں نے کمرے میں پڑے گانے بجانے کے انسٹرومنٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں جناب...... استاد رات کو آتے ہیں اور صبح صبح چلے جاتے ہیں۔“

”اچھا...... یہاں کافی تماش بین آئے ہوں گے۔ ظاہر ہے ہر شخص کا حلیہ یاد رکھنا تو مشکل ہوتا ہے لیکن کچھ خاص تماش بین بھی ہوتے ہیں۔ میں نے ہنکارا بھرا...... اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میری بات تم سمجھ گئے ہوگے۔“

”بالکل جناب! اللہ آپ کو اور ترقی دے۔ ایک بندہ ایسا ہے جو بائی جی پر زیادہ ہی مہربان ہوگیا تھا۔“

”اچھا......“ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور سوال کیا۔

”اس کے متعلق کیا کچھ جانتے ہو؟“

”جناب! آپ کو تو پتہ ہے کہ ہمیں صرف نوٹوں سے غرض ہوتی ہے۔ بہرحال یہ بندہ ہفتے میں ایک بار ضرور آتا تھا اور اکیلے بیٹھ کر گانا سنتا تھا۔“

اس کے بعد ہم تھانے میں واپس آگئے۔ کمرے کو قانونی تقاضے نبھاتے ہوئے سیل کرآئے تھے۔

کوٹھے سے ہمیں ایک چیز ملی تھی۔ جس کا ذکر مناسب موقع پر آئے گا۔

تھانے میں واپس آ کر میں نے اے ایس آئی شاہد کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ نیلم بائی کے کوٹھے کے متعلق ادھر ادھر سے معلومات حاصل کرے۔

اس بات کی تصدیق بہت ضروری تھی کہ کیا واقعی اس کوٹھے پر صرف مجرا ہوتا تھا۔

اسی دن شام سے ذرا پہلے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آگئی۔ اسے ہم ابتدائی رپورٹ کہتے ہیں۔ تفصیلی رپورٹ اور لاش کو صبح آنا تھا۔

ابتدائی رپورٹ کے مطابق مقتولہ کو جو گولی لگی تھی اس نے دل چیر دیا تھا اور یہ بات بھی خاص طور پر درج تھی کہ نشانہ تقریباً ایک ڈیڑھ گز کی دوری سے لیا گیا تھا۔

اس دوران مجھے پتہ چل گیا کہ بڑی بائی ابھی اسپتال میں ہی ہے۔ اسے جگر کا کوئی مسئلہ تھا اور حالت سیریس تھی۔ اسے انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں رکھا گیا تھا۔ اور ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ بچنے کی امید کم ہے۔

اگلی صبح مقتولہ نیلم بائی کی لاش اور یہ خبر ساتھ ساتھ آئی کہ ریشم بائی کا انتقال ہوگیا ہے۔

اب دو لاشوں کو دفنانے کا مسئلہ پیدا ہوگیا تھا۔

خیر مسئلے تو حل ہونے کے لیے ہی ہوتے ہیں۔

یہ غالباً اس سے دو دن بعد کا ذکر ہے کہ شاہد یہ معلومات لے کر آیا کہ واقعی کوٹھے پر صرف مجرا ہی ہوتا تھا۔

نیلم بائی جس کی عمر مقتولہ بننے پر پچیس چھبیس سال تھی۔ ریشم بائی کی سگی بیٹی تھی اور یہ ایک تماش بین کی نشانی تھی۔ ریشم بائی اپنی جوانی میں بہت خوب صورت تھی۔

ایسے کیسوں کی تفتیش کے سلسلے میں بعض' بلکہ اکثر ایسی باتیں بھی سامنے آتی تھیں جن کو من وعن لکھنا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے باقی اندازے آپ کی ذہانت پر چھوڑتا ہوں اور آگے کا حال سناتا ہوں۔

اے ایس آئی شاہد ذہین بندہ لگتا تھا۔ آگے کی معلومات حاصل کرنے کی ڈیوٹی میں نے اس کے ہی ذمے لگادی۔

اور کانسٹیبل وقار کو مقتولہ کے کمرے سے ملنے والی چیز دے کر کہا کہ اس بندے کو لے کر آجائے۔ اسے اسی شہر کے ایک دوسرے تھانے میں جانا تھا...... وقار گو ایک کانسٹیبل تھا لیکن کھرے کھوج لگانا اس پر ختم تھا۔ آگے جاکر اس نے بہت ترقی کی تھی اور تھانے دار ریٹائر ہوا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے کچھ امتحان بھی پاس کیے تھے۔

بہرحال اگلے دن اس نے مجھے بتایا' کہ مطلوبہ بندہ نہیں ملا۔ اب یہ بات بتادوں کہ مقتولہ کے کمرے سے ہمیں ایک شناختی کارڈ ملا تھا۔

البتہ اس نے ایک امید افزا خبر یہ سنائی کہ اس کا بچپن کا دوست محبوب اسے مل گیا تھا۔

یہ تو آپ کے علم میں ہے کہ دوسرے تھانے کی حدود میں کسی قسم کی کارروائی ڈالنے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ محبوب نے اسے دوسرے اہلکار کی نظر بچا کر ایک رقعہ دیا تھا جس پر لکھا تھا کہ وہ کل کسی وقت آئے گا۔

اگلے دن جو جوان میرے سامنے آیا اس کا رنگ گورا اور چہرے پر ایک کالا تل تھا۔ عمر بتیس کے قریب رہی ہوگی۔ ماتھے پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں اور وہ بھوئیں تان کر بات کرتا تھا۔

اس نے ایک لمبی چوڑی کہانی سنادی۔ جو اگر میں ساری لکھنے لگوں تو بات بہت لمبی ہوجائے۔

اس لیے بات کو ذرا مختصر کرتا ہوں۔ یہ کہانی عبرت اثر بھی ہے اور ہمارے معاشرے کا المیہ بھی۔

محبوب نے اپنے دوست کا نام اصغر بتایا۔

اصغر ابھی چار پانچ سال کا ہی تھا کہ اس کے ابو اچانک فوت ہوگئے۔ وہ ایک مل میں کام کرتے تھے۔ وہاں لوہے کے پانی والے بڑے بڑے پائپ بنتے تھے۔ پائپ کرین سے ادھر ادھر کیے جاتے تھے۔ اچانک کرین کا پٹہ ٹوٹ گیا اور پائپ سیدھا اس کے سر پر آلگا۔ اور چند لمحوں کے اندر اندر ہی اس کے باپ نے دم توڑ دیا۔

اس کی ماں کی دنیا اندھیر ہوگئی۔ ایک مہینہ تو اس بیچاری کو کچھ سمجھ ہی نہیں آیا کہ اچانک یہ کیا ہوگیا۔

بڑی مشکل سے رشتے داروں کے سمجھانے بجھانے پر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اسے اپنے ننھے اصغر کی یاد آگئی۔ اس نے اسے سینے سے لگایا تو اسے افسوس ہوا کہ اس نے اب تک اسے چچا چچی کے رحم وکرم پر کیوں چھوڑا ہوا تھا۔ اس نے اصغر کے لیے جینے کا تہیہ کرلیا۔ ورنہ وہ تو کہتی تھی کہ اصغر کے ابا مجھے بھی ساتھ لے جاتے' میں تمہارے بغیر جی کر کیا کروں گی۔

اصغر کے ابا اپنی بیوی اور بیٹے سے بہت پیار اور محبت کرتے تھے۔ ایک سال کا عرصہ اسی طرح گزر گیا۔ چالیسویں کے بعد اصغر کی ماں کشور بیگم اپنے بھائیوں کے در پر آگئی تھی۔ ماں باپ فوت ہوچکے تھے۔

ایک بہن تھی' جس کے در پر جانا اچھا نہیں تھا۔

کشور بیگم نے لوگوں کے کپڑے سینے شروع کردیئے تھے۔ اصغر اسکول میں داخل ہوگیا تھا۔

اصغر پیار محبت میں پلا بڑھا تھا۔ ماں اور باپ دونوں کا بے تحاشا پیار ملا تھا۔

ماں نے اپنے آپ کو کام دھندے میں الجھالیا تھا۔ جس پیار کا اصغر عادی تھا۔ وہ بہت کم ہوگیا تھا۔ صرف

رات کو جب وہ ماں کی چھاتی سے لگ کر سوتا تھا تو اسے احساس ہوتا تھا کہ ماں تو ہے' لیکن یہ ناکافی تھا۔ ادھر کشور بیگم الجھی الجھی رہتی تھی۔ کچھ عرصے سے بھاوجوں نے اسے دوسرا نکاح کرنے کے لیے اشاروں کنایوں میں کہنا شروع کردیا تھا۔

یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا۔ حالانکہ وہ ان پر بوجھ نہیں تھی۔ کپڑے سی کر وہ اتنا کما لیتی تھی جس سے دونوں ماں بیٹے کی ضرورتیں پوری ہورہی تھیں۔

میں بات کو ذرا مختصر کرتا ہوں۔ آخر کار کشور بیگم کو دوسرا نکاح کرنا پڑا۔

وہ بندہ سائیکلوں کا کام کرتا تھا۔ اور اتنا کما لیتا تھا جس سے گزارا ہورہا تھا۔

اصغر نے پہلے دن سے ہی نئے باپ کو قبول نہیں کیا۔ بچے پیار کے بھوکے ہوتے ہیں نئے باپ سے وہ پیار نہ ملا۔ ماں بھی اسے زیادہ پیار نہ دے سکی۔ خاوند دن بھر کا تھکا ہارا آتا تو کشور بیگم اس کی خاطر تواضع میں لگ جاتی۔

اصغر نے باہر دوست بنالیے۔ اب وہ چھوٹا نہیں تھا ایک کبرو جوان بن گیا تھا۔ محبوب اس کا بچپن کا دوست تھا۔

وہ اکثر محبوب کے آگے اپنا رونا روتا رہتا تھا۔

دونوں نے میٹرک پاس کرلیا۔ محبوب کی سیکنڈ اور اصغر کی تھرڈ ڈویژن تھی۔

ایک دن اصغر نے محبوب کو یہ خوش خبری سنائی کہ اسے ملازمت مل گئی ہے۔ اب وہ مہینے میں ایک دوبار آیا کرے گا اور ساتھ یہ بھی بتایا کہ اسے پیار مل گیا ہے لیکن اصغر نے زیادہ تفصیل میں نہیں بتایا اور نہ اصغر نے محبوب کو اپنے کام کی جگہ کے متعلق بتایا تھا۔

یہ چھ ماہ پہلے کی بات تھی۔ اس دوران اصغر صرف پانچ چھ دفع ہی محبوب سے ملنے آیا تھا اور اب پندرہ دن ہوگئے تھے۔

قارئین آپ اصغر کی نفسیات کے متعلق جان ہی گئے ہوں گے ایسے پیار کے پیاسے کو جہاں ذرا پیار ملتا ہے وہیں کے ہو کے رہ جاتے ہیں۔ اگر یہ بات فرض کرلی جائے کہ اسے نیلم بائی کے روپ میں پیار مل گیا تھا تو اس نے اپنے پیار کو قتل کیوں کیا؟

علاوہ ازیں وہ کہاں تھا؟

اکو اور شیدے نے بتایا تھا کہ ''خاص تماش بین'' ایک ہفتے پہلے آیا تھا۔

طوائفوں سے متعلق یہ بات خاص طور پر مشہور ہوتی ہے کہ یہ صرف پیسے کی یار ہوتی ہیں۔

یہ سب کچھ کیا تھا......؟ میں نے اس پر سے پردہ اٹھانا تھا۔ محبوب کو رخصت کرنے سے پہلے میں نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ جونہی اصغر اس سے ملنے آئے۔ اسے اپنے پاس کسی بہانے سے روک کر ہمیں اطلاع دے۔

اس تھانے میں بھی مخبری کا نظام ہر تھانے کی طرح بڑا موثر تھا۔

یہاں ایک بات کا اور ذکر کرنا ضروری ہے کہ ریشم بائی کے مرنے کی وجہ سے اس بندے کا سراغ ملنا ناممکن ہوگیا تھا۔ جس کی نشانی نیلم بائی تھی۔ اے ایس آئی شاہد نے کافی کوشش کی تھی لیکن مایوسی کے کچھ ہاتھ نہیں آیا تھا۔ اس طرح ان ماں بیٹی کا ماضی اندھیرے میں تھا اور میں آپ کو یہاں یہ بھی بتادوں کہ آخر تک اندھیرے میں ہی رہا تھا۔

اس وقت شاہد میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور ہم چائے پیتے ہوئے اس کیس کے متعلق بات چیت کررہے تھے۔

''سر...... لگتا ہے قاتل اصغر ہی ہے اور اب روپوش ہوگیا ہے۔''

شاہد نے چائے کی پیالی خالی کر کے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"فی الحال سب سے بڑا مشتبہ وہی ہے۔" میں نے بھی چائے کا آخری گھونٹ حلق سے نیچے اتارتے ہوئے کہا۔

لیکن اگر وہی قاتل ہے تو اسے ڈھونڈنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔"

"سر آپ نے جگنو کے متعلق کیا سوچا ہے؟"

"ہر وقت ہماری نظروں کے سامنے ہے۔ میں ذرا پکا ہاتھ ڈالنا چاہتا ہوں...... مخبر اپنا کام کر رہے ہیں نہ۔"

"بالکل سر۔" شاہد چلا گیا۔

اور میں میز پر بکھرے ہوئے کاغذات کی طرف متوجہ ہو گیا۔

جگنو کا اصل نام جابر خان تھا۔ اور باخبر ذرائع سے ہمیں پتہ چلا تھا کہ وہ منشیات کا کاروبار کرتا ہے۔

بظاہر وہ عوامی ٹائپ بندہ تھا۔ غریبوں کی مدد کرنا' ہر غمی میں شریک ہونا' اور اب تو بہت سے لوگوں نے اسے اپنی خوشیوں میں شریک کرنا شروع کر دیا تھا۔

ابھی ہمارے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا اس کے خلاف۔

نیلم بائی کے قتل والے کیس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ "معاملہ" بھی دیکھنا تھا اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے۔ نیلم بائی کو قتل ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔

مجھے اطلاع دی گئی ہے کہ ایک عورت آئی ہے۔ وہ کہتی ہے صرف بڑے تھانیدار سے ملنا ہے۔

میں نے اطلاع لانے والے (جو ایک سپاہی تھا) کو کہا۔

"بھیج دو۔"

چند لمحوں بعد جو عورت نپے تلے قدموں کے ساتھ چلتی ہوئی میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے سفید ٹوپی والا برقع پہنا ہوا تھا۔ ہمارے دور میں یہ برقع عام تھا۔ کچھ امیر خاندان کی عورتیں کالا برقع بھی پہنتی تھیں اور ان کا تعلق زیادہ تر شہروں سے ہوتا تھا۔ اسے فیشنی برقع کہتے تھے۔

اس عورت نے برقع اٹھایا تو مجھے ایک دھچکا سا لگا۔

یہ ایک خوب صورت دوشیزہ تھی۔ عمر بیس بائیس سال ہی ہوگی۔

"ہاں بی بی کس طرح آئی ہو؟" میں نے سوال کیا۔ اس سے پہلے میں اسے کرسی پر بیٹھنے کا کہہ چکا تھا اور وہ بیٹھ بھی چکی تھی۔

تھانیدار صاحب' میں ایک بندے کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروانے آئی ہوں۔" اس نے پریشان نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کس کی؟ اور تمہارا اس کے ساتھ کیا رشتہ ہے؟" میں نے استفہامیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

اگر سمجھیں تو بہت کچھ...... نہ سمجھیں تو کچھ بھی نہیں...... باقی آپ خود سمجھدار ہیں۔"

"یہاں تک تو میں سمجھ گیا ہوں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن بندے کا نام تو بتاؤ۔"

جب اس نے بندے کا نام بتایا تو میں اچھل پڑا۔

وہ اصغر تھا۔ کیونکہ میں نے استفسار کر کے اس کا حلیہ بھی پوچھ لیا تھا۔

قارئین آپ سمجھ گئے ہوں گے' جی ہاں یہ عشق معشوقی والا معاملہ تھا۔

"بی بی...... رپورٹ درج کروانے کی فی الحال ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں خود اس کی تلاش ہے۔"

"کیا مطلب......؟" اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

اور جب میں نے اسے وجہ بتائی تو وہ نفی میں تیزی

سے ادھر ادھر گردن ہلانے لگی اور اس کی آنکھیں مزید پھیل گئیں۔

اس سے اور بھی باتیں ہوئیں۔ جن کا ذکر آگے آئے گا۔ وہ مجھے اپنی طرف سے یقین دلا گئی کہ اصغر کا ایک طوائف کے ساتھ اور خاص کر اس کے قتل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ آخر میں دبی زبان سے یہ بھی کہہ گئی کہ......

"میرا اصغر ایسا نہیں ہو سکتا۔"

یہ تو جذباتی باتیں ہوتی ہیں۔ اگر تھانیدار ان ہی باتوں پر یقین کر کے بیٹھ جائے تو......؟ البتہ...... وہ کچھ اشارے دے گئی تھی۔ یہ تو اندھے کے ہاتھ بٹیر آنے والی بات تھی۔

میں نے کانسٹیبل وقار کو ضروری ہدایات دے کر کہا۔ کہ تازہ ترین حالات کے مطابق کارروائی کرے اور تفتیش کی گاڑی کو اس پٹڑی پر چڑھا دے۔

اصغر کے متعلق میں نے جو باتیں آپ کو بتائی تھیں ان سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ اصغر کے لواحقین کیوں خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ مہینہ دو دو مہینہ گھر نہیں جاتا تھا۔

بہرحال یہ ان کا ذاتی مسئلہ تھا۔ مجھے تو قاتل کو ڈھونڈنا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ مخبروں کو ہم نے "جگنو" کے پیچھے لگایا ہوا تھا۔ ایک مخبر فقیر کے بھیس میں جگنو کی کوٹھی (جو ایک کنال پر بنی ہوئی تھی) کے سامنے والے فٹ پاتھ پر براجمان تھا۔ اس کے ساتھ ایک پولیس اہلکار سفید کپڑوں میں ملبوس اس کی نگرانی کر رہا تھا۔ جگنو کی کچھ پراسرار اور مشکوک سرگرمیاں ہمارے مخبروں نے دیکھی تھیں اور چند دن پہلے ہی ہم نے یہ انتظام کیا تھا۔

یہ اسی شام کی بات ہے کہ مجھے اطلاع ملی۔

"جگنو اپنی کار میں ایک کوٹھی میں گیا ہے۔ وہ کوٹھی عموماً ویران رہتی ہے۔ کبھی کبھی وہاں رات کو گہما گہمی دیکھنے کو ملتی ہے۔

میں نے تھانے کا انتظام اے ایس آئی ابرار کے سپرد کیا اور خود مکمل تیاری کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

میرے ساتھ دس اہلکار تھے۔ جو ہر قسم کے حالات سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیتوں سے مالا مال تھے۔

ہم نے انہیں اچانک جا لیا...... وہ بڑے اطمینان سے لکڑی کی چند پیٹیوں کا معائنہ کر رہے تھے۔

وہاں جگنو کے علاوہ چھ بندے اور بھی تھے اور یہ سب شکل سے چھٹے ہوئے بدمعاش لگتے تھے۔

ہم نے سب کو آہنی زیور پہنا دیا۔

جگنو نے مجھے ایک طرف لے جا کر بہت بڑی رشوت کی پیش کش کی۔

میں نے نفسیاتی چال چلتے ہوئے کہا۔

"اس وقت تم سب کو تھانے لے جاؤں گا۔ وہاں مک مکا ہو جائے گا۔"

وہ میری چال میں آ گیا۔ اور اس طرح ہم بڑی آسانی سے انہیں تھانے لے آئے اور حوالات میں بند کر دیا۔

جب جگنو کو حوالات میں بند کرنے لگے تو اس نے واویلا مچایا کہ وعدہ خلافی ہے۔

وہ یہ چاہتا تھا کہ میں اسے چھوڑ دوں۔

اور باقی بندوں پر کیس بنا دوں۔

میں اسے کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ سیانے کہتے ہیں کہ برے کی ماں کو مارو۔ تاکہ وہ کوئی اور برا نہ جن سکے۔

یہ رات میں نے تھانے میں ہی گزارنی تھی۔ میں نے عملے سے یہ کہہ دیا کہ باقیوں کو دال روٹی دے دینا۔ لیکن جگنو کو صرف پانی دینا۔

ظاہر ہے پیٹیاں بھی تھانے میں آ گئی تھیں۔ یہ تعداد میں دس تھیں اور ان میں چرس اور افیون تھی۔ بعد

کی پوچھ گچھ سے یہ بات پتہ چلی تھی کہ یہ مال آج ہی آیا تھا اور جگنو صاحب اس کا معائنہ کرنے تشریف لے گئے تھے اور اب ان کا معائنہ ہم کر رہے تھے۔

رات بارہ بجے کے قریب میں نے جگنو کو اپنے کمرے میں بلایا۔ کوٹھی میں اس کی تلاشی لے کر سب کچھ نکال لیا گیا تھا۔ یہاں یہ بات بھی بتاتا چلوں کہ ہم سب دیوار پھاند کر کوٹھی میں داخل ہوئے تھے اور اس وقت اچھا خاصا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ یہ کوٹھی ذرا ہٹ کر تھی اور کوٹھی کے نیچے تہہ خانہ بھی تھا۔ معائنے کے بعد سارا مال وہاں منتقل ہونا تھا۔

جگنو کی جیب سے ایک ریوالور (جس پر سائیلنسر فٹ تھا) ہزار روپیہ' ایک خوب صورت سگریٹ کیس جس میں غیر ملکی سگریٹ تھے اور عمدہ قسم کی چرس برآمد ہوئی تھی۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ چرس کا عادی ہے۔ باقی چیزوں کو میں نے مال خانے میں رکھوا دیا تھا۔ جبکہ سگریٹ کیس اور چرس کو میز کے اوپر سامنے رکھا ہوا تھا۔

اس وقت کمرے میں جگنو اور دو سپاہی تھے۔ جگنو بار بار للچائی ہوئی نظروں سے چرس اور سگریٹ کیس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ بھوکا بھی تھا۔ اور سب سے بڑھ کر اس کا نشہ اکھڑا ہوا تھا۔

"جناب، مجھے ایک سگریٹ تو پی لینے دیں۔" اس وقت وہ بھیگی بلی بنا ہوا تھا اور اس کے سارے خواب بکھر چکے تھے۔

"سگریٹ بھی ملے گا اور اچھا کھانا بھی۔ پہلے میرے کچھ سوالوں کے جواب دے دو۔ میں نے گرم لوہے پر چوٹ مارتے ہوئے کہا۔

"جناب تھانے دار صاحب اب پوچھنے کو کیا باقی بچا ہے۔ میں چار پانچ سالوں سے یہ دھندا کر رہا ہوں لیکن مجھ پر کبھی شک تک نہیں کیا گیا۔ آپ نے تو......"

اس نے ایک بار پھر چرس اور سگریٹ کی ڈبیا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم نے وہ بات تو سنی ہوگی کہ سو دن چور کا ایک دن شاہ کا۔ میں نے اسے گویا چٹکی لیتے ہوئے کہا۔

وہ کچھ نہ بولا۔ بے بسی سے میری طرف دیکھتا رہا۔

میں تیکھی نظروں سے اسے گھورتا رہا۔ میں اسے بالکل توڑ دینا چاہتا تھا۔ تا کہ اس کے منہ سے صرف سچ نکلے۔

"جناب! مجھے بیٹھنے کی اجازت تو دیجیے۔ میں زیادہ دیر کھڑا نہیں رہ سکتا۔ وہ کچھ دیر کے بعد رونی سی صورت بنا کر بولا۔

میں نے سپاہی کو اشارہ کیا اس نے دبکا مارتے ہوئے کہا۔

"اوئے...... چپ چاپ کھڑے رہو' یہ تھانہ ہے۔"

اس کے بعد وہ کسی ریکارڈ کی طرح بج اٹھا۔ میرے ہر سوال کا جواب دیا...... اور خوب دیا۔

میں نے حسب وعدہ اسے اچھا سا کھانا کھلا دیا اور ایک سگریٹ اور تھوڑی سی چرس اسے دے دی۔

پھر اسے حوالات میں بند کر دیا۔

صبح ان پر مقدمہ بنا کر حوالہ عدالت کرنا تھا۔ نہ مار کٹائی کی نوبت آئی اور نہ ریمانڈ لینے کی۔

بعض اوقات نفسیاتی طریقہ تفتیش کارآمد ہوتا تھا۔

قارئین آپ کے من میں ہلچل مچی ہوئی ہوگی۔ کہ اس اللہ کے بندے نے ہمیں ابھی تک اندھیرے میں رکھا ہوا ہے۔ چلیں آپ کو سب کچھ بتاتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ بتا دوں کہ تھانے میں جو دوشیزہ آئی تھی وہ جگنو کی بہن عشرت تھی۔ اس نے ٹوپی والا برقع اپنے آپ کو چھپانے کے لیے پہنا ہوا تھا۔ ورنہ وہ کالا یعنی فیشنی برقع پہنتی تھی۔

عشرت کے ماں باپ فوت ہو چکے تھے۔ ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ بھائی کے ساتھ رہتی تھی۔ جگنو کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کے دو بچے بھی تھے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ گھر کا ماحول ذرا آزادانہ تھا۔ عشرت کو گھومنے پھرنے کا شوق تھا۔ اس کی بھابی جگنو سے کئی بار کہہ چکی تھی کہ عشرت کی شادی کر دو لیکن عشرت نے کہا۔ کہ ابھی اس کا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ علاوہ ازیں جونہی اسے کوئی لڑکا پسند آیا وہ شادی کر لے گی۔ پھر ایک دن ایک پارک میں اس کی ملاقات اصغر سے ہو گئی وہ اکثر وہاں جا کر بیٹھا کرتا تھا اور گھاس پر بیٹھا تنکوں سے کھیلتا رہتا تھا۔

بقول عشرت کے وہ اکثر اسے دیکھتی رہتی تھی۔ ایک دن وہ اس کے قریب چلی گئی اور بولی۔

"معاف کیجیے گا' میں اکثر آپ کو یہاں دیکھتی ہوں۔ آپ بہت غمگین سے لگتے ہیں اور اس کے قریب ہی گھاس پر بیٹھ گئی۔

اصغر پیار کا بھوکا تھا...... اندر سے ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ اسے کسی کاندھے کی تلاش تھی جس کے اوپر سر رکھ کر وہ رو سکے۔

پارک میں وہ رو تو نہیں سکتا تھا البتہ اس نے اپنا دل کھول کر عشرت کے سامنے رکھ دیا اور ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ وہ بے روزگار ہے۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتا ہے اور گھر والوں سے دور رہنا چاہتا ہے۔

شاید شعوری طور پر عشرت بھی پیار کی متلاشی تھی۔ گھر والوں کو جگنو نے بتایا تھا کہ اس کا ایکسپورٹ امپورٹ کا کاروبار ہے۔

دو چار ملاقاتوں میں دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئے اور ایک دن عشرت نے اصغر کو اپنے بھائی سے ملا دیا۔ اسے اپنی سہیلی کا بھائی ظاہر کیا اور اپنے بھائی سے کہا۔

"بھیا! اسے اپنے ساتھ کام پر لگا لو۔"

ان دنوں جگنو کو ایک بندے کی تلاش تھی۔ اس طرح اصغر کا کام بن گیا۔

جب اسے جگنو کے دھندے کا پتہ چلا تو اس نے انکار کر دیا۔ جگنو نے اسے کہا۔ میں تمہیں اپنے راز میں شریک کر رہا ہوں اور راز دانوں کو ہم یوں جانے نہیں دیتے۔ مار کر لاش غائب کر دیتے ہیں۔

اصغر نفسیاتی مریض بن چکا تھا۔ وہ ڈر گیا اور بادل نخواستہ یہ کام کرنے لگا۔

ادھر گھر میں کھچڑی پک رہی تھی اور یہ چڑی اور چڑے والی کھچڑی نہیں تھی بلکہ عشرت کی شادی کے سلسلے میں پک رہی تھی۔ جگنو کی بیگم اپنے بھائی کے لیے زور دے رہی تھی۔

وہ ایک بزنس مین تھا اور اچھا کماتا کھاتا تھا۔ جگنو کو بھی یہ رشتہ پسند تھا۔ لیکن عشرت نہیں مان رہی تھی۔

جب ایک دن غصے میں جگنو کی بیگم نے عشرت سے یہ کہا۔

"آخر کب تک کسی شہزادے کی تلاش میں بھٹکتی رہو گی جب سر میں چاندی جیسے بال آ جائیں گے۔"

"بھابی مجھے وہ لڑکا مل گیا ہے۔ پیار کرنے والا آپ کے بھائی نے تو مجھے شوپیس کے طور پر گھر میں رکھنا ہے۔ اسے اپنے بزنس سے پیار ہے۔"

اور جب اس نے اصغر کا نام لیا تو ایک قیامت آ گئی۔ جگنو بھی اس وقت گھر میں موجود تھا۔ اس نے معاملہ سنبھال لیا اور اپنی بیوی سے کہا۔ یہ مسئلہ غصے سے حل نہیں ہوگا۔ کوئی طریقہ سوچنا پڑے گا۔ جوان بہن ہے' بہرحال وہ اس مسئلے کو حل کرنے کے طریقے سوچنے لگا۔

وہ نیلم بائی کا شیدائی تھا اور اکثر اس کا گانا سننے جاتا رہتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ جسمانی تعلق بھی جوڑنا چاہتا تھا لیکن اس کی دال نہیں گل رہی تھی۔ دونوں

بدمعاش اکو اور شیدا اس کی مٹھی میں تھے۔وہ انہیں رقمیں دیتا رہتا تھا۔اس نے ایک منصوبہ بنایا اور اپنے ایک گرگے کی مدد سے اصغر کو مال والی کوٹھی کے تہہ خانے میں قید کردیا اور اس کا شناختی کارڈ اڑا لیا۔اس کے ذہن میں ایک منصوبہ پل رہا تھا۔

یہ اس صبح کی بات ہے جب بڑی بائی یعنی ریشم بائی اسپتال میں داخل تھی۔اکو نے اس تک یہ بات پہنچائی تھی۔وہ وہاں پہنچ گیا۔

نیلم کو جگایا گیا۔اصغر کا شناختی کارڈ اس کے ہاتھ میں دے کر۔

جگنو نے اس کہا کہ وہ کسی دن اس کے ساتھ چل کر اس کی بہن عشرت سے یہ کہہ دے کہ یہ بندہ (اصغر) اس کے پاس آتا ہے اور راتیں بھی گزارتا ہے۔شناختی کارڈ اپنے پاس ہی رکھ لے اور جب عشرت سے ملے تو ثبوت کے طور پر شناختی کارڈ اسے دکھادے۔یہ کچا کام تھا لیکن جگنو تو پاگل ہوا تھا۔ہر قیمت پر عشرت کو اصغر سے متنفر کرنا چاہتا تھا لیکن جب ایک خطیر رقم کا لالچ دینے کے باوجود نیلم نے یہ کام کرنے سے انکار کردیا تو وہ مزید پاگل ہوگیا اور اس کے ساتھ دست درازی شروع کردی۔شاید اس طرح وہ اسے جھکانا چاہتا تھا۔اس کو پتہ تھا کہ نیلم صرف مجرا ہی کرتی ہے اور وہ کافی عرصے سے اس کے جسم پر دانت تیز کررہا تھا۔غیر شعوری طور پر یہ سب کچھ اس سے ہورہا تھا۔

نیلم نے اس کے منہ پر تھوک دیا تو اس پر وہ پاگل پن سوار ہوگیا جسے ہم تھانیدار اور ماہر نفسیات ایک لمحے کے پاگل پن سے منسوب کرتے ہیں اس نے اپنی جیب سے سائیلنسر لگا ریوالور نکالا اور دل کا نشانہ لے کر ٹرائیگر دبادیا۔جب گولی اپنا کام کرگئی تو جگنو کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔کافی دیر سوچنے کے بعد اس نے دوسرے کمرے میں جاکر اکو اور شیدے کو ساری صورت حال بتادی وہ اونگھ رہے تھے۔افیون کے عادی تھے اور یہ افیون جگنو کے توسط سے ان کو ملتی تھی۔

تینوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور آخر میں انہوں نے پولیس کو چکر دینے کے لیے ایک ڈرامے کا اہتمام کیا۔اصغر کا شناختی کارڈ جان بوجھ کر کمرے میں اس جگہ رکھ دیا گیا جہاں ہماری نظر پڑ سکتی تھی۔جو کچھ اکو اور شیدے نے ڈرامہ کیا اس کا ذکر آچکا۔وہ اصغر کو قاتل ظاہر کرنا چاہتے تھے۔

جب سب بات آپ کو بتادی ہے تو یہ بھی بتادوں، میں اکو اور شیدے سے شروع سے ہی مطمئن نہیں تھا۔میں نے ان کو پابند کیا ہوا تھا کہ وہ اس قتل کا عقدہ حل ہونے تک کہیں نہ جائیں اور جب کہیں جائیں تو تھانے میں بتا کر جائیں اور واپس آکر تھانے میں رپورٹ کریں۔ان دونوں کو بھی مقدمے میں شامل کرلیا گیا تھا۔

ظاہر ہے اصغر کو ہم نے برآمد کرلیا تھا۔اسے بھی رگڑا لگتا تھا، کیونکہ وہ بھی اس دھندے میں شامل تھا۔چاہے بادل نخواستہ ہی تھا...... اصغر عشرت سے روز ملتا رہتا تھا۔جب وہ کئی دن اس سے نہ ملا تو اسے کچھ شک ہوا کہ کہیں اس کے بھائی نے تو اسے غائب نہیں کروادیا اور وہ تھانے آگئی اور ہم نے جگنو کے گرد گھیرا تنگ کردیا۔نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔

قسط نمبر 4

قلندر ذات

امجد جاوید

قلندر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو شکر گزاری کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ کر قرب الٰہیٰ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ رب تعالیٰ بھی ان کی خواہش کو رد نہیں کرتا۔ دوسرے وہ جو ذات کے قلندر ہوتے ہیں۔ ان کا پیشہ بندر، ریچھ اور کتے نچانا ہوتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے مرد آہن کی ہے جو ذات کا قلندر تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اپنی انگلیوں پر نچایا جو اپنے تئیں دنیا مسخر کرنے کی دھن میں انسانیت کے دشمن بن گئے تھے۔ انسانی صلاحیتوں کی ان رسائیوں کی داستان جہاں عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فکر حیران۔ اس داستان کی انفرادیت کی گواہی آپ خود دیں گے۔ کیونکہ یہ محض خانہ فرسائی نہیں مقاصد کا تعین بھی کرتی ہے۔

دلبر نے گن ان نوواردوں پر تانی ہوئی تھی۔ہم سب حیران تھے کہ اسے ہوکیا گیا ہے۔ایک طرح سے اس کی بات بالکل درست تھی کہ اگر انہوں نے کوئی پوچھ گچھ کرنی تھی تو سکون سے بات کی جاسکتی تھی۔اب اگر انہوں نے اسلحہ تان ہی لیا ہے تو پھر گولی کھانے کا بھی حوصلہ رکھنا چاہیے تھا مگر ان کا چہرہ فق ہوگیا تھا۔اپنے سامنے موت کو پاکر حواسوں میں رہنے والے چند لوگ ہی ہوتے ہیں۔ورنہ عام بندہ تو لڑکھڑا کر رہ جاتا ہے۔ان کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔میں ذاتی طور پر ان کا نقصان نہیں چاہتا تھا کیونکہ اگر انہیں کوئی نقصان ہوجاتا تو میرا بنا بنایا کھیل ختم ہوکر رہ جاتا۔میں نے ایک لمحے کو سوچا اور پھر کھڑا ہوگیا۔

''ٹھیک ہے دلبر،جیسا تم چاہو،میں تجھے منع نہیں کروں گا لیکن ایک بات یاد رکھنا،پیرزادہ وقاص اچھا آدمی ہے،بندے کی قدر کرنے والا ہے،باقی تیری مرضی۔''

''چل جانے دے یار،کیا یاد کرے گا اپنا جمال،اس بار چھوڑ دے۔'' چھاکے نے دلبر کے کاندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔میں اچھی طرح جانتا تھا کہ چھاکا چاہتا تو اس وقت وہ دلبر سے گن چھین سکتا تھا لیکن اس میں رسک بھی تھا اور بداعتمادی بھی،دلبر نے ٹیڑھی نگاہ سے چھاکے کو دیکھا اور بولا۔

''جمال صرف اپنی بات کی لاج رکھ رہا ہے،مگر میرے ڈیرے پر......'' اس نے کوئی سخت بات کہنا چاہی لیکن میرا چہرہ دیکھ کر خاموش ہوگیا۔ہماری نگاہیں چار ہوئیں تو میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔اس لیے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''دلبر!میں نہیں جانتا کہ ان کے ساتھ تمہاری کیا دشمنی ہے اور کب سے ہے،میں تو بس اتنا چاہتا ہوں کہ پیرزادے تک یہ پیغام پہنچ جائے کہ میران شاہ بستی کے لوگوں کو تونے کچھ نہیں کہا،اگر کہا ہوتا تو یہ لوگ یہاں سے زندہ سلامت نہ جاتے۔سمجھ لے ہم آج سے ان کے ساتھ دوستی کا ہاتھ ملانے کی ایک کوشش کریں گے،اگر مل گیا تو ٹھیک،نہ ملا تب دشمنی تو ہے ہی......''

''جمال!ان بڑے لوگوں کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا،ابھی تم نے کہا تھا نا کہ یہ لوگ سرداروں کے پاس کیوں نہیں جاتے،انہیں اچھی طرح پتا ہے کہ علاقے میں بندے وہی مار سکتے ہیں یہ ان کے پاس کیوں نہیں جاتے،ان سے کیوں نہیں پوچھتے۔'' دلبر نے غصے میں کہا۔

”ہمیں اس سے غرض نہیں کہ وہ سرداروں سے کیسا تعلق رکھتے ہیں۔ ہم تو اپنی بات کرتے ہیں۔ میں اب تم سے نہیں کہوں گا' اب جو تیری مرضی ہے وہ کر......“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو دلبر اپنی گن ہٹاتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولا۔

”تیرے کہنے پر انہیں جانے دیتا ہوں۔ تیری دوستی کی کوشش بھی دیکھ لیتے ہیں۔ پھر ہوگا وہی جو میں کہہ رہا ہوں۔“

”مجھے یقین ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔“ میں نے کہا تو دلبر نے انہیں جانے کا اشارہ کیا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر اپنی جیپ کی جانب بڑھنے لگے۔ تبھی میں نے چھاکے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ان کا اسلحہ بھی انہیں دے دو۔ خالی کر کے......“

وہ جیپ میں بیٹھ چکے تھے تب چھاکا انہیں ان کا اسلحہ دے آیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ لوگ وہاں سے چلے گئے۔ تب دلبر نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور بولا۔

”کیسی تھی میری اداکاری......؟“

”میں اگر وقت پر نہ پہنچتا تو اب تک تم یہ اداکاری کرنے کے قابل نہ ہوتے۔“ میں نے بھی ہنستے ہوئے کہا تو وہ اچانک ہی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

”اب کیا کرنا ہے جمال...... کہیں وہ......“

”کچھ نہیں ہوگا۔“ میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”انہیں فقط شک ہے اور یہ شک رہنے دو' انہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہم ایسا بھی کر سکتے ہیں۔ نہیں تو...... کچھ نہ کچھ تو ہوگا نا یار۔“

”چل بھول جا سب کچھ' بکرا ذبح کر لیا ہے' اب پکاتے ہیں' پھر سکون سے کھائیں گے۔“ دلبر نے ساری بحث کو ایک جھٹکے میں سمیٹ دیا۔ میں نے دیکھا' اندر کمرے میں تازہ گوشت سے دیگی بھری ہوئی تھی' ہم چارپائیوں پر بیٹھ گئے تو دو چار لوگ اٹھ کر اسے پکانے کے لیے بڑھ گئے۔

اس وقت سورج ڈوب رہا تھا۔ جب کھا پی کر ہم وہاں سے چل دیئے۔ میں اور چھاکا اپنی اپنی بائیک پر گاؤں واپس آ گئے۔ چوک کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے کہا۔

”رندھاوے نے جو بندہ بھیجا تھا' اس کی بات یاد ہے نا......“

”کیا بات......؟“ میں نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

”یہی کہ رات...... مطلب آج تم نے کہیں غائب نہیں ہونا' گاؤں والوں کے درمیان رہنا ہے۔“ اس نے مجھے یاد کراتے ہوئے کہا تو میں تیزی سے بولا۔

”ہاں...... ہاں...... یاد آیا...... تو پھر......“

”یہاں چوک میں آ جانا' یہیں بیٹھ کر تماشہ کریں گے کوئی......“ اس نے ہنستے ہوئے کہا تو میں اپنے گھر کی جانب بڑھ گیا۔



اندھیرا چھا گیا تھا' اوگی پنڈ کی روشنیاں جگمگا اٹھی تھیں' جب ہرپریت اور جسپال گھر سے نکلے۔ ہرپریت کی سج دھج دیکھنے والی تھی۔ ہلکے فیروزی رنگ کی شلوار قمیص جس پر سنہری تلے کا کام تھا' اسی رنگ کا مہین سا بڑا آنچل' کانوں میں بڑے بڑے بندے' ہلکا ہلکا میک اپ' جس میں آنکھیں بہت خوب صورت انداز میں سنواری ہوئی تھیں۔ کس کر باندھی ہوئی چوٹی سے اس کا ماتھا بڑا کشادہ دکھائی دے رہا تھا۔ جسپال اس وقت سرشار سا ہو گیا' جب وہ مہکتی ہوئی اس کے ساتھ پہلو میں پسنجر سیٹ پر آن بیٹھی تھی۔ تبھی گیئر میں جیپ ڈالتے ہوئے جسپال نے کہا۔

”آج بڑی خوب صورت لگ رہی ہو۔“

”تا پہلے میں بدصورت لگتی تھی' یا آج تمہیں کچھ ہو گیا ہے؟“ ہرپریت نے تیز لہجے میں کہا تو وہ چونکتے ہوئے بولا۔

”ہائیں......! یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں...... ہری مرچیں تو نہیں چبا کر آئی ہو۔“

”کچھ نہیں' تم جیپ چلاؤ' بس......“ یہ کہہ کر وہ ذرا سا پہلو بدل کر بیٹھ گئی۔

”اوئے سوہنو ملائی تے مکھنو...... ہوا کیا ہے' کیوں ناراض ہو......“ جسپال نے پھر پوچھا۔

”مجھے یہ بتاؤ جسی! وہ بے غیرت بلجیت سنگھ دھمکیاں لگا کر چلا گیا اور تم نے اسے کچھ بھی نہ کہا۔“

”اتنا کچھ تو کہا ہے اسے۔“ وہ حیرت سے بولا تو ہرپریت نے نفرت سے کہا۔

”یہ کہنا کچھ کہنا نہیں ہے، کم از کم اس کے منہ پر کوئی ایک آدھ زخم ضرور لگتا تو بات بنتی۔“

اس وقت تک وہ پکی سڑک پر آ چکے تھے۔ تبھی جسپال نے گاڑی روک کر کہا۔

”میں پہل نہیں کرنا چاہتا تھا۔“

”پہل تو وہ کر چکا تھا' اس نے آ کر دھمکیاں دی تھیں۔“ ہرپریت نے کہا۔

”چل! اب چلتے ہیں۔ پہلے اس کی طرف چلتے ہیں پھر شادی میں چلے جائیں گے۔“ جسپال کے لہجے میں گہری سنجیدگی تھی۔

”تمہارا کیا مطلب ہے' وہ ہمارے انتظار میں بیٹھا ہوا ہوگا' وہ خوشی سے کہے گا کہ آؤ اور مجھے سبق سکھا کر چلے جاؤ' کیا بات کرتا ہے جسی تو......“ ہرپریت نے تڑپتے لہجے میں کہا۔

”دیکھ لے ہرپریت' اتنا غصہ نہ کر' بڑا وقت پڑا ہے' پتا نہیں کتنی دیر تک ان سے لڑنا ہے' چل ابھی مسکرا دے۔“ جسپال نے لجاجت سے کہا۔

”اگر نہ مسکراؤں تو......“ ہرپریت نے معشوقانہ انداز میں کہا تو وہ بولا۔

”تو پھر میں ابھی اور اسی وقت بلجیت کی طرف چل پڑوں گا' پھر دیکھا جائے گا' جو ہوگا۔“

اس کے یوں کہنے پر ہرپریت نے اس کی طرف دیکھا اور پھر گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔

”میں سمجھتی ہوں کہ ابھی وقت نہیں ہے' لیکن میں کیا کروں' میرا غصہ ٹھنڈا نہیں ہو رہا۔“

”اس کا بھی کچھ کرتے ہیں' تم بس ذرا سا مسکرا دو......“ وہ بولا تو ہرپریت ہنس دی لیکن اس کی ہنسی میں کھنکھناہٹ نہیں تھی' جس پر جسپال نے اسے غور سے دیکھا' تب وہ بولی۔

”تم...... ان تک پہنچو یا نہیں' مگر وہ تم تک ضرور پہنچیں گے۔ میں ان کی فطرت جانتی ہوں۔ چلو' تم گاڑی چلاؤ۔“

”وہ تو میں چلاتا ہوں' لیکن تم کہنا کیا چاہتی ہو' مجھے صاف لفظوں میں کہو۔“ یہ کہتے ہوئے جسپال نے جیپ کو گیئر لگا دیا اور اوگی پنڈ کے مخالف پکی سڑک پر جانے لگا۔

”اصل میں تم نے بلجیت کو چھوڑ کر اچھا نہیں کیا' اسے وہیں ختم کر دینا چاہیے تھا۔“ ہرپریت نے آگ اگلنے والے لہجے میں کہا تو وہ گہرے لہجے میں بولا۔

”میں اب بھی تمہاری منطق نہیں سمجھا؟“

”دیکھو......! آج نہیں تو کل' ان سے آمنا سامنا تو ہونا ہی ہے بلکہ ان سے دشمنی کہاں ختم ہوئی ہے' رویندر سنگھ اس لیے کمیشن میں شامل ہوا ہے' اب وہ دھوکے سے اور قانونی ہتھکنڈے استعمال کر کے تمہیں' بلکہ ہم سب کو پریشان کریں گے۔ وہ ایک طرف نہ صرف تمہیں قتل کرنے کی کوشش کریں گے بلکہ کسی نہ کسی ناجائز کیس میں پھنسا کر الجھا دیں گے اور کچھ نہیں تو یہاں کا ظالم ترین قانون ”ٹاڈا“ تم پر لگوا دیں گے' اس کے بعد تو پھر شنوائی ہی نہیں ہے۔ جب تک چاہیں

تمہیں اندر رکھیں۔ ان کے ساتھ معاملہ جتنا لمبا کرو گے یہ اتنا ہی ہمیں الجھادیں گے۔ وہ اب حملہ آور ہیں لیکن اگر بلجیت قتل ہوجاتا تو وہ اپنی بقا والی پوزیشن پر آجاتے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو ہرپریت لیکن اگر انہیں قتل کردیا تو پھر کیا ہے میرے پرکھوں کا انتقام پورا ہوجائے گا' نہیں' نہیں ہرپریت نہیں' میں ان لوگوں کو اتنی جلدی مکتی نہیں دے سکتا' مجھے میرے حساب سے چلنے دو پلیز۔ دشمنی جذبات سے نہیں دل سے لڑی جاتی ہے۔"

"میں مانتی ہوں' مگر یہ بھی سچ ہے کہ دشمن کو زیادہ وقت نہیں دینا چاہیے۔" ہرپریت نے گہرے لہجے میں کہا۔

"ظالم اپنی قوت کے نشے میں یہ سمجھتا ہے کہ شاید ہمیشہ وقت اسی کا رہے گا' لیکن وقت بدلتا رہتا ہے' یہی اس کی فطرت ہے' ڈونٹ وری' اپنے چہرے پر سے پریشانی اور دماغ پر سے بوجھ ہٹادو۔ خوش دکھائی دو' ایک دم فریش کسی گلاب کی طرح......" جسپال نے کہا اور اشارے سے پوچھا کہ کس طرف جانا ہے۔ اس نے سیدھے چلتے رہنے کا اشارہ دیا اور پھر ذرا سا ترچھی ہوکر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"واقعی' ہم جب سے ملے ہیں' اپنے دشمنوں کی باتیں کرتے رہے ہیں۔ اپنے بارے میں بس ایک دن بات کی' وہ بھی کیا بات کی۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ میرے پاس وقت بہت کم ہے اور میرے دشمن بڑے طاقت ور ہوگئے ہیں لیکن تمہارا ساتھ مل گیا میرے لیے اتنا ہی کافی ہے' تو میرا حوصلہ بن گئی ہے۔" جسپال نے رومانوی انداز میں آہستگی سے کہا تو وہ ایک دم سے شرما گئی۔ وہ جتنی بھی بولڈ تھی' آخر تھی تو مشرقی لڑکی' ان دونوں میں خاموشی آ گئی۔

جسپال تیزی سے جیپ بھگائے چلا جارہا تھا۔ تبھی سڑک کنارے ایک گاؤں کی طرف جاتے ہوئے ہرپریت نے اشارہ دیا۔ وہ اس طرف مڑ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ گاؤں کی ایک حویلی کے سامنے جارکے۔ جسے برقی قمقموں سے سجایا گیا تھا۔ گاڑیاں باہر ہی پارک ہورہی تھیں۔ اس لیے انہوں نے جیپ پارک کی اور اندر کی طرف چل دیئے۔

"ہرپریت!' تو نے یہ تو بتایا ہی نہیں' شادی لڑکے کی ہے یا لڑکی کی۔"

"لڑکی کی...... مجھے تو لگتا ہے بارات آ گئی ہو گی۔" اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا اور سامنے کھڑے ایک بزرگ سردار سے ملے جو اس کی آمد پر اوگی ان کے گھر آیا تھا۔

"بہت خوشی ہوئی' تو آیا ہے پتر' بہن گلجیت کور نہیں آئی۔" اس نے پوچھا۔

"ان کی طبیعت تھوڑی اپ سیٹ تھی......" ہرپریت نے کہا' پھر زیادہ باتوں کا موقع نہیں ملا' وہ دوسرے مہمانوں کی طرف متوجہ ہوگئے۔ وہ ایک بڑے سے پنڈال کی طرف بڑھے' جہاں پہلے ہی بہت سارے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہرپریت نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

"لگتا ہے ابھی بارات نہیں آئی۔"

"چلو آ جائے گی۔" جسپال نے بھی ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں' انہیں گرودوارے سے جا کر لانا ہوگا' وہ اُدھر آئیں گے۔ شادی کی رسم اُدھر ہی ہوگی۔" وہ بولی۔

"اوکے...... اب آئے ہیں تو......" جسپال ادھوری بات چھوڑ کر خاموش ہوگیا۔ "تم بیٹھتی کیوں نہیں ہو؟"

"میں اپنی سہیلیوں کو دیکھ رہی ہوں۔ میں لڑکیوں کے ساتھ آ جاؤں گی۔" یہ کہہ کر وہ اندر کی

جانب چلی گئی اور وہ وہاں پر اکیلا بیٹھ گیا۔ کچھ وقت گزرا تھا اور وہ ادھر ادھر لوگوں کو دیکھ رہا تھا کہ انوجیت کی کال آ گئی۔

"کہاں پر ہو؟"

"میں شادی میں۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"اچھا اچھا' بس تمہاری خیریت معلوم کرنا تھی' یہاں لوگوں سے ملو' گپ شپ کرو۔" وہ خوشگوار لہجے میں بولا۔

"ابھی تو اکیلا ہی ہوں' ہرپریت اندر لڑکیوں میں چلی گئی ہے۔" اس نے جواب دیا تو انوجیت نے کہا۔

"ارے کوئی بات نہیں' ابھی تیرے پاس کافی سارے لوگ آجاتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کردیا۔ کچھ دیر گزری ہوگی کہ چند نوجوان اس کے پاس آ گئے۔ انہوں نے اپنا تعارف کرایا' وہ انوجیت کے وہ دوست تھے جو اوگی پنڈ سے تھے۔ وہ بھی گپ شپ کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد وہ لڑکی کو لے کر گرودوارے کی جانب چل دیئے' وہ سب بھی چل پڑے۔

گرودوارے میں "ارداس" (ایک طرح کی دعائیہ محفل جو ہر خوشی اور غمی کے موقع پر منعقد کرتے ہیں) شروع ہوچکی تھی۔ دولہا اور دلہن اپنے روایتی لباس میں گیانی کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ باقی سب لوگ آہستہ آہستہ' خاموشی کے ساتھ گرودوارے کے اندر بیٹھتے چلے جارہے تھے۔ گیانی بڑے پرجوش لہجے میں گروگرنتھ کا پاٹھ کرکے اس کی وضاحت کرنے لگا۔ ہرپریت لڑکیوں میں تھی اور جسپال لڑکوں میں۔ کافی دیر تک ارداس چلتی رہی' پھر دولہا اور دلہن نے گرنتھ صاحب کے آگے ماتھا ٹیکا' گیانی نے کچھ رسمیں ادا کیں اور ان کی شادی ہوگئی پھر دلہا دلہن تو گاڑی پر حویلی آ گئے' باقی سارے پیدل ہی حویلی کی جانب چل پڑے' جو بالکل قریب ہی تھی۔

رات گئے تک شادی والے گھر میں ہلا گلا چلتا رہا۔ شراب پانی کی مانند بہنے لگی' رقص و موسیقی کی محفل جم گئی۔ ہنستے کھیلتے' کھاتے پیتے رات خاصی گہری ہوگئی۔ جسپال کے آس پاس جمع ہونے والے لڑکے سبھی شراب کے نشے میں دھت تھے۔ ایک دو ہوش میں تھے۔ وہ جانے لگے تو انہوں نے پوچھا۔

"چلیں جسپال بابو۔"

"تم چلو' ہرپریت آتی ہے تو میں نکلتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر وہ باہر کی جانب چل دیئے اور وہ ہرپریت کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ چند لڑکیوں کے ساتھ نمودار ہوئی' پھر اسے دیکھ کر ان سے اجازت لے کر آ گئی۔ قریب آتے ہی بولی۔

"کیسا رہا یہ شادی کا ہنگامہ......؟"

"اچھا تھا' میرے لیے یہاں کے کلچر کی مناسبت سے بالکل نیا...... چلیں اب......"

"بالکل......! وقت بھی خاصا ہوگیا۔" یہ کہہ کر وہ باہر کی طرف چل پڑی۔ گیٹ پر وہ بزرگ سردار لوگوں کو وداع کررہے تھے۔ وہ تپاک سے ملے شکریہ ادا کیا پھر یہ پارکنگ سے جیپ میں بیٹھے اور واپسی کے لیے چل پڑے۔

"ڈیش بورڈ میں میرا پسٹل پڑا ہے' وہ نکال لو۔" جسپال نے سنجیدگی سے کہا تو ہرپریت نے کچھ کہے بنا پسٹل نکال کر ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔ شاید یہ اس کی چھٹی حس تھی یا محض حفظ ماتقدم کے طور پر لاشعوری عمل تھا' وہ دونوں محتاط ہوگئے تھے اور اسی لیے خاموش تھے' رات کے وقت سڑک سنسان تھی' اس لیے وہ تیز رفتاری سے جیپ بھگائے لے جارہا تھا۔ سارا راستہ

کٹ گیا' پھر جیسے ہی وہ اپنے گھر کی طرف مڑنے کے لیے آہستہ ہوئے' بالکل موڑ پر آگے ایک سفید کار کھڑی تھی اور اس کے ساتھ ہی ہائی ایس وین نے راستہ روکا ہوا تھا۔ جسپال کے جبڑے بھنچ گئے' اسے گاڑی روکنا پڑی۔ تبھی بولا۔

''ہرپریت...... الرٹ ہو جا......'' یہ کہتے ہوئے اس نے بریک لگا دیئے اور ہیڈ لائٹس روشن رہنے دیں۔

''فکر نہ کر......'' یہ کہہ کر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ تبھی وین کی اوٹ میں سے چند آدمی باہر نکلے' ان کے ہاتھوں میں گنیں تھیں۔ تبھی ہرپریت نے پچھلی نشست پر کودتے ہوئے کہا۔ ''حوصلہ رکھنا۔''

''تو بھی فکر نہ کر......''

وہ تین لوگ تھے اور چوتھا وہیں وین ہی کے پاس کھڑا رہا۔ جسپال نے پسٹل ڈیش بورڈ سے اٹھا کر اپنی ران کے پاس رکھ لیا۔ تبھی ایک نے ٹارچ اس کی طرف کر کے روشنی چہرے پر ڈالی' پھر اونچی آواز میں بولا۔

''یہی ہے......''

''تو نکالو باہر اسے۔'' انہی میں سے ایک نے کہا۔ جسپال نے پچھلی سیٹ پر ہرپریت کو دیکھا' وہ تیزی سے ایک گن میں میگزین لگا کر گن کو سیدھی کر رہی تھی۔ وہ ہلکے سے بولی۔

''جاؤ' وہ میرے نشانے پر ہیں......'' اس نے سن روف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

جسپال گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی قریب آئے اور آ کر دروازہ کھولتے ہوئے ہرپریت کو دیکھ لے...... وہ ان کی جانب بڑھا تو انہوں نے گنیں تان لیں۔

''ہاتھ اوپر رکھو جسپال...... کوئی چالاکی دکھائی تو گولی مار دیں گے۔''

اس نے ہاتھ اوپر کر دیئے اور بڑے حوصلے سے ان کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور اونچی آواز میں پوچھا۔

''تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟''

''ہم کون ہیں۔ یہ تمہیں بتانے کے پابند نہیں' لیکن ہاں چاہتے کیا ہیں یہ بتا دیتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے بلند آواز میں قہقہہ لگایا تو دوسرے نے کہا۔

''بس ایویں' دو چار ہڈیاں توڑنی ہیں تیری......''

''وہ توڑ لینا...... اگر تم میں ہمت ہوئی تو...... کیونکہ ہڈیاں توڑنے والے یوں بزدلوں کی طرح گنیں لے کر نہیں کھڑے ہوتے......'' جسپال نے طنزیہ انداز میں کہا تو پہلے نے نہایت غلیظ قسم کی گالی بکتے ہوئے کہا۔

''اس کی تلاشی لو' پھر بتاتے ہیں۔''

ان کے قریب جو خاموش کھڑا تھا' وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے جیسے ہی تلاشی لینا چاہی جسپال نے نہایت تیزی سے اسے قابو کیا اور اپنا پسٹل نکال کر اس کی کنپٹی پر رکھ دیا۔

''اسے مارنا ہے یا ہتھیار پھینکنے ہیں جلدی بولو۔''

''اوئے اسے چھوڑ...... میرے ساتھ ہاتھوں میں ہاتھ ڈال......'' پہلے نے کہا تو جسپال نے سکون سے کہا۔

''لگتا ہے تو پاگل ہے یا پھر تجھے کسی پاگل نے بھیجا ہے' گن پھینک۔''

''جو قابو ہو گیا' تو ہو گیا' مر جانے دے اسے......'' دوسرے نے کہا اور گن سیدھی کی' تبھی یکے بعد کئی فائر ہوئے تو ان کے ہوش اڑ گئے۔ گولیاں کچھ ان کے پاؤں پر اور کچھ زمین میں لگی تھیں۔ شاید انہیں گمان نہیں تھا کہ جیپ کی طرف سے بھی فائر ہو سکتا ہے۔ ان کے ہاتھوں میں گنیں لرز گئیں۔ انہوں نے

لاشعوری طور پر آڑ لینا چاہی۔ اتنے میں ہرپریت نے دوسری بار فائر کھول دیا۔ اس کے ساتھ ہی تیز چیخ بلند ہوئی۔ رات کے وقت فائرنگ کی آواز بھی بہت خوفناک تھی۔ وہ ایک دم سہم گئے اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھے۔ تیسری بار ہرپریت نے گولیاں ان کی ٹانگوں پر ماریں تو وہ وہیں ڈھیر ہوگئے۔ انہیں موقع ہی نہیں ملا کہ وہ جوابی فائرنگ کردیں۔ تبھی جسپال نے کہا۔

''اب بھی وقت ہے گنیں پھینک دو ورنہ جان چلی جائے گی۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے قابو میں کیے ہوئے شخص کے ماتھے پر زوردار پسٹل کا دستہ مارا' وہ لڑکھڑا گیا۔ وہ نیچے گرا تو جسپال بھی فائر کرنے لگا اور واپس گاڑی کی طرف جست لگادی۔ اس وقت وہ وین میں گھس گئے تھے جب کار کی طرف سے فائر ہوا۔ یقیناً وہاں کوئی تھا' جسپال نے اسے نشانے پر رکھ لیا۔ ہرپریت نے ایک برسٹ ادھر مارا تو اس طرف سے ایک دم خاموشی چھاگئی۔ جسپال گاڑی کے اندر آگیا۔ ہرپریت نیا میگزین لگارہی تھی۔

''میں جیسے ہی کہوں' جیپ تیزی سے آگے بڑھادینا۔ وین ہٹالیں تو ٹھیک ورنہ مار دینا اس میں۔''

ہرپریت نے تیزی سے کہا تو جسپال نے گیئر لگادیا۔ جیسے ہی اس نے چلو کہا' اس کے ساتھ ہی اس نے سن روف سے باہر نکل کر فائرنگ شروع کردی۔ تبھی سامنے سے جوابی فائرنگ ہونا شروع ہوگئی۔ جسپال نے گاڑی بڑھادی' لمحوں میں وہ وین کے ساتھ جاٹکرائی۔ ایک دھماکے کی آواز آئی' وین الٹ گئی تھی۔ یہی وہ وقت تھا' جب تین چار گاڑیاں سڑک پر سے گزرتے ہوئے کچھ فاصلے پر رک گئیں۔ جیپ کے لیے آگے جانے کا راستہ نہیں تھا۔ ہرپریت نے نیچے ہوکر تیزی سے کہا۔

''جسی......! دروازہ کھول کر سیدھے بھاگ نکلو' میں بھی آئی۔''

جسپال نے ویسے ہی کیا چشم زدن میں اتر کر بھاگ نکلا' اس کے پیچھے ہی ہرپریت آگئی۔ دونوں بھاگتے ہوئے گندم کے کھیت میں چلے گئے۔ دونوں آگے پیچھے آگے ہی آگے بھاگ رہے تھے۔ کیونکہ کچھ فاصلے پر ان کے گھر کی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ جیسے ہی بھاگ کر گیٹ کے قریب گئے' انوجیت تیزی سے نکلا' اس کے ہاتھ میں گن تھی۔

''انوجیت رکو......'' جسپال نے کہا۔

''تم...... یہاں...... ہرپریت...... وہ کون تھے......'' اس نے تیزی سے پوچھا۔

''پتہ نہیں......'' جسپال نے بھی تیزی سے کہہ کر انتہائی اختصار سے اس واقعے کے بارے میں بتایا۔ تبھی اس نے کہا۔

''پتہ تو کرنا ہوگا...... آؤ......'' یہ کہہ کر وہ محتاط انداز میں آگے بڑھا۔ اس نے فون نکالا' جو آن لائن ہی تھا۔ ''ادھر سے کوئی سامنے آیا' کون ہے......؟''

''کسے فون کررہے ہو......'' جسپال نے پوچھا۔

''وہ سڑک پر...... جو تمہیں شادی میں ملے تھے...... انہوں نے مجھے بتایا کہ......'' یہ کہتے ہوئے وہ رک گیا۔

وہ ابھی کچھ فاصلے پر ہی تھے کہ اوگی پنڈ کی طرف سے چار گاڑیاں تیزی سے وہاں آن پہنچیں۔ وہ رابطے میں تھا اور ان سے پوچھ رہا تھا' پھر فون ہٹاتے ہوئے بولا۔ ''وہ بلجیت کے غنڈے ہیں...... ممکن ہیں وہ اب ادھر گھر پر دھاوا بول دیں' جلدی پلٹو......'' یہ کہتے ہوئے وہ تقریباً بھاگتے ہوئے گھر کی طرف چلا۔ جسپال اور ہرپریت بھی مڑ گئے۔ گیٹ پار کرتے ہی اس نے گیٹ بند کیا اور بولا۔ ''تیزی سے اوپر چھت پر...... ادھر اسلحہ پڑا ہے' ہرپریت بتاؤ......''

وہ تیزی سے اوپر کی جانب چڑھتے چلے گئے' چند منٹ بعد وہ چھت پر تھے۔ انہوں نے دوسری منزل کے ایک کمرے سے اسلحہ لے لیا تھا۔ وہ لوگ وین سیدھی کرچکے تھے اور شاید زخمیوں کو لے جارہے تھے۔ انہوں نے گھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک وہاں سے ہر بندہ گاڑیوں سمیت چلا گیا۔ ان کی جیپ وہیں کھڑی رہی۔

''وہ تو گئے۔'' جسپال نے کہا تو انوجیت نے منتشر لہجے میں کہا۔

''کوئی پتا نہیں...... ان کا...... تم لوگ یہاں ٹھہرے رہو۔ میں نیچے جاتا ہوں اور بندے بلواتا ہوں۔''

''اوئے انوجیت...... سکون کر...... کچھ نہیں ہوتا...... اور اگر جانا ہی ہے تو چائے کے دو کپ بھیج دینا بوتی کے ہاتھ۔'' جسپال سنگھ نے یوں کہا جیسے وہ پکنک پر آئے ہوئے ہوں۔ تب انوجیت نے ایک گہرا سانس لیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

''اوئے یار! میں گھبرا گیا تھا...... لیکن پہرا تو دینا ہے۔''

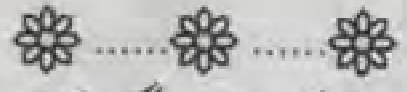
''ٹھیک ہے تو چائے بھیج۔'' جسپال نے کہا تو وہ نیچے چلا گیا۔ تبھی اس نے ہرپریت کی طرف دیکھا اور کہا۔

''تم تو بڑے کام کی چیز ہو...... ایویں کہہ رہی تھیں مجھے فائٹنگ سکھادو۔''

تبھی وہ کھلکھلا کر ہنس دی' پھر آہستگی سے بولی۔

''گرو گوبند جی کی بیٹی ہوں...... امرت ''شکھا'' ہوا ہے' لڑنا ہی تو میری شان ہے۔'' اس کے لہجے میں گرو گوبند جی کی پیروکار ہونے پر فخر تھا۔

''چل تجھ سے کبھی فائٹ کرکے دیکھ لیں گے۔ لیکن ابھی تو......'' اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑتے ہوئے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا' وہ سمٹ کر اس کے سینے سے جالگی۔ جسپال نے محسوس کیا کہ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئی ہیں اور یہی حال ہرپریت کا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں گم ہوگئے۔



چاند نکل آیا تھا' چوک میں برگد کے درخت سے ذرا ہٹ کر چارپائیاں دھری ہوئی تھیں۔ میں جب وہاں پہنچا تو گاؤں کے کافی سارے لوگ وہاں جمع ہوچکے تھے۔ ایک طرف چھاکا اور اس کے دوست موجود تھے' اس کے قریب ہی دلبرا اپنے ساتھیوں سمیت بیٹھا تھا۔ گاؤں کے وہ بزرگ وہاں آچکے تھے جنہیں مختلف برادریوں نے چھوٹے چھوٹے فیصلوں کا حق دیا ہوا تھا۔ چونکہ وہ مخلص لوگ تھے' اس لیے سب ان کی مانتے بھی تھے۔ میرے وہاں جاتے ہی لوگوں میں تھوڑی ہلچل ہوئی کیونکہ انہیں یہی معلوم تھا کہ آج جمال نے پنچائیت میں بات کرنی ہے۔ میرے وہاں بیٹھتے ہی ایک معمر شخص نے پوچھا۔

''ہاں بھئی جمال' کیا کہنا چاہتے ہو تم؟''

''میاں جی! بات یہ ہے کہ ہمارا علاقہ بڑا پرامن ہے لیکن ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے اس پرامن علاقے میں اچھی خاصی گڑبڑ ہونے لگی ہے۔ میں نہیں کہتا کہ میں اس گڑبڑ کا حصہ نہیں ہوں' یا میرا دامن پاک صاف ہے' مگر دیکھنا یہ ہے کہ ایسا کیوں ہورہا ہے' جس کسی کا جب دل چاہے حملہ کردیتا ہے' جب چاہے کوئی بندے مار کر چلا جاتا ہے' حد تو یہ ہے کہ پھر شک بھی اپنے ہی علاقے کے بندوں پر کیا جاتا ہے۔ انہیں جان سے مارنے کی دھمکیاں ہی نہیں بلکہ ذلیل

بھی کیا جاتا ہے' اسلحے کی نوک پر ان سے پوچھ تاچھ کی جارہی ہے' میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ہمیں اپنے تحفظ کے لیے اب اسلحہ اٹھالینا چاہیے' یا پھر اس غنڈہ گردی کا کوئی سدباب کرنا ہوگا؟" میں نے انتہائی جذباتی انداز میں اپنی بات ختم کی تو ایک دوسرے بزرگ نے پوچھا۔

"تمہارے خیال میں ایسا کیوں ہورہا ہے؟"

"میرے خیال میں تو بہت کچھ ہے بزرگو' یہ ساری صورت حال آپ بھی جانتے ہیں۔ پھر بھی آپ میرا خیال پوچھ رہے ہیں' کون نہیں جانتا۔" میں نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا تو وہ بزرگ سب کی طرف دیکھ کر بولے۔

"تم ٹھیک کہتے ہو' لیکن ہم جمع ہی اس لیے ہوئے ہیں کہ اس صورت حال پر بات کریں' میں تمہی سے ابتدا کرتا ہوں' اسی لیے تم سے پوچھا ہے کہ تمہارا کیا خیال ہے' یہ سب کیوں ہورہا ہے؟"

"تو پھر سنیں۔" میں نے ان کی طرف دیکھ کر جذباتی انداز میں کہا۔ "اصل میں ہم لوگ اس علاقے کے جاگیرداروں کے غلام بن چکے ہیں۔ بظاہر ہم آزاد ہیں' لیکن ذہنی طور پر اب بھی غلام ہیں۔ سفید چمڑی والے آقا گئے برسوں ہوگئے مگر یہ کالی چمڑی والے اب ہم پر مسلط ہیں۔ ان کی غلامی کرنا' انہی کی چاکری کرکے' انہی کا حکم ماننا ہماری گھٹی میں پڑ چکا ہے۔ جس جاگیردار کا دل کرتا ہے' وہ ان غریبوں کو اپنی ملکیت تصور کرتے ہوئے اس کی جان تک سے کھیل جاتا ہے' یہ صورت حال صرف اس وجہ سے ہے کہ ہم ان جاگیرداروں کی غلامی میں ہیں۔"

"تم وہی عام سی بات کررہے ہو' جو محض نوجوانوں کو بھڑکانے کے لیے کوئی بھی کرسکتا ہے' کیا ثبوت ہے تیرے پاس......" ایک تیسرے بزرگ نے تیزی سے پوچھا۔

"سردار شاہ دین کے ڈیرے پر آنے والے بندوں نے میراں شاہ کے علاقے کے بندوں کو مار دیا۔ مجھ پر چند دن پہلے ہونے والے حملے میں سردار شاہ دین کا ہاتھ تھا۔ وہ بندے بھی اس کے ڈیرے پر ٹھہرے تھے۔ اب اس کا مطلب آپ کو سمجھانا پڑے گا کہ سردار جب چاہے' اس علاقے کے بندے مروادے' اسے بندے مارنے کا اختیار کس نے دیا ہے؟ اور دوسری طرف پیرزادے...... آج ہی دلبر پر پیرزادوں نے آکر اسلحہ تان لیا۔ وہ یہ پوچھنے آئے تھے کہ میراں شاہ والے بندوں کو انہوں نے مارا ہے؟" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

"جمال...... تم پورے ہوش سے بات کررہے ہو' یہ سرداروں اور پیرزادوں پر محض الزام تو نہیں۔" ایک بزرگ نے میرے بیان کی تصدیق چاہی۔

"میں ثبوت دے رہا ہوں۔ محض الزام نہیں لگا رہا۔ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ جو بندے قتل ہوئے ہیں' وہ کہاں ٹھہرے تھے؟" میں نے کسی حد تک غصے میں کہا تو وہاں موجود لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔ چہ میگوئیاں کرتے ہوئے لوگ بھی حیران تھے کہ آج تک کسی نے اتنے واشگاف الفاظ میں سرداروں کے خلاف بات نہیں کی' آج اسے کیا ہوگیا ہے؟

"ممکن ہے وہ آئیں تو سردار ہی کے پاس ہوں اور اپنی ہی کسی دشمنی کی وجہ سے ان کے درمیان تنازع ہوگیا ہو۔" اس بزرگ نے کہا تو مجھے واقعتاً غصہ آگیا۔ میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"ممکن تو کچھ بھی ہوسکتا ہے بزرگو......! ہم اندھے بھی ہوسکتے ہیں' ہماری جانوں کو ہر وقت خطرہ بھی ہوسکتا ہے' اگر دلبر پر اسلحہ تانا گیا' دلبر مرجاتا' اس کے ساتھی مرجاتے' یا حملہ آور مرجاتے' بات تو بڑھتی دونوں طرف کے بندے مارے جاتے' سرداروں اور پیرزادوں کا کیا جاتا' مرنا تو پھر ہم غریبوں ہی نے ہے۔ بالکل اسی طرح ہم غریب لوگ کیڑے مکوڑوں کی مانند مارے جارہے ہیں لیکن نہ ہم دیکھنا چاہتے ہیں اور نہ ہم حوصلہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ بات کرکے میں نے اپنی موت کو دعوت دے دی ہے' اس لیے میں یہاں پر اعلان کرتا ہوں کہ اگر میں قتل کردیا جاؤں تو میرے قتل کے ذمے دار صرف اور صرف یہ سردار ہوں گے۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتے کہ کوئی غریب غربا اُٹھ کر ان کے خلاف آواز بلند کرے۔"

"تم چاہتے کیا ہو؟" ایک بزرگ نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں حیرت سے پوچھا۔

"میں یہ چاہتا ہوں کہ اگر آپ لوگوں نے اپنی آنے والی نسل کو غلامی سے بچانا ہے' انہیں خوشحال دیکھنا ہے اور انہیں اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق دینا ہے تو ان جاگیرداروں سے جان چھڑانا ہوگی۔ ان کے خلاف بغاوت کرنا ہوگی' ان کے چنگل سے نکلنا ہوگا' ورنہ یہ لوگ ہمیں یونہی مارتے رہیں گے اور ہمارا پرسان حال کوئی نہیں ہوگا۔ اس کے لیے جنگ لڑنا ہوگی۔" میں نے صاف لفظوں میں اپنا مدعا کہہ دیا۔

"تم تو دیوانوں جیسی باتیں کررہے ہو میرے پتر' نہتے لوگ کیا جنگ لڑیں گے۔ ان غریبوں کی تو روٹی پوری نہیں ہوتی۔" اس بزرگ نے طنزیہ انداز میں کہا تو میں نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

"یہی تو میں آپ لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کررہا ہوں' اس روٹی کا حصول کن لوگوں نے تنگ کیا ہوا ہے' وسائل پر قبضہ کیے ان لوگوں کے کتے بہترین راتب کھاتے ہیں اور یہاں عام آدمی روٹی سے تنگ ہے۔ یہ الیکشن کے دنوں میں اپنا دیدار کرواکے آپ سے ووٹ لے جاتے ہیں' روٹی انہوں نے نہیں' آپ لوگوں نے خود اپنے لیے تنگ کی ہوئی ہے' خیر......! میرا جو آپ لوگوں سے سوال ہے' اس کا جواب کیا ہے؟"

"تمہارا سوال غلط نہیں' مگر تم کیا سمجھتے ہو کہ ہم کیا کریں۔" دوسرے بزرگ نے خاصے دردمند لہجے میں پوچھا۔

"میرے پاس بڑے حل ہیں لیکن اس پر سوچ بچار کرنے کی زحمت میں نے آپ کو اسی واسطے دی ہے کہ اگر آپ کچھ نہیں کریں گے تو مجبوراً ہمیں خود کرنا پڑے گا۔ میں یونہی کیڑے مکوڑوں کی طرح مرنا نہیں چاہتا۔ یہاں سب گاؤں والے موجود ہیں۔ پوچھیں ان سے......" میں نے وہاں پر موجود گاؤں کے لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا' تبھی کئی جوشیلے نوجوانوں نے میری ہاں میں ہاں ملائی تو ایک شور برپا ہوگیا۔ ہر کوئی اپنی کہے چلا جارہا تھا۔ سو اس بزرگ نے سب کو خاموش کراتے ہوئے پوچھا۔

"یہ تم نے ٹھیک بات کہی کہ ہمیں سوچ بچار کرنا چاہیے۔ سوچتے ہیں' اس مشکل سے کیسے نکلنا ہے' اس پر بھی سوچتے ہیں کیا تم نہیں جانتے ہو کہ یہ کتنا مشکل کام ہے؟"

"میں نے تو اپنی بات کہہ دی' اب آپ جانیں اور آپ کا کام......" میں نے گویا بات ختم کرتے ہوئے کہا' تبھی لوگ اپنے اپنے طور پر تبصرہ آرائی کرنے لگے۔ ہر بندہ اندر سے بھرا ہوا تھا۔ وہ اپنا اظہار چاہتا تھا' لیکن خوف کے باعث بات نہیں کرسکتا تھا۔ یہاں انہیں اظہار کا موقع ملا تو ان کے اندر کی نفرت ظاہر ہورہی تھی' وہ بھی تنگ تھے اور خوف محسوس کررہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ محفوظ نہیں ہیں۔ میں خاموش بیٹھا سنتا رہا۔ اس دوران چھاکا میرے قریب ہوا اور کان کے پاس بولا۔

"اب چل، جو کام ہونا تھا وہ ہو گیا ہے؟"

میں چند لمحے بیٹھا رہا پھر اٹھ کر ان بزرگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"آپ ہمارے بزرگ ہیں، ہمارے لیے بہت ہی محترم، میں جانتا ہوں کہ یہ اتنا آسان کام نہیں ہے، ہم سب اس پر سوچیں اور کوئی لائحہ عمل بنائیں۔ ہم چند دن بعد پھر یہاں اکٹھے ہوں گے، بڑے احترام کے ساتھ میں آپ سے یہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ صرف اتنا ذہن میں رکھیں، ان سرداروں کی سرداری، علاقے پر حاکمیت صرف ہماری وجہ سے ہے، اب میں چلتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" ایک بزرگ نے کہا تو میں لوگوں میں سے باہر نکل آیا۔

کچھ فاصلے پر چھاکا چند دوستوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ میں ان کے قریب پہنچا تو چھاکے نے بائیک سیدھی کی، میں اس کے پیچھے بیٹھ گیا تو وہ چل پڑا، ذرا سا آگے جا کر اس نے بڑی گرمجوشی سے کہا۔

"رندھاوے نے بڑا کام دکھا دیا ہے یار......"

"کیا؟" میں نے تجسس سے پوچھا تو وہ تیزی سے بولا۔

"وہ ملک سجاد آ گیا ہے اور پتا ہے کہاں آ کے ٹھہرا ہے؟"

"اوئے سیدھی بات کر......" میں نے اکتاہٹ میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"بات یوں ہے پیارے کہ آج شام ملک سجاد ان سرداروں کے پاس آ گیا ہے، اس کے ساتھ کافی سارے بندے بھی ہیں۔ یوں سمجھو فوج ہی لے کر آیا ہے لیکن رندھاوے نے ان کے چار بندے پھڑکا دیئے ہیں پولیس مقابلے میں، وہ سبھی اشتہاری تھے۔"

"اوہ واہ......" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ "لگتا ہے رندھاوا یاری نبھائے گا۔ کہاں ہوا ہے یہ پولیس مقابلہ......؟"

"ہوا یوں کہ ملک سجاد کے آگے پیچھے بندے تھے۔ اب وہ کوئی امن کا پیغام لے کر تھوڑا آیا ہے، رندھاوا ان لوگوں کے انتظار میں تھا، ایک ٹولی مل گئی، انہوں نے پکڑ لی، بس ہو گیا مقابلہ۔"

"اس کا مطلب ہے......اب تھانے میں اچھی خاصی گہما گہمی ہو گی۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اور سرداروں کا کیا حال ہو گا؟" چھاکے نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

"اب ایسے کر، مجھے گھر پر اُتار کر سارے دوستوں کو اکٹھا کر...... دلبر کو بھی لے اور بھیدے کے پاس ڈیرے پر چلا جا، میں بھی وہیں آتا ہوں۔ آج رات بہت محتاط رہنا ہو گا۔ سمجھو، ہمیں شکار کرنا ہے، یا پھر ہم شکار ہو جائیں گے......"

"میں سمجھتا ہوں ایسا ہی کچھ ہو گا......" چھاکے نے کہا اور بائیک تیز کر دی۔ وہ مجھے میرے گھر کے گیٹ پر اتار کر چلا گیا۔

میں گھر میں داخل ہوا تو سامنے دالان میں اماں جائے نماز بچھائے نماز پڑھ رہی تھی۔ اس دن پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میری ماں کتنی بہادر ہے، اکیلی اتنے بڑے گھر میں رہتی ہے، اسے پوری طرح احساس ہے کہ میں موت کے چنگل میں ہوں، لیکن پھر بھی نہیں گھبرائی، اگر پریشان ہوتی بھی ہو گی تو اس کا اظہار نہیں کرتی تھی۔ ہمیشہ میری ماں نے مجھے حوصلہ ہی دیا تھا۔ کبھی وقت اور حالات سے ڈرایا نہیں تھا۔ میں قریب پڑی چارپائی پر چپکے سے بیٹھ گیا اور غور سے ماں کو دیکھنے لگا، کتنی بہادر اور پرعزم تھی میری ماں، جس نے اپنے سینے میں انتقام کی آگ نہیں بجھنے دی تھی اور میں نے دودھ کے ساتھ اس آگ کی حدت کو بھی اپنے اندر اتار لیا تھا۔ میں انہی سوچوں میں کھویا ہوا تھا کہ میری ماں نے سلام پھیرا، پھر مجھے دیکھ کر اشارے سے اپنے قریب بلایا، میں ان کے پاس جا بیٹھا تو میرے سر پر پھونک ماری، جیسے اس نے مجھے اپنی دعاؤں کے حصار میں لے لیا ہو۔

"کھانا کھائے گا؟" ماں نے پوچھا۔

"نہیں اماں، بھوک نہیں ہے تم پڑھو نماز، میں بس کچھ دیر کے لیے آیا تھا، ابھی جا رہا ہوں۔" میں نے تیزی سے کہا تو اماں نے غور سے میری طرف دیکھا اور بولیں۔

"اپنا خیال رکھنا پتر۔"

یہ کہہ کر وہ بقیہ نماز کے لیے اٹھ گئیں اور میں اوپر چھت پر چلا گیا۔ مجھے وہاں سے کچھ اسلحہ اور رقم لینی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد میں گھر سے اپنی بائیک پر نکلا اور ڈیرے کی طرف چل دیا۔ چاند کی روشنی کچھ زیادہ تھی یا پھر مجھے لگ رہی تھی۔ دور دور سے بھی ہیولے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ میں گاؤں کی گلیوں سے نکلتا چلا گیا اور بڑی سڑک پر آ گیا۔ میں اکیلا تھا اور مجھے معلوم تھا ملک سجاد اس وقت مجھے تلاش کرنے کے لیے اپنے بندے بھیج چکا ہو گا۔ اگر وہ اب تک مجھے تلاش نہیں کر سکے ہیں تو رندھاوے نے انہیں تھانے ہی میں مصروف رکھا ہو گا۔ اس وقت کون کیا کر رہا ہے، مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔ نجانے کیوں میرے ذہن میں یہ بات اٹکی ہوئی تھی کہ کسی نہ کسی طرح پیرزادہ وقاص سے رابطہ ہو جائے تو پھر جو میں چاہتا ہوں، وہی ہو جائے گا۔

میں ڈیرے پر پہنچا تو چھاکے کے ساتھ دلبر اور اس کے کئی سارے ساتھی تھے۔ وہ میرے ہی انتظار میں تھے۔ میرے بیٹھتے ہی باتیں شروع ہو گئیں۔ تبھی میں نے پوچھا۔

"یار، ہم یہاں بیٹھے رہیں گے، ارد گرد کی خبر ہمیں کیسے ملے گی؟"

"میں اور دلبر ابھی یہی باتیں کر رہے تھے۔ ابھی ہم یہاں ہیں اور ان لوگوں کا پتہ نہیں وہ کیا کر رہے ہیں اور کدھر ہیں؟" چھاکے نے کافی حد تک تشویش سے کہا تو میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کون لوگ؟"

"وہی ملک سجاد کے لوگ؟" اس نے جواب دیا۔

"ان کے لیے رندھاوا ہی کافی ہے، اگر ایک سوال کا جواب مل جائے تو پھر......" میں نے کہتے ہوئے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"وہ کیا؟" چھاکے اور دلبر نے ایک ساتھ بے ساختہ پوچھا تو میں نے کہا۔

"اس وقت پیرزادوں کی کیا کیفیت ہے؟ وہ کیا کر رہے ہیں، ان کی طرف سے خاموشی، سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔"

"میرا نہیں خیال کہ وہ خاموش ہوں گے......" دلبر نے تیزی سے کہا۔

"یہ محض خیال ہی ہے نا، تصدیق تو نہیں۔" میں نے کہا۔

"تو یہ کیسے ہو گا؟" اس نے مایوسانہ لہجے میں پوچھا تو میں نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

"اگر ایک بار رندھاوے سے ملاقات ہو جائے نا، تو بہت کچھ سامنے آ جائے گا، کیونکہ وہ دائی ہے پورے علاقے کی، کون سا مجرم کہاں ہے، اسے سب معلوم ہوتا ہے۔"

"تو چل نکل چلتے ہیں، مل لیتے ہیں اس سے، یہ کونسی بڑی بات ہے۔" دلبر نے تیزی سے کہا، وہ خاصا

بے تاب دکھائی دے رہا تھا۔
"اوئے ملنا کیا ہے اس سے اچھو کرپانے والے سے فون......" چھاکے نے کہا تو میں نے ٹوک دیا۔
"نہیں یہ ہم بڑی غلطی کرتے رہے ہیں۔ وہ اگر ہمیں ساری بات بتا سکتا ہے تو دوسروں کو بھی سب کچھ کہہ سکتا ہے۔ تو ایسا کر یہاں سب سنبھال لے بلکہ گاؤں میں بندے چھوڑ، تاکہ معلومات ملتی رہے۔ میں اور دلبر جاتے ہیں۔" میں نے کہا تو وہ فوراً اٹھ گیا۔ پھر تیزی سے بہت کچھ طے کیا اور ہم دونوں بائیک پر نکل کھڑے ہوئے۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ وہ ہمیں تھانے میں مل جاتا۔ میں نے باہر نکلتے ہوئے چھاکے کو اسلحہ اور رقم کے بارے میں سمجھا دیا تھا کہ ان کا کیا کرنا ہے وہ سمجھ گیا تھا۔ اس وقت آدھی رات ہونے کو تھی، جب میں اور دلبر دونوں ڈیرے سے نکلے اور قریبی قصبے کی جانب چل پڑے۔ میں بائیک چلا رہا تھا اور دلبر اسلحہ لیے میرے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ کچے راستوں پر میں احتیاط سے چلتا رہا پھر جیسے ہی پکی سڑک آئی میں نے طوفانی رفتار سے بائیک بھگایا اور تقریباً پون گھنٹے میں ہم قصبے جا پہنچے۔ تھانہ کافی حد تک سنسان پڑا ہوا تھا۔ میں نے جاتے ہی باہر کھڑے سنتری سے پوچھا۔
"رندھاوا صاحب ہیں تھانے میں......!"
"جی، نہیں، وہ چلے گئے ہیں۔" اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ دلبر نے اپنا اسلحہ چھپایا ہوا تھا۔
"کہاں گئے ہیں۔ مجھے ان سے بہت ضروری ملنا ہے۔" میں نے کہا کیونکہ وہ مجھے پہچان کر مسکرا دیا تھا۔
"پتہ نہیں گشت پر ہوں یا پھر آرام کرنے کوارٹر پر...... دیکھ لیں۔" اس نے اشارے میں جواب دیا تو میں نے تھانے کے اندر جا کر بائیک رہائشی علاقے کی طرف موڑ لی۔ ہمیں رندھاوے کا کوارٹر تلاش کرتے چند منٹ لگے۔ میں بائیک روک کر اترا اور جا کر اس کا دروازہ بجایا۔ دوسری دستک کے بعد اس نے دروازہ کھول دیا۔ پھر تیزی سے بولا۔
"جلدی سے اندر آ جا اسے بھی لے آ اندر۔"
دلبر نے بات سن لی تھی، وہ اترا تو میں نے بائیک کوارٹر کے اندر کر لی وہ تنہا تھا اور یونیفارم میں تھا۔
"آپ کو کیسے پتا رندھاوا صاحب کہ میں ہی ہوں...... کوئی اور بھی ہو سکتا تھا۔"
"میں ابھی آیا ہوں، تیری پہلی دستک پر میں نے اندر سے جھانک کر تصدیق کر لی تھی کہ باہر کون ہے مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ تیرے ساتھی کے پاس اسلحہ ہے، چل اب کام کی بات کر، کیوں آیا ہے؟" اس نے تیزی سے کہا۔
"میں صورت حال جاننے کے لیے آیا ہوں۔ یہ کیا گیم چل رہی ہے...... اور میں......"
"تجھے فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جب تیرا کام ہوتا تو تجھے بتا دیتا۔ میرا بندہ تم تک پہنچ جاتا تو بے فکر ہو جا۔"
"لیکن پھر بھی...... ملک سجاد......"
"اوئے سن...... اس کی تو بہن...... وہ اب زندہ یہاں سے نہیں جائے گا۔ پیرزادوں کو یہ باور کرا دیا ہے میں نے کہ تم اس گیم کا حصہ نہیں ہو۔ اس کے تینوں بندے سرداروں نے ہی مروائے ہیں اور یہ جو چار بندے مرے ہیں یہ پیرزادوں ہی نے مارے ہیں۔ ان دونوں کی آپس میں لگ گئی ہے۔ صبح تک دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ میں داد دیتا ہوں تیرے ذہن کی، تو نے جو پلان کیا تھا ویسا ہی ہو رہا ہے۔"
"اگر انہوں نے آپس میں کوئی سمجھوتہ کر لیا تو ......" میں نے ایک خدشہ ظاہر کیا۔

"وہ تو ہونا ہی ہے آج نہیں تو کل...... کل نہیں تو پرسوں...... جب بھی انہیں معلوم ہوا کہ گیم کیا ہوئی ہے، مگر یہ اس وقت تک سمجھوتہ نہیں ہو سکتا، جب تک ملک سجاد ادھر ہے۔ کیونکہ پیرزادے یہ سمجھ رہے ہیں کہ انہیں کرش کرنے کے لیے سرداروں نے دوسروں سے مدد لے لی ہے۔ اب ملک سجاد کا مرنا بہت ضروری ہے۔"
"تو پھر اسے مار دیتے ہیں۔" میں نے یوں کہا جیسے کسی چیونٹی کو مسلنے کی بات کر رہا ہوں۔
"میں جانتا ہوں کہ تم اسے مار دو گے، لیکن یہ مدعا پیرزادوں کے سر ہی پڑنا چاہیے۔ تاکہ یہ دشمنی لمبی ہو جائے۔"
"یہ کیسے ہو گا، ملک سجاد تو یہاں قلعہ بند ہو گیا ہے۔ وہ تو باہر نہیں آ رہا۔" میں نے یونہی بات چھوڑی، حالانکہ مجھے اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔
"ہاں یہ تو ہے، میں نے خود اسے سرداروں کی حویلی تک محدود رہنے کو کہا ہے، باہر نکلنے پر میں نے اس کی ذمہ داری نہیں لی اس کے بندے ڈیرے پر ہیں اور تجھے بتا دوں، آج رات کسی وقت پیرزادوں کے بندوں نے ڈیرے پر حملہ کر دینا ہے اب اس میں کس کا کتنا نقصان ہوتا ہے، میں نہیں جانتا۔" اس نے بے پروا انداز میں کہا تو ایک دم سے میرے ذہن میں خیال رینگ گیا۔ تب میں نے کہا۔
"میں اگر ان کی مدد کروں تو......؟"
"نہیں، پھر تو معاملہ سارا سامنے آ جائے گا۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا۔
"ٹھیک ہے، میں کچھ بھی نہیں کروں گا، لیکن اگر میں ملک سجاد کا کام کر دوں تو......" میں نے اس کو اشارہ دیا تو وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔
"مجھے کیسے پتا چلے گا کہ تو نے ایسا کر دیا ہے اور پھر سرداروں کی حویلی میں...... ناممکن ہے......"
"یہ میرا کام ہے کہ میں یہ کیسے کرتا ہوں، باقی سنبھالنا آپ کا کام ہے۔ یہ میں نہیں جانتا کیسے؟" یہ کہہ کر میں نے اٹھتے ہوئے اس کے چہرے پر دیکھا، جہاں تفکر کے گہرے اثرات تھے پھر آہستگی سے بولا۔
"کیا میرا وہاں پر ہونا ضروری ہے؟"
"میں نہیں جانتا، لیکن آج رات کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ ایک دم سے بولا۔
"ٹھیک ہے، اب جو ہو گا دیکھا جائے گا، تو کر اپنا کام، میں دیکھ لوں گا۔" وہ اضطراری انداز میں اٹھتے ہوئے بولا، میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور پھر مڑ گیا۔ دلبر نے بائیک باہر نکالی، پھر اگلے چند لمحوں میں ہم رہائشی کالونی سے نکلتے چلے گئے۔
رات کا تیسرا پہر ختم ہونے کو تھا۔ چاند مغربی افق کنارے جا لگا تھا۔ چاندنی کی وہ پہلے والی آب و تاب نہیں رہی تھی۔ میں گاؤں کے باہر آ پہنچا تھا۔ میرے ایک طرف گاؤں، تقریباً آدھا کلومیٹر کے فاصلے پر حویلی اور پھر اس سے آگے جا کر تقریباً دو کلومیٹر پر سرداروں کا ڈیرا تھا۔ اگر میں گھوم کر حویلی کے عقب سے نکلتا تو ڈیرے تک جا سکتا تھا، یا پھر سڑک پر جاتے ہوئے میں حویلی کے راستے کے سامنے سے گزرتا، مجھے حویلی اور ڈیرے کے درمیان رکنا تھا۔ مجھے اصل میں حیرت یہ تھی کہ ملک سجاد نے آتے ہی مجھ پر حملہ کیوں نہیں کروایا؟ اس سوال کا جواب تو مجھے گاؤں ہی میں مل گیا تھا کہ اس کے بندے مارے گئے تھے۔ اگر رندھاوا مجھے پیرزادوں کے حملے کے بارے میں نہ بتاتا تو میرے ذہن میں کئی دوسرے خیال آتے چلے جا رہے تھے۔ اب پورا منظر میرے سامنے واضح تھا۔ میں نے ساری احتیاط ایک طرف رکھی اور پکی سڑک پر

سیدھا چلتا چلا گیا۔ حویلی کی طرف جانے والے راستے پر کوئی نہیں تھا۔ پھر چند ہی منٹوں میں ہم حویلی اور ڈیرے کے درمیان جارکے' بائیک بند ہونے سے ایک دم سناٹا چھا گیا۔

''دلبر! تو سمجھ گیا ہے نا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔''

''اچھی طرح......'' وہ میرے اشاروں سے بات سمجھ گیا تھا۔

''تو نے سامنے نہیں آنا' پھر جیسے ہی میں کہوں نکل جانا ہے' باقی تم خود سمجھ دار ہو۔'' میں نے اپنے طور پر اسے سمجھایا اور کچی سڑک کے دوسری جانب چلا گیا۔ میں نے اپنے پسٹل نکالے' میگزین دیکھے اور پوری طرح تیار ہو گیا۔ میری جیکٹ میں دو دستی بم تھے' جو میں خصوصی طور پر چھت سے اٹھا کر لایا تھا۔

ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ڈیرے کی طرف سے ایک دم فائرنگ شروع ہو گئی۔ رات کے سناٹے میں فائرنگ کی آواز بہت دور دور تک سنائی دینے لگی تھی۔ میں اپنی جگہ جما رہا' کس طرف سے کتنی گولیاں چلیں' یہ تو نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن تقریباً تیس منٹ تک یہ فائرنگ ہوتی رہی' پھر ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔ تقریباً پانچ منٹ بعد اکا دکا فائر کی آواز آنے لگی۔ میں نے اس طرف توجہ نہ دی' بلکہ اب میں حویلی کے عقب میں اس راستے کو دیکھ رہا تھا جو ڈیرے اور حویلی کے درمیان انتہائی مختصر راستہ تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہاں سے ملک سجاد ضرور باہر نکلے گا۔ کیونکہ میں سرداروں کی فطرت سے واقف تھا۔ ان میں سے کسی نے نہیں نکلنا تھا۔ ملک سجاد تو آیا ہی مجھے ختم کرنے کے لیے تھا۔ لمحہ لمحہ مجھ پر بھاری ہو رہا تھا۔ اچانک گیٹ کھلا اور اس میں سے ہائی ایس ڈالا برآمد ہوا۔ اس کے پیچھے ایک اور بڑی فور وہیل جیپ تھی۔ دونوں تیزی سے آگے بڑھیں اور لمحہ بہ لمحہ آگے آنے لگیں۔ دلبر بائیک سمیت دوسری سمت چھپ چکا تھا اور میں پوری طرح تیار تھا۔ میں نے دونوں پسٹل نکال لیے اور فور وہیل جیپ کی روشنی میں آگے والی گاڑی کے پچھلے ٹائر کا نشانہ لیا' جیسے ہی وہ رینج میں آیا میں نے فائر داغ دیا۔ ایک دھماکا ہوا اور ٹائر پھٹ گیا' میں نے انتظار نہیں کیا' دوسری گاڑی کے ٹائروں کا نشانہ لیا' یکے بعد دیگرے دو دھماکے ہوئے۔ گاڑیاں ہچکولے کھاتی ہوئی رک گئیں۔ ان کی ہیڈ لائٹس جلتی رہیں۔ یہی ان سے بہت بڑی غلطی ہو گئی تھی۔ ان کی طرف سے اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ میں ایک پیڑ کے پیچھے تھا' فوراً اوپر چڑھ گیا۔ ملگجی روشنی میں ان کے ہیولے دکھائی دے رہے تھے۔ میں ایک دوشاخے پر جم کر بیٹھ گیا اور پھر تاک تاک کر ایک ایک کو مارنے لگا۔ انہیں اب تک میری پوزیشن کا اندازہ اس لیے نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ فائر ہونے کی سمت کا تعین ہی نہیں کر پا رہے تھے اور میں نے انہی چند لمحوں کا فائدہ اٹھانا تھا۔ یہاں پر دلبر نے بہت سمجھداری سے کام لیا' اس نے دوسری طرف سے اچانک دو فائر کیے اور اپنی جگہ تبدیل کر لی۔ وہ الجھن کا شکار ہو گئے' اچانک ان کی طرف سے فائرنگ ہونا بند ہو گئی۔ اب میرے لیے یہاں ٹکے رہنا بہت خطرناک تھا۔ میں تیزی سے اترا اور زمین کے ساتھ لگ کر ساکت ہو گیا۔ چند لمحے یونہی پڑا رہنے کے باعث ان کی طرف سے حرکت ہوئی اور پھر سے اندھا دھند فائرنگ ہونے لگی۔ تب میں نے ایک بڑا رسک لینے کا سوچ لیا۔ میں نے دستی بم کی پن کھینچ لی اور پھر تاک کر بم ان کی طرف پھینک دیا۔ چند لمحوں بعد ہی ایک دھماکا ہوا' تیز چیخوں کے ساتھ ہی لمحہ بھر میں ایک اور دھماکا ہو گیا۔ آگے والی فور وہیل جیپ پھٹ گئی تھی۔ وہاں تیز روشنی ہو گئی' موٹا سا ایک شخص پوری

قوت سے بھاگا' نجانے کیوں میرے ذہن میں یہ آیا کہ یہی ملک سجاد ہو سکتا ہے۔ میں بھی اس کی تاک میں بھاگا' تین چار بندے اس کے ساتھ بھاگ رہے تھے۔ شاید وہی بچے تھے۔ ممکن ہے ان کے ذہن میں یہ ہو کہ دوسری گاڑی بھی پھٹ سکتی ہے اور پھر ہوا بھی ایسے ہی اچانک ہی ہائی ایس ڈالا گاڑی ایک زوردار دھماکے سے پھٹ گئی۔ میں نے بھاگتے ہوئے ان بندوں پر فائرنگ کرنا شروع کر دی۔ اس بار انہیں فائر کی سمت کا اندازہ ہو گیا۔ انہوں نے جلدی میں پوزیشن لے لی' مگر تب تک میں دو کو ڈھیر کر چکا تھا۔ اب صرف دو بندے تھے۔ ایک وہی موٹا سا بندہ اور دوسرا اپنے حلیے ہی سے کوئی گارڈ دکھائی دے رہا تھا۔ میں کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اس گارڈ کا نشانہ لے لیا۔ جیسے ہی اس موٹے بندے کو اندازہ ہوا کہ وہ تنہا رہ گیا ہے' اس نے بھاگنا چاہا' مگر میں نے اس کی ٹانگوں کا نشانہ لیا۔ وہ گر گیا' میں نے آخری میگزین بدلا اور اس کے قریب چلا گیا۔ میں نے اندھیرے میں اسے سیدھا کیا اور پوچھا۔

''ملک سجاد...... اپنی آخری خواہش بتاؤ۔''

''ک...... کون ہو تم......'' اس نے لرزتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

''تمہاری موت...... بڑے دعوے کیے تھے نا تم نے......'' میں نے لفظ چباتے ہوئے کہا۔

''میں ہار مانتا ہوں' میں ابھی یہاں سے چلا جاؤں گا' باقی تمہاری مرضی......'' اس نے کہا تو میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''جاؤ......! بھاگ جاؤ' اگر بھاگ سکتے ہو' موت کوئی سزا نہیں ہے' جب بھی تمہارے ساتھ کچھ ہوگا تجھے میں یاد آؤں گا' جاؤ' بھاگ جاؤ......''

اس نے اٹھنے کی کوشش کی' مگر نہیں اٹھ سکا' اس نے رحم طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔

''مجھے بچا لو......''

''نہیں' انسان کو بچایا جاتا ہے' سانپ کو نہیں...... جو برس ہا برس دودھ پلانے والے کو بھی ڈنک مار دیتا ہے...... اب تمہاری قسمت' میں جا رہا ہوں......'' میں نے کہا اور تیزی سے اس طرف بڑھا جہاں میں نے دلبر کو چھوڑا تھا' مجھے اندازہ ہی تھا' میں جب وہاں پہنچا تو' یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ زخمی حالت میں پڑا تھا' اندھا دھند فائرنگ میں اسے کوئی گولی لگ گئی تھی۔

''دلبر......! اوئے دلبر...... ہوش کر......''

''میں...... میں...... ٹھیک ہوں......'' اس نے بڑے حوصلے سے کہا تو میں نے اسے تیزی سے اٹھا لیا' اس کی گن نجانے کدھر تھی' میں نے بائیک کے پاس پہنچ کر کہا۔

''حوصلہ رکھنا دلبر...... اور مجھے پکڑ کر بیٹھے رہنا' بس گاؤں تک پہنچ جائیں۔''

''تو فکر نہ کر......'' اس نے کراہتے ہوئے کہا' میں نے اسے احتیاط سے بٹھایا اور پھر بائیک بڑھا دی۔

❀ ...... ❀ ...... ❀

صبح کی روشنی ہر طرف پھیل چکی تھی۔ جسپال اور ہرپریت نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی تھی۔ وہ کچھ دیر تک چھت پر رہے پھر نیچے کمرے میں آ گئے۔ انوجیت نے کچھ بندے بلوا لیے تھے' وہی رات بھر پہرہ دیتے رہے۔ انوجیت نے فون پر ہی تھانے میں اطلاع دے دی تھی مگر وہاں سے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ پھر ان تینوں نے فیصلہ کیا کہ وہ خود تھانے جائیں گے' ان کی جیپ رات ہی سے وہیں کھڑی تھی۔ اس وقت میں اپنی کار میں بیٹھ کر نکل رہے تھے' کلجیت کور انہیں افسردہ نگاہوں سے دیکھ رہی

تھی۔ جسپال نے ایک نگاہ ان پر ڈالی اور پھر ہلکے سے مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا اور انوجیت کے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تب اس نے کار بڑھادی۔ ان کا رخ تھانے کی طرف تھا۔ راستے میں انہوں نے اپنی جیپ کو دیکھا' اس کا اگلا حصہ ہی ڈسٹرب ہوا تھا۔ باقی سب ٹھیک تھا۔ وہ تینوں جیپ دیکھتے ہوئے خاموش رہے۔ انوجیت نے کار آگے بڑھالی' جبکہ جسپال ان جگہوں کو دیکھنے لگا جو اس کی سمجھ کے مطابق رات اس نے بھاگ دوڑ میں پار کی تھی۔ عجیب طرح کا تاثر اس کے اندر پھیل گیا تھا' جس میں غصہ' نفرت اور انتقام کی شدت زیادہ تھی۔ وہ اپنے طور پر سوچنے لگا تھا کہ اب اس نے کیا کرنا ہے' دشمن تو اس تک پہنچ گیا ہے' یہی سوچتے ہوئے وہ تھانے کے گیٹ پر جا پہنچے۔ کار ایک طرف پارکنگ میں لگانے کے بعد وہ تینوں اس پرانی سی عمارت کے اندر چلے گئے۔ انوجیت کو معلوم تھا کہ جس پولیس آفیسر سے ملنا ہے' وہ کہاں بیٹھتا ہے' وہ تینوں اردلی کی پروا کیے بغیر کمرے میں چلے گئے۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں چند دن پہلے جسپال آیا تھا لیکن اب وہاں کرسی پر ایک نیا پولیس آفیسر براجمان تھا۔ وہ ایک اسمارٹ نوجوان تھا۔ شاید اس کی پہلی تعیناتی ہی یہاں ہوئی تھی۔ اس نے ان تینوں کی طرف غور سے دیکھا اور ان کے بیٹھنے سے پہلے ہی بولا۔

"کون ہیں آپ لوگ...... اور کیسے آنا ہوا؟"

"آپ کا قصور نہیں آفیسر...... لگتا ہے آپ نے پولیس کی نوکری ابھی جوائن کی ہے۔" جسپال نے کہا اور کرسی پر اس کے سامنے بیٹھ گیا تو وہ دونوں بھی ادھر ادھر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"میں سمجھا نہیں اور نہ ہی آپ نے میرے سوال کا جواب دیا ہے۔" اس آفیسر نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"رات بھر آپ کو فون کرتے رہے' لیکن فون سن لینے کے بعد بھی کوئی ہماری مدد کو نہیں پہنچا۔" جسپال نے قدرے اکھڑ لہجے میں کہا۔

"رات......" اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس کا علم نہیں۔" یہ کہہ کر اس نے میز پر پڑی گھنٹی بجائی تو فوراً ہی اردلی آگیا۔ "ست پال کو بلاؤ۔"

"یس سر......" یہ کہہ کر اردلی واپس مڑ گیا تو وہ جسپال کی طرف دیکھ کر بولا۔

"آپ بتائیں؟"

تبھی جسپال نے انتہائی اختصار کے ساتھ رات والے واقعے کے بارے میں بتادیا۔ وہ بڑے غور سے سنتا رہا پھر جب جسپال کہہ چکا تو اسی دوران ست پال اندر آگیا۔ یہ وہی شخص تھا' جس نے جسپال کو فارم بھرنے کے لیے دیا تھا۔ ست پال نے ساری بات سمجھ کر کہا۔

"سر' رات تھانے میں ایک بندے کے سوا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ وہ اکیلا کہاں جاتا؟"

"لیکن مجھے اب تک بتایا نہیں گیا؟"

"میں بتانے والا ہی تھا جی۔" وہ منمناتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے' ایف آئی آر درج کرو' باقی میں دیکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ جسپال کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "میں ابھی موقع دیکھتا ہوں' آپ پلیز......"

اس نے کہا تو جسپال اٹھ گیا۔ انہیں ابتدائی رپورٹ لکھواتے کچھ دیر ہوگئی' اس سے فراغت کے بعد وہ وہاں سے چل دیئے۔ وہ سمجھ گئے کہ یہاں مزید رکنا بے کار ہوگا۔

"اب کیا پروگرام ہے' ان کا انتظار کرنا ہے؟" انوجیت نے کار میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ لوگ پتا نہیں کب آئیں گے' تو حویلی کی طرف چل' دیکھیں کام کتنا مکمل ہوا ہے' میں چاہتا ہوں کہ جتنی جلدی مکمل ہوجائے اتنا ہی بہتر ہے۔"

تب انوجیت نے کار کا رخ اس طرف کرلیا' کچھ ہی دیر بعد وہ اس چوک میں پہنچ گئے' جس کے ایک کونے میں ان کی حویلی تھی اور وہاں بہت ساری مزدور کام کررہے تھے' کچھ ہی دیر بعد ٹھیکیدار ان کے پاس آگیا۔ وہ کچھ دیر کام سے متعلق باتیں کرتے رہے' جسپال ابھی وہیں پر تھا کہ اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اس نے اسکرین دیکھی' وہ وینکوور سے فون تھا۔ اس نے ریسیو کرکے ہیلو کہا تو دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"آپ کمپیوٹر کے پاس ہیں؟"

"ابھی تو نہیں؟" اس نے جواب دیا۔

"تو پھر آپ فوراً کمپیوٹر پر آئیں۔" دوسری طرف سے کہا گیا اور اس کے ساتھ ہی فون بند کردیا گیا۔ اس کے دماغ میں الارم بج گیا تھا۔ سو اس نے ٹھیکیدار سے اپنی بات سمیٹی اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔

"اتنی جلدی۔" ہرپریت نے پوچھا۔

"ہاں' ابھی بتاتا ہوں۔" اس نے دور کھڑے انوجیت کو اشارے سے چلنے کا کہا اور کار کی جانب بڑھ گیا۔

جس وقت وہ پکی سڑک سے' گھر جانے والی کچی سڑک پر آئے تو کچھ پولیس والوں کے ساتھ پولیس آفیسر بھی کھڑا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی جسپال نے کہا۔

"انوجیت' تم ذرا انہیں ڈیل کرنا' میرا گھر پہنچنا ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر اس نے کچھ فاصلے پر کار روک دی' انوجیت اتر گیا تو اس نے ڈرائیونگ سنبھال لی' پھر وہ وہاں نہیں رکا اور سیدھا گھر چلا گیا۔ کار سے اترتے ہوئے اس نے کسی حد تک حیران ہرپریت کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تم ایسا کرو' چائے کی تیز پیالی بنا کر اوپر میرے کمرے میں آجاؤ' فوراً۔"

"کیا ہوتی سے نہ کہہ دوں۔" اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا' تب تک وہ اندر کی جانب چل دیا تھا۔

"جو تم مناسب سمجھو۔" یہ کہتے ہوئے وہ سیڑھیاں چڑھ گیا۔ وہ اپنے کمرے میں پہنچا' لیپ ٹاپ اٹھایا اور اسے آن کرکے صوفے پر بیٹھ گیا۔ وینکوور سے اس کا خاص دوست جسمیندر سنگھ ڈھلوں آن لائن تھا۔

"ہاں بولو!" اس نے کہا۔

"تمہیں رویندر سنگھ کے بارے میں معلومات چاہیے تھیں نا۔"

"ہاں' تو......" وہ تیزی سے بولا۔

"وہ میں نے تمہیں میل کردی ہیں تصویروں اور نقشوں کے ساتھ...... پڑھنے کے بعد ڈیلیٹ کردینا اور باقی میں نے امرتسر میں سارا سیٹ اپ کردیا ہے' بس تمہیں وہاں پہنچنے کی تاریخ بتانا ہوگی' باقی سارا انتظام وہ کردے گا۔"

"میں آج ہی نکلوں گا اور رات کے کسی پہر وہاں پہنچ جاؤں گا' یا ممکن ہے شام سے پہلے......" اس نے جوش بھرے لہجے میں کہا' جس میں کافی حد تک غصہ چھلک رہا تھا۔

"تو ٹھیک ہے' میں تمہیں ایک نمبر بھیج دیتا ہوں' امرتسر جاتے ہی رابطہ کرنا اور اس بندے پر آنکھیں بند کرکے اعتماد کرنا' وہ بہت بھروسے کا ہے' تم نہیں جانتے اس کی آدھی سے زیادہ فیملی ادھر ہے' جسمیندر سنگھ نے اسے پورے اعتماد سے بتایا۔

"ٹھیک' بھیجو نمبر......"

"اور ہاں' یہ سب کچھ میں نے اسی سے حاصل کیا ہے' میرے پاس محفوظ ہے' جب چاہے دوبارہ بھیج دوں گا۔ لیکن تم کوئی رسک نہ لینا۔"

"اوکے، میں سمجھ گیا۔" جسپال نے تیزی سے کہا۔ پھر کچھ وقت تک ان میں دوستوں اور فیملی کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں کہ ہرپریت آگئی۔ تبھی اس نے اسے اپنے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ چند منٹوں بعد جسمیندر آف لائن ہو گیا۔ تبھی اس نے اپنا ان بکس کھولتے ہوئے کہا۔

"ہرپریت...... میں ابھی کچھ دیر بعد امرتسر جا رہا ہوں۔"

"کیوں، اکیلے ہی......" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، اکیلے ہی، کیا تم جانا چاہو گی میرے ساتھ...... اور جہاں تک کیوں کا سوال ہے، وہ تمہیں ابھی بتا دیتا ہوں۔"

اس وقت تک ان بکس کھل گیا تھا اور ایک میل پر اس نے کلک کر دیا، اگلے ہی لمحے اس کے سامنے ایک صفحہ کھل گیا، جس میں تصویروں کے ساتھ رویندر سنگھ کے بارے میں تفصیلات بتائی گئی تھیں۔

"اوہ...... یہ کیا......" ہرپریت کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"جان گئی ہو، میں امرتسر کیوں جا رہا ہوں......؟"

"یہ بھی تو دیکھو جسی، اتنا پروٹوکول، اتنے باڈی گارڈ اور یہ محل نما گھر...... تم یہ سب اکیلے کیسے کر لو گے......"

"واہ گورو پر بھروسہ رکھو ہرپریت...... سب ہو گا، یہی تو کرنے آیا ہوں۔" اس نے ان تصویروں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی پوری توجہ اسکرین پر تھی اور اس میں دی گئی معلومات کو ذہن نشین کر رہا تھا۔

"تو پھر...... جسی...... میں تمہارے ساتھ جاؤں گی......" اچانک ہرپریت نے کہا تو وہ چونک گیا۔

"کیا کہا تم نے......؟" وہ کسی حد تک حیرت سے بولا تو وہ اس کی طرف دیکھ کر قدرے افسوس بھرے لہجے میں بولی۔

"میں نے کسی غیر زبان میں تو بات نہیں کی۔ میں نے وہی کہا ہے جو تو نے سمجھا ہے۔"

"ہرپریت، یہ کوئی بحث نہیں ہے اور میں سیر پر نہیں جا رہا، نجانے حالات کیسے ہوتے ہیں اور میں......" اس نے سمجھانا چاہا تو وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

"مجھے یہ بتاؤ جانا کب ہے، میں اپنے طور پر تیار ہو جاؤں۔"

"اوکے......! لیکن کلجیت پھوپھو کو تم نے خود جواب دینا ہے، میں نے نہیں۔" اس نے ایک دم سے کہا تو وہ سنے بغیر کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ جسپال اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا، پھر اسکرین کی طرف متوجہ ہو گیا۔

دوپہر ڈھلنے والی تھی جب وہ اوگی پنڈ سے نکلے۔ کلجیت کور نے انہیں بڑی دعائیں دے کر وداع کیا تھا۔ انوجیت انہیں جالندھر تک چھوڑنے گیا تھا۔ وہاں سے آگے وہ بس کے ذریعے جانا چاہتے تھے۔ وہ تینوں خاموش تھے اور اسی خاموشی میں وہ جالندھر جا پہنچے۔ بس اسٹینڈ پر جب وہ سامان اتار چکے تو جسپال نے انوجیت سے بغل گیر ہوتے ہوئے کہا۔

"چل اب تو جا، شام ہونے سے پہلے پہلے اوگی واپس پہنچ جا، اپنا اور بے بے کا بہت خیال رکھنا۔"

"اور تم بھی......" انوجیت نے گرم جوشی سے کہا پھر ہرپریت سے ملا اور گاڑی میں بیٹھ کر واپس چلا گیا۔ امرتسر جانے والی بس تیار تھی۔

رات کا پہلا پہر ختم ہونے کو تھا، جب وہ امرتسر پہنچ گئے۔ راستے ہی میں اس نے جسمیندر کے دیئے ہوئے نمبر پر کال کی تھی۔ وہاں سے ایک لڑکی نے کال ریسیو کی۔ وہ اسے جانتی تھی اور بس اسٹینڈ پر ہی ملنے کو

کہا تھا۔ وہ بس سے اتر کر ارد گرد نگاہیں دوڑا رہے تھے کہ جسپال کا سیل فون بج اٹھا۔ اس نے اسکرین پر وہی نمبر دیکھا اور کال ریسیو کر لی۔ تبھی ہیلو کے جواب میں لڑکی نے کہا۔

"آپ نے سیاہ پتلون پر نیلی دھاری والی سفید شرٹ پہنی ہے نا؟ اور ساتھ میں کاسنی رنگ کے......"

"ہاں...... ہاں......" اس نے جواب دیا۔

"تو میں آپ کے بالکل سامنے کھڑی ہوں۔ میں نے سیاہ سوٹ پہنا ہوا ہے، سفید شرٹ پر ٹائی......"

"میں نے دیکھ لیا۔" جسپال نے کہا اور سامنے کان کے ساتھ فون لگائے لڑکی کو ہاتھ سے اشارہ کیا، وہ ان کی طرف بڑھ آئی اور پھر گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے شستہ انگریزی میں بولی۔

"میں کرن جیت کور، آپ مجھے کرن پکار سکتے ہیں۔ امرتسر میں آپ کو خوش آمدید کہتی ہوں۔" پھر ہرپریت سے ہاتھ ملا کر بہت پیار سے کہا۔ "بہت خوب صورت ہیں آپ...... آئیں چلیں۔"

یہ کہتے ہی وہ کسی روبوٹ کی مانند پلٹی اور پھر چلتی چلی گئی، وہ اپنا سامان اٹھا کر کچھ فاصلے پر کھڑی فور وہیل جیپ میں جا بیٹھے، ڈرائیونگ سیٹ پر ایک صحت مند نوجوان بیٹھا ہوا تھا، جس کا صاف رنگ، تیکھے نقوش، کلین شیو اور چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔ کرن اور ہرپریت پچھلی نشست پر بیٹھ گئیں۔ جسپال پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا تو اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کمل ویر سنگھ ہوں، آپ میرے پاس ہی آئے ہیں۔"

جسپال نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"مطلب، آپ میزبان ہیں۔"

"جی اور کرن مجھ سے بھی بڑھ کر آپ کی میزبان ثابت ہو گی۔" اس نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا پھر بیک مرر میں ہرپریت کی طرف دیکھ کر بولا۔

"آپ ہرپریت ہیں نا......" یہ کہتے ہوئے اس نے گیئر لگا دیا۔

"ہاں، کیا تم جانتے ہو مجھے......؟" اس نے پوچھا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے جسمیندر نے بتایا تھا، خیر اچھا ہے، میری اور کرن کی موجودگی میں جسپال کو بوریت نہیں ہو گی۔" اس نے اشارے میں کہا اور پھر ہلکا سا قہقہہ لگا کر ہنس دیا پھر جسپال سے مخاطب ہو کر بولا۔

"وہ سب کمپیوٹر سے صاف کر دیا تھا نا۔"

"بالکل اور ہم نے کب......" وہ کہنا چاہ رہا تھا کہ کمل ویر نے کہا۔

"یہ باتیں ہم گھر جا کر کریں گے، ابھی تو آپ امرتسر کو سمجھیے اور اسے دیکھنے کی کوشش کریں، بڑا تاریخی شہر ہے۔"

"کیا تم نہیں سمجھتے ہو؟" جسپال نے پوچھا۔

"میں تو نہ جانے کب کا سمجھ چکا، اگر فقط میں نے ہی سمجھنا ہوتا نا تو آپ کو یہاں بلانے کی ضرورت کیا تھی۔" اس کے لہجے میں گہری سنجیدگی تھی۔

"چلیں گھر جا کر سمجھ لیتے ہیں۔" اس نے کہا اور خاموش ہو گیا۔

کمل ویر تیزی سے جیپ بھگائے لیے جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک پوش علاقے میں تھا۔ وہاں جدید طرز پر گھر بنے ہوئے تھے۔ یوں دکھائی دے رہا تھا کہ جیسے یہاں امیر طبقے کے لوگ ہی رہائش پذیر ہیں۔ پھر ایک موڑ مڑنے کے بعد کمل ویر نے کہا۔

"جسپال، غور سے دائیں طرف دیکھو، رویندر سنگھ کا گھر پہچان لو گے نا۔"

"ہاں، وہ رہا سامنے......" اس نے ایک گھر پر نگاہ

ٹکاتے ہوئے کہا تو کمل ویر بولا۔
"ایک نظر ہی دیکھ پاؤ گے...... ہم نے یہاں رکنا نہیں۔"
"اوکے......!" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا، لیکن اس کے اندر ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی اترے اور دندناتا ہوا اندر گھس جائے، سامنے ہی کہیں رویندر سنگھ ملے اور وہ اپنے پسٹل کی ساری گولیاں اس کے بھیجے میں اتار دے۔ مگر یہ محض خیال تھا اس نے اپنا سر جھٹکا اور سامنے دیکھنے لگا۔
"جسپال جی......! جو دل چاہے کرنا، ہم بھی یہیں اور یہ بھی یہیں ہے۔" کمل ویر نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ تب وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔
اس پوش علاقے سے نکلنے کے کچھ دیر بعد وہ ایک ایسے علاقے میں جا پہنچے جہاں ابھی اتنی آبادی نہیں ہوئی تھی۔ بڑے بڑے گھر تھے لیکن ابھی کئی زیر تعمیر تھے۔ ایک ہو کا عالم تھا، چاندنی کے ساتھ برقی قمقموں سے بہت حد تک روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ایک قلعہ نما گھر کے سامنے رک گئے جلد ہی گیٹ کھول دیا گیا تو جیپ سمیت پورچ میں جا رکے۔
"یہ لیں جی، ہمارا گھر آ گیا۔" کمل ویر نے کہا اور اتر گیا۔ وہ سب بھی اتر کر اندر کی جانب چل دیئے۔ پہلے پہل تو یوں لگا جیسے ان کے علاوہ کوئی ہے ہی نہیں، پھر دھیرے دھیرے کچھ ملازم اور ملازمائیں نظر آنا شروع ہو گئیں، جو لفظوں سے زیادہ اشارے سمجھتے تھے۔ "یہاں کسی قسم کا بھی تکلف نہیں، آپ اپنے کمرے سے ہو آئیں پھر ڈنر کرتے ہیں۔"
جسپال نے سر ہلایا تو کرن انہیں لے کر کمرے کی طرف چلی گئی۔ شاہانہ انداز میں سجایا گیا کمرہ ان کا منتظر تھا۔

"کیسا لگا تمہیں کمل اور کرن...... مطلب...... ڈبل کے......" ہرپریت نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
"اچھا...... بہت اچھا...... باقی اس کا کام دیکھ کر......" جسپال نے محتاط انداز میں کہا اور پھر واش روم کی جانب بڑھ گیا۔
نہایت پرتکلف ڈنر کے بعد جب برتن اٹھائے جانے لگے تو وہ چاروں ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ کمل ویر نے اپنا لیپ ٹاپ کھول لیا پھر ویسی ہی معلومات کا صفحہ نکال کر بولا۔
"یہ ہے رویندر سنگھ کا گھر...... آج وہ یہاں نہیں دہلی میں ہے، لیکن اس کا پتر...... ہردیپ سنگھ آج ادھر ہی ہے، ورنہ یہ اپنے باپ کے ساتھ ہی ہوتا ہے، اس کی پتنی اور بیٹا بھی یہیں ہیں۔ ابھی ہم یہاں سے کچھ دیر بعد نکلیں گے۔"
"واؤ...... ابھی......" ہرپریت کے منہ سے بے ساختہ نکلا تو کمل اور کرن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، پھر چند لمحے دیکھتے رہنے کے بعد وہ پھر اسکرین پر دیکھ کر بولا۔
"یہ اس کے گھر کا نقشہ ہے۔" پھر ایک جگہ نشاندھی کر کے بولا۔ "یہاں سے ہم نے اندر جانا ہے، ہمارے لیے جو سب سے اچھی بات ہے وہ یہ کہ اس عمارت میں کتے نہیں ہیں۔ ہردیپ سنگھ کو کتے پسند نہیں ہیں اس لیے اس نے اپنی سیکورٹی پر بندے زیادہ لگائے ہوئے ہیں۔ یہ عمارت میں داخل ہونے کا بہترین پوائنٹ ہے۔" اس نے ماؤس کے تیر سے ایک جگہ کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا۔ پھر اس کے ساتھ ہی وہ پلان کی تفصیلات بتانے لگا جسے چند منٹ تک سبھی نے خاموشی سے سنا، تبھی جسپال نے سب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تو پھر کب چلنے کا ارادہ ہے؟"
"بس ابھی کچھ دیر بعد......! مجھے ایک فون کال کا انتظار ہے۔" کرن نے کمل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"اوکے......!" وہ گردن ہلاتے ہوئے بولا تو ہرپریت اٹھ کر اندر چلی گئی۔ چند منٹ تک ان میں خاموشی رہی پھر یوریت سے اکتاتے ہوئے جسپال پلان کے مختلف پہلوؤں پر بات کرنے لگا۔ اتنے میں ہرپریت پلٹ آئی۔ اس نے بلیو جین اور سیاہ ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی، اپنی زلفیں کس کر پونی کی صورت میں باندھ لی تھیں۔ ٹی شرٹ کے اوپر اس نے ایک جیکٹ پہنی تھی جو سلیو لیس تھی۔ پاؤں میں گرے جاگرز، وہ پوری طرح تیار دکھائی دے رہی تھی۔ سبھی نے ایک نگاہ اسے دیکھا، ممکن ہے کوئی تبصرہ ہوتا لیکن ایسے میں کرن کا فون بج اٹھا۔ ہیلو کے بعد وہ کچھ دیر سنتی رہی، پھر اوکے کہہ کر فون بند کر دیا۔
"ہردیپ سنگھ، اپنی پتنی اور بیٹے کے ساتھ اس وقت اوپر والے پورشن میں موجود ہے، وہ ان کے ساتھ بیٹھا ایک دلچسپ انڈین فلم دیکھ رہا ہے، جو زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ مزید چلے گی۔"
"سیکیورٹی کی کیا پوزیشن ہے؟" کمل نے سنجیدگی سے پوچھا۔
"وہ تو وہی ہے، رہائش گاہ کے سامنے کی طرف ڈرامہ کرنا ہو گا۔" کرن نے کہا۔
"اوکے......! آؤ چلیں۔" کمل نے کرسی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا تو وہ سبھی اٹھ گئے۔
وہ ایک ہی جیپ میں نکلے تھے۔ لیکن دو تین چوراہوں کے بعد دو کاروں نے ان کا پیچھا کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ انہی کے ساتھ تھے۔ تقریباً آدھے گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد وہ اس پوش علاقے میں پہنچ گئے۔ تبھی کمل نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔
"جسپال۔! یہاں کچھ کرنا اتنا مشکل نہیں ہے لیکن کر کے فرار ہونا بہت مشکل ہے، اس لیے کسی کا انتظار کیے بغیر جسے نکلنے کا چانس ملتا ہے، وہ نکل جائے۔"
سب نے سن لیا، مگر بولا کوئی نہیں، وہ کچھ فاصلے پر کھڑی سیکورٹی گارڈز کی ایک گاڑی کو دیکھ رہے تھے۔ اگلے چند منٹ میں وہ اس رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ کمل نے وہاں گاڑی نہیں روکی بلکہ سڑک کے ساتھ ہی ٹرن لے لیا اور عمارت کی پچھلی طرف جا کر رک گئے۔ اسٹریٹ لائٹ ہر جانب روشن تھی۔ انہوں نے گاڑی رکتے ہی چشم زدن میں ادھر ادھر دیکھا اور باؤنڈری وال کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئے۔ اس طرف جھاڑی نما پودے اور چھوٹے پھول دار درخت تھے۔ چند لمحے دبکے رہنے کے بعد کمل کھڑا ہوا۔ کرن بھی اس کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ کمل نے اپنے ہاتھ جوڑ کر پیٹ کے ساتھ لگائے۔ کرن نے اس پر پاؤں رکھا اور خاردار تاروں کے تلے چار دیواری پر ہاتھ کو مضبوطی سے جمایا۔ دوسرے ہاتھ سے کٹر نکالا، پھر بڑی احتیاط سے لوہے کی تار کاٹ دی۔ ایک لمحے کے لیے وہ ساکت ہو گئی۔ انہیں بتا دیا گیا تھا کہ خاردار تاروں میں بجلی کی رو کو بند کر دیا گیا ہے لیکن پھر بھی احتیاط ضروری تھی۔ تار کٹتے ہی الارم بجتے تو سارا معاملہ ہی ٹھپ ہو جاتا۔ مگر کچھ نہ ہوا، اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ اندر کی معلومات درست ہیں۔ تبھی کرن نے ہولے سے کہا۔
"اوکے...... کٹ گئی۔"
"گارڈ......" کمل نے ہلکے سے پوچھا۔
"سامنے تو نہیں ہیں۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔
"چلو پھر......" اس نے کہا تو کرن اُچک کر اوپر اٹھ گئی۔ اسی لمحے جسپال اور ہرپریت نے بھی ایسا ہی

کیا۔ ہرپریت اوپر پہنچ گئی۔ اس وقت تک دونوں چار دیواری کی دوسری طرف کود گئی تھیں‘ جب کمل نے جسپال کو اوپر چڑھنے میں مدد دی‘ جسپال دیوار پر چپک کر لیٹ گیا اور اس نے ایک بازو سے کمل کو سہارا دیا۔ وہ آناً فاناً پیر جماتا‘ اوپر اٹھ گیا۔ اس سارے عمل میں ایک سے دو منٹ صرف ہوئے اور وہ چار دیواری کی دوسری طرف دبک کر بیٹھے ہوئے تھے۔

اسی اثنا میں دو کاروں کے ٹائروں کے چرچرانے کی تیز آواز گونج اٹھی۔ پلان یہی تھا کہ رہائش گاہ کے سامنے دو کاریں آمنے سامنے یوں رکیں گی جیسے حادثہ ہو جانے والا ہو پھر دونوں طرف سے لوگ اتر کر ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا ہو جائیں گے‘ یہاں تک کہ اسلحہ نکل آئے گا‘ یہی وہ وقت تھا جب ہم نے اپنے طور پر ہردیپ سنگھ تک پہنچنے کی کوشش کرنی تھی۔

وہ رہائشی عمارت کا پچھلا حصہ تھا۔ اس طرف گارڈز ہونے چاہیے تھے لیکن وہ اس وقت موجود نہیں تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ ادھر نہ آئیں گے۔ ایک بڑے سارے برآمدے میں اندر کی طرف ایک دروازہ تھا اس کی حالت سے لگتا تھا کہ وہ بند ہی رہتا ہوگا‘ جس کمرے میں متوقع طور پر ہردیپ موجود تھا‘ اس کے ساتھ ہی ایک لوہے کا پائپ اوپر تک جاتا تھا‘ جسپال تیزی سے اس پائپ پر چڑھنے لگا‘ جبکہ کمل اور کرن اسی دالان میں تاریکی کا حصہ بن گئے‘ نیچے ہرپریت کور کھڑی تھی‘ جسپال کو اوپر پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ ایک منٹ لگا ہوگا‘ وہ کھڑکی تک پہنچ گیا۔ باہر کی طرف سے لوگوں کے ہلکے ہلکے شور کی آوازیں آنے لگی تھیں جو یقیناً وہاں پر بہت اونچی ہوں گی۔ جسپال نے کھڑکی میں سے دیکھا‘ سامنے ٹی وی چل رہا تھا۔ اس کے سامنے پڑے صوفے پر ایک مرد‘ عورت اور بچے کی گردنیں دکھائی دے رہی تھیں۔ بلاشبہ کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنے سے آواز پیدا ہونی تھی۔ مگر یہ رسک اسے لینا تھا۔ اس کے ساتھ اندر کی طرف تو شیشہ تھا‘ لیکن باہر لوہے کی مضبوط جالی تھی‘ جسے وہ فوراً کاٹ نہیں سکتا تھا۔ یہی اس کی راہ میں رکاوٹ تھی‘ ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اندر جا کر خود اپنے ہاتھوں سے ہردیپ سنگھ کا گلا دبا دے‘ پھر اس پر مٹی کا تیل چھڑک کر اپنی آنکھوں سے اس کے جلنے کا تماشہ کرے‘ اس کے پاس اپنی ان خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ اس نے آناً فاناً شیشہ توڑ دیا۔ جس سے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں نے چونک کر کھڑکی کی طرف دیکھا‘ اس کے سامنے ہردیپ سنگھ تھا جو حیرت سے کھڑکی کی جانب دیکھ رہا تھا‘ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا اور کسی پناہ میں چھپ جاتا‘ اس نے ٹریگر پر انگلی رکھ دی‘ کے بعد دیگرے تین فائر ہوئے‘ ایک فائر اس کے چہرے پر لگا تھا جس سے خون کا فوارہ ابل پڑا تھا‘ وہ مزید وہاں رکنا نہیں چاہتا تھا‘ وہ فوراً نیچے کی جانب لپکا‘ کھڑکی میں سے چیخنے چلانے اور کراہوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔

اس وقت تک کمل دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ کرن نے اپنا پاؤں اس کے ہاتھوں پر رکھا اور چار دیواری پر جا پہنچی‘ ایسا ہی ہرپریت نے کیا‘ پھر جسپال اور آخر میں کمل نے اسے اوپر اٹھا لیا‘ چشم زدن میں وہ چاروں دیوار کے پار تھے۔ رہائشی عمارت کے اندر بھگدڑ مچ چکی تھی۔ ایک کہرام تھا جو اٹھ گیا تھا۔ اب ان کے پاس ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ وہ چاروں تقریباً ایک ہی وقت میں بیٹھے تھے۔ چابی اگنیشن میں تھی‘ کمل نے اسٹارٹ کے لیے چابی گھمائی‘ انجن جاگتے ہی اس نے گاڑی بھگا دی۔ وہ اس پوش کالونی کا مین گیٹ بند ہو جانے سے پہلے وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا‘ ورنہ گاڑی چھوڑ کر گلیوں اور دکانوں کے

راستوں میں سے نکلنا تھا اور یہ انتہائی درجے کا رسک تھا۔ وہ کالونی میں کہاں تک بھاگتے‘ کرن‘ ہرپریت اور جسپال ہتھیار لیے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ پکڑے جانے سے زیادہ‘ لڑنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ دو تین موڑ مڑنے کے بعد سامنے مین گیٹ تھا‘ کمل نے رفتار دھیمی کر لی‘ رہائشی کالونی کے اس گیٹ پر سیکورٹی گارڈ بھی زیادہ تھے۔

”جسپال‘ ذرا سا رسک بھی نہ لینا‘ اگر انہوں نے روکنے کی کوشش بھی کی تو اڑا دینا۔“ کمل نے دانت بھینچتے ہوئے کہا۔ اس کی پوری توجہ ڈرائیونگ پر تھی۔ تبھی ان کی نگاہ گیٹ کے باہر والی طرف پڑی‘ جہاں ان کے پیچھے آنے والی کاروں کے لوگ کھڑے تھے۔ وہ کسی بھی ہنگامی صورت حال ہی کے لیے تھے‘ وہ لوگ اپنا ڈرامہ ختم کر کے کالونی سے باہر آ چکے تھے۔ اس وقت کالونی سے نکلنے والے مین گیٹ کا فاصلہ تقریباً دو گز رہا ہوگا‘ جب ایک طرف بنے ہوئے سیکورٹی گارڈز کے کیبن سے ایک شخص تیزی سے نکلا‘ اس کے کان کے ساتھ سیل فون لگا ہوا تھا۔ اس نے چیخ کر کہا۔

”روکو......روکو......اس گاڑی کو روکو......“

کمل نے ایک دم سے اسپیڈ بڑھا دی‘ اگلے ہی لمحے وہ گیٹ سے باہر تھے۔ جس وقت وہاں موجود گارڈز سمجھتے‘ وہ گیٹ پار کر چکے تھے۔ جیپ کو انتہائی خطرناک انداز میں دائیں جانب موڑا تو فائرنگ کی آواز آئی‘ دونوں سیاہ کاریں چل پڑی تھیں۔ بلاشبہ اب نہ صرف ان کا تعاقب کیا جانا تھا‘ بلکہ پورے امرتسر کی پولیس ان کی تلاش میں نکل پڑنے والی تھی۔ تقریباً پندرہ منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ رنجیت ایونیو کے گول چکر کے پاس آ گئے‘ تبھی کمل نے گاڑی کو ٹرن دیا اور ایک بڑی ساری شاپ کے سامنے جیپ روک لی‘ پھر ہنستے ہوئے بولا۔

”شریف لوگوں کی طرح اپنے اپنے ہتھیار چھپا کر باہر نکلو فوراً۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے گاڑی بند کی اور اتر کر یوں دکان کی جانب چل پڑا جیسے اسے کوئی جلدی نہ ہو‘ وہ وقت ضائع کرنے کے لیے آیا ہے‘ اتنے میں وہ بھی اس کے پاس آ گئے تو اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس شاپنگ مال کے اندر ہی اندر سے دوسری جانب نکلنا ہے۔ کرن اور ہرپریت الگ ہو جاؤ‘ کسی ٹیکسی میں بیٹھو......رابطہ ہو جائے گا۔“ وہ شاپنگ سینٹر کے اندر چلے گئے‘ دونوں لڑکیاں یوں دکھائی دے رہی تھیں جیسے ان کے ساتھ کوئی مرد نہیں ہے‘ بظاہر مطمئن دکھائی دینے والے‘ تیزی سے دوسری طرف کے راستے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ جسپال نے یونہی پیچھے مڑ کر دیکھا‘ ایک پولیس گاڑی ان کی جیپ کے پاس آ کر رک گئی تھی۔

”کمل نکلو۔“ اس نے بے ساختہ کہا‘ اور قدم بڑھا دیئے۔ دوسری جانب ٹیکسیاں اور رکشے کھڑے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی ایک رکشے والا ان کے قریب آ گیا۔ وہ لپک کر اس میں بیٹھ گئے۔

”کدھر جانا ہے باؤ جی۔“

”جہاں اچھی سی فلم لگی ہو......“ کمل نے تیزی سے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ یہ سنتے ہی وہ چل پڑا۔ کمل نے تیزی سے ایس ایم ایس کرن کو بھیج دیا۔ مگر ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا‘ وہ دونوں کسی حد تک پریشان ہو گئے۔ تبھی اس نے کرن کو فون کر دیا۔

”کدھر ہو۔“ رابطہ ہوتے ہی اس نے پوچھا۔

”ٹیکسی میں بیٹھ کر نکل پڑے ہیں۔“ کرن نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

رکشا کچھ دیر تک چلتا رہا' تبھی کمل نے اس سے کہا۔

"اوئے یار...... کدھر لے کر جا رہا ہے کچھ بتاؤ تو......"

"باؤ جی' دوسرا شو تو شروع ہوگیا ہوگا' میں اب تک سوچ رہا ہوں کہ آپ کو کدھر لے جاؤں'"

"چل پھر تو ایسا کر ہمیں کسی کھانے پینے والی دکان پر چھوڑ اور تو جا......" اس نے ایک قریب آتی ہوئی مارکیٹ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ رکشے والے نے انہیں وہاں چھوڑ دیا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ مارکیٹ میں چلے گئے' کچھ دیر ٹہلنے کے بعد جسپال نے کہا۔

"اب چلیں' رات گہری ہو رہی ہے' زیادہ رسک نہ لیں۔"

"اب ہم نے ادھر نہیں جانا' بلکہ جب تک کسی نئے ٹھکانے کے بارے میں کرن نہ بتا دے' اب ہم نے ادھر نہیں جانا۔"

"وہ کیوں......؟" اس نے پوچھا۔

"وہ اس لیے کہ ہماری جیپ پکڑی گئی ہے' اگرچہ وہ چوری کی تھی لیکن دو دن سے وہ میرے استعمال میں تھی۔ لوگوں نے دیکھا ہے......" کمل نے ہنستے ہوئے کہا۔

"وہ گھر......" جسپال نے حیرت سے پوچھا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"چوکیدار جانے اور وہ گھر...... ایسے کئی ٹھکانے مل جاتے ہیں' وہاں سے اپنا سامان شفٹ ہو چکا ہوگا۔"

"واہ......! کیا پلاننگ ہے۔"

"پچھلے دو ہفتے سے جسمیندر بائی جی نے میرے ذمے یہ کام لگایا ہوا ہے' میں نے......" لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ اس کا سیل فون بج اٹھا' دوسری جانب کرن تھی' اس نے کالونی اور گھر کا نمبر بتا دیا اور پہنچ جانے کو کہا' تبھی فون بند کر کے بولا۔ "لو بائی جی ٹھکانہ مل گیا' چلیں۔" یہ کہہ کر اس نے ادھر ادھر دیکھا' ایک ٹیکسی پکڑی اور وہ دونوں اس میں بیٹھ گئے۔

وہ ایک اوسط درجے کے سرکاری ملازمین کی کالونی تھی۔ وہاں پہنچ کر لگ رہا تھا کہ جیسے یہ تاحد نگاہ پھیلی ہوئی ہے' جلد ہی وہ اپنے مطلوبہ نمبر والے مکان پر پہنچ گئے' کمل نے ٹیکسی چھوڑ دی' پھر کرن سے کنفرم کیا' وہ بالکونی میں آ گئی' کچھ دیر بعد وہ کمرے کے اندر تھے۔ دوسری منزل پر قدرے سکون تھا اور کافی حد تک خاموشی۔ انہوں نے جوتے اتارے اور پلنگ پر دراز ہوگئے۔

"ہرپریت کدھر ہے؟" جسپال نے پوچھا تو وہ واپس پلٹتے ہوئے بولی۔

"کچن میں ہے' ہم نے راستے میں کچھ کھانے پینے کے لیے لے لیا تھا۔" یہ کہہ کر وہ کمل ویر کی جانب دیکھ کر بولی۔ "ہم نے یہاں نہیں رہنا' اس لیے سونا نہیں' ہم نے صبح ہونے سے پہلے یہاں سے نکلنا ہے۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

"اوکے میم صاحب۔" کمل ویر نے کہا اور سامنے پڑا ٹی وی چلا دیا۔ دو چار چینل بدلتے ہی اس کا مطلوبہ چینل مل گیا۔ نیوز کاسٹر پورے جوش و جذبے کے ساتھ ایک ایم ایل اے کے بیٹے کے قتل کی خبر کے ساتھ اس کی جزئیات بتا رہی تھی۔ پس منظر میں کھڑکی سے دیوار کی کٹی ہوئی تاریں' صوفے پر خون کے دھبے' مین گیٹ والے گارڈ کا بیان' غم زدہ بیوی اور بیہوش بچے دکھایا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد رویندر سنگھ کو دکھایا گیا' وہ کہہ رہا تھا۔

"میں ابھی اس قتل کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا' مجھے اور میرے بیٹے کو کئی دنوں سے دھمکیاں مل

رہی تھیں۔ یہ کسی کھاڑکو (دہشت گرد) گروپ کی کارروائی لگتی ہے' میں انہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ نہ ہم بکنے والے ہیں اور نہ جھکنے والے' اپنے دیش کے لیے ہم قربان ہو جانے کا جذبہ رکھتے ہیں......"

"بند کر اس بہن......" جسپال سنگھ نے غصے میں کہا تو کمل ویر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر ٹی وی بند کرتے ہوئے بولا۔

"یار......! میں یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ملزموں کی تلاش کس سطح پر کی جا رہی ہے اور مزید آگے کس ٹریک پر تلاش ہوگی۔"

"تمہاری سوچ سے بھی زیادہ۔" جسپال نے کہا

"کیوں......؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"میں نے کمیشن کے دو بندے بھی پھڑکائے ہوئے ہیں اور وہ......" جسپال نے کہنا چاہا تو وہ حیرت سے بولا۔

"اوہ...... اس کا مطلب ہے مجھے بھی اسی سطح پر سوچنا ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ چند لمحے سوچتا رہا' پھر ہنستے ہوئے بولا۔ "اوہ واہ یار...... میں بھی پاگل ہوں...... جتنا پروٹوکول نظر آئے گا' اتنا ہی پھنسیں گے۔ تو چل سکون سے دو دن آرام کر...... پھر دیکھی جائے گی۔"

یہ لفظ کرن نے سن لیے تھے' وہ کھانا لے کر آئی تھی' اس لیے بولی۔

"کچھ بھی ہے یہاں سے نکلنا ہے' ادھر کی عورتیں بڑی کن سوئی رکھتی ہیں' فی الحال کھانا کھائیں' آؤ ہرپریت۔"

"لیکن میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔" جسپال نے کہا۔

"کیا......؟" کمل ویر نے پوچھا۔

"یہی کہ ابھی یہاں سے نکل جاؤں' ورنہ اوگی میں وہ انوجیت کو تنگ کریں گے۔ اور یہ امرتسر میرے لیے چوہے دان بن سکتا ہے۔" جسپال نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔

"کہاں جاؤ گے۔"

"نکودر یا پھر دہلی......" جسپال نے حتمی انداز میں کہا تو وہ بولا۔

"چل ٹھیک ہے' پہلے کھانا کھا' پھر سوچتے ہیں۔"

وہ چاروں کھانے کے لیے بیٹھ گئے اور ان کے درمیان خاموشی آن ٹھہری۔

❀ ...... ❀ ...... ❀

دلبر کا خون بہت زیادہ بہہ گیا تھا۔ اس کی حالت بہت نازک ہو رہی تھی' اس کا اسپتال پہنچ جانا بہت ضروری تھا۔ مگر گاؤں میں اطلاع دینا بھی ضروری تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے فیصلہ کیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے اسپتال جانے کو ترجیح دی۔

"اوئے دلبر......! حوصلہ رکھنا' میں تجھے اسپتال لے جا رہا ہوں۔ ذرا سا وقت لگ جائے گا۔"

"اوئے نہیں اوئے...... تو مجھے گاؤں لے چل' سمجھ کہانی مک گئی ہے' اسپتال لے کر میری لاش......"

"اوئے حوصلہ رکھ......"

"نہیں...... جمالیا' نہیں...... تجھے نہیں پتہ......" دلبر نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا اس وقت تک میں گاؤں جانے والی کچی سڑک پر آ گیا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ چند کلومیٹر کے فاصلے پر موجود اسپتال میں دلبر کو لے کر جاؤں گا۔ میں اسے بے رحمی سے بے بسی کی موت نہیں مرنے دینا چاہتا تھا۔ میں نے تڑپ کر کہا۔

"دلبر......! میرے ویر بس' ذرا سا دم لے...... میں تجھے اسپتال ضرور لے جاؤں گا' میرے ویر بس ذرا سا حوصلہ۔"

"چل تو کر لے..... کوشش....." اس نے بے دم ہوتے ہوئے کہا اور میں نے بائیک کی اسپیڈ بڑھا دی۔ میں ابھی کچھ ہی آگے گیا تھا کہ سڑک کے ایک طرف مجھے کچھ موٹر سائیکل کھڑے ہونے کا شک ہوا۔ میں ٹھٹک گیا' اگر دشمن ہوئے تو مجھے بھی یہیں ڈھیر کر دیں گے اور اگر زندگی ہوئی تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ میں نے رفتار کم نہیں کی اور زن سے ان کے پاس سے گزر گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بائیک والے میرے پیچھے لگ چکے ہیں۔ دلبر نے یقیناً پیچھے مڑ کر دیکھا تھا' اس لیے بولا۔ "چند موٹر سائیکل والے ہمارے..... پیچھے..... ہیں....."

"آنے دو..... بس تو قابو ہو کر بیٹھ....." میں نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا لیکن حیرت یہ تھی کہ ابھی تک کسی نے فائر نہیں کیا تھا۔ میں اگر ان کی جگہ ہوتا تو اب تک بائیک گرا لیتا۔ بہر حال میں اپنی پوری توجہ سامنے رکھے ہوئے تھا اور قصبے کے اسپتال پہنچ گیا۔ میں نے بائیک روکی تو دلبر ایک طرف لڑھک گیا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے بائیک کو ایک طرف پھینکا اور دلبر کو قابو میں کر لیا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا' جو میری مدد کرتا' میں نے اسے قابو کیا اور وہیں زمین پر لٹا دیا۔ اتنے میں موٹر سائیکلوں کی روشنی ہم پر پڑی' میں دیکھ ہی نہ سکا کہ دلبر کیسا ہے؟

"اوئے کیا ہو گیا اس کو....." چھاکے نے چیخ کر کہا تو میرے حواس ایک دم سے بحال ہو گئے' دشمنی والی لہر ایک دم سے ختم ہو گئی تھی۔ جس وقت تک وہ اتر کر میرے قریب آتے' میں نے اس کی نبض دیکھی جو بہت آہستہ چل رہی تھی۔

"اوئے دیکھو' یہاں کوئی بندہ ہے؟"

فوراً ہی وہ سب اردگرد پھیل گئے۔ ایک نے میرے ساتھ دلبر کو اٹھایا اور اسے قریب پڑے ایک بینچ پر لٹا دیا' اس کے خون سے میرے بدن پر چپچپاہٹ ہونے لگی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ایک ڈسپنسر آنکھیں ملتا ہوا اندر سے نکلا' پھر یوں ایک بندے کو خون میں لت پت دیکھ کر حواس باختہ سا ہو گیا۔ اس نے جلدی سے چوکیدار کو آواز دی' پتا نہیں کیا نام لیا تھا اس نے' وہ بھاگتا ہوا آیا تو ڈسپنسر نے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب کو بلا کر لاؤ فوراً ایمرجنسی ہے۔"

وہ بھاگتا ہوا رہائشی کوارٹر کی طرف چلا گیا۔ میرے اندر ایک دم سے بے چینی اتر آئی تھی۔ دلبر' موت اور زندگی کی دہلیز پر پڑا تھا۔ اب ڈاکٹر آنے میں پتا نہیں کتنا وقت لگتا ہے' میں نے اس بے چینی میں قریب کھڑے چھاکے سے کہا۔

"تم وہاں کیسے.....؟"

"تمہیں آنے میں بڑی دیر ہو گئی تو میں نے تمہارے پیچھے جانے کے لیے ان کو ساتھ لیا اور گاؤں سے باہر آ گیا۔ ابھی یہاں پہنچے ہی تھے کہ حویلی کے پیچھے فائرنگ کا سن کر یہاں رک گئے' ابھی مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ قصبے کی طرف جاؤں یا پھر حویلی کی طرف..... اتنے میں بائیک دکھائی دی' اندھیرے میں پتا نہیں چلا کہ کون ہے' جب تو بالکل سامنے سے گزرا تو پتا چلا' بس پھر تیرے پیچھے پیچھے یہاں تک آ گئے۔"

"اچھا ہو گیا..... لیکن مجھے لگتا ہے ڈاکٹر پولیس کیس کا بہانہ کر کے اس کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔" میں نے بے چینی اور بے یقینی میں کہا تو وہ بولا۔

"پھر کیا کریں....."

"تو کسی طرح جا اور رندھاوے کو یہاں لے آ..... اسے صورت حال بتا دینا' کوئی اور ہو تو کہنا راستے میں ڈکیت پڑ گئے تھے۔" میں نے سوچ کر سمجھاتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھ گیا۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے اپنے موٹر سائیکل کی جانب بڑھا' تب تک ڈاکٹر تیزی سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے دلبر کو ایک نگاہ سے دیکھا اور کہا۔

"مریض کو آپریشن تھیٹر میں لاؤ فوراً۔"

"تم نے..... جلدی آنا ہے۔" میں نے چھاکے کو ایک دم رکتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ باقی سب نے دلبر کو اٹھایا اور آپریشن تھیٹر میں جا لٹایا۔ ڈسپنسر آکسیجن سلنڈر لے آیا تو ڈاکٹر نے پوچھا۔

"ہوا کیا ہے' اتنا خون....."

"میں اور یہ ادھر سے اپنے گاؤں جا رہے تھے۔ راستے میں ڈکیت پڑ گئے' بس انہوں نے گولیاں ماری ہیں' اب پتا نہیں....." میں نے تیزی سے کہا تو ڈاکٹر نے میری حالت پر ایک نگاہ دوڑائی' وہ تجربہ کار شخص لگتا تھا' ادھیڑ عمر تھا' اب پتا نہیں میری بات کا یقین کیا تھا یا نہیں' تاہم وہ تیزی سے اپنا کام کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد دلبر کی سانسیں بحال ہونے لگی تھیں۔ اس نے تیزی سے ایک کاغذ پر کچھ دوائیں وغیرہ لکھ کر دیں اور کہا۔

"یہ کسی نہ کسی طرح لے آئیں' رات اگرچہ کافی ہو گئی ہے ممکن ہے کوئی ایک دوکان ابھی کھلی ہو۔"

میں نے کاغذ کا پرچہ لیا اور اپنے دو ساتھیوں کو دیتے ہوئے کہا۔

"فوراً لے آؤ۔ دیر نہیں کرنی۔"

انہوں نے کاغذ پکڑا اور آناً فاناً چلے گئے۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد دلبر کی حالت بحال ہو گئی۔ اسے دو گولیاں لگی تھیں۔ تب تک ڈاکٹر اس کے ساتھ مصروف رہا۔ اتنے میں ایک پولیس والا اے ایس آئی' وہاں آ گیا۔ اس کے ساتھ دو سپاہی تھے۔ وہ بھی ڈاکٹر کے انتظار میں تھے۔ کچھ دیر بعد وہ باہر آیا اور مجھے دیکھ کر بولا۔

"بلاشبہ مریض کی یہ اپنی قوت مدافعت تھی کہ وہ اب تک زندہ ہے ورنہ خون بہت بہہ گیا ہے' ایک تو خون کا فوری بندوبست چاہیے..... دوسرا خدشہ ہے کہ اس کے بدن میں زہر کا اثر ہو جائے..... اس لیے جس قدر جلدی ممکن ہو سکے' اسے ضلعی اسپتال میں لے جائیں۔ وہاں سہولتیں ہیں' یہاں نہیں ہیں۔"

"ایمبولینس تو ملنے سے رہی۔" میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا پھر ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر کہا۔ "آپ خون لے لیں' تب تک کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے کہا اور واپس پلٹ گیا۔ چھاکا آ گیا تھا' تبھی مجھے پولیس والوں کا خیال آیا تو میں نے اے ایس آئی سے پوچھا۔

"رندھاوا صاحب' وہ کہاں ہیں؟"

"پتہ نہیں جی' وہ کچھ دیر پہلے آپریشن کے لیے نکلے ہیں۔ آپ رپورٹ وغیرہ لکھوائیں چل کر تھانے میں....."

"مجھے اس وقت گاڑی چاہیے..... جو مریض کو لے کر ضلعی اسپتال جائے' رپورٹ تو رندھاوا صاحب آئیں گے تو لکھواؤں گا۔" میں نے کافی حد تک غصے میں کہا' جس پر پولیس والے نے مجھے گھور کر دیکھا' میں سمجھ رہا تھا کہ اس وقت اس کی کیا حالت ہو گی' میں نے کوئی پروا نہیں کی۔

"ٹھیک ہے وہ آ جائیں تو لکھوا دینا رپورٹ۔" وہ یہ کہتا ہوا واپس مڑ گیا۔ میں نے اس کی پروا نہیں کی۔ تبھی اپنا اپنا خون ٹیسٹ کروانے چل دیئے تھے لیکن ہمارا ایک دوست موٹر سائیکل لے کر اسپتال سے باہر چلا گیا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اچانک کیوں نکلا ہے۔

مشرقی افق پر سرخی نمودار ہونے کو تھی' جب پوری کوشش کے باوجود دلبر کا سانس اکھڑنے لگا۔ میرا وہ

دوست جو اچانک نکلا تھا' وہ ایک کار لے کر آ گیا تھا' اس کا کوئی دوست قصبے میں تھا' ڈاکٹر پوری تندھی کے ساتھ اس کی زندگی بچانے میں مصروف تھا' خون بھی دستیاب ہو گیا تھا' لیکن دلبر کی سانسیں قابو میں نہیں آ رہی تھیں۔ اچانک اس کے جسم کے سارے روم کھل گئے تھے' ایک ایک روم کانٹے کی مانند کھڑا ہو گیا اور پھر اس کی گردن ایک جانب ڈھلک گئی۔ میرے اندر دکھ کی ایک شدید لہر سرایت کر گئی۔ مجھے وہ جیتا جاگتا دلبر یاد آنے لگا جس نے کچھ ہی دیر قبل آگ اور خون کی ہولی کھیلی تھی' میری آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے۔

''سوری یار......!'' ڈاکٹر نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''میں سمجھتا ہوں ڈاکٹر۔ آپ نے بہت کوشش کی' لیکن اس کی زندگی نہیں تھی۔''

میں نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا تو ایک بار پھر سے میرا کاندھا تھپکا کر ڈاکٹر چلا گیا۔ ہم نے انتہائی دکھ سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا' پھر میں چھاکے کو اس کی نعش اٹھانے کا اشارہ کر کے باہر نکلتا چلا گیا۔

اس وقت سورج نکل چکا تھا جب ہم گاؤں نور نگر واپس پہنچے۔ دلبر کے مر جانے کی اطلاع آناً فاناً پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ ہم نے جس وقت میت ان کے گھر جا کر رکھی تو ایک کہرام مچ گیا۔ میرے کپڑوں اور بدن پر خون جم کر رہ گیا تھا' میں نے چھاکے کو اشارہ کیا اور گھر سے باہر نکل آیا۔

''بولو کیا بات ہے۔'' اس نے میرے قریب آ کر پوچھا۔

''اس کی آخری رسومات کا اچھی طرح انتظام کرو' رقم ہے کچھ......''

''ہاں ہے......'' اس نے جواب دیا۔

''میں کپڑے بدل کر آتا ہوں۔ رات کے واقعہ کی سن گن لے' ملک سجاد کو میں نے رات شدید زخمی کر دیا تھا۔ اب معلوم نہیں' وہ کدھر ہے۔'' میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس کا بھی پتا چل جائے گا' تم جاؤ اور جلدی سے واپس آ جاؤ۔'' چھاکے نے کہا تو میں نے اپنی بائیک لی اور گھر کی طرف چل دیا۔

گیٹ کھلا ہوا تھا اور میں بائیک سمیت اندر چلا گیا۔ صحن کے ایک کونے میں بائیک کھڑی کی اور لاشعوری طور پر ماں کو دیکھنے لگا' وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیں۔ میں نے دل ہی دل میں اسے اچھا خیال کیا کہ یوں خون میں لت پت کپڑے دیکھ کر ممکن ہے وہ گھبرا جاتیں' اگرچہ ایسا کبھی ہوا نہیں تھا کہ ماں صبح ہی صبح کسی کے گھر جائے' ممکن ہے دلبر کا سن کر کہیں آس پڑوس میں چلی گئی ہوں۔ میں نے جلدی سے نہانے اور کپڑے بدلنے کی سعی کی' تاکہ جب تک ماں آئے میں ان کپڑوں سے نجات لے لوں' میں نے الماری سے کپڑے نکالے اور باتھ روم میں گھس گیا' کچھ دیر بعد میں نہا دھو کر تازہ دم ہو گیا۔ اس وقت میں آئینے کے سامنے کھڑا کنگھا کر رہا تھا' جب چھاکا گھر میں داخل ہوا۔

''تو کیوں آ گیا ہے۔ میں ابھی آ ہی رہا تھا۔'' میں نے اونچی آواز میں کہا اور کنگھا رکھ دیا۔

''وہ رندھاوا صاحب آئے ہیں۔'' وہ دور ہی سے بولا اور باہر والا کمرے کھولنے چلا گیا۔ میں بھی وہیں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد چھاکا باہر جا چکا تھا اور ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

''یار......! رات کمال کر دیا تو نے۔ اتنی جلدی کر دیا سب کچھ...... میں تو سوچ رہا تھا کہ دو چار دن لگ جائیں گے۔''

''بس دیکھ لیں' قسمت نے یاوری کی ہے...... مجھے دلبر کا بہت افسوس ہے' وہ رات میرے ساتھ تھا۔'' میں نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا۔

''خیر......! یہ تو قسمت کی بات ہے' اب سن' وہ شدید زخمی ہے اور اسے شہر لے گئے ہیں۔ اب پتا نہیں اس کا کیا بنا ہے۔ رات میری شاہ دین سے بات ہو گئی تھی' اس نے سارا وقوعہ ہی الٹ دیا ہے اور نامعلوم ڈکیتوں پر ڈال دیا ہے۔ یہی کچھ تم نے کہا۔''

''تو پھر......!'' میں نے پوچھا۔

''پھر کیا...... وہ سب تو یہاں نہیں ہیں' شاہ دین بھی بہت ڈرا ہوا ہے' ہو سکتا ہے وہ آج دن میں کسی وقت یہاں سے چلا جائے' شاہ زیب کافی نڈر ہے' میں نے اس کی طرف سے شک وشبہ لے لیا ہے۔ پیرزادوں کے خلاف آج ان کی پکڑ دھکڑ کروں گا۔''

''ملک سجاد سے کوئی بات نہیں ہو سکی' مطلب' آپ نے اسے دیکھا بھی نہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''نہیں نا...... خیر......! تم اپنا بیان دے دو...... میں وقوعہ کا وقت اس سے پہلے لکھ دوں گا' جو انہوں نے لکھوایا ہے۔ اب دو چار دن کچھ نہیں کرنا' بس پیرزادوں کی پکڑ دھکڑ ہو گی تو وہ تڑپیں گے' دو دن بعد میں تمہیں بتاؤں گا کہ اب گیم کیا بنی ہے۔''

''لیکن ملک سجاد مرا نہیں ہے نا...... اس کا مجھے افسوس رہے گا۔'' میں نے جان بوجھ کر کہا۔

''اوئے اچھا ہے یہ...... زخم چاٹے گا۔ اور ادھر نور نگر میں دلبر کا قتل بھی پیرزادوں کے کھاتے میں ڈالنے کی افواہ پھیلانی ہے۔ بس...... باقی دو دن بعد......'' رندھاوے نے سمجھاتے ہوئے کہا اور پھر اٹھتے ہوئے بولا۔ ''اب چلتا ہوں...... ادھر آ کر اپنا بیان لکھوا دینا۔''

''کوئی چائے وائے تو......'' میں نے پوچھا۔

''پھر کبھی سہی۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے نکل گیا۔ میں وہیں بیٹھا چند لمحے اس صورت حال پر غور کرتا رہا' پھر اٹھ کر باہر صحن میں آ گیا۔ میرے پیٹ میں بھوک نے ہلچل مچائی ہوئی تھی لیکن اماں ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ بھیدے نے ابھی تک دودھ بھی نہیں پہنچایا تھا۔ میں گرم ہوتے ہوئے دماغ کے ساتھ باہر جانے کے لیے بائیک نکالی' تبھی سامنے گھر والی ماسی مختاراں تیزی سے اندر آئی وہ خاصی گھبرائی ہوئی تھی۔

''او جمالے...... کدھر جا رہا ہے......؟''

''دلبر کے گھر' کیوں خیر تو ہے' اتنی پریشان دکھائی دے رہی ہے۔''

''اب پتا نہیں' اس بات پر پریشان ہونا چاہیے یا نہیں' لیکن رات کے پچھلے پہر' ایک بڑی سیاری جیپ ادھر آ کر رکی تھی' میں اس وقت جاگ رہی تھی۔ تمہاری ماں نے دروازہ کھولا تھا' وہ جیپ باہر ہی کھڑی رہی۔''

''پھر......!'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

''کچھ دیر بعد' جب حویلی کی طرف شدید فائرنگ ہوئی تھی' اس وقت تیری ماں اور وہ لڑکی' جو چند دن پہلے تیرے پاس آئی تھی' وہ جیپ میں بیٹھ کر چلی گئیں۔''

''کیا کہہ رہی ہو ماسی تم......'' میں نے تقریباً چیختے ہوئے کہا تو وہ ایک دم سے گھبرا گئی' پھر تیزی سے بولی۔

''میں نے پوچھا تھا کہ اچانک اس وقت کہاں جا رہی ہو؟''

''پھر کیا کہا......'' میں نے بائیک سے اترتے ہوئے پوچھا تو اس نے ہاتھ میں ایک مڑا تڑا کارڈ میری طرف بڑھایا اور بولی۔

''اس لڑکی نے کہا تھا کہ یہ کارڈ جمال کو دے دینا۔ یہ لو......''

میں نے وہ کارڈ تیزی سے پکڑا اس پر کسی ڈانس پارٹی کا پتہ درج تھا۔ پشت پر ایک سیل فون نیلے رنگ کی بال پن سے گھسیٹا ہوا تھا مجھے ایک دم سے اپنی دنیا اندھیر ہوتی ہوئی معلوم ہوئی' ایک طرف مجھے اپنی ماں پر غصہ آرہا تھا کہ وہ مجھ سے پوچھے بغیر کیوں چلی گئی اور دوسری طرف میں سوہنی کی اس حرکت پر پاگل ہورہا تھا' میں ایک دم سے باہر جانے کے لیے لپکا کہ اچھو کریانے والے کی دکان پر جاکر سوہنی کو فون کروں لیکن پھر ٹھٹک گیا' کیا مجھے ایسا کرنا چاہیے یا نہیں؟ ماسی مختاراں واپس جاچکی تھی۔ میں سمجھ نہیں پارہا تھا کہ سوہنی نے ایسا کیوں کیا؟ میرا دماغ ایک دم سے ماؤف ہوگیا تھا۔

❀ ...... ❀ ...... ❀

یہ خوف بھی عجیب شے ہوتی ہے۔ جس شخص کے اندر وارد ہوجائے' اس کے دشمنوں کو مزید شہہ دینے کا فائدہ دے دیتا ہے۔ کیونکہ خوف کا اظہار چہرے ہی سے نہیں عمل سے بھی ظاہر ہوتا ہے اور دشمن اس کا فائدہ اٹھالیتا ہے' یہی خوف اگر نہ رہے تو دشمن پر فتح کی طرف آخری قدم تک حوصلہ برقرار رہتا ہے اور پھر محض خوف کا تاثر کبھی کبھی منافقت کو بے نقاب کرنے میں انتہائی مدد دیتا ہے۔ منافق فقط اس وقت شہہ پکڑتا ہے جب اسے یقین ہوجائے کہ جس کے بارے میں وہ محض' عناد کے ساتھ سازش تیار کررہا ہے' وہ خوف زدہ ہے' خوف زدہ ہونے کا یقین ہوتے ہی وہ کھل کر اپنی پوری خباثت کے ساتھ سامنے آجاتا ہے' کیونکہ منافق بنیادی طور پر بزدل ہوتا ہے' بزدلی ہی کمینگی کو شہہ دیتی ہے۔

جسپال نے ایک دم سے محسوس کیا کہ کمل ویر انجانے میں اسے خوف زدہ کرتا چلا جارہا ہے۔ وہ پورے خلوص کے ساتھ اسے بچانے کے چکر میں کچھ زیادہ ہی محتاط ہوگیا تھا۔ وہ کھانا کھاچکے تھے' جب رات کا آخری پہر شروع ہوگیا تھا۔ اس وقت تک کمل ویر نے ایک ٹیکسی کا بندوبست کرلیا تھا۔ جس کا ڈرائیور اس کا اپنا خاص آدمی تھا۔

"میں سوچ کر تو یہی آیا تھا کہ کافی دن رہوں گا' لیکن کام جلدی ہوگیا' میں جلدی آؤں گا دوبارہ۔" جسپال نے کمل ویر سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"میں انتظار کروں گا۔" اس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ کو دبایا پھر اس نے کرن سے ہاتھ ملایا اور ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور ادھیڑ عمر اور کافی حد تک سانولے رنگ کا سکھ تھا جس کی داڑھی کھچڑی ہوچکی تھی۔

رات گہری ہوچکی تھی اور چاند مغربی افق کی جانب جھک گیا تھا۔ جب وہ امرتسر سے نکلے' ہرپریت پچھلی نشست پر تھی اور جسپال آگے پسنجر سیٹ پر' اس نے پسٹل پاؤں میں رکھا ہوا تھا۔ ڈرائیور نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس کی شکل ہی سے لگ رہا تھا کہ وہ خاموش طبع بندہ ہے۔ اس کی تمام تر توجہ سڑک پر تھی۔ جسپال کو بھی یہ احساس تھا کہ صرف شہر سے ہی نکلنا مشکل ہوگا' پھر آگے انہیں آسانی ہوگی۔ سڑک پر اتنا رش نہیں تھا' جیسے جیسے وہ شہر سے باہر جارہے تھے' رش کم ہوتا چلا جارہا تھا اور ان کی رفتار تیز ہوتی جارہی تھی۔ اچانک ڈرائیور نے رفتار کم کردی' کچھ ہی فاصلے پر ناکہ لگا ہوا تھا' تبھی ڈرائیور نے کہا تھا۔

"صاحب گھبرانا نہیں' میں سب سنبھال لوں گا۔"

"اوکے......!" جسپال نے اس سے زیادہ بات کرنا پسند نہیں کیا' وہاں پر چند پولیس والے ہی تھے۔ یوں جیسے معمول کے مطابق ہی ناکہ لگا ہو۔ ڈرائیور نے ان کے قریب جاکر گاڑی روک دی۔ تبھی ایک پولیس والا آگے بڑھا اور ٹیکسی کے اندر جھانکتے ہوئے بولا۔

"کدھر سے آرہے ہو اور کدھر جارہے ہو؟"

"ایئرپورٹ سے......ترن تارن جارہے ہیں صاحب جی۔" ڈرائیور نے معمول کے مطابق کہا۔

"مطلب فارن کی سواریاں نا......" اس نے معنی خیز انداز میں کہا تو ڈرائیور جلدی سے باہر نکل گیا۔ وہ سپاہی بھی اس کی جانب چلا گیا۔ ٹیکسی کے پیچھے چند لمحے کھڑے رہنے کے بعد وہ واپس آیا' ٹیکسی ویسے ہی اسٹارٹ تھی' اس نے گیئر لگایا اور چل دیا۔

"یہ ہے جی ہماری پولیس کا حال' چند نوٹ میں چاہے جو مرضی کرلو......ادھر میڈیا پر آگ لگی ہوئی ہے اور ان کا سکون دیکھو۔" ڈرائیور نے اپنے طور پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ پر جسپال نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ پھر وہ بھی خاموش ہوگیا۔

اس وقت سورج نکل رہا تھا' جب وہ نکودر شہر میں داخل ہوگئے۔ جسپال کے ذہن میں تھوڑا بہت ایڈووکیٹ گل کے گھر کا آئیڈیا تھا' لیکن ہرپریت اس بارے میں جانتی تھی۔ پھر ایک جگہ اس نے ڈرائیور سے کہا۔

"ہمیں یہیں اتار دو۔"

ڈرائیور نے اتنا ہی سنا اور سڑک کے کنارے گاڑی لگادی۔ جسپال نے جیب میں ہاتھ ڈال کر چند بڑے نوٹ نکالے اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ لو......اسے کرایہ......"

"نہیں صاحب......! مجھے سب کچھ مل گیا ہے' آپ جائیں۔" اس نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"اوکے......! مل گیا ہوگا' لیکن یہ تمہارا ناشتہ ہے جو ابھی میں نے تمہیں کروانا تھا" جسپال نے نوٹ اس کی جیب میں رکھتے ہوئے کہا اور گاڑی سے اتر گیا' ہرپریت پہلے ہی اتر چکی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور چلا گیا تو ہرپریت نے ایڈووکیٹ گل کا نمبر ملایا۔ کچھ ہی دیر بعد فون ریسیو کرلیا گیا۔

"انکل جی' میں ہرپریت......یہاں نکودر میں......جی آکر بتاتے ہیں نا......ہاں میرے ساتھ جسپال بھی ہے۔ جی......آجائیں۔" یہ کہہ کر وہ وہاں کی لوکیشن بتانے لگی۔ فون بند کرکے اس نے جسپال کو دیکھا جو غیر محسوس انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ایڈووکیٹ گل کی گاڑی ان کے پاس آن ٹھہری' وہ پھر اسی ترتیب سے بیٹھ گئے۔ تبھی گیئر لگاتے ہوئے گل نے پوچھا۔

"اچانک......؟"

"امرتسر سے آرہے ہیں؟" ہرپریت بولی۔

"کیوں......؟" وہ چونکا۔

"رویندر سنگھ کے پتر' ہردیپ کو قتل کرکے......" وہ دھیرے سے بولی۔

"اوہ......! تو وہ تم لوگ تھے......" اس نے حیرت بھرے لہجے میں بات پوری نہ کی۔

"ہاں......! ہم آپ کے پاس آئے ہیں' کل شام کے اپنے قانونی مشوروں کے لیے' وہ آپ ہمیں بتادیں۔" جسپال نے کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے سمجھ گیا۔

"مجھے تم پر قاتلانہ حملے اور پولیس کے رویے کے بارے میں پتا چل گیا تھا' میں نے اپنے طور پر تیاری کرلی تھی اور کچھ معلومات بھی آپ لوگوں کے ساتھ شیئر کرنا چاہ رہا تھا' اچھا ہوا آپ لوگ آگئے۔" گل نے سوچتے ہوئے بتایا۔ "یہ جو نیا پولیس آفیسر ہے نا' یہ اے سی پی رن ویر سنگھ' یہ پولیس کی اسپیشل برانچ سے یہاں تعینات ہوا ہے' ابھی سروس کو دو یا تین سال ہوئے ہیں' مگر ڈیپارٹمنٹ میں "معصوم سانپ" کے نام سے مشہور ہوچکا ہے۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ وہ اندر سے کتنا ظالم ہے' خیر......! اسے یہاں اس لیے لگایا

گیا ہے کہ کمیشن کے دو بندے غائب ہوگئے ان کے قاتلوں کا کوئی سراغ نہیں مل رہا ہے یہاں تک کہ جس کے لیے کمیشن بنا تھا ان بندوں تک کا پتہ نہیں چلا۔"

"پھر تو اب تک وہ ہمارے گھر پہنچ چکا ہوگا۔" ہرپریت نے تشویش سے کہا اور انوجیت کے نمبر ملانے لگی۔

"نہیں ابھی وہاں نہیں پہنچا میری انوجیت سے بات ہوگئی ہے جب تمہارا فون آیا تھا۔" گل نے تیزی سے کہا۔ تب تک ہرپریت کا رابطہ ہوگیا اس نے اسپیکر آن کردیا۔

"ہاں بول ہرپریت......"

"ہم انکل گل کے ساتھ ہیں کوئی پرابلم تو نہیں وہاں۔"

"کوئی نہیں بہرحال تم لوگ میرے آنے تک ادھر ہی رہنا۔ اکٹھے ہی تحصیل چلیں گے۔" انوجیت نے کہا اور فون بند کردیا۔ اس پر ہرپریت قدرے پریشان ہوگئی۔ اس نے اچانک فون بند کردیا تھا جس کا اظہار اس نے کیا تو گل بولا۔

"اوئے پتر......! واہ گورو خیر کرے گا تم دل چھوٹا مت کرو۔"

"اس کا لہجہ......" وہ بولی۔

"او میں پتہ کرلیتا ہوں بس گھر جانے کی دیر ہے سکون سے پوچھتا ہوں۔" گل نے کہا اور گلی میں گاڑی موڑ دی۔ اس کا گھر اسی گلی میں تھا۔

گھر پہنچے تو ناشتہ تیار تھا۔ مسز گل نے میز سجایا ہوا تھا۔ وہ فریش ہو کر آئے تو ناشتے کی میز پر وہ تینوں تھے۔ گل نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا اور بڑے نرم لہجے میں بولا۔

"سب سکون سکھ اور شانتی ہے فکر کی ضرورت نہیں میں نے پتا کرلیا ہے۔"

"ٹھیک ہے انکل ہمیں آج تحصیل آفس میں کیا کرنا ہوگا۔" ہرپریت نے پوچھا۔

"کچھ نہیں بس وہاں حاضری ڈالنی ہے ادھر ادھر پھرنا ہے ایک دو آفیسرز سے مل لیں گے اور بس۔" گل نے پرسکون لہجے میں کہا اور ناشتے کی طرف اشارہ کیا۔ ناشتے کے دوران وہ باتیں کرتے رہے گل نے انہیں وہ سب سمجھا دیا جو وہ انوجیت سے طے کرچکا تھا۔ تاکہ کبھی کا بیان ایک جیسا رہے وہ ناشتہ کرچکے تو گل نے کہا۔ "اب دو ڈھائی گھنٹے آرام کرلو تب تک انوجیت بھی آجائے گا۔"

"اوکے انکل۔" ہرپریت نے کہا تو جسپال بھی اٹھ گیا۔

ان دونوں کے لیے ایک ہی کمرہ تھا جو گیسٹ ہاؤس قسم کا تھا۔ الگ تھلگ اور پرسکون۔ ہرپریت نے انوجیت کو ایس ایم ایس کردیا تھا کہ آتے ہوئے ان کے کپڑے لے آئے۔ اتنی دیر میں جسپال نے جاگر اتار کر پھینکے اور بیڈ پر لیٹ گیا۔ ہرپریت اس کے ساتھ دوسری جانب لیٹ گئی۔ تب جسپال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یار ہرپریت......! کہیں تم میرے ساتھ آکر پچھتا تو نہیں رہی ہو؟"

"یہ خیال تمہیں کیسے آیا۔" وہ کافی حد تک غصے میں بولی۔

"یہی اتنی بھاگ دوڑ...... یہ خون قتل وغارت......" اس نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ابھی تو یہ کچھ بھی نہیں ہے جسی جی ابھی تو شروعات ہیں......" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو جسپال نے ایک دم موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"یہ تمہارا مجھے جسی کہنا بہت اچھا لگتا ہے کیا میں بھی تمہیں پریتو پریتی یا......"

"پریتے......" اس نے بات کاٹتے ہوئے ایک دم سے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تو وہ سنجیدگی سے بولا۔

"برا مان گئی ہو......؟"

"نہیں...... نہیں...... جسی جی نہیں تم جو کہو......" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"تو پھر ٹھیک ہے پریتی......" یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں پیار بھرا خلوص مہک اٹھا تھا۔ جس سے ہرپریت اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ وہ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر جسپال نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "سو جاؤ......! تم کافی تھک چکی ہوگی۔"

"تمہیں نیند آجائے گی کیا؟" ہرپریت نے دھیرے سے پوچھا۔

"کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے اور تم تو پھولوں جیسی ہو۔" جسپال نے خمار آلود لہجے میں کہا تو وہ کروٹ لے کر دوسری جانب دیکھنے لگی جسپال نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور پھر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا...... نجانے کتنا وقت گزر گیا تھا۔ وہ نیند میں ڈوب گیا۔

ان کی آنکھ فون کی آواز پر کھلی۔ وہ انوجیت کا فون تھا وہ آچکا تھا اور گل ایڈووکیٹ کے پاس ڈرائنگ روم میں تھا۔ ہرپریت اس کے پاس جا کر کپڑے لے آئی اور پھر تیار ہو کر ان کے پاس ڈرائنگ روم میں آگئی۔ جسپال اس سے پہلے ان کے پاس تھا۔ کچھ دیر تفصیلی باتوں کے بعد وہ تحصیل چل پڑے۔ جہاں وہ دوپہر تک رہے پھر وہیں سے وہ اوگی پنڈ کی طرف چل پڑے۔ سہ پہر ہوچکی تھی جب وہ اپنے گھر پہنچے وہاں اچھی خاصی سیکورٹی تھی۔ اعلان ہو رہا تھا کہ اسی گاؤں میں آکر رویندر سنگھ کے بیٹے ہردیپ سنگھ کی آخری رسومات ادا کی جائیں گی۔ ظاہر ہے اس پر بہت وی آئی پی لوگ آنے والے تھے۔ پولیس کی بھاری نفری ادھر ادھر پھر رہی تھی۔ تاہم کسی نے انہیں نہیں روکا تھا اور وہ سکون سے گھر پہنچ گئے۔ ان کے آنے کے بارے میں کلجیت کور کو پہلے ہی سے خبر تھی۔ اس لیے ان کے آتے ہی کھانے کی میز سج گئی۔ پھر کھا پی کر جب وہ سکون سے بیٹھے تو کلجیت کور کو انہوں نے پوری روداد سنائی۔ انوجیت اور وہ چپ چاپ سنتے رہے جب وہ ساری بات سن چکی تو بولی۔

"تھانے سے ایک بندہ دوبار جسپال کے بارے میں پوچھنے آیا تھا اور میں نے دونوں بار نکودر کے بارے میں بتایا ہے۔"

"اس نے بتایا نہیں کہ وہ کس مقصد کے لیے پوچھ رہا ہے؟" انوجیت نے تیزی سے پوچھا۔

"میں نے خود نہیں پوچھا اس نے یہیں سے کہلوادیا میں سامنے ہی نہیں گئی انہیں شک ہے تو وہ جسپال کا پوچھ رہے ہیں۔" کلجیت کور نے کہا تو جسپال نے انوجیت سے پوچھا۔

"ہوتا رہے یار۔ انوجیت یار وہ رویندر سنگھ ادھر گاؤں میں آتو رہا ہے اور کسی ہنگامے کے بغیر چلا جائے یہ کیسے ممکن ہے اسے کچھ نہ کچھ تو احساس ہونا چاہیے۔"

"وہ ہوجائے گا تم بس آرام کرو میں نہیں چاہتا کہ سیکورٹی کے نام پر تجھے پکڑ لیں۔ ان کا کوئی پتا نہیں ہے ابھی دو دن پہلے ان سے تو تو...... میں میں ہوئی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے کلجیت کور کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بے بے......! یہ اس گھر کی چار دیواری کے باہر نہ جائے۔ اس وقت دس دس کلومیٹر تک سیکورٹی پھیلی ہوئی ہے یہ وقت کسی بھی قسم کے رسک لینے کا نہیں ہے سمجھا دو اسے......"

"او بائی جی سمجھ گیا میں اب تقریر نہ کرو میں نیند

پوری کروں گا۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا اور اٹھ گیا۔
"ٹھیک ہے جاؤ۔" اس نے کہا تو ہرپریت اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

جسپال نے اپنے کمرے میں جا کر سائیڈ ٹیبل سے لیپ ٹاپ اٹھایا اور بیڈ پر دراز ہو کر اسے کھول لیا۔ جسمیندر سنگھ کی کئی ای میل آئی ہوئی تھیں۔ اس نے بھی دیکھ لیں، سب میں معلومات تھیں، اسے گاؤں میں بیٹھے معلوم نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے، لیکن وہ اسے یہاں کی خبریں بھیج رہا تھا، اس نے میل کا جواب دیا اور جسمیندر سنگھ کے آن لائن ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ کافی دیر گزر جانے کے باوجود آن لائن نہیں ہوا تو اسے اکتاہٹ ہونے لگی، اس نے لیپ ٹاپ بند کیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر اسے نیند نہیں آئی، یونہی ادھر ادھر کی سوچیں لے کر سوچتا رہا، تقریباً دو گھنٹے یونہی لیٹے رہنے سے بھی تنگ آ گیا۔ وہ لاشعوری طور پر الجھن کا شکار تھا، اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اتنی بڑی سیکورٹی کے باوجود وہ رویندر سنگھ کو بتانا چاہتا تھا کہ موت اس کے سر پر منڈلا رہی ہے۔ وہ ہنگامہ کرنا چاہ رہا تھا، وہ کھڑکی میں کھڑا تھا اور باہر کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس کی پشت پر نرم نرم ہاتھوں نے چھوا۔ وہ دھیرے سے پلٹا تو ہرپریت کھڑی تھی، اس کی آنکھوں میں نرماہٹ، پیار اور چمک تھی۔ وہ چند لمحے اس کے چہرے پر دیکھتی رہی پھر نرم سے لہجے میں بولی۔
"کیا سوچ رہے ہو؟"
"سچی بات تو یہی ہے کہ رویندر سنگھ کو......" اس نے کہنا چاہا تو وہ ٹوکتے ہوئے بولی۔
"میرا بھی یہی خیال تھا، تم یہی سوچ رہے ہو گے لیکن جسی، ہم بھی ہیں، وہ بھی یہیں، بلاشبہ وہ بھی کچھ ایسا ہی سوچ رہے ہوں گے، کیا ہم ان کے جال میں پھنس جائیں...... نہیں جسی نہیں...... میرے انسٹرکٹر کہا کرتے تھے، انتظار کرو، جب تک کر سکتے ہو، لیکن جب وار کرو تو پھر اتنا بھرپور ہو کہ دوسرا بچ نہ سکے۔"
"تمہارا انسٹرکٹر ٹھیک کہتا ہے پریتی......" اس نے ایک انگلی سے ہرپریت کے لبوں کو چھوتے ہوئے کہا۔ جس کی نرماہٹ نے اس کے جسم میں گدگداہٹ پھیلا دی تھی۔ تبھی ہرپریت کی آنکھیں نیم وا ہو گئیں۔ اس نے پیار سے اپنا سر جسپال کے کاندھے سے لگا دیا تو وہ اس کے کاندھوں کو پکڑ کر سہلانے لگا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنے اندر کی بے چینی کو دبانے کی کوشش کر رہا ہے۔ جب کافی وقت ایسے بیت گیا تو ہرپریت اس سے الگ ہوتے ہوئے بولی۔
"چل آ، نیچے لان میں بیٹھتے ہیں۔ چائے پیتے ہیں اور بڑی پیاری باتیں کریں گے۔"
"چل......" اس نے ایک دم سے کہا اور پھر دونوں کمرے سے نکلتے چلے گئے۔

اس وقت وہ دونوں لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے، کمرے سے آ کر یہاں آنے تک اور پھر چائے پینے تک میں کچھ وقت لگ گیا تھا، اس دوران ہرپریت نے اپنے کالج کے قصے سنا کر اس کے ذہن سے کافی حد تک رویندر کے خیال کو نکال دیا تھا۔ وہ دونوں قہقہے لگا رہے تھے کہ ان کے چوکیدار بنتا سنگھ نے آ کر ایک پولیس مین کے آنے کی اطلاع دی۔
"کیا یہ وہی ہے جو صبح سے دو بار آ چکا ہے؟" ہرپریت نے پوچھا۔
"جی، وہی ہے۔" اس نے جواب دیا۔
"بلاؤ اسے......" جسپال نے کہا تو بنتا سنگھ واپس پلٹ گیا۔ تبھی اس نے ہرپریت کی طرف دیکھ کر کہا۔
"لگتا ہے، اس گھر کی نگرانی ہو رہی ہے؟"
"یہ کوئی نئی بات نہیں، اکثر ہوتا رہتا ہے۔" ہرپریت نے کہا تو وہ کاندھے اچکا کر بولا۔
"چلیں، دیکھتے ہیں۔"
کچھ دیر بعد ایک نوجوان سکھ پولیس مین ان کے سامنے تھا، جسپال نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ بیٹھ گیا۔ تو اس نے پوچھا۔
"چائے پیو گے؟"
"نہیں، بس میں صاحب کا پیغام لے کر آیا تھا کہ آپ ان سے ایک دفعہ مل لیں۔" وہ بولا۔
"خیریت۔" جسپال نے پوچھا۔
"پتہ نہیں، میں صبح سے دو بار آپ کا پوچھنے آ چکا ہوں۔" اس نے احسان جتا دینے والے انداز میں کہا۔
"یار بات سن، تیرے صاحب کے پاس میرا فون نمبر ہے۔ اگر ایسی ہی کوئی بات تھی تو وہ مجھے فون کر لیتا، خیر، میں اسے فون کر لیتا ہوں، نمبر بتا اس کا......" جسپال نے اپنا فون نکالتے ہوئے کہا۔
"اس وقت تو صاحب مصروف ہوں گے، بڑی وی آئی پی سیکورٹی ہے۔ جی، اس وقت......" اس نے یوں کہا جیسے کہہ رہا ہو کہ اس سیکورٹی میں کوئی بندہ نہیں پھڑک سکتا۔
"تو نمبر بتا، میں کوشش کرتا ہوں۔ ورنہ پھر بعد میں کر لوں گا۔" جسپال نے اصرار کرتے ہوئے کہا تو اس نے نمبر بتا دیا۔ اس نے پش کیا، چند بیل جانے کے بعد اس نے فون ریسیو کر لیا۔
"اے سی پی رن ویر سنگھ چٹھہ بات کر رہے ہو؟"
"ہاں...... آپ کون......؟"
"میں جسپال سنگھ، ابھی آپ کا بندہ میرے پاس آیا ہے، کہہ رہا ہے صبح بھی دو بار آیا تھا، آپ مجھے فون کر لیتے۔" اس نے کافی حد تک طنزیہ انداز میں کہا۔

"اور آپ کہاں تھے؟" اس نے پوچھا' لہجے میں ہتک آمیز غصہ تھا۔

"نکودر تھا کل سے' ابھی دوپہر کے بعد آیا ہوں' کیا کوئی کام تھا' بندے تلاش کر لیے آپ نے کیا؟ پنجاب پولیس اتنی شاندار کارکردگی دکھانے لگی ہے؟"

"ابھی میں مصروف ہوں' کل ملنا اور ممکن ہوا تو آج ہی بات کروں گا۔ آپ کو تھانے آنا پڑے گا۔" اس نے غصے میں کہا۔

"میں آپ کی فون کال کا انتظار ابھی سے کرنے لگا ہوں۔" اس نے پھر طنزیہ انداز میں کہا۔ تو رن ویر بولا۔

"اوکے......ہوتی ہے ملاقات......" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ جسپال نے فون جیب میں واپس رکھتے ہوئے سامنے بیٹھے پولیس مین سے کہا۔

"تمہارے صاحب سے ہو گئی ہے بات......اب تم جاؤ۔"

"صاحب! آپ اگر ہمارا خیال رکھو گے نا' تو ہم بھی یاروں کے یار ہیں' کبھی آزما کر دیکھ لینا۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"بس جلدی سے ہماری جیپ پر حملہ کرنے والوں کے بارے میں بتا دو......خوش کر دوں گا۔" جسپال نے ہنستے ہوئے کہا۔

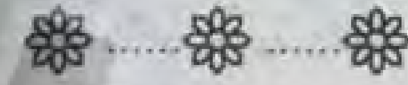
"وہ بھی مل ہی جائیں گے۔" یہ کہہ کر وہ چل پڑا۔ وہ سمجھ گیا کہ جو پتا اس نے پھینکا ہے' وہ ضائع چلا گیا ہے۔ شاید اس نے یہ گمان کیا تھا کہ وہ کوئی بات کرے گا' مگر جیسی ایسا سب کچھ سمجھتا تھا وہ چلا گیا تو ہرپریت نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"تو وہ ملنا چاہتا ہے......؟"

"ہاں......! اور میرے اس گھر تک محدود رہنے کے بارے میں جاننا بھی چاہتا ہے۔" جسپال نے سوچتے ہوئے کہا۔

"مطلب' اسے ہم پر شک ہو گیا ہے......" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"تو ہم اس کا شک رفع کر دیں گے' جیسے بھی ہوا۔" یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگایا' پھر ایک ہی سانس میں سامنے دھرا کپ خالی کر دیا۔ وہ کچھ دیر اپنی اپنی سوچوں میں گم رہے پھر یونہی باتوں میں مصروف ہو گئے جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔



ایک طرف جہاں میں حیران تھا کہ سوہنی یہاں آ کر اماں کو لے گئی ہے' وہاں میں حد درجہ پریشان بھی تھا کہ اماں اس کے ساتھ کیوں چلی گئی' مجھ سے پوچھے بغیر' کوئی بات کیے بغیر وہ یوں کیسے اس کے ساتھ چلی گئی' کئی خیال میرے ذہن میں آ رہے تھے' کیا سوہنی نے اماں سے جھوٹ بولا' اسے کوئی دھمکی دی' یا پھر ڈرا دھمکا کر لے گئی' سوہنی نے ایسا کیوں کیا؟ یہی بات میرے دماغ میں تیر کی طرح کھب گئی تھی' کیونکہ یہ سب ایسے موقع پر ہوا تھا جب ملک سجاد موت وحیات کی کشمکش میں تھا۔ جب سے سوہنی اتفاقیہ طور پر میری زندگی میں آئی تھی' تب سے انجانے میں ملک سجاد کے ساتھ دشمنی شروع ہو گئی تھی۔ عورت اور وہ بھی طوائف' اس کا کیا بھروسہ' وہ ایک طرف خود کو مظلوم ثابت کر رہی تھی تو دوسری جانب ممکن ہے پیسے اور لالچ کے باعث ملک سجاد سے مل گئی ہو۔ یا پھر دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے راتب بن گئے ہوں' میں سمجھتا ہوں کہ کتے کا پھر بھی بھروسہ کیا جا سکتا ہے' مگر سانپ کا نہیں' میرے دماغ میں سے سب شبہیں نکل گئی تھیں اور صرف میری ماں کا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے ٹک گیا تھا۔ میں نے گھر ویسے ہی کھلا رہنے دیا اور بائیک پر سیدھا چوک میں اچھو کریانے والے کی دکان پر پہنچا' اگرچہ میرے ذہن میں یہی تھا کہ یہاں سے فون نہیں کرنا چاہیے' کیونکہ اس سے میری بہت بڑی کمزوری دشمنوں کے ہاتھ میں آ سکتی تھی' لیکن پتا تو پھر بھی لگ جاتا تھا' ماسی مختاراں سے کہاں یہ بات چھپائی جا سکتی تھی۔ آج نہیں تو کل پورے گاؤں کو پتہ چل جاتا تھا' میں نے جاتے ہی ریسیور اٹھایا تو اچھو فوراً بولا۔

"جمال بھائی' فون کل سے خراب ہے' کوئی کال نہیں ہو گی' ٹھیک کر رہے ہیں' ممکن ہے ابھی ٹھیک ہو جائے۔" اس کے یوں کہنے پر مجھے یوں لگا جیسے میری ماں' میری دسترس سے دور ہوتی چلی جا رہی ہے۔ میں کافی دیر تک وہاں کھڑا رہا' ممکن ہے فون جلدی ٹھیک ہو جائے اور میں کال کر لوں' یہاں تک کہ ظہر کا وقت ہو گیا پھر میں نے وہاں مزید ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا اور سیدھا دلبر کے گھر کی طرف بڑھا۔ جہاں اب تک لوگوں کا رش لگ چکا تھا۔ میری نگاہیں چھاکے کو تلاش کر رہی تھیں۔ جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ ساتھ والی بیٹھک میں پولیس والوں کے پاس بیٹھا ہے۔ میں اس جانب بڑھ گیا۔ دروازہ ویسے ہی بند تھا' میں نے کھولا اور اندر دیکھا' رندھاوے کے ساتھ دو پولیس والے' گاؤں کے بزرگ اور چھاکا بیٹھے ہوئے تھے۔

"لو جی' جمال بھی آ گیا ہے۔" ایک بزرگ نے کہا تو میں بولا۔

"میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔ دو منٹ چھاکے سے بات کرنی ہے' میں نے......"

"خیریت تو ہے نا جمال......" رندھاوے نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔ شاید میرا چہرہ پڑھ لیا تھا۔

"بتاتا ہوں' ذرا چھاکے سے بات کر لوں۔" میں نے کہا' تب تک وہ اٹھ کر میرے پاس آ گیا۔ میں اسے لے کر بیٹھک سے باہر آ گیا۔

"اوئے جمالے بتا خیر تو ہے۔" اس نے گلی میں آ کر پوچھا۔ تو میں نے ساری روداد اسے سنا دی۔ پھر کہا۔

"ممکن ہے' وہ ہمیں بلیک میل کریں۔"

"دیکھ جمالے......تو اپنے آپ پر قابو رکھ' دلبر کی تدفین ہو جانے دے' تب تک جو بھی ہو گا' وہ سامنے آ جائے گا' ورنہ پھر سوہنی کو تلاش کرنا کون سا اتنا مشکل ہو گا۔"

"اگر......اگر اس کی نیت ٹھیک نہ ہوئی تو سوہنی کو تلاش کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔" میں نے کہا تو اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

"نیت کا پتہ کیسے چلے گا......؟ اس سے رابطہ ہو گا' یا پھر اس سلسلے میں ہم سے کوئی رابطہ کرے گا۔"

"تو پھر کیا کرنا چاہیے؟" میں نے زچ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ دیر تک خاموش رہ......دلبر کو دفناتے ہی کچھ کرتے ہیں۔" لفظ ابھی اس کے منہ ہی میں تھے کہ گلی میں پانچ چھ کاریں آ گئیں۔ ان کے درمیان ایک ہیوی فور وہیل جیپ بھی تھی۔ وہ دلبر کے گھر سے ذرا فاصلے پر رک گئیں۔ میں ٹھٹک گیا۔ آنے والے پتا نہیں کون تھے۔ دوست تھے یا دشمن۔ میں انہیں غور سے دیکھ رہا تھا۔ تبھی فور وہیل جیپ سے پیرزادہ وقاص باہر نکلا' اس سے پہلے کئی لوگ کاروں سے نکل آئے تھے۔ یہ سب علاقے کے مختلف لوگ تھے۔ اس نے ماحول پر طائرانہ نگاہ ڈالی اور مجھ پر رک گئی۔ ہم دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں تو وہ سیدھا میری طرف بڑھا' میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان لمحات میں مجھے کس طرح کے ردعمل کا اظہار کرنا چاہیے' وہ بڑھتا ہی چلا آ رہا تھا اور

لازمی طور پر اس کے ساتھ آئے ہوئے لوگ بھی اس کے ہمراہ تھے۔ میں کھڑا رہا‘ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا‘ میں نے بڑھ کر اس سے مصافحہ کیا تو اس نے مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

”مجھ سے ملو جمال‘ تجھ سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔“

”ابھی یا......“ میں نے سرگوشی میں کہا۔

”آج شام تک کسی بھی وقت......“ اس نے بھی دھیرے سے کہا۔

”چلیں‘ ملتے ہیں کہیں......“ یہ کہہ کر میں اس سے الگ ہوا‘ پھر دوسرے لوگوں سے ملنے لگا۔ اتنے میں رندھاوے کو اطلاع مل گئی‘ وہ بھی آ گیا۔ یوں گلی میں ایک ہجوم سا اکٹھا ہو گیا‘ دریاں بچھادی گئیں تو سارے لوگ وہیں جمع ہو کر بیٹھ گئے۔ میرے دماغ میں پیرزادے کی بات سن کر یونہی ہلچل مچ گئی تھی۔ ”کیا سوہنی کا رابطہ پیرزادے سے ہے‘ اگر ہے تو......“ میں مزید اس سے آگے کچھ نہ سوچ پا رہا تھا‘ میرے اندر سنسنی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ جنازہ تیار ہونے میں تھوڑا سا وقت تھا۔ لاشعوری طور پر لوگوں کے ذہن میں تھا کہ گاؤں میں ہونے والی اس فوت تگی پر شاہ زیب ضرور آئے گا‘ مگر حویلی والوں کی طرف سے دور دور تک کسی کی آمد نہیں ہوئی تھی۔ لوگوں کی باتوں کی ہلکی ہلکی بھنبھناہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ وقت گزر گیا‘ جنازہ تیار ہو گیا اور پھر لوگ قبرستان کی طرف چل دیئے۔

نورنگر کے لوگوں کے لیے پہلی مرتبہ یہ دیکھنے میں آیا تھا کہ کوئی بڑا زمیندار یوں جنازے کے ساتھ پیدل چلتا چلا جا رہا ہے۔ ورنہ پہلے تو یہی ہوتا تھا کہ وہ عین جنازہ پڑھنے کے وقت پہنچتے‘ یا ان کا انتظار کیا جاتا‘ یا پھر دوسرے تیسرے دن دعا کے وقت وہ لوگ اظہار ہمدردی کے لیے آ موجود ہوتے۔ میں خود پر جبر کرتے ہوئے چلتا چلا جا رہا تھا۔ میری تمام تر سوچیں سوہنی اور اپنی ماں کی طرف تھیں۔ یہاں تک کہ قبرستان آ گیا۔ نماز جنازہ کے بعد لوگ دلبر کو دفنانے لگ گئے جبکہ پیرزادے نے دھیرے سے میرا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف کو چل دیا۔ مجھے بھی تجسس تھا‘ لہٰذا اس کے ساتھ چلتا ہوا لوگوں سے کافی دور آ گیا۔

”جمال......! کیا تیری میری کوئی دشمنی ہے؟“ پیرزادے نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”بالکل نہیں۔“ میں نے فوراً جواب دیا۔

”اگر میری اور سرداروں کی لڑائی ہو جائے‘ تو تم کس کا ساتھ دو گے؟“ اس نے پوچھا۔

”کسی کا بھی نہیں۔“ میں نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

”کیوں......؟“ اس نے براہ راست میری آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

”مجھے کسی کی لڑائی لڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور پھر مجھے یقین ہے کہ تم دونوں کبھی آپس میں نہیں لڑو گے۔“ میں نے بیزاری سے کہا۔

”نہیں‘ میں فیصلہ کر چکا ہوں جمال‘ آج تک بابا سائیں مجھے روکتے آئے ہیں کہ میں سردار شاہ دین کے خلاف نہ جاؤں‘ مگر میری اس خاموشی نے انہیں شہ دی ہے‘ اگرچہ یہ تیرا اچھا فیصلہ ہے کہ تم اس لڑائی میں نہیں آؤ گے‘ مگر......وہ لوگ تجھے اس طرح استعمال کر چکے ہیں کہ تجھے پتا تک نہیں چلا۔“ اس نے کسی حد تک طنزیہ لہجے میں کہا۔

”ممکن ہے انہوں نے ایسا کر لیا ہو‘ لیکن......“

”لیکن......شک نہیں‘ حقیقت ہے یہ...... غور کرو‘ میلے سے لے کر اب تک کے واقعات پر......وہ سیاسی طور پر اس علاقے سے اب پنجاب کی سطح پر حکمرانی کرنا

چاہتا ہے‘ ملک سجاد جیسے کئی دوست بنائے ہیں اس نے...... بڑی مچھلی بن کر چھوٹی مچھلیوں کو نگل جانا چاہتا ہے۔ اب یہ ہماری بقا کی جنگ ہے......ورنہ وہ ہمیں اپنا مطیع بنا کر رکھے گا‘ یا ختم کر دے گا...... یہ ہے تمہاری اس بات کا جواب کہ میں اس سے کیوں لڑنا چاہتا ہوں......“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”لڑو...... لیکن ہم پر تو عرصہ تنگ ہو گیا نا...... بقول آپ کے ہم استعمال ہو گئے‘ وہ غریبوں کو اور آپ بھی غریبوں ہی کو اس جنگ میں جھونک دو گے......“ میں نے غصے میں کہا۔

”یہ تو ہو گا...... جنگ میں پیادے زیادہ مارے جاتے ہیں۔ اور تم کیا سمجھتے ہو‘ سردار نے اپنی قوت نہیں بڑھائی‘ کیا ملک سجاد اگر موت وحیات کی کشمکش سے نکل آیا تو وہ ان لوگوں سے بدلہ لینے کی کوشش نہیں کرے گا‘ جنہوں نے اسے اس حال تک پہنچایا۔“

”تو کیا اسے آپ لوگوں نے مارا ہے؟“ میں نے مصنوعی حیرت سے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

”نہیں‘ ہم نے نہیں مارا‘ ممکن ہے تم نے مارا ہو؟ مگر......وہ کھاتے میں تو ہمارے پڑ گیا نا‘ بات اب اس علاقے تک محدود نہیں رہی‘ بہت بڑھ گئی ہے۔“

”ابھی آپ اپنی بقا کی جنگ لڑیں‘ سیاسی طور پر‘ لوگوں کو بتائیں کہ انہوں نے علاقے کے عوام پر کیا ظلم کیا ہے‘ بات تو یہیں سے بڑھے گی نا......“ میں نے اپنا نکتہ نظر بیان کیا۔

”تم نے اچھا کیا جو گاؤں کے لوگوں کو اکٹھا کر کے یہ بات ان کے سامنے رکھ دی تھی۔ مجھ تک پہنچی ہے بات‘ میں نے بھی پورے علاقے کے لوگوں کو اکٹھا کرنا ہے ایک دو دنوں میں اور سردار شاہ دین سے سوال کرنا ہے‘ کہ اس نے ملک سجاد کو یہاں غنڈہ گردی کی اجازت کیوں دی؟“ اس نے ایک جذبے سے کہا۔

”تو بس پھر ٹھیک ہے۔ اس کے جواب پر آئندہ کا ردعمل کر لیں گے۔“ میں نے فوراً ہی جواب دیا۔

”اس کا مطلب ہے‘ تم حق بات پر پہرہ دو گے؟“ اس نے پوچھا۔

”کیوں نہیں‘ کیا میں اس علاقے سے تعلق نہیں رکھتا۔“ میں نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے‘ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ بس دو دن دو مجھے......“ اس نے کہا اور پھر اس جانب چل پڑا جدھر دلبر کو دفنا رہے تھے۔ وہ مجھ سے الگ ہوا تو چھاکا تیزی سے میرے پاس آیا‘ میں نے اسے نکلنے کا اشارہ کیا‘ ہم قبرستان سے نکلتے چلے گئے۔ میں دلبر کے گھر جانے کی بجائے اچھو کریانے والے کی دکان کی طرف چلا گیا۔ اس کا فون ٹھیک ہو چکا تھا۔ میں نے کارڈ پر درج نمبر ملائے‘ چند لمحوں بعد فون اٹھا لیا گیا۔ دوسری طرف سے سوہنی ہی بول رہی تھی۔

”مجھے معلوم تھا کہ تو مجھے فون کرے گا۔“ اس نے خمار آلود لہجے میں کہا تو میں نے غصے کو دباتے ہوئے پوچھا۔

”تو یہ بتا کہ ماں کدھر ہے اور تو اسے کیوں لے کر گئی ہے؟“

”لے اماں سے بات کر......“ یہ کہہ کر اس نے اماں کو فون دے دیا‘ کیونکہ اگلے ہی لمحے اماں کی آواز ابھری۔ ”کیسا ہے تو جمال؟“

”اماں‘ یہ تو نے کیا کیا......اس کے ساتھ کیوں چلی آئی۔“

”ملک سجاد کے لوگ تجھے مارنے کے لیے گھر تک آ گئے تھے۔ سوہنی کو معلوم تھا کہ وہ ایسا کریں گے‘ میری جان کو خطرہ تھا وہاں‘ سو انہیں تو نہیں ملا‘ پھر اچانک خبر ملی کہ ملک سجاد کو گولیاں لگ گئی ہیں......

سوہنی مجھے اپنے ساتھ ادھر لے آئی۔"

"ادھر کہاں......" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"لاہور...... یہاں اپنے گھر......" اماں نے جواب دیا۔

"تو ٹھیک تو ہے ناماں...... اس نے کوئی دھمکی......"

"اوہ نہیں پتر......! تو ایسا نہ سوچ...... میں بڑے آرام سے ہوں یہاں پر۔"

"یہ ملک سجاد کے کہنے پر تو......" میں نے کہنا چاہا۔

"او نہیں اس کے تو فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہے۔ وہ تو خود اسپتال میں ہے تو ایسا کر یہ سوہنی سے پتا پوچھ لے...... پھر مجھے جب چاہے لینے آجانا۔ میں محفوظ ہوں یہاں پر۔" اماں نے دلاسہ دینے والے انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے دوا سے فون......" میں نے کہا تو چند لمحوں بعد سوہنی لائن پر تھی۔

"دیکھ جمال...... مجھے تیری بہت ضرورت ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اماں کو یہاں لاکر تجھے بلیک میل کر رہی ہوں۔ میں اماں ہی کو نہیں تجھے بھی بچا لینا چاہتی ہوں۔ پلیز...... یہاں میرے پاس آجاؤ جو کہنا ہے مجھے کہہ لو مگر میری بات ضرور سن لو۔"

"پتہ لکھواؤ" میں نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنا پتا لکھوانا شروع کر دیا۔ لکھتے ہوئے مجھے یقین نہیں تھا کہ یہ درست بھی ہوگا یا غلط لیکن میں نے لکھ لیا۔ پھر میں نے کہا۔

"دیکھ......! اگر یہ پتا درست نہ ہوا تو......"

"تیری سب سے بری عادت یہی ہے کہ تو کسی پر اعتماد نہیں کرتا جب چاہے چلے آنا میں تجھے یہیں ملوں گی اور سن ماں کی طرف سے بے فکر ہو جا" میں نے سنبھال لیا ہے اسے۔" اس نے بڑے پیار سے کہا تو مجھے غصہ آگیا۔

"اوئے تو کون ہوتی ہے میری سنبھال لینے والی دیکھ تو اماں کو لے کر ادھر آجا ورنہ مجھے تو آنا ہی ہے...... تجھے پاتال سے بھی نکال لوں گا۔"

"میں یہی تو چاہتی ہوں کہ تو میرے پاس ادھر آئے کل کا آتا ہے آج آجا۔" اس نے پھر اسی پیار بھرے لہجے میں میرا غصہ نظر انداز کرتے ہوئے کہا اب اس سے مزید بات کرنا فضول تھا۔ اس لیے میں نے فون بند کر دیا۔ میں نے اچھو کی طرف ایک بڑا نوٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ رکھ پیسے اور یہ نمبر کسی کے ہاتھ نہیں لگنا چاہیے۔"

"پیسے بھی آپ رکھو اور یہ نمبر میں ابھی یہاں سے ختم کر دیتا ہوں نہ ہوگا نہ مجھے پتا چلے گا میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔"

"تو پھر تو زندہ بھی رہے گا۔" میں نے کہا اور نوٹ اس کے کاؤنٹر پر رکھ کر پلٹ گیا۔ چھاکا بائیک لینے چلا گیا تھا اور میں اس کے انتظار میں وہیں کھڑا ہو گیا۔

اس وقت مجھے بالکل بھی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں اور کدھر جاؤں۔ بس ذہن میں یہی تھا کہ فوراً اماں کے پاس جا پہنچوں۔ سوہنی نے تو انکار کر دیا تھا کہ وہ اب گاؤں نہیں آئے گی پیرزادہ اپنے طور پر مجھے آئندہ آنے والے دنوں کے بارے میں بتا چکا تھا۔ میں کسی طور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔ پیرزادوں اور سرداروں کے درمیان سرد مہری اب غصے میں بدل چکی تھی۔ اگر یہ لاوا پھٹ جاتا ہے تو انہی دو خاندانوں کا نقصان ہونا تھا۔ لیکن اگر وہ دونوں "اندر کھاتے" بیٹھ کر صلح کر گئے تو پھر علاقے سے لوگ چن چن کر ماریں گے۔ تب میرا مقصد پورا نہیں

ہونے والا تھا۔ میں نے ملک سجاد کو چھوڑ کر اچھا کیا تھا یا برا یہ میں نہیں جانتا تھا لیکن سردار اس پورے علاقے میں "گندے" ہو گئے تھے ہر دماغ میں ان کے خلاف زہر بھر چکا تھا۔ یہ میری کسی حد تک کامیابی تھی۔ میں یہی جمع تفریق کر رہا تھا کہ چھاکا بائیک لے کر آگیا۔

"چل گھر چل......" میں نے کہا فوراً اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ اس نے خاموشی سے بائیک بڑھا دی۔ کچھ ہی دیر بعد ہم گھر جا پہنچے۔ صحن میں نیم کے درخت تلے چارپائی بچھا کر بیٹھ گئے۔ تبھی میں نے سوہنی سے فون پر ہونے والی باتوں کے بارے میں بتا دیا۔ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد وہ بولا۔

"ایسا کر چلتے ہیں لاہور اور اماں کو لے آتے ہیں۔" چھاکے نے کہا۔

"چل پھر...... چلتے ہیں لیکن صرف ایک مسئلہ ہے ہمارے دوست کہیں یہ خیال نہ کریں کہ ہم بھاگ گئے ہیں کہیں یا اس موقع سے دشمن فائدہ نہ اٹھالے......" میں نے یونہی تشویش ظاہر کی تو وہ بولا۔

"دیکھ...... ملک سجاد کا کوئی بندہ اب علاقے میں نہیں ہے پیرزادوں اور سرداروں کی لڑائی میں تو ہم ویسے ہی دخل نہیں دیں گے۔ اول تو ان کی لڑائی نہیں ہوگی اگر ہوئی بھی تو ہم نے تماشہ دیکھنا ہے اور وہ دو تین دن سے پہلے نہیں ہونے والی اور اگر تجھے زیادہ ہی فکر ہے تو پھر تم چلے جاؤ میں ادھر رہتا ہوں۔" چھاکے نے تجویز دی۔

"تو ادھر ہی رہ یہاں گھر میں...... میں نکلتا ہوں......" میں نے ایک دم سے اٹھتے ہوئے کہا۔ کیونکہ اماں کے بغیر مجھے سکون نہیں آرہا تھا۔

"رب راکھا۔" چھاکے نے کہا تو میں نے بائیک اٹھائی اور نکلنے لگا تب چھاکے نے میری طرف مسکرا کر دیکھا تو میں چل دیا۔

جس وقت میں قریبی قصبے میں پہنچا تب تک سورج مغربی افق کی جانب جھک گیا تھا۔ مگر دن ڈھلنے میں کافی وقت پڑا تھا۔ میں نے اپنی بائیک ایک دوست کے گھر کھڑی کی اور اس کی گاڑی لے کر لاہور کی جانب چل پڑا۔ مجھے یقین تھا کہ میں آدھی رات سے پہلے لاہور پہنچ جاؤں گا۔

رات کا دوسرا پہر شروع ہو چکا تھا جب میں لاہور کے ماڈل ٹاؤن میں پہنچا گھر تلاش کرنے میں مجھے تھوڑی سی دقت تو ہوئی لیکن میں پہنچ گیا۔ میں نے گیٹ کے سامنے گاڑی روکی اور نمبر کی تصدیق کر کے کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ اندر سے ایک چوکیدار برآمد ہوا۔ اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر واپس مڑ کر بڑا گیٹ کھول دیا پھر اشارے سے سمجھانے لگا کہ گاڑی اندر لے آؤ۔ تب ہی مجھے ایک دم سے خیال آیا کہ کہیں یہ چال نہ ہو سوہنی نے مجھے پھنسانے کے لیے ایک پتا تھما دیا اور میں آنکھیں بند کر کے اندر چلا جاؤں جہاں کے چوکیدار نے مجھ سے بات کرنا پسند نہیں کیا تھا میں نے چوکیدار سے کہا۔

"جاؤ پہلے اپنی بیگم صاحبہ کو بلا کر لاؤ۔"

چونکہ وہ گیٹ کھول چکا تھا اس لیے نہ آگے جا سکتا تھا اور نہ کھلا گیٹ چھوڑ کر اندر پلٹ سکتا تھا۔ وہ اسی کشمکش میں تھا کہ اندر سے سوہنی برآمد ہوئی۔ میں پہلی نگاہ میں اسے پہچان ہی نہیں سکا تھا۔ اس نے پورا لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ سر پر آنچل یوں تھا جیسے سکارف باندھا ہوا ہو۔ صرف اس کے چہرے پر کپڑا نہیں تھا وہ دھیمے دھیمے قدم بڑھاتی ہوئی آگئی۔ پھر مجھے دیکھ کر بولی۔

"مجھے معلوم تھا کہ تو نہیں آئے گا ایسے حالانکہ میں نے تجھے بالکونی سے دیکھ لیا تھا چل آ اندر۔" میں

نے دلچسپ نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر گاڑی اندر لانے کے لیے لپکا۔

کچھ ہی دیر بعد میں اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں تھا' جہاں سامنے ہی صوفے پر اماں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کھڑی ہوگئی۔ پھر مجھے گلے لگاتے ہوئے بولی۔

"مجھے معلوم تھا کہ تو آج رات ہی آجائے گا' تو نہیں رہ سکتا میرے بغیر۔"

"اماں......! تو مجھے یہ بتا' اس کی باتوں میں آ کر تو یہاں کیوں آ گئی۔ اس نے جھوٹ بولا کہ ملک سجاد کے بندے اس رات ہمارے گھر آئے ہیں...... میں نے پتا......"

"یاد کر' یہ بات میں نے تم سے کہی تھی' سوہنی نے نہیں۔" اماں نے میری تصیح کی۔

"لیکن وہاں تو کوئی بھی نہیں آیا تھا۔" میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"آئے تھے پتر' مگر سوہنی کو وہاں دیکھ کر پلٹ گئے۔ اس لیے تو میں یہاں آ گئی ہوں۔" اماں نے تیزی سے بتایا۔

"مگر کیوں اماں' کیا مجھ پر بھروسہ نہیں ہے۔" میں نے غصے میں کہا۔

"ہے...... بھروسہ ہے' میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تو میرا ہر طرح سے تحفظ کرسکتا ہے لیکن تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں ہی وہ ذات ہوں جو تیری کمزوری ہے۔ پتر میں تجھے کہیں بھی کمزور نہیں دیکھنا چاہتی' تیرے ذمے جو مقصد ہے' تو وہی پورا کر......" اماں نے بے حد جذباتی انداز میں کہا۔

"لیکن اس کے پاس کیوں...... اس پر کیسے بھروسہ کیا جاسکتا ہے......" میں نے سوہنی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا' تب وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"یہ باتیں بیٹھ کے بھی ہوسکتی ہیں۔"

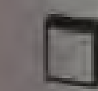
اس کے یوں کہنے پر اماں بیٹھ گئی' پھر اس کے ساتھ وہ بیٹھی تو مجھے مجبوراً بیٹھنا پڑا۔

"سنو جمال......! میں نے میلے والی رات ہی اپنی زندگی کا بہت بڑا فیصلہ کرلیا تھا اور وہ فیصلہ تھا کہ میں نے یہ طوائف والی زندگی ختم کردینی ہے۔ میں لاشعوری طور پر پہلے ہی اس زندگی سے اکتائی ہوئی تھی۔ جسے بس ہلکا سا اشارہ چاہیے تھا۔ کوئی سہارا دے دے مجھے اور میں گناہوں کی اس زندگی سے چھٹکارا پالوں۔ میں نے وہاں تمہارے پاس رہنا چاہا' لیکن تم نے مجھے نہیں رہنے دیا۔ ملک سجاد' میرا بڑا عاشق بنا پھرتا ہے' لیکن تمہارے سامنے وہ کچھ بھی ثابت نہ ہوا۔ میں یہاں سے زیادہ وہاں تمہارے گاؤں میں محفوظ تھی' تم پر بوجھ نہ بنتی اپنا خود کما لیتی' مگر تو نے مجھے ذرا بھی سہارا نہیں دیا۔"

"مجھے اب تک سمجھ نہیں آرہی ہے کہ تم کہنا کیا چاہتی ہو' میری اماں کا اس بات سے کیا تعلق ہے؟" میں نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

"ہے تعلق ہے' اماں نے مجھے اخلاقی طور پر سہارا دیا' ایک جھٹکے سے میرے ذہن میں موجود گند کو نکال دیا۔ مجھے انہوں نے بتایا کہ عورت ہوتی کیا ہے' اب ان پر ہے' چلی جائیں گی' تو میں دوبارہ طوائف کی زندگی کی طرف پلٹ جاؤں گی' مجھے کوئی نہیں روک سکے گا' اگر اماں کو لے جاسکتے ہو تو لے جاؤ......" سوہنی نے عجیب لہجے میں کہا' جس میں غرور' محبت اور اپنے ہونے کا احساس تھا۔ وہ مجھ سے جواب مانگ رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اب اسے کیا کہوں؟

(باقی آئندہ)



بے حسی

معاشرتی بے حسی جو اس دور میں ہے شاید اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی۔ ہم دو طبقوں میں بٹ گئے ہیں ایک امراء کا طبقہ جہاں ہر چیز کی فراوانی ہے جبکہ دوسرے طبقے میں لوگ ضروریات زندگی کی چیزوں کے لیے بھی سسکتے ملتے ہیں۔ کہیں اشیاء خورد و نوش کی فراوانی ہے تو کہیں لوگ ان کے لیے اپنی جان سے چلے جاتے ہیں۔

معاشرے کی دوطبقاتی نظام کا شاخسانہ' ایک پر اثر تحریر

شان سوئٹس بیکرز اینڈ ریسٹورنٹ کے سامنے زندگی اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ رواں دواں تھی۔ یہ ریسٹورنٹ شہر سے ذرا ہٹ کر ایک چوراہے کے قریب واقع تھا جس کے اردگرد ہر وقت ٹریفک کا ہجوم رہتا تھا۔ ریسٹورنٹ کے سامنے سڑک پار' چند دکانیں فوٹو اسٹیٹ کی تھیں۔ بائیں طرف گرلز اور بوائز کا مشترکہ کالج تھا اور اس کے بالکل سامنے ایک بہت بڑی کتابوں کی دکان تھی' جس میں ضرورت کی ہر شے دستیاب تھی۔ یہ ریسٹورنٹ متوسط اور اچھے طبقے کے لوگوں کا پسندیدہ ریسٹورنٹ تھا۔ یہاں دام مناسب اور چیزیں نہایت معیاری تھیں اس لیے اس ریسٹورنٹ میں ہر وقت رش رہتا تھا۔ ریسٹورنٹ کے پاس ایک بجلی کے کھمبے کے بالکل نیچے ایک نو دس سالہ بچی اور ایک ساتھ پینسٹھ سالہ ایک ضعیف بڑھیا بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں کی ہی حالت نہایت خستہ اور لباس بے حد خراب تھا۔ دونوں بھوکی تھیں اور دونوں نے ہی کل شام سے ایک نوالہ بھی اپنے حلق سے نیچے نہیں اتارا تھا۔

ریسٹورنٹ میں صبح سے اب تک پچاس سے ساٹھ افراد آ جا چکے تھے اور وہ بچی ہر فرد کے سامنے جا کر ہاتھ پھیلا چکی تھی مگر ہر بار ہی اسے خالی لوٹا دیا گیا تھا۔ جیسے ہر فرد جانتا ہے کہ وہ بھوکی نہیں ہے' ضرورت مند نہیں ہے بالکل اس کے ماں باپ نے اسے سکھا سمجھا کر بھیک مانگنے کے لیے بھیجا ہے۔ جیسے یہی ان لوگوں کا دھندا ہے' صبح سے دوپہر ہوگئی تھی۔ سر پر عارضی سایہ سرک کر دور چلا گیا تھا اور اب سورج کی کرنیں براہِ راست ان پر پڑ رہی تھیں۔

بھوک سے بے حال اب ان کے وجود میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ وہ ذرا سا سرک کر چھاؤں میں ہی چلی جاتیں۔ بھیک مانگنا صرف بچی کے ذمہ تھا کیونکہ بڑھیا یہ ذمہ داری اٹھانے سے قاصر تھی (وہ ذہنی طور پر معذور تھی) وہ بڑھیا اور بچی کون ہیں اور ان کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟ اس بارے میں وہاں کے لوگ کچھ زیادہ نہیں جانتے تھے بس انہیں اتنا پتا تھا کہ اب سے دو برس قبل وہ دونوں انہیں وہاں نظر آئی تھیں اور پھر اس کے بعد ان لوگوں کو ان دونوں کو وہاں دیکھنے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ بڑھیا کو بھی اب اپنے اور بچی کے رشتے کا ذرا احساس نہیں تھا۔ اسے بس اتنا پتا تھا کہ وہ بچی اس کے لیے جو چیز کھانے کی لاتی ہے وہ اسے کھانا پڑتی ہے۔ کبھی کبھار بڑھیا کے ذہن میں ایک فلم سی چلنے لگتی ہے' کٹ کٹ کر۔ تصور میں چند مناظر اجاگر ہوتے ہیں اور پھر اوجھل ہوجاتے ہیں۔ اسے تصور میں ایک پیارا سا گھر دکھائی دیتا ہے' جو اسے کسی گلشن کی طرح عزیز ہے وہ اس گلشن کے مالی کے قدموں میں جھکی ہوئی ہے وہ اس کا مزاجی خدا ہے۔

بہت عرصہ گزر گیا ہے تقدیر اس پر مہربان ہوگئی ہے ویران گلشن میں اس قدر بہار آئی ہے' ہزاروں شاخوں پر پھول لہلا اٹھے ہیں۔ ایک...... دو...... تین...... وہ مسرت سے گنگ ہوتی جارہی ہے۔ اچانک بہار آور چمن خزاؤں کی زد میں آ گیا ہے۔ چمن میں ایک سفید چادر بچھ گئی ہے' کئی شبنمی موتی گردش میں ہیں وہ ایک بار پھر صابر ہے' نرم پھولوں اور کلیوں کو بادِ صرصر سے بچانے کے لیے اس نے خود پر ہر شے' ہر سکھ حرام کرلیا۔ اس بار بھی اسے اس کی محنت کا' اس کے صبر کا

اجر ملا ہے۔ تمام پھول اپنی تمام تر کامیابیوں کے ہمراہ اس کے قدموں میں جھکے ہوئے ہیں۔ وہ بے حد خوش تھی کہ اچانک پھر اسے کسی کی نظر کھا گئی اس بار صرف ایک چارپائی پر ایک سفید چادر نہیں بلکہ تین چار پائیوں پر اسی طرح تین سفید چادریں بچھی ہوئی تھیں اس کے علاوہ اس کے دماغ میں اور کچھ نہیں آتا تھا۔ ان ادھورے اور الجھے ہوئے تصورات کی دنیا میں وہ دن رات مگن رہتی تھی۔ اچانک اس ریسٹورنٹ کے سامنے ایک شاندار کار آ کر رکی۔ کار میں ایک 45 سالہ مرد‘ 35 سالہ عورت اور دس بارہ سالہ دو لڑکے بیٹھے ہوئے تھے۔ گاڑی کا شیشہ ذرا سا نیچے سرکتے ہی ایک گرم ہوا کا جھونکا گاڑی کے اندر در آیا۔ ایک پل کو اندر بیٹھی ہوئی عورت کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرے اور پھر غائب ہوگئے۔

ریسٹورنٹ سے ایک شخص باہر آیا اور سیٹھ صاحب سے آرڈر لے کر اندر چلا گیا۔ چند لمحوں بعد اس نے دو بڑی آئس کریمز (لڑکوں کی فرمائش پر) آ کر سیٹھ صاحب کو تھما دیں۔ صاحب نے ایک ہرا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھا۔

”بقیہ رقم ٹپ کے طور پر رکھ لینا۔“

”شکریہ صاحب!“

بچی نے ایک نظر گاڑی کو دیکھا اور پھر اپنی رہی سہی توانائی جمع کر کے گاڑی کے قریب آ گئی۔ اس کا ایک ہاتھ خود بخود سیٹھ صاحب کے سامنے پھیل گیا۔ سیٹھ صاحب نے ایک نظر بچی کو دیکھا‘ میلے کچیلے اور بوسیدہ لباس میں ہونے کے باوجود وہ بچی انہیں اچھی لگی۔ معصوم معصوم سی‘ بڑے لڑکے نے آئس کریم ذرا سی چکھنے کے بعد باہر اچھال دی۔ چھوٹے لڑکے نے بھی اس کی تقلید کی۔

”مجھے آئس کریم نہیں کھانی پاپا! گھر چلیں مجھے ویڈیو گیمز کھیلنی ہیں۔“ چھوٹے لڑکے نے ضد کی۔

بچی کا ہاتھ بدستور سیٹھ صاحب کے سامنے پھیلا ہوا تھا‘ پھر اس سے پہلے کہ صاحب بچی کو کچھ دیتے‘ اندر بیٹھی ہوئی عورت سخاوت سے گویا ہوئی۔

”وہ جو بچوں نے ابھی ابھی آئس کریم باہر پھینکی ہے اٹھا کر کھالو۔“ بچی کی نظریں آئس کریم تک پہنچ کر واپس لوٹ آئیں۔ بھوکی ہونے کے باوجود کچرے کے ڈھیر پر پڑی ہوئی آئس کریم اٹھا کر کھانا اسے گوارہ نہیں تھا اس نے بمشکل اپنا تھوک نگلا۔

”وہ کچرے کے ڈھیر پر پڑی ہے میں وہاں سے چیزیں اٹھا کر نہیں کھاتی۔“ عورت کی پیشانی پر نخوت سے چند شکنیں جمع ہوگئیں۔

”ارے واہ بھئی واہ! نواب زادی کے نخرے تو دیکھو‘ ایک تو مانگنا اوپر سے نخرے دکھانا اگر اتنے ہی نخرے دکھانے ہیں تو اپنے ماں باپ کو دکھاؤ۔ ہمارے پاس اتنے روپے فالتو نہیں ہیں کہ تمہارے نخرے اٹھاتے پھریں۔ چلیں جی...... گھر چلیں۔ بچوں نے ویڈیو گیمز بھی کھیلنی ہے اونہہ! بھلے کا تو زمانہ ہی نہیں ہے۔ اُف کتنی گرمی ہے۔“ سیٹھ صاحب نے بلا کسی چوں چراں کے اپنی طرف کا شیشہ چڑھایا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ عورت کی کسی بھی بات سے انکار کرنا ان کے بس سے باہر تھا۔ گاڑی جاتے ہی بچی کی نظریں ایک بار پھر آئس کریم پر جم گئیں۔ آئس کریم گھلتی جا رہی تھی اس کے ساتھ اس کا دل بھی گھلتا جا رہا تھا پھر وہ خود بھی لڑکھڑا کر ان کے پاس گر پڑی۔ بھوک نے اس کی رہی سہی توانائی بھی سلب کر لی تھی۔

☆......☆......☆

دو گھنٹے مزید گزرنے کے باوجود بچی اور بڑھیا ہنوز بھوکی تھیں اچانک ایک فرد بڑبڑاتے ہوئے ان کے پاس سے گزرا۔

”سالے الو کے پٹھے! پیسے لے لیتے ہیں مگر مال خراب ڈال دیتے ہیں۔“ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے شاپر میں سے چند کیلے نکال کر فٹ پاتھ کی طرف اچھال دیئے۔ وہ کیلے بڑھیا کے بالکل سامنے آ گرے۔

بھوک کے ہاتھوں ستائی ہوئی بڑھیا اور بچی کی نظریں بیک وقت ان کیلوں پر پڑیں۔ کیلے حقیقتاً بے حد خراب تھے۔ بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر بچی نے کچرے کے ڈھیر میں پڑی ہوئی وہ آئس کریم بھی بمشکل اٹھا کر کھائی تھیں اور اب یہ کیلے...... انہیں

کھانے کے لیے اس کا من مائل نہ ہو سکا مگر بڑھیا کی بات الگ تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک کیلا اٹھا لیا پھر وہ کیلے کا چھلکا اتارنے لگی۔ بے حد خراب ہونے کی وجہ سے کیلے کا چھلکا اتر نہ سکا۔ کیلے کے برادے سے بڑھیا کی انگلیاں لتھڑ گئیں۔ کچھ برادہ اس کے کپڑوں پر بھی گر گیا۔ جسے وہ اٹھا کر کھانے لگی ایک کیلا کھانے کے بعد اس نے اپنا ہاتھ دوسرے کیلے کی طرف بڑھا دیا۔

گاڑی کا ہارن سنتے ہی اچانک بچی نے اپنی مندی ہوئی آنکھیں ہڑبڑا کر کھول دیں‘ اس نے سامنے دیکھا اسے گاڑی میں وہی سیٹھ صاحب نظر آئے جسے کچھ دیر پہلے اس نے وہاں دیکھا تھا۔ وہ اشارے سے اسے اپنی طرف بلا رہے تھے۔ بچی ڈھیرے سے اٹھی اور ان کے قریب پہنچ گئی۔ سیٹھ صاحب نے نرمی سے اس کا ایک بازو تھام لیا۔

”بھوک لگی ہے؟“ بچی نے سر کو جنبش دی۔ ”بہت زیادہ؟“

”ہوں......“ سیٹھ صاحب نے اپنی گاڑی کی دوسری طرف کا دروازہ کھولا۔

”چلو کوئی بات نہیں‘ تم میرے ساتھ چلو میں تمہیں کھانا بھی کھلاؤں گا اور اچھے سے کپڑے بھی دوں گا۔“ بچی کی نظریں بڑھیا کی طرف اٹھ گئیں۔ سیٹھ صاحب نے جیسے اس کی نظروں کا مفہوم سمجھ لیا۔

”اس کی فکر مت کرو‘ اسے کچھ نہیں ہوگا تمہیں کھانا کھلانے کے بعد میں خود یہیں آ کر چھوڑ جاؤں گا اور اس کے لیے بھی بہت سا کھانا دوں گا۔ چلو شاباش! آؤ گاڑی میں بیٹھو۔“ بچی ایک پل کو جھجکی‘ گھبرائی اور پھر بھوک نے اس سے تمام اختیارات چھین لیے۔ وہ چپ چاپ گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی۔

☆......☆......☆

گھر پہنچتے ہی صاحب نے اپنی نوکرانی کو آواز دی۔ سلمٰی فوراً ہی حاضر ہوگئی۔

”جی صاحب!“ صاحب نے بچی کا بازو اسے تھمایا۔

”اسے اچھی طرح نہلانے اور صاف ستھرے کپڑے پہنانے کے بعد کمرے میں لے آؤ۔“ پندرہ منٹ بعد سلمٰی بچی کے ساتھ کمرے میں موجود تھی۔

”فریزر میں جو بھی کھانے پینے کا سامان موجود ہو لے آؤ۔“ سلمٰی گئی اور بہت کچھ کھانے کا سامان ایک ٹرے میں سجا کر لے آئی۔

”اب تم جاؤ۔“ سلمٰی کے جانے اور سیٹھ صاحب کا اشارہ پاتے ہی بچی کھانے پر ٹوٹ پڑی۔

بچی کی نظریں کھانے پر تھیں اور ان کی بچی پر۔ بچی نے جی بھر کر کھانا کھایا‘ فروٹ کھائے اور دودھ بھی پیا۔

بچی نے کھانا کھانے کے بعد صاحب نے برتن ایک طرف رکھے اور اٹھ کر کمرے کے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔

وہ ایک گھنٹے بعد کمرے سے باہر نکلے تو بچی کا ایک بازو ان کے ایک ہاتھ میں تھا‘ بچی کی شلوار کا ایک حصہ کسی سرخ مائع سے سرخ ہو چکا تھا اور وہ کسی برسات میں بھیگی ہوئی چڑیا کی طرح تھر تھر کانپ رہی تھی۔ باہر نکلتے ہی صاحب نے سلمٰی کو آواز دی۔ سلمٰی کے آتے ہی انہوں نے بچی کا بازو انہیں تھمایا۔

”اسے وہی سابقہ کپڑے پہنا کر لے آؤ۔“ بچی کی حالت دیکھتے ہی وہ سب کچھ سمجھ گئی تھی مگر کوئی سوال کیے بغیر وہ وہاں سے رخصت ہوگئی چند منٹ بعد وہ پھر صاحب کے روبرو تھی۔

”فریزر میں بقیہ جو کھانا بچا ہوا ہے اسے ایک شاپر میں بھر کر لے آؤ۔“ سلمٰی اس بار بھی گئی اور چند لمحوں بعد لوٹ آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک شاپر تھا صاحب نے کھانے کا شاپر اپنے ڈرائیور کی طرف بڑھایا۔

”اس بچی کو شان ریسٹورنٹ کے سامنے چھوڑ آؤ۔“

”جی صاحب!“ ڈرائیور نے شاپر گاڑی میں رکھا‘ بچی کو پچھلی سیٹ پر لٹایا اور وہاں سے رخصت ہوگیا۔

☆......☆......☆

سیٹھ صاحب اپنے کمرے میں بیٹھے فلم دیکھنے میں مصروف تھے کہ اچانک ان کا موبائل بج اٹھا۔ انہوں نے اسکرین پر نگاہ کی‘ سامنے ہی ان کے ایک بے

تکلف دوست کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ کال ریسیو ہوتے ہی کال کرنے والا شروع ہوگیا۔

''یار! بڑے بے مروت نکلے تم تو' ہم سب تمہارا یہاں انتظار کرتے رہے اور تم آئے ہی نہیں۔ تمہیں پتا ہے آج کتنا مزا آیا؟ تم ہوتے تو خوب انجوائے کرتے۔'' صاحب نے تصور میں بچی کو دیکھا اور مسکرائے۔

''جب فریش پیس کھانے کو مل رہا ہو تو باسی کھانے کو کون منہ لگاتا ہے؟''

''مطلب......؟'' صاحب نے ساری کارگزاری ان کے گوش گزار کردی۔ دوسری طرف سے رشک آمیز آواز ابھری۔

''یار! اکیلے اکیلے ہی مزے اڑا رہے ہو اور ہم سے پوچھا بھی نہیں اور ہماری بھابی؟ کیا وہ گھر پر نہیں تھیں؟''

''دراصل کھانا ہی اتنا قلیل تھا کہ ایک سے زائد فرد کی گنجائش ہی نہیں تھی اور تمہاری بھابی آج شام سے پہلے بچوں کے ہمراہ میکے چلی گئی تھیں۔''

''اچھا چھوڑو! یہ بتاؤ اگلی پارٹی ہماری طرف سے ہوگی یا اس بار تم بھی کچھ کرو گے؟'' صاحب نے ایک پل کو سوچا۔

''اچھا چلو! اس بار پارٹی میری طرف سے۔''

''واقعی...... کب؟''

''کل شام پانچ بجے۔''

''پکا......؟''

''بالکل پکا!''

☆......☆......☆

اگلے روز شام چار بجے سیٹھ صاحب شان ریسٹورنٹ کے سامنے موجود تھے۔ انہوں نے سامنے نگاہ کی تو انہیں بے حد حیرت ہوئی کیونکہ بچی اور بڑھیا میں سے کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ اتنی دیر میں ایک ویٹر ان کے قریب آ گیا۔

''جی سر! حکم کریں؟''

''ہوں...... آج کسی شے کی ضرورت نہیں ہے۔'' انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

''دراصل آج میں کسی اور کام سے اس طرف آیا ہوں' یہاں سامنے ایک پاگل سی بڑھیا بیٹھی تھی' آج نظر نہیں آ رہی۔ کچھ خبر ہے کہاں ہے وہ؟''

''آپ کو معلوم نہیں ہے صاحب! وہ تو چلی گئیں؟''

''چلی گئیں...... کہاں؟''

''اوپر۔''

''اوپر...... کب؟ کیسے؟''

''صاحب کل شام کی ہی بات ہے نشے میں دھت ایک ٹرک ڈرائیور نے اپنی گاڑی فٹ پاتھ پر چڑھا دی تھی۔ بڑھیا پہلے کب ہوش میں رہتی تھی کہ اپنا بچاؤ کرلیتی۔ سیدھی اوپر پہنچ گئی اس پر ترس کھا کر ایک رفاہی تنظیم والے اسے سپردِ خاک کر آئے۔'' صاحب نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''اور اس کے ساتھ ایک بچی ہوا کرتی تھی اس کا کچھ پتا ہے؟''

''صاحب! حیرت کی بات ہے اب سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وہ بچی اس بڑھیا سے ایک پل کے لیے جدا ہوئی ہو مگر نجانے کل وہ کہاں چلی گئی تھی جب وہ لوٹی تو یہ سانحہ پیش آچکا تھا۔ جانے کیوں وہ بہت گم صم اور کھوئی کھوئی سی تھی۔ بڑھیا کی لاش دیکھ کر بھی اس کا ایک آنسو تک نہ نکلا اور آج شام کے ایک اخبار نے اس بچی کی موت کی خبر شائع کی ہے کہ کل رات ریل گاڑی کے نیچے آ کر وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ جانے یہ سانحہ کیسے آیا اس کی کوئی تفصیل موجود نہیں تھی۔'' صاحب نے ایک سرخ نوٹ نکال کر ویٹر کے ہاتھ پر رکھا اور بڑبڑاتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔

''سالی الو کی پٹھی! ایک دن اور زندہ نہیں رہ سکتی تھی کیا؟''



تا ایک تنہائی

موجودہ دنیا ایک گلوبل ولیج بن گئی ہے جہاں اس سے بے حد فوائد ہیں وہیں اس کے منفی اثرات نے سماجی طور پر معاشرے کو کھوکھلا کردیا ہے۔ ٹیکنالوجی کا غلط استعمال' معاشرے میں بگاڑ کا سبب بن جاتا ہے۔ مگر اسی جدید ٹیکنالوجی کے استعمال سے دنیا میں بے حد ترقی ہورہی ہے۔

ٹیکنالوجی کے غلط استعمال نے ایک انسان کی زندگی کا خاتمہ کردیا

موبائل فون کا غلط استعمال کرنے والوں کے لیے بطورِ خاص

''ارے یار اسے مت چھیڑو' نہیں تو رونے لگے گا یہ ممی ڈیڈی بچہ ہے' ابھی تک اس کی ممی روزانہ اس کا منہ ہاتھ دھلا کر بالوں میں کنگا کرکے اور اپنے ہاتھوں سے ناشتہ کروا کر کالج بھیجتی ہیں۔''

''کیا کپڑے بھی ممی ہی تبدیل کرواتی ہیں۔'' میرے دوسرے دوست نے کہا تو سب زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

ہم سب اپنے خالی پیریڈ میں کینٹین میں بیٹھے چائے اور سموسوں کے ساتھ انصاف کررہے تھے' یہاں آ کر بیٹھتے تو ایک دوسرے کی ٹیک کرتے تھے' آج یہ سب میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے تھے اور اس کی بھی ایک وجہ تھی اور وہ یہ کہ میں انیس سال کا ہوگیا تھا اور میری زندگی میں ابھی تک کوئی لڑکی نہیں آئی تھی' جب کہ میرے سارے دوستوں کی کسی نہ کسی لڑکی سے دوستی تھی۔ کسی نے فون پر رانگ نمبر پر دوستی کررکھی تھی تو کسی نے باقاعدہ دوست بنا رکھی تھی۔ وہ سب خود کہتے تھے کہ ہمیں ان سے ایسا کوئی جذباتی لگاؤ نہیں ہے کہ اگر اس سے دوستی برقرار نہ رہی تو مر جائیں گے' یہ سب شغل تو ٹائم پاس کرنے کا ذریعہ ہیں۔ دل لگی اور تفریح ہے' جب ہمارا ایک دوسرے سے دل بھر جائے گا یا کوئی دوسری نظر آجائے گی تو پرانی دوستی ختم کردیں گے' ان کی دوستوں کا بھی شاید یہی حال تھا۔

میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا' ہر وقت امی ابو کی نگاہوں کے سامنے ہی رہتا تھا' امی آج بھی میرا خیال اسی طرح سے رکھتی تھیں جس طرح بچپن میں رکھا کرتی تھیں۔

انہوں نے میری تربیت ہی کچھ اس طرح سے کی تھی کہ مجھے سوائے اپنی پڑھائی یا پھر شام کے وقت روزانہ فٹ بال کھیلنے تک میری دلچسپیاں محدود تھیں۔ بہت زیادہ ٹی وی اور فلمیں دیکھنے کی مجھے اجازت نہیں تھی۔

میں شاید فطرتاً شرمیلی طبیعت کا مالک تھا' اس لیے کبھی بھی جوان اور ہم عمر لڑکیوں کو گھور گھور کر نہیں دیکھتا تھا اور نہ ہی میں نے کبھی بھی اپنی کسی بھی کزن سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی۔

میرے دوست روزانہ اپنی گرل فرینڈ کے قصے مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے اور میں حیرانی سے سنا کرتا تھا' وہ لوگ مجھے بھی زور دے کر کہتے کہ میں کیوں نہیں کسی لڑکی سے دوستی کرتا اور میں گھبرا کر کہتا کہ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے اور اگر میں نے ایسا کر بھی لیا اور میرے امی اور ابو کو پتا چل گیا تو بہت بری بات ہوگی' امی ہمیشہ کہتی ہیں جو عزت دار لوگ ہوتے ہیں وہ کبھی کسی دوسرے کی عزت پر غلط نگاہ نہیں ڈالتے۔

بس یہ کہنا میرا جرم بن گیا اور یہ سب بیٹھے میری

اسی بات کو لے کر میرا مذاق اڑا رہے تھے۔ روزانہ ہی یہ موضوع نکل آتا اور روزانہ میرے دوست مجھے گرل فرینڈ بنانے پر اکساتے رہتے۔

وہ مجھے لڑکی کو پٹانے کے گر بھی سکھاتے تھے اور سب کی باتیں چپ چاپ سننے کے بعد میں یہ کہہ کر اٹھ جاتا کہ "یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔"

اس وقت میں انٹر میں تھا' کیریئر بنانے کے لیے یہ بہت اہم سال تھا' بہت زیادہ محنت کرنا تھی۔ تاکہ انٹر میں اچھا گریڈ آئے اور میں انجینئرنگ میں داخلہ لے سکوں' مجھے انجینئر بنانا میرے ابو کا خواب تھا۔ کیونکہ وہ خود انجینئر بننا چاہتے تھے لیکن ان کے نمبر کم آئے اس لیے ان کا انجینئرنگ یونیورسٹی میں ایڈمیشن نہ ہوسکا اور اب اپنے اس خواب کی تعبیر وہ میری صورت میں پانا چاہتے تھے۔

فائنل ایگزام نزدیک تھے' ریحان میرا بیسٹ فرینڈ تھا' وہ کمبائنڈ اسٹڈی کے لیے میرے گھر آجاتا تھا' یا پھر کبھی میں اس کے گھر چلا جاتا تھا' پڑھائی کے دوران ہمارے درمیان کوئی بھی فضول بات نہیں ہوتی تھی۔

اللہ اللہ کرکے پیپرز شروع ہوئے اور پھر پریکٹیکل سے فارغ ہوتے ہوتے پورا مہینہ لگ گیا۔ پیپرز بہت اچھے ہوئے تھے' مجھے پوری امید تھی کہ میرا اے ون گریڈ ضرور آئے گا۔

اگزام کے بعد بہت سے دوست گھومنے پھرنے چلے گئے تھے کچھ اپنے رشتہ داروں کے ہاں' دوسرے شہروں میں' بس کبھی کبھی میں اور ریحان مل لیا کرتے تھے' پھر ریحان کو بھی لاہور اپنے کزن کی شادی میں جانا پڑ گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں بہت بور ہونے لگا۔

ایک دن امی ابو کسی رشتے دار کی میت میں چلے گئے' امی جاتے ہوئے کہہ گئیں تھیں کہ کھانا بنا کر رکھ دیا ہے تم کھا لینا اور گھر سے باہر مت جانا ہم رات تک ہی آئیں گے۔

امی ابو کے جاتے ہی میں نے ٹی وی لگا لیا اور ایک رومانی مووی دیکھی' پھر کھانا کھا کر لیٹ گیا۔ بستر پر لیٹا تو مووی کے ہیرو اور ہیروئن کا رومانس بار بار ذہن میں آنے لگا۔

اچانک ہی مجھے اپنی زندگی بہت بے رنگ اور پھیکی پھیکی سی لگنے لگی اور میں سوچنے لگا کہ اگر میری بھی کوئی گرل فرینڈ ہوتی تو اس سے اسی طرح کی باتیں کرتا ' واقعی اگر زندگی میں کوئی رنگین ساتھی نہ ہو تو زندگی کتنی بے رونق اور بے مزہ لگتی ہے۔

میں نے سوچا کہ مجھے بھی کوئی گرل فرینڈ بنانی چاہیے' مگر کیسے......؟ یہ سوال ذہن میں آیا تو عابد اور ریحان کے مشورے بھی دماغ میں گونجنے لگے' پھر میرے لب آپ ہی آپ مسکرانے لگے اور میں نے فون کا ریسیور ہاتھ میں اٹھا لیا۔ یوں ہی ایک نمبر ملانے کا سوچا پھر اپنی ڈیٹ آف برتھ کا نمبر اپنے علاقے کے نمبر کے ساتھ ملا دیا۔

دوسری جانب مسلسل گھنٹی بج رہی تھی' مگر کوئی فون اٹھا ہی نہیں رہا تھا۔ اس وقت شام کے چار بجنے والے تھے' گرمیوں کے دن تھے' میں نے سوچا کہ میں نے غلط وقت پر فون کیا ہے' لگتا ہے اس گھر والے سو رہے ہیں۔ ابھی میں فون رکھنے ہی والا تھا کہ کسی نے فون اٹھایا اور ایک بہت خوب صورت سی آواز سنائی دی۔

"ہیلو......کون ہے؟"

"جی میں فواد!" ایک نسوانی اور وہ بھی اتنی مدھر آواز کو سنتے ہی میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اس لیے میں نے جھٹ اپنا نام بتا دیا۔

"فواد کون؟" اس نے دھیرے سے پوچھا۔

"فواد فواد ہے اور کون......!" میں نے شوخ لہجے میں کہا۔

"اچھا فواد صاحب کس سے بات کرنی ہے' اگر آپ کو امی جی سے بات کرنی ہے تو امی جی تو سو رہی ہیں۔"

"نہیں مجھے آپ کی امی جی سے بات نہیں کرنی' آپ سے کرنی ہے۔ اچھا ہے کہ آپ کی امی جی سو رہی ہیں۔" میں نے کہا۔

"مجھ سے......؟" اس نے حیرت سے کہا۔ "مجھ سے کیا بات کرنی ہے؟"

"اچھا چلیں' یہ بتائیں کہ آپ کا کیا نام ہے' کیا کرتی ہیں' وغیرہ وغیرہ......" اس کے اتنی بات کرنے سے میری ہمت بڑھی اور میں نے سوال کر دیا۔

"ثمینہ......!" اچانک ایک آواز سنائی دی اور "امی جی جاگ گئیں" کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

"ثمینہ......!" میں نے ریسیور اپنے سینے پر رکھا اور زیر لب یہ نام دہرایا' اچھا تو ثمینہ نام ہے محترمہ کا۔ کتنی پیاری دھیمی دھیمی اور میٹھی آواز ہے' وہ خود بھی اپنی آواز جیسی ہی حسین اور نازک سی ہوگی۔ میں نے خود سے کہا اور مسکراتے ہوئے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا' پھر میں نے وہ فون نمبر اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا تاکہ بھول نہ جاؤں۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد میں نے دوبارہ فون کیا تو ایک کرخت آواز بڑی بی کی سنائی دی۔

"ہیلو کون بول رہا ہے......؟"

میں نے جھٹ گھبرا کر فون رکھ دیا' لگتا ہے امی جی پوری طرح بیدار ہوگئی ہیں۔ اسی شام پھر میں نے سوچا کہ فون کروں لیکن یہ سوچ کر نہیں کیا کہ اب تو شام ہوگئی ہے' ہوسکتا ہے کہ اس کے ابا اور بھائی وغیرہ گھر آگئے ہوں' فون کرنے کے لیے دوپہر کا وقت بالکل ٹھیک ہے' اب کل پھر اسی وقت فون کروں گا' میں نے فیصلہ کر لیا۔

رات بھر ثمینہ کی مدھر آواز میرے کانوں میں رس گھولتی رہی۔ میں نے تصور ہی تصور میں اس سے ڈھیر ساری باتیں کر لیں۔

اگلا دن صبح سے میں بہت بے چین اور بے قرار تھا کہ کب چار بجیں اور میں فون ملاؤں۔ دوپہر کے کھانے کے بعد امی بھی اپنے کمرے میں سونے کے لیے لیٹ گئیں اور میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ میں نے فون ٹیبل سے اٹھا کر اپنے بیڈ پر رکھ لیا۔ میری نگاہیں گھڑی کی سوئیوں پر تھیں' ساڑھے تین ہی بجے تھے کہ میرا صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ نمبر ملایا۔

نمبر ملاتے ہی خوش گوار حیرت ہوئی کہ جیسے ہی گھنٹی بجی دوسری جانب سے ریسیور اٹھا لیا گیا لیکن خاموشی رہی' تب میں نے آہستہ سے کہا۔

"ہیلو......!" وہ پھر خاموش رہی' میں نے پھر کہا۔

"ہیلو ثمینہ......!" وہ جھٹ بولی۔

"آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟"

"بھئی دیکھ لیں' ہم جو معلوم کرنا چاہتے ہیں معلوم کر لیتے ہیں۔ یہ تو آپ جناب کا نام ہی ہے۔" میں نے شوخ لہجے میں کہا۔

"بھئی سچ بتائیں ناں......!" اس نے پریشان کن لہجے میں کہا تو مجھے اس پر ترس آ گیا اور میں نے کہا۔

"کل آپ کی امی جی نے آپ کو آواز دی تھی ناں...... میں نے سن لیا تھا اور جناب میں نے ایک گھنٹے کے بعد پھر فون کیا تھا لیکن وہ آپ کی امی جی نے اٹھا لیا' اس لیے میں نے فوراً بند کر دیا۔"

"شکر......!" اس نے ایک اطمینان بخش طویل

سانس لی، میں تو ڈر ہی گئی تھی، کہیں آپ نے امی جی کے سامنے تو میرا نام نہیں لے دیا تھا۔" اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"آپ نے کیا اتنا احمق سمجھا ہوا ہے مجھے۔" میں نے شکوہ کناں لہجے میں کہا۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے' امی جی ذرا مزاج کی سخت ہیں' مجھے فون اٹھانے کی اجازت نہیں ہے۔ امی جی جاگ رہی ہوتی ہیں تو خود فون اٹھاتی ہیں۔ دوپہر کو وہ سو جاتی ہیں اور مجھے نیند نہیں آتی' اس لیے میں نے فون اٹھالیا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"اچھا ایک بات بتایئے بالکل سچ!" میں نے کہا۔

"جی......!" اس نے دھیرے سے کہا اور گہری سانس لی۔

اس کی یہ گہری گہری سانسیں میری سانسوں میں بھی ہلچل مچا رہی تھیں۔ بہت خوش گوار سا احساس ہو رہا تھا' میں نے اپنے آپ کو دو چار گالیاں دیں کہ میں واقعی احمق ہی تھا جو اتنا خوب صورت تجربہ نہیں کیا۔

"آپ اس وقت میرے فون کا ہی انتظار کر رہی تھیں ناں' جب ہی تو پہلی ہی بیل پر فون اٹھالیا۔" میں نے کہا۔

"میں دراصل فون کے پاس ہی بیٹھی تھی اور فون فوراً اس لیے اٹھالیا کہ اس کی گھنٹی کے شور سے امی جی کی آنکھ کھل جاتی' وہ بیمار ہیں ناں' دوا کھا کر سوتی ہیں۔" اس نے دھیمے دھیمے لہجے میں کہا۔

"آپ نے تو میرا دل ہی توڑ دیا' اگر یہ کہہ دیتیں کہ آپ میرے فون کا ہی انتظار کر رہی تھیں تو آپ کا کیا بگڑ جاتا۔" میں نے روٹھے روٹھے لہجے میں کہا تو وہ دھیرے سے ہنس پڑی۔

اور میں نے دل ہی دل میں نعرہ لگایا' واہ بیٹا فواد لڑکی ہنسی تو پھنسی۔

اور پھر میں اس سے دیر تک باتیں کرتا رہا' اس نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ اپنی امی اور ابو کے ساتھ رہتی ہے' امی مزاج کی بہت سخت ہیں۔ اسے باہر زیادہ آنے جانے نہیں دیا جاتا' اس کی سہیلیاں بھی نہیں ہیں' وہ میٹرک میں ہے۔ امی بیمار رہتی ہیں ابو جاب کرتے ہیں۔ میں نے اس سے ادارے کا نام پوچھا تو اس نے کہا کہ "بینک میں۔"

شاید اسے بھی میری طرح تنہائی کا شدید احساس ہوتا ہوگا' اس لیے وہ مجھ سے دوستی پر آمادہ ہوگئی۔

ایک بار میں نے اس سے باہر ملنے کے لیے کہا تو اس نے صاف انکار کر دیا کہ ایسا ممکن نہیں ہے وہ تنہا کہیں نہیں جاتی۔

"تم مارکیٹ وغیرہ نہیں جاتیں کیا؟" میں نے جھلا کر کہا۔

"نہیں!" اس نے قطعی لہجے میں جواب دیا' ابو میرے کپڑے اور ضرورت کی دوسری اشیاء لا دیتے ہیں۔"

"کمال ہے آج کل کے اس ماڈرن دور میں کوئی گھر ایسا بھی ہے جہاں لڑکیوں پر باہر نکلنے میں اتنی سخت پابندی ہو۔" میں نے کہا۔

"دوسروں کا تو مجھے پتا نہیں لیکن ہمارا گھر ایسا ہی ہے۔" اس نے کہا۔

"اچھا ثمینہ تم اسکول تو جاتی ہوگی' مجھے اپنے اسکول کا نام بتاؤ۔ میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں' تمہیں اسکول آتے جاتے ہی دیکھ لوں گا۔" میں نے کہا۔

"آپ پھر بھی مجھے نہیں دیکھ سکیں گے' کیونکہ میں حجاب کرتی ہوں اور وین میں اسکول جاتی ہوں اور اگر آپ میرے اسکول کے راستے میں کھڑے ہوں گے تو میری رسوائی ہوگی۔" اس نے مجھے مکمل طور پر مایوس کر دیا۔

لیکن میں بھی مایوس ہونے والوں میں سے نہیں تھا' میں نے کہا۔ "ثمینہ میں تمہیں گفٹ دینا چاہتا ہوں' بتاؤ کس طرح سے دوں۔"

"گفٹ......" وہ ایک دم چپ ہوگئی۔

"سوری ثمینہ تمہیں برا لگا۔" میں اس کے خاموش ہو جانے سے یہی سمجھا کہ اسے برا لگا ہے۔

"نہیں برا نہیں لگا' بلکہ میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ آپ کا گفٹ کس طرح سے لیا جائے۔" اس نے جواب دیا تو میں خوش ہو گیا اور پوچھا۔

"اچھا یہ بتاؤ تمہیں کیا چاہیے' تمہیں سب سے زیادہ کیا چیز پسند ہے۔"

"پرفیوم!" اس نے جھٹ کہا۔

"کون سا؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی بھی...... بس مجھے پرفیوم بہت پسند ہیں۔"

"مجھے بھی!" میں نے جھٹ کہا۔ "ثمینہ تمہاری اور میری پسند کتنی ملتی ہے' چلو اچھا ہے پسند ایک ہو تو زندگی اچھی گزرتی ہے۔" میں نے شوخ لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟ آپ مجھ سے شادی کریں گے......؟" اس نے فوراً پوچھا۔

"پہلے تم بتاؤ کیا تم مجھ سے شادی کرنا پسند کرو گی۔ جبکہ تم نے تو مجھے دیکھا بھی نہیں ہے۔" میں نے الٹا اس سے سوال کر ڈالا۔

"مجھے پتا ہے آپ بہت اچھے ہوں گے' بالکل اپنی باتوں کی طرح......" اس نے کہا۔

"تمہیں میری باتیں اچھی لگتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بہت!" اس نے دھیرے سے کہا۔

"واقعی!" میں نے خوش ہو کر کہا تو وہ ہنس پڑی۔

اس کی ہنسی کی آواز بھی اس کی آواز کی طرح دلکش تھی' مجھے اپنے چاروں جانب نقرئی گھنٹیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

ہمیں باتیں کرتے کرتے تین مہینے گزر گئے۔ اب مجھے اس کی عادت سی ہوگئی تھی۔ میں دن بھر کہیں بھی ہوتا' تین بجے اپنے کمرے میں آجاتا اور اس سے پورے ایک گھنٹے باتیں کیا کرتا۔ آہستہ آہستہ مجھے اس کے بارے میں مزید معلوم ہوا' اس کی باتوں میں بہت حسرت ہوتی تھی۔ اس کا بھی دل چاہتا تھا کہ وہ بھی باہر گھومنے جائے' شاپنگ کرے' اسے سمندر بہت پسند تھا لیکن وہ صرف ایک بار کلفٹن گئی تھی۔ دوبارہ نہیں گئی۔ اسے مری اور سوات گھومنے کا بھی بہت شوق تھا مجھ سے بہت حسرت بھرے لہجے میں کہا کرتی کہ اسے مری اور اسلام آباد گھومنے کا بہت شوق ہے۔

"پتا ہے فواد جب شہلا باجی گھوم کر آئی تھیں ناں تو وہ پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت ہوگئی تھیں۔ وہ خوش بھی بہت تھیں' ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی ناں۔"

"کون شہلا باجی؟" میں نے پوچھا تو وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوگئی اور کچھ نہیں بولی۔

"بولو ناں بھئی یہ شہلا باجی کون ہیں۔" میں نے دوبارہ پوچھا۔

"وہ......وہ......ناں میری کزن ہے۔" اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا اور خاموش ہوگئی۔

"کیا ہوا تم تو گھبرا گئیں۔" میں نے اس کے لہجے میں چھپی گھبراہٹ کو محسوس کر لیا' مجھے ایسا لگا جیسے وہ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو یا پھر جھوٹ بول رہی ہو۔

"نن......نہیں تو!" اس نے کہا پھر تیزی سے بولی۔ "اچھا...... امی جی اٹھ گئیں میں فون رکھتی ہوں۔" اور یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔

حیرت انگیز طور پر چند ہی دنوں کی گفتگو سے مجھے اس کے ساتھ ایک ذہنی لگاؤ سا ہو گیا۔ وہ مجھ سے بہت سی باتیں کرتی' پیار و محبت کی ٹی وی ڈراموں کی

لیکن اگر میں کبھی کسی اور موضوع پر اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا تو وہ کنی کترا جاتی، کبھی جھنجلا کر کہتی۔

"یہ کیا آپ بور باتیں لے کر بیٹھ گئے، چھوڑیں ان باتوں کو یہ بتائیں آپ نے فلاں فلم دیکھی تھی۔"

پھر وہ کیبل پر کسی نئی آنے والی فلم کے بارے میں باتیں کرنے لگتی، مجھے اس کی یہ باتیں عجیب سی تو لگتی تھیں مگر پھر میں خود ہی کہتا کہ وہ دراصل گھر تک ہی محدود ہے اس کا حلقہ احباب بھی وسیع نہیں ہے۔ شاید اسی لیے اسے صرف فلموں ڈراموں یا پھر رومانی باتوں کے علاوہ کسی اور موضوع پر بات کرنا اچھا نہیں لگتا۔

وقت گزرتا رہا، ریحان بھی لاہور سے اپنے کزن کی شادی اٹینڈ کر کے اور گھوم پھر کر واپس آ گیا، دوسرے دوست بھی آ گئے، پھر ہم سب نے مل کر ایک گیدرنگ رکھی، خوب ہلا گلا کیا، مزے مزے کی باتیں ہوئیں۔ میرے دوستوں نے نئی جگہوں پر نئی دوستیاں لگالیں، وہ فون نمبر بھی لائے تھے، مجھ سے سب نے پوچھا کہ میں نے یہ فارغ وقت کس طرح سے گزارا تو میں نے بھی سوچا کہ انہیں ثمینہ کے بارے میں بتاؤں لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ مجھے اچھا نہیں لگے گا جب یہ لوگ اسے موضوع گفتگو بنائیں گے مجھ سے اس کے بارے میں کرید کرید کر پوچھیں گے اس لیے میں مسکراتے ہوئے ان کی چھیڑ چھاڑ سے لطف اندوز ہوتا رہا اور ان کے کسی بھی مذاق کا برا نہیں منایا۔

میرے اس طرح کے رویے سے میرے دوست سمجھ گئے کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے کیونکہ پہلے جب وہ لوگ میرا مذاق اڑاتے تھے تو میں جھنجلا جاتا تھا لیکن آج ایسا نہیں تھا، دوستوں نے بہت اصرار کیا لیکن میں نے اپنے لب سی لیے اور ثمینہ کا نام زبان پر نہیں لایا، کیونکہ اس کی عزت مجھے بہت عزیز تھی۔

اس روز رات کو میں نے اپنے دل کو ٹٹولا تو مجھے یہ احساس ہوا کہ میں ثمینہ سے محبت کرنے لگا ہوں۔ حالانکہ میں نے تو یہ کھیل تفریح سمجھ کر کھیلا تھا لیکن چونکہ میری فطرت دوسروں سے جدا تھی اور میری زندگی میں آنے والی ثمینہ پہلی لڑکی تھی اس لیے میں اس کی محبت میں سرتاپا گرفتار ہو گیا۔

ان ہی دنوں میرا انٹر کا رزلٹ آ گیا اور اللہ کے فضل سے میرا اے ون گریڈ آ گیا، امی ابو میری اس شاندار کامیابی پر بے حد خوش تھے۔ ہمیں یقین تھا کہ میرا این ای ڈی یونیورسٹی میں باآسانی ایڈمیشن ہو جائے گا۔

میں نے جب ثمینہ کو اپنی کامیابی کی خوش خبری سنائی تو اس نے بہت خوشی کا اظہار کیا اور بولی۔

"اب تو آپ مجھ سے شادی کریں گے ناں......!" میں اس کی بات سن کر بہت حیران ہوا اور کہا۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو ثمینہ ابھی کہاں شادی...... ابھی تو میرا اہم تعلیمی دور شروع ہوا ہے، کم از کم چار سال تو میری پڑھائی مکمل ہونے میں لگیں گے، پھر میں جاب حاصل کروں گا، پھر کہیں جا کر شادی کے بارے میں سوچوں گا۔"

"اتنی دیر......" اس نے بے ساختہ کہا۔ "اور اگر اس دوران کوئی اور مجھے بیاہ کر لے گیا تو......!"

"یہ بھی تمہارے ہاتھ میں ہے، اس بات کا خیال تو تمہیں رکھنا ہے، تم بھی کالج میں ایڈمیشن لے لینا، جب تک میں انجینئر بنوں گا تم گریجویشن کر لینا، تب ہمارے والدین کو بھی اس رشتے پر اعتراض نہ ہوگا۔"

میری بات سن کر وہ خاموش ہو گئی۔ میرے بار بار بلانے پر بھی نہیں بولی اور یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ امی جی کے اٹھنے کا ٹائم ہو گیا ہے۔

میرا ایڈمیشن ہو گیا تھا اور میں اپنی پڑھائی میں مصروف ہو گیا۔ اب یونیورسٹی سے آتے آتے ہی چار بج جاتے تھے، اس وقت امی میرا کھانے پر انتظار کر رہی ہوتیں تھیں اور کھانے سے فارغ ہوتے ہوتے پانچ بج جاتے تھے۔ میری کئی دنوں سے ثمینہ سے بات نہیں ہو سکی، میں خود بھی بہت بے چین تھا لیکن کیا کرتا ٹائم ہی نہیں مل رہا تھا۔ اس روز میں یونیورسٹی سے جلدی آ گیا اور تین بجے اسے کال کی، میری آواز سنتے ہی وہ رونے لگی اور بولی۔

"میں سمجھ رہی تھی کہ آپ مجھے بھول گئے ہیں۔ اب تو آپ کو نئی نئی لڑکیاں مل گئی ہوں گی۔"

"تمہاری جان کی قسم ثمینہ ایسی بات نہیں ہے، میں بہت مصروف تھا، تمہارے بھی اگزام ہونے والے ہیں۔ تم بھی اپنی پڑھائی پر توجہ دو...... ویسے بھی اب اس وقت بات کرنا بہت مشکل ہوگا آج تو میں صرف تمہاری خاطر جلدی آ گیا ہوں ایسا کرتے ہیں کہ رات میں بات کرتے ہیں۔ میں ایک موبائل تمہیں بھی دے دوں گا، پھر رات کو بات کیا کریں گے۔" میں نے کہا تو وہ خوش ہو گئی اور بولی۔ "ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔"

"لیکن میں تمہیں تمہارا تحفہ کیسے دوں گا۔" میں نے کہا۔

"آپ گھر پر آ کر دے دیں۔ میں خاموشی سے لے لوں گی۔"

"ارے واہ! چلو اچھا ہے اس طرح ہم ایک دوسرے کو دیکھ بھی لیں گے۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"اور میرا پرفیوم۔" اس نے جھٹ کہا۔

"وہ بھی لے آؤں گا۔" میں نے پیار سے کہا۔

"اچھا آپ کل شام پانچ بجے آیئے گا میں دروازے پر ملوں گی۔" پھر اس نے مجھے گھر کی لوکیشن سمجھائی، میں نے مکان کا نمبر پوچھا تو بولی۔ "مجھے نہیں معلوم......"

مجھے اس بات پر بھی بڑی حیرت ہوئی، کہ اسے اپنے مکان کا نمبر نہیں معلوم۔ جواب میں اس نے کہا، ہم لوگ کچھ مہینے قبل ہی ادھر آئے ہیں اور ویسے بھی مجھے اس بات کی ضرورت ہی نہیں پڑی کہ مکان کا نمبر معلوم کرتی۔" اس نے مجھے اچھی طرح سے ساری نشانیوں سے سمجھا دیا۔ کہ گلی کے کونے پر کس نام کا میڈیکل اسٹور ہے اور یہ کہ کونے سے تیسرا مکان ہے، باہر ناریل کے درخت لگے ہیں۔ سرمئی رنگ کا گیٹ ہے وغیرہ وغیرہ۔

اس تمام رات میں خوابوں میں ثمینہ کو دیکھتا رہا، کہ وہ ایسی ہوگی ویسی ہوگی، اس کی آنکھیں، اس کے ہونٹ، اس کے بال، اس کی رنگت...... میرے تصور میں اس کا ایک بہت خوب صورت سا امیج بنا ہوا تھا۔

اگلے دن میں نے ایک خوب صورت سا موبائل اور اپنی پسندیدہ پرفیوم کو بہت خوب صورت پیکنگ میں تیار کیا اور شاپر میں ڈال کر امی کو سوتا ہوا چھوڑ کر چپ چاپ گھر سے نکل گیا۔

اس کا گھر میرے گھر سے بہت زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ میں بائیک پر سات منٹ میں ہی وہاں پہنچ گیا اور پھر جیسے ہی گلی میں داخل ہوا، مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا اور میں رک گیا۔

اسی گلی میں میرے دوست ریحان کا گھر تھا، اب کیا کروں...... اگر ریحان نے مجھے دیکھ لیا تو......! میں نے گلی میں جھانکا...... اس وقت زیادہ چہل پہل نہیں تھی۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا سرمئی گیٹ تک آ گیا۔ یہاں باہر کیاری میں ناریل کے درخت بھی لگے تھے لیکن گیٹ بند تھا، ثمینہ نے تو کہا تھا کہ وہ گیٹ پر کھڑی ہوگی، میں خاموش گیٹ پر

کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیا کروں‘ تب ہی آہستہ سے گیٹ کھلا اور ایک چہرہ سامنے آیا......! اور میں وفور شوق سے اٹھی ہوئی نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میرے سامنے ایک سیاہ رنگت کی چھوٹے سے قد کی لڑکی شرمائی شرمائی کھڑی تھی۔

”ثمینہ!“ میرے لبوں سے کراہ کی صورت نکلا تو اس نے مسکراتے ہوئے گردن نفی میں ہلادی اور بولی۔

”میں یہاں کام کرتی ہوں‘ باجی کہہ رہی ہیں کہ آپ جو لائے ہیں وہ دے دیں‘ وہ دروازے پر نہیں آسکتیں۔“

یہ سن کر میں نے سکون کا سانس لیا اور کہا۔ ”ان سے کہو کہ صرف ایک منٹ کے لیے یہاں آجائیں......!“

”نہیں جی وہ نہیں آسکتیں‘ امی جی اٹھ گئی ہیں۔ لائیں جلدی لائیں آپ مجھے یہ شاپر دے دیں۔“ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے ایک قدم باہر نکال کر اپنی سیاہ بھدے اور کھردرے ہاتھ آگے بڑھائے اور میرے ہاتھ سے شاپر چھیننے کے انداز میں لے لیا اور چھپاک سے اندر ہوگئی اور گیٹ بند کردیا۔

میں تھکے تھکے قدموں سے اپنی بائیک کی جانب جانے لگا‘ بائیک میں نے کونے پر ہی کھڑی کردی تھی۔ مجھے بہت زیادہ غصہ آرہا تھا‘ ثمینہ نے بھی حد کردی‘ کیا تھا جو صرف ایک جھلک مجھے دکھادیتی‘ لگتا ہے اسے تو مجھے بھی دیکھنے کا شوق نہیں ہے۔ میں حددرجہ مایوس اور دل گرفتہ سا تھا‘ بائیک پر بیٹھا اور اسٹارٹ کرنے کے لیے کک لگا ہی رہا تھا کہ اچانک بائیک پر ریحان نمودار ہوا مجھے دیکھا تو رک گیا اور حیرانی سے بولا۔

”ارے فواد...... تم! یہاں کیا کررہے ہو...... کیسے آنا ہوا خیریت تو ہے......!“

میں یوں اچانک ریحان کو دیکھ کر حیران رہ گیا اور گڑبڑا گیا‘ میری کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دوں۔ بس اس کی شکل دیکھنے لگا‘ میری پیشانی پر پسینہ اور شکل پر گھبراہٹ دیکھی تو ریحان بائیک سے اتر کر میرے نزدیک آیا اور تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

”کیا بات ہے فواد......؟ سب خیریت ہے ناں تو اتنا گھبرایا ہوا کیوں ہے...... ابے کسی نے گن پوائنٹ پر تیرا پرس اور موبائل تو نہیں چھین لیا۔“

”نن......! نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں چلتا ہوں پھر ملیں گے۔“ میں نے جلدی سے کہا اور بائیک اسٹارٹ کرکے وہاں سے چلا آیا۔

ابھی مجھے آئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ریحان میرے گھر چلا آیا‘ وہ میری حالت دیکھ کر خاصا پریشان ہوگیا تھا اور سمجھ گیا تھا کہ میں کوئی بات اس سے چھپا رہا ہوں۔

میں جتنا اسے ٹالنے کی کوشش کرتا اس کا اصرار بڑھتا ہی چلا جاتا‘ بالآخر تھک کر میں نے اسے سب کچھ بتادینے کا فیصلہ کرلیا اور یہ سوچا کہ ریحان اسی کی گلی میں رہتا ہے ہوسکتا ہے کہ اس کے گھر میں ثمینہ سے ملاقات کی کوئی سبیل نکل آئے‘ ریحان کی ایک چھوٹی بہن بھی تھی وہ ہماری مددگار ثابت ہوسکتی تھی۔

”میں تجھے سب کچھ بتانے کو تیار ہوں لیکن تجھے مجھ سے یہ وعدہ کرنا ہوگا کہ دوسرے دوستوں کو اس بات کی ہوا بھی نہیں لگنے دے گا۔ اگر تو نے وعدہ خلافی کی تو سمجھ لینا وہ میری اور تیری دوستی کا آخری دن ہوگا۔“ میں نے صاف صاف وارننگ دیتے ہوئے کہا۔

”پکا وعدہ کسی سے بھی نہیں کہوں گا لیکن تو بات تو بتا کہ تو نے ایسا کیا کردیا کہ جس کی وجہ سے تو

اتنا پریشان ہے۔“ ریحان نے میرا ہاتھ تھام کر سختی سے دباتے ہوئے کہا۔

”اچھا تو ٹھیک ہے۔ یہاں گھر پر یہ بات کرنا ٹھیک نہیں ہے‘ امی گھر پر ہیں چل سامنے والے پارک میں چل کر بیٹھتے ہیں۔“ ہمارے علاقے گلستان جوہر میں کافی پارک بنے ہوئے ہیں اور ایک پارک تو میرے گھر کے قریب ہی بنا ہوا تھا۔

ہم دونوں پارک میں آگئے اور میں نے اسے شروع سے لے کر آج تک کی ایک ایک بات اس کے گوش گزار کردی۔ وہ خاموشی سے ساری بات سنتا رہا‘ میں جب خاموش ہوا تو وہ بولا۔

”تو نے کون سا گھر بتایا تھا‘ ذرا ایک بار پھر بتانا۔“

میں نے دوبارہ سے اسے ثمینہ کے گھر کے بارے میں بتایا تو وہ حیرانی سے بولا۔

”وہ تو صمدانی صاحب کا گھر ہے۔“

”مجھے اس کے والد کا نام نہیں معلوم تم کہہ رہے ہو تو یہی ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”لیکن رکو...... تم نے بتایا ہے کہ تم صمدانی صاحب کی بیٹی ثمینہ سے بات کرتے ہو لیکن ان کی بیٹی کا نام تو ثمینہ نہیں ہے بلکہ شہلا ہے اور وہ......“

”شہلا!“ میں نے حیرانی سے کہا ہوسکتا ہے کہ اسے گھر میں پیار سے ثمینہ کہتے ہوں۔“

”نہیں بھئی صمدانی صاحب کی صرف دو ہی اولادیں ہیں ایک بیٹا اور ایک بیٹی‘ بیٹے کا نام روحیل ہے اس کی شادی ہوچکی ہے اور وہ امریکہ میں رہتا ہے‘ جبکہ بیٹی کا نام شہلا ہے‘ اس کی بھی ابھی ایک سال قبل شادی ہوئی ہے اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ دوبئی میں رہتی ہے‘ صمدانی صاحب اور ان کی بیوی تو تنہا رہتے ہیں اور تم کہہ رہے ہو کہ تم اس گھر میں کسی ثمینہ سے بات کرتے ہو۔ یہ ثمینہ کون ہے......؟“ اس نے حیران ہوکر سوچتے ہوئے کہا۔

”یار تم نے تو میرا دماغ چکرا کر رکھ دیا ہے‘ اگر یہ بات تھی تو اس نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا۔“ میں نے کہا پھر خیال آیا کہ ہوسکتا ہے کہ تنہائی کے خیال سے صمدانی صاحب نے اپنی کسی بھانجی یا بھتیجی کو اپنے گھر میں رکھ لیا ہو اور اس بات کا اظہار جب میں نے ریحان سے کیا تو اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”ہوسکتا ہے۔“

”میں آج ہی ثمینہ سے اس بارے میں بات کروں گا کہ اس نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا۔“ میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”نہیں فواد ابھی تم اس سے کوئی بات مت کرنا۔ مجھے تو کچھ اور ہی خیال آرہا ہے‘ میں ریحانہ سے کہتا ہوں کہ کل وہ ان کے گھر جائے اور اس ثمینہ کا پتا لگائے‘ پھر میں تمہیں ساری حقیقت کھول کر بتاؤں گا۔ بس تم ایک رات کا صبر کرو اور ابھی ثمینہ سے کچھ مت کہنا اور اس سے اسی طرح بات کرنا جیسے کرتے ہو۔“ ریحانہ نے کہا تو میں نے سوچا کہ ریحان ٹھیک کہہ رہا ہے مجھے ایک رات صبر سے کام لینا ہوگا۔

پھر ہم اپنے اپنے گھر آگئے۔ رات کو میں نے اسی موبائل نمبر پر ثمینہ کو کال کی‘ میں نے فون میں سم لگا کر اپنا نمبر نام کے ساتھ سیو کرکے دیا تھا۔

میں نے جیسے ہی فون کیا اس نے جھٹ فون اٹھالیا اور بولی۔

”فواد آپ بہت پیارے ہو‘ بہت خوب صورت بالکل میرے خوابوں کے شہزادے کی طرح۔“

”اچھا جی تو آپ نے ہمیں دیکھ لیا اور ہمیں خود کے دیدار سے محروم رکھا‘ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی‘ ویسے تم نے مجھے کہاں سے دیکھا تھا۔“ میں نے دل پر جبر کرکے کہا۔

"میں نے کھڑکی سے آپ کو دیکھا تھا لیکن ایک بات تو بتائیں آپ مجھ سے شادی تو کریں گے ناں......!" اس نے بے قراری سے پوچھا۔

"کیا تمہیں میری محبت پر کوئی شک ہے ثمینہ تم بار بار ایک ہی سوال کیوں کرتی ہو۔" میں نے کہا۔

"بس ایسے ہی...... مجھے یقین نہیں آ رہا کہ اتنا پیارا لڑکا مجھ سے محبت کرتا ہے۔" اس نے بے یقینی سے کہا۔ پھر بولی۔ "اچھا کیا آپ مجھ سے اتنی زیادہ محبت کرتے ہیں کہ بغیر دیکھے مجھے اپنا سکتے ہیں۔"

"بالکل......! محبت کسی کی شکل وصورت دیکھ کر تھوڑی کی جاتی ہے یہ تو دلوں کا سودا ہے اور ہمارے دلوں نے ایک دوسرے کو قبول کیا ہے اب تم چاہے جیسی بھی ہو...... میری ہو......!" میں نے کہا۔

"سچ......! آپ کتنے اچھے ہیں۔" اس نے خوشی سے دھیرے سے ہنستے ہوئے کہا پھر بولی۔ "مجھے آپ کے دونوں تحفے بہت پسند آئے ہیں۔ پتا ہے میں نے ابھی پرفیوم کھول کر لگایا ہے دن میں نہیں لگا سکتی امی جی ناراض ہوتی ہیں۔"

"شکر ہے تمہیں تحفے پسند آئے۔" میں نے کہا۔ "اچھا ثمینہ اب کل بات کریں گے مجھے سونا ہے صبح یونیورسٹی بھی جانا ہے۔"

"اتنی جلدی......! ابھی تو ہم نے جی بھر کے بات بھی نہیں کی۔" اس نے مچل کر کہا کوئی اور وقت ہوتا تو میں اس کے اس انداز پر ہزار جان سے قربان ہو جاتا لیکن اس وقت میرا دماغ بہت الجھا ہوا تھا ثمینہ کی شخصیت اب میری نگاہوں میں مشکوک ہو چکی تھی اور اس کے جھوٹ پر مجھے بہت غصہ آ رہا تھا مجھے یہ بھی یاد آ گیا کہ ایک بار اس نے کہا تھا کہ شہلا باجی مری اور سوات اپنی شادی کے بعد گھوم کر آئی تھیں تو بہت خوش تھیں اور میرے پوچھنے پر کہ شہلا کون ہے تو اس نے بتایا تھا کہ اس کی کزن ہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اس نے سچ بولا تھا اگر وہ شہلا کی کزن ہے تو اس میں چھپانے والی کون سی بات ہے۔

میں نے فون بند کر دیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا لیکن نیند میری آنکھوں سے روٹھ چکی تھی۔ میں تقریباً ساری رات ہی بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا صبح کے قریب آنکھ کھلی وہ بھی امی کے جگانے پر لیکن میں کسلمندی سے لیٹا رہا اور دوبارہ سو گیا اس روز یونیورسٹی نہیں جا سکا۔

مجھے شدت سے شام ہونے کا انتظار تھا کہ کب ریحان آئے اور مجھے صحیح صورت حال معلوم ہو امی میری سرخ اور سوجی ہوئی آنکھیں دیکھ کر بے حد فکرمند تھیں وہ بار بار پوچھ رہی تھیں کہ میری طبیعت تو خراب نہیں ہے لیکن میں ذہنی طور پر اتنا زیادہ الجھا ہوا تھا کہ امی سے بھی ڈھنگ سے بات نہیں کر رہا تھا۔

شام کو پانچ بجے ریحان کا فون آیا اور اس نے مجھ سے پوچھا کہ آج میں یونیورسٹی کیوں نہیں آیا لیکن میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کر دیا اور بے قراری سے پوچھا۔

"یار کچھ پتا چلا......!"

"ہاں!" اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تو پارک میں پہنچ میں بھی وہیں آ رہا ہوں۔ وہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں فوراً اٹھا اور پارک جانے لگا امی مجھے آوازیں دیتی رہ گئیں کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے کہاں جا رہے ہو لیکن میں نے امی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور باہر نکل آیا۔

میرے پہنچنے کے پانچ منٹ بعد ہی ریحان بھی آ گیا۔ میں بے قراری سے اس کی جانب بڑھا۔

"ہاں ریحان اب بتا۔"

"بتاتا ہوں ذرا صبر کر...... اچھا پہلے میرے ایک سوال کا جواب دے کیا تو اس سے واقعی محبت کرنے لگا ہے یا محض ٹائم پاس کر رہا تھا۔"

"تو مجھے کیا سمجھتا ہے ریحان کہ میں کیسا لڑکا ہوں یار میں نے محض تفریح کی غرض سے اس سے بات کی تھی لیکن رفتہ رفتہ میرے دل میں اس کی محبت پیدا ہو گئی۔" میں نے کہا۔

"کیا تو اس سے شادی کرنے تک سنجیدہ ہے......؟" اس نے غور سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ناں یار......!" میں نے جھلا کر کہا۔

"اچھا یہ بتا تجھے اس کی کیا بات اچھی لگی...... کیا تو سمجھتا ہے کہ وہ تیرے اور تیرے گھر کے معیار کی ہے۔" ریحان نے کہا۔

"یار تو پہیلیاں مت بوجھا سیدھی طرح سے بتا کہ وہ کون ہے......؟" میں نے پہلے سے زیادہ جھنجلا کر کہا۔

"تو پھر بیٹھ اور تسلی اور ٹھنڈے دماغ سے میری بات سن...... اس نے ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے قریب سیمنٹ کی بینچ پر بٹھاتے ہوئے کہا تو میں اس کی جانب دیکھنے لگا۔ وہ بولا۔

"صمدانی صاحب کی ایک ہی بیٹی ہے جس کا نام شہلا ہے اور وہ شادی کے بعد دوبئی میں رہتی ہے۔ چونکہ صمدانی صاحب کی بیگم بیمار رہتی ہیں شہلا یونیورسٹی میں پڑھتی تھی اس لیے انہوں نے گھر کے کام کاج کے لیے ایک فل ٹائم ملازمہ رکھی تھی جو دن بھر گھر میں رہا کرتی تھی لیکن شہلا کی شادی کے بعد وہ دن رات ان کے گھر میں رہتی ہے اس کا نام ثمینہ ہے اس کا تعلق رحیم یار خان کے ایک دیہات سے ہے اس کے آٹھ بہن بھائی ہیں ماں اور دوسری بہنیں بھی دوسرے گھروں میں کام کرنے جاتے ہیں ابا اور بھائی ٹھیلے پر پھیری لگا کر دن بھر بھوسی ٹکڑے اور ٹین ڈبے جمع کرتے ہیں۔ ثمینہ چٹی ان پڑھ اور جاہل لڑکی ہے اور وہ وہی لڑکی ہے جس نے گیٹ پر آ کر تجھ سے تحفے وصول کیے تھے۔"

ریحان بتا رہا تھا اور مجھے اتنی زور سے چکر آ رہے تھے کہ سارا پارک مجھے اپنے گرد تیزی سے گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس پارک میں موجود ایک ایک مرد عورت اور بچہ میرے اوپر ہنس رہا ہو میری بے وقوفی پر تمسخر سے قہقہے لگا رہا ہو...... بہت سے آنسوؤں کا گولہ میرے حلق میں آ کر اٹک گیا اور میرے ہاتھ پاؤں لرزنے لگے۔

"یار سنبھال خود کو...... فواد...... فواد...... میرے یار...... یہ تجھے کیا ہو رہا ہے...... سنبھال خود کو میرے بھائی......" ریحان مجھے کندھوں سے پکڑ کر زور زور سے ہلا رہا تھا لیکن میری زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکل رہا تھا۔ میں اس وقت اپنے آپ کو دنیا کا احمق اور بے وقوف ترین انسان سمجھ رہا تھا۔ ثمینہ کی شکل اور اس کی باتیں تیزی کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے گردش کر رہی تھیں اس کی بہت سی باتوں پر مجھے حیرت ہوتی تھی تب میں نے کیوں نہیں سنجیدگی سے سوچا کیوں احمق بنتا رہا۔

آواز...... ہاں وہ آواز ہی تھی جس نے مجھے الو بنایا...... بلاشبہ اس کی آواز بہت میٹھی تھی۔ دھیما لہجہ تھا میں اس کی آواز کے دھوکے میں آ گیا پھر نگاہوں میں اس کا سیاہ بھدا اور کھردرا ہاتھ آ گیا جس نے شاپر میرے ہاتھوں سے جھپٹ لیا تھا۔ تبھی وہ مجھے دیکھ کر شرمائی تھی۔

سالی...... الو کی پٹھی...... ایک ماسی...... ماسی کی

بیٹی..... کباڑیے کی بیٹی..... جاہل مطلق..... میں نے اس سے محبت کی..... میں نے خود ہی اپنے منہ پر ایک زور کا تھپڑ مارا اور کہا۔

''اخ تھو' لعنت ہے تجھ پر فواد حسن.....''

میں نے زمین پر تھوک دیا اور اٹھ کر چل دیا۔ ''یار میری بات تو سن.....'' ریحان میرے پیچھے مجھے آوازیں دیتا ہوا آرہا تھا لیکن میں کچھ سن ہی نہیں رہا تھا' بس چلے جارہا تھا۔

میں سیدھا گھر آیا اور اپنے کمرے میں بیڈ پر گر کر رونے لگا..... امی نے میرا چہرہ دیکھا تو میرے پیچھے چلی آئیں اور بے قراری سے میرے اوپر جھک آئیں۔

''کیا ہوا میرے بچے..... کیا بات ہے.....تو کیوں اتنا پریشان ہے' مجھے بتا تو سہی۔'' انہوں نے مجھے اٹھا کر اپنے سینے سے لگالیا۔ تو میں امی کے گلے لگ کر رونے لگا۔

امی کے بار بار پوچھنے پر بھی میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا۔ رات کو انہوں نے ابو سے میرا ذکر کیا تو وہ بھی پریشان ہوگئے تو میں نے ریحان سے لڑائی کا بہانہ بنادیا' امی بولیں' میں ابھی ریحان کو فون کر کے بلاتی ہوں اور تم دونوں کو ڈانٹوں گی' بھلا اچھے دوست بھی بھی لڑتے ہیں۔ تب میں نے انہیں سختی سے منع کیا کہ آپ فون مت کریں' میں خود بات سنبھال لوں گا۔

رات کو جب سب سو گئے تو میں نے ثمینہ کو فون کیا وہ بے چینی سے میرے فون کی منتظر تھی۔

''ثمینہ.....!'' میں نے ٹھہرے ہوئے اور بھاری لہجے میں پکارا۔

''جی.....!'' اس نے سابقہ لہجے میں کہا۔

''تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ تم ثمینہ ہو اور اس گھر میں ملازمت کرتی ہو' میرے سامنے آئیں تو اپنے آپ کو ملازمہ تو کہا لیکن یہ نہیں بتایا کہ تم وہی ہو' اگر تم سچ بتادیتیں تو کیا میری محبت میں کمی آجاتی۔''

میری بات سن کر اسے جیسے سانپ سونگھ گیا اور وہ کچھ نہیں بولی۔

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا' بتاؤ تم نے اپنی اصلیت کیوں چھپائی مجھ سے.....'' میں نے حتی امکان اپنے لہجے کو نرم رکھا۔

''آ..... آپ..... آپ کو..... کے..... کیسے پتا چلا؟'' اس نے اٹک اٹک کر کہا۔

''تم کیا سمجھ رہی تھیں کہ میں امریکہ میں رہتا ہوں' بھئی میں بھی یہیں رہتا ہوں تمہارے محلے میں.....'' میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ مطمئن ہوگئی' تب میں نے کہا۔

''اچھا اب تو تمہیں مجھ سے باہر ملنا پڑے گا..... ملوگی.....؟'' میں نے چالاکی سے کہا۔

''کہاں پر.....؟'' وہ جھٹ راضی ہوگئی اور بولی۔

''پارک میں' کل شام کو مغرب کے بعد آجاؤ۔'' میں نے کہا۔

''آئس کریم کھلائیں گے.....؟'' وہ اپنی اصلیت پر اتر آئی۔

''کیوں نہیں جان من..... جتنی چاہو کھالینا۔'' میں نے کہا۔

اور ہمارے درمیان کل کی ملاقات طے ہوگئی۔

دوسرے دن مغرب کے بعد میں' بہت سوچ سمجھ کر کہ مجھے اس سے کیا کہنا ہے' ساری پلاننگ کر کے پارک چلا گیا۔

وہ ایک بینچ پر بیٹھی میرا انتظار کررہی تھی' مجھے دیکھا تو کھڑی ہوگئی اور مسکرانے لگی' میں نے کہا۔ ''صمدانی صاحب کی بیگم سے کیا بہانہ کر کے آئی ہو۔'' میں نے بغیر خیر مقدمی مسکراہٹ کے سپاٹ لہجے میں پوچھا تو وہ

حیرانی سے میری شکل دیکھنے لگی۔

''بولو..... چپ کیوں ہو؟'' میں نے تیز نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

''یہ آج آپ کس طرح سے مجھ سے بات کررہے ہیں فواد.....!'' اس نے میرا ہاتھ تھام کر بے چارگی سے کہا تو میں نے تیزی کے ساتھ اس طرح سے اس سے اپنا ہاتھ چھڑایا جیسے کوئی مردہ چوہا میرے ہاتھ سے ٹکرا گیا ہو۔

''اس طرح سے بات کررہا ہوں جس طرح سے بات کرنی چاہیے' تم نے کیا سمجھا تھا کہ تم میٹھی میٹھی باتیں کر کے مجھے بے وقوف بناتی رہوگی اور میں تمہیں دیکھے اور ملے بغیر تم سے شادی کرلوں گا' جاہل گنوار..... ماسی..... چھی..... گھن آرہی ہے مجھے تم سے..... لعنت بھیجتا ہوں میں اس سارے وقت پر جو میں نے باتیں کر کے تمہارے ساتھ ضایع کیا۔ کیوں کیا تم نے ایسا..... بتاؤ.....'' میں نے غصے میں زور سے اسے دھکا دیا۔

''مجھے نہیں پتا فواد.....'' اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ ''لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ میں ایک غریب ماسی ہوں' جاہل ہوں گنوار ہوں لیکن آپ سے بے پناہ محبت کرتی ہوں' آپ مجھ سے شادی کرلیں' میں ساری عمر آپ کے پیروں کی مٹی بن کر زندگی گزار دوں گی' آپ کی خادمہ بن جاؤں گی۔ اگر آپ نے مجھ سے منہ موڑا تو میں مر جاؤں گی' جی نہیں سکوں گی۔'' اس نے روتے ہوئے میرے آگے اپنے سیاہ اور بھدے ہاتھوں کو جوڑتے ہوئے کہا۔

''شٹ اپ.....'' میں نے غصے میں پھنکارتے ہوئے کہا۔ ''شٹ اپ اب جو کبھی آئندہ میرا نام تمہارے لبوں پر آیا مجھے تم سے نفرت ہے۔ جاؤ اور جا کر کسی کے گھر کا فرش صاف کرو' یہی تمہاری اوقات ہے۔'' میں نے انتہائی نفرت انگیز لہجے میں کہا اور بنا پیچھے مڑے تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا گھر آگیا۔

میرے سر میں شدید درد ہو رہا تھا' امی سے چائے بنوائی اور سر درد کی ٹیبلٹ کھا کر لیٹ گیا۔ امی مجھے لے کر بہت تشویش میں مبتلا تھیں' انہیں یقین تھا کہ میرے ساتھ کوئی نہ کوئی غیر معمولی بات ضرور ہوئی ہے' وہ میری ماں تھیں اور مجھے اچھی طرح سے پہچانتی تھیں۔

کئی دن ہوگئے' میں پہلے تو ذہنی طور پر خاصا ڈسٹرب رہا' رہ رہ کر اپنی حماقت کا احساس ہو رہا تھا' پھر عشق ومحبت کے اس بے ہودہ کھیل پر پوری طرح سے لعنت بھیج کر میں تندہی سے اپنی پڑھائی میں لگ گیا۔

حالانکہ میرا فون نمبر ثمینہ کے پاس تھا لیکن وہ بھی شاید رو دھو کر خاموش ہو کر بیٹھ گئی تھی' اس نے بھی کوئی فون نہیں کیا۔

اس بات کو پورا ڈیڑھ مہینہ گزر گیا تو میں پوری طرح سے مطمئن ہوگیا کہ بات ختم ہوچکی ہے' اس نے بھی مجھے بھلا دیا ہوگا' میں اپنی اسٹڈی میں مصروف ہوگیا لیکن یہ میری خام خیالی اور خوش فہمی تھی' کیونکہ اب جو کچھ میرے ساتھ ہوا اس نے تو مجھے پوری طرح سے ہلا کر رکھ دیا۔

رات کا ایک بج رہا تھا' میں اب اپنی کتابیں سمیٹ کر بستر پر سونے کے لیے جارہا تھا کہ میرے فون کی بیل بجی' میں نے نمبر دیکھا' ان نون نمبر تھا' پہلے تو میں نے سوچا کہ نہ جانے کس کا نمبر ہے' یقیناً رانگ نمبر ہوگا' آج کل کے اس دور میں جب ہر ایک کے ہاتھ میں موبائل فون آگیا ہے اور اس فون کے ذریعے کوئی بھی اجنبی لڑکی کسی لڑکے کے بیڈروم میں پہنچ جاتی ہے اور

کوئی بھی اجنبی اور نامحرم کسی بھی خاتون کے بیڈروم میں پہنچ جاتا ہے اور رات بھر یہ لوگ ابلیس کو خوش کرنے میں لگے رہتے ہیں' مسجدوں سے اذانوں کی آوازیں بلند ہوتی ہیں تو یہ جذبات میں ڈوبے ہوئے بستروں میں اوندھے منہ لیٹ جاتے ہیں۔

میں نے گھنٹی بجنے دی اور فون ریسیو نہیں کیا۔ فون بج بج کر بند ہوگیا لیکن دوبارہ بیل ہونے لگی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں خوشی خوشی فون ریسیو کر لیتا لیکن ثمینہ والے واقعے کے بعد میں نے اس قسم کے کاموں سے توبہ کر لی تھی۔

فون کی گھنٹی پانچ چھ مرتبہ ہوئی' تب میں نے غصے میں فون کے ریسیور کا بٹن پش کردیا' یہ سوچ کر کہ اگر کوئی لڑکی ہوئی تو اسے خوب ڈانٹوں گا۔

''ہیلو...... کون ہے...... کیا مصیبت آئی ہے تمہارے اوپر رات کے ڈیڑھ بجے......'' میں نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

''ارے ارے اتنا غصہ فواد جی......'' فون سے ثمینہ کی وہی کھنکتی ہوئی آواز ابھری جس نے مجھے اس کا دیوانہ بنادیا تھا۔

''تم......'' میں نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔ ''تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھے فون کرنے کی۔''

''ویسے ہی جیسے آپ کی ہوتی تھی' پہلے آپ مجھے فون کرتے تھے' اب میں آپ کو کر رہی ہوں' بھئی قرض تو اتارنا ہے ناں......!'' اس نے مزے سے کہا۔

''بکواس مت کرو...... وہ محض میری حماقت تھی اور کچھ نہیں' آئندہ مجھے فون مت کرنا...... میرے پاس تمہاری فالتو بکواس سننے کا وقت نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور فون بند کردیا۔

لیکن فوراً ہی اس کا فون پھر آ گیا۔ اس مرتبہ میں نے فون ہی آف کر کے رکھ دیا اور سونے لیٹ گیا لیکن میری نیند اڑ چکی تھی اور پریشان ہونے لگا کہ اب یہ مجھے بار بار تنگ کرے گی لیکن یہ کہہ کر خود کو تسلی دی کہ ہر بار جب میں اسے ذلیل کروں گا تو خود ہی تھک کر بیٹھ جائے گی۔

لیکن اب یہ روزانہ ہونے لگا' وہ مجھے بہت تنگ کرنے لگی' تھک کر میں نے سم چینج کر لی لیکن میں چونکا اس وقت جب ایک دن گھر کے فون پر کسی لڑکی کی کال آئی اور اس نے کہا کہ وہ امی اور ابو سے ایک بہت ضروری کام کے سلسلے میں ملنا چاہتی ہے' امی نے اس کا نام پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ آ کر بتائے گی' تو امی نے کہا کہ آ جاؤ۔

ذرا دیر بعد ہی بیل بجی' نہ جانے کیوں میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور مجھے یقین ہوگیا کہ یہ کال ثمینہ کی ہی ہوگی' اس لیے بیل ہوتے ہی اپنے کمرے میں چلا گیا اور دروازے کے پیچھے سے چھپ کر دیکھنے لگا کہ کون آیا ہے؟

امی نے جا کر دروازہ کھولا تو ایک ادھیڑ عمر عورت اور اس کے ساتھ ثمینہ اندر آ گئیں' اندر آ کر انہوں نے امی کو سلام کیا اور امی نے بھی انہیں ان کے ظاہری حلیے سے پہچان لیا اور کہا۔

''غالباً تم گھروں میں کام کرتی ہو لیکن فی الحال مجھے کسی ماسی کی ضرورت نہیں ہے' میرے پاس ہے' تمہیں میرا نمبر کس نے دیا ہے......؟''

''آپ غلط سمجھ رہی ہیں' ہم آپ کے پاس کام مانگنے کے لیے نہیں آئے بلکہ کسی اور مقصد سے آئے ہیں؟'' ثمینہ نے امی کی بات کے جواب میں کہا۔

''کچھ مالی مدد چاہیے......؟'' امی نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''مدد......!'' ثمینہ نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''مدد تو نہیں البتہ میں انصاف ضرور مانگنے

کے لیے آئی ہوں' فواد کہاں ہیں۔'' اس نے بنا امی کے کہے لاؤنج میں رکھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھتے ہوئے مطمئن لہجے میں میرے بارے میں پوچھا' اس کے ساتھ آئی ہوئی عورت اب تک خاموش تھی۔

''فواد......! فواد سے تمہیں کیا کام ہے؟'' امی کو اس طرح اس کا میرے بارے میں پوچھنا ناگوار گزرا اور انہوں نے ناگوار لہجے میں کہا۔

جب ثمینہ نے میرے بارے میں پوچھا تو میرا دل چاہا ابھی جا کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر سے دھکے مار کر نکال دوں۔ یہ پتا نہیں امی کے سامنے کیا بکواس کرنے والی ہے لیکن یہ سوچ کر خاموشی سے اندر کھڑا رہا کہ دیکھتا ہوں یہ کیا کہتی ہے پھر ضرورت پڑی تو میں اس کے سامنے جاؤں گا۔ اتنے میں ابو بھی اپنے کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آ گئے اور سوالیہ انداز میں امی کی جانب دیکھنے لگے۔

''آپ پوچھ رہی ہیں کہ فواد سے کیا کام ہے......!'' وہ استہزائیہ انداز میں دھیرے سے ہنسی پھر بولی۔

''وہی تو ہے' جس نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا اور مجھے زمانے میں رسوائی اور ذلت کا نشان بنا کر چھوڑ دیا ہے اور اب جب اس کے محبت کے کھیل کی نشانی ظاہر ہوگئی ہے تو وہ چھپ کر بیٹھ گیا ہے۔''

اس ذلیل لڑکی کی یہ بات سن کر امی کا تو جو حال ہوا ہوگا وہ ہوا ہوگا لیکن خود میں غصے کے مارے کانپ رہا تھا' وہ کتنے اطمینان اور بے حیائی کے ساتھ میرے اوپر اتنا گھٹیا الزام لگا رہی ہے۔

''کیا بکواس کر رہی ہے لڑکی...... تو ہوش میں تو ہے۔'' امی نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور ابو ان کی تو جیسے کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا۔

"میں بکواس نہیں کررہی پورے ہوش وحواس میں ایک حقیقت بیان کررہی ہوں' فواد اور میں بہت عرصے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں نا صرف جانتے ہیں بلکہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے' فواد کے دل کا تو مجھے اس وقت نہیں معلوم تھا کہ وہ میرے ساتھ فراڈ کررہے ہیں میں نے تو اپنے دل کی گہرائیوں سے انہیں چاہا تھا اور اسی چاہت میں اندھی ہوکر ان کے کہنے پر کہ اگر مجھ سے سچا پیار کرتی ہو تو اپنا آپ میرے حوالے کردو اور میں نے انہیں اپنی چاہت کا یقین دلانے کے لیے ایسا ہی کیا اور جب ان کا مجھ سے دل بھر گیا اور ہمارے پیار کی نشانی ظاہر ہوگئی تو انہوں نے مجھے دھتکار دیا' اب آپ بتائیں میں کہاں جاؤں' کیا کروں' میں تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی' انہوں نے مجھے برباد کردیا' اب میں آپ کے پاس اپنی فریاد لے کر آئی ہوں کہ آپ ہی مجھے اپنے دامن میں سمیٹ لیں' ورنہ اگر دنیا والوں کو اس بچے کے باپ کا نام معلوم ہوا تو سوچ لیں کہ آپ کی کتنی بدنامی ہوگی۔"

امی تو ثمینہ کے منہ سے اتنی بکواس سنتے ہی صوفے پر گر پڑیں اور ان سے کچھ بھی بولا نہیں گیا ابو البتہ بہت صبر و تحمل سے اس کی بات سنتے رہے وہ خاموش ہوئی تو انہوں نے امی پر ایک نگاہ ڈالی اور ثمینہ سے مخاطب ہوئے۔

"تمہارے پاس اپنی بات کی سچائی میں کوئی ثبوت ہے جس کو دیکھ کر ہم یقین کرلیں کہ کبھی فواد کا تم سے تعلق رہا ہے۔"

"جی ہاں۔" اس نے مطمئن لہجے میں کہا۔ "میں اپنے ساتھ وہ گفٹ لے کر آئی ہوں جو فواد نے مجھے دیئے تھے۔ یہ دیکھیں اس پر انہوں نے میرا نام لکھ کر بڑے پیار سے یہ موبائل اور یہ پرفیوم گفٹ کیے تھے۔ اس موبائل میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ہم نے ایک دوسرے کو کال کی ہے اور رات میں باتیں بھی کیں ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے کندھے سے بیگ اتارا وہ اور وہ گفٹ اور ریپر ابو کے حوالے کردیئے۔ ابو نے ریپر پر لکھی میری تحریر کو بغور پڑھا' موبائل کے اندر کالز کے نمبر اور ٹائمنگ دیکھے اور دونوں چیزیں دیکھتے ہی جیسے ان کے قدموں میں بھی جان نہیں رہی وہ بھی بے جان انداز میں صوفے پر گر سے گئے اور ان کے لبوں سے دہاڑ کی صورت میرا نام نکلا۔

"فواد...... باہر آؤ......!"

اب تو میرے بھی صبر کا پیمانہ لبریز ہوچکا تھا' میں غصے میں بھرا باہر آیا اور مجھے دیکھتے ہی ثمینہ جھٹ اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی اور بولی۔

"فواد آپ......"

"شٹ اپ...... ذلیل فاحشہ لڑکی' تمہیں شرم نہیں آئی مجھ پر اتنا گھٹیا الزام لگاتے ہوئے۔" میں نے خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا ہے فواد......!" ابو نے میرے گفٹ اور ان کے ریپرز زور سے صوفے پر مارتے ہوئے کہا۔

"مم...... میں...... آپ کو سب کچھ سچ سچ بتادوں گا' پہلے آپ اس ذلیل لڑکی کو دھکے دے کر یہاں سے باہر نکالیں۔" میں نے ابو سے کہا اور جواب میں ابو نے اٹھ کر الٹے ہاتھ کا اتنی زور کا تھپڑ میرے منہ پر مارا کہ میں پیچھے پلٹ کر گرتے گرتے بچا۔

"ابو یہ جھوٹ بول رہی ہے' بکواس کررہی ہے ایسا کچھ بھی نہیں ہے ابو...... میں خدا کی قسم کھاتا ہوں۔"

میں نے ثمینہ کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا جس کے لبوں پر گہری طنزیہ مسکراہٹ تھی جیسے کہہ رہی ہو۔

"میری اوقات دیکھ لی...... میں کیا کرسکتی ہوں۔"

"مجھے تم صرف اس بات کا جواب دو کہ یہ تمہاری ہینڈ رائٹنگ ہے یا نہیں۔" ابو نے گفٹ پیپر میرے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"میں مانتا ہوں ابو کہ یہ میری رائٹنگ ہے میں نے ہی یہ لکھا ہے لیکن یہ میں نے اس کے لیے نہیں لکھے تھے' کیا آپ کو یقین آرہا ہے کہ میں اس کے ساتھ محبت کا کھیل کھیل سکتا ہوں۔ میں آپ کو سب کچھ بتادوں گا۔ لیکن پہلے اس فراڈ لڑکی کو یہاں سے نکالیں۔ اس جیسے نیچ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہم لوگوں کو عزت کے نام پر بلیک میل کرسکتے ہیں۔" میں نے کہا تو امی جیسے ہوش میں آ گئیں اور چیختے ہوئے بولیں۔

"آپ ابھی شہریار بھائی کو فون کریں' اسے ان کے حوالے کریں' تھانے میں اسے جوتے پڑیں گے تو اس کی ساری بلیک میلنگ نکل جائے گی۔"

شہریار امی کے بھائی اور میرے ماموں جان تھے جو پولیس میں ایس پی کے عہدے پر تھے۔

"دیکھو لڑکی تم جو کوئی بھی ہو اس وقت یہاں سے جاؤ لیکن جانے سے پہلے میری ایک بات اچھی طرح سے سن لو اگر تم نے میرے بیٹے پر یہ گھناؤنا الزام جھوٹا لگایا ہے تو تمہیں اپنی بقیہ زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارنی پڑے گی اور اگر تم اپنے دعوئی میں سچی ہو تو یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں باعزت طریقے سے تمہیں اپنی بہو بنا کر اپنے گھر لے آؤں گا۔ اور ہاں اس گھر میں دوبارہ آنے سے پہلے یہ بات یاد رکھنا کہ اب میڈیکل چیک اپ کے ذریعے یہ بات آسانی سے پتا لگائی جاسکتی ہے کہ تم سچی ہو یا جھوٹی۔"

یہ کہہ کر ابو نے گھر کے باہر والے دروازے کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا' اس نے موبائل واپس لینے کے لیے ابو کی جانب ہاتھ بڑھایا تو ابو نے وہ اسے واپس نہیں دیئے تو وہ خاموشی سے چلی گئی۔

اس کے جاتے ہی امی نے بھاگ کر دروازہ بند کیا اور روتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے بری طرح مجھے پیٹ ڈالا وہ روتی جارہی تھیں اور کہتی جارہی تھیں۔

"میری تربیت میں کہاں کمی رہ گئی فواد...... تو نے کیسے ہماری عزت کو ان جیسے لوگوں کے ہاتھوں میں روندھنے کے لیے دے دیا۔"

"کیا کررہی ہو ہوش میں آؤ...... پہلے اس کی بات بھی سن لو۔" ابو نے انتہائی تحمل کا مظاہرہ کیا اور امی کے ہاتھ پکڑ لیے لیکن ان پر تو ایک ہیجانی سی کیفیت سوار تھی' اچانک ان کے دماغ میں ایک خیال آیا اور وہ ابو کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ چھڑا کے مجھے کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے بولیں۔

"تو میری قسم کھا کر بتا فواد کہ اس روز جب تو کمرے میں آ کر رو رہا تھا اور کئی دن تک بے حد پریشان رہا تھا تو کہیں اس کی وجہ وہ تو نہیں تھی جو یہ لڑکی بیان کررہی تھی' سچ بتا میری جان کہیں سچ مچ تجھ سے یہ بھیانک گناہ تو سرزد نہیں ہوگیا۔"

"نہیں امی میں آپ کی بلکہ اپنے اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں' بلکہ میری سچائی کا گواہ میرا رب ہے' کہ میں نے ایسا گناہ نہیں کیا' آپ اطمینان سے بیٹھیں میں آپ کو ساری بات بتاتا ہوں۔" میں نے کہا اور امی نے میرے چہرے پر میرے لبوں کی بیان کردہ سچائی کی جھلک صاف دیکھ لی اور انہوں نے پرسکون ہوکر آنکھیں بند کرلیں۔

میں نے امی کے لرزتے اور کانپتے ہوئے وجود کو صوفے پر آرام سے لٹایا اور بھاگ کر فرج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر لایا' گلاس میں پانی ڈال کر اپنے ہاتھوں سے امی کو پلایا' پھر ابو کو پانی دیا' پھر خود پیا۔

لمحہ بھر میں سناٹا سا چھا گیا۔ سب خاموش تھے'

پھر میں نے مختصر سے لفظوں میں اپنا جرم قبول کرلیا۔ امی کو یہ بھی بتایا کہ اس دن میرے رونے کی وجہ صرف یہ تھی کہ ریحان نے مجھے ثمینہ کی حقیقت بتادی تھی۔ میں شدید شاک میں تھا اور اس سے زیادہ احساس ندامت ہورہا تھا' اب کئی دنوں سے یہ مسلسل مجھے فون کررہی ہے لیکن میں اسے ڈانٹ دیتا ہوں اور بات نہیں کرتا' اب اس نے اپنی بات منوانے کے لیے یہ اوچھا ہتھکنڈہ استعمال کیا ہے۔" میں اپنی بات ختم کرکے خاموش ہوا تو ابو نے کہا۔

"بیٹا! غلطی تو آپ نے کی ہے' وہ گھروں میں کام کرنے والی ماسی ہے تو کیا ہوا' سینے میں دل تو رکھتی ہے اور ہر لڑکی کی طرح اسکے بھی جذبات ہیں' آپ نے اس سے محبت کا دعویٰ کیا تو وہ بھی محبت کرنے لگی لیکن آپ کی ساری محبت اس کی حقیقت جانتے ہی ہوا بن کر اڑ گئی' جب کہ اس کے لیے تو ایسی کوئی بات ہی نہیں ہے' تم ہر لحاظ سے بہتر ہو' وہ کم عقل ہے' جاہل ہے' اس لیے اس نے یہ غلط طریقہ اپنایا۔"

میں ندامت سے سر جھکائے ابو کی باتیں سن رہا تھا' تب امی بولیں۔

"ٹھیک ہے جاوید صاحب' وہ جب دوبارہ آئے گی تو میں اسے پیار سے سمجھاؤں گی' نہیں مانے گی تو ڈراؤں گی' امید ہے کہ وہ مان جائے گی۔"

اور پھر اس واقعے کے بعد امی ابو کے سامنے میری نگاہیں ہمیشہ کے لیے جھک گئیں' میں ہمیشہ سے ان کا فرمانبردار تھا اور ہمیشہ رہنا چاہتا تھا' کبھی ان کا دل نہیں دکھانا چاہتا تھا' میں یہ بھی جانتا تھا کہ میری اس حرکت کا امی اور ابو کو بہت دکھ پہنچا ہے' بھلے انہوں نے میری اس غلطی کو جوانی کی پہلی نادانی سمجھ کر معاف کردیا ہو لیکن میں اپنی نگاہوں میں گر گیا تھا۔

دوسرے دن میں یونیورسٹی چلا گیا اور ابو آفس' دوپہر کو گھر آیا تو امی چپ چاپ صوفے پر بیٹھی تھیں۔ دوپہر کا کھانا بھی نہیں بنا تھا۔

میں سمجھ گیا کہ ثمینہ آئی ہوگی' اس لیے امی کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور ان سے پوچھا۔

"امی ثمینہ آئی تھی......؟" تو امی نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

"کیا بات ہوئی؟" میں نے پوچھا تو امی خاموشی سے میری شکل دیکھتی رہیں پھر بولیں۔

"ہاں وہ آئی تھی' آج وہ تنہا آئی تھی' وہ دوسری عورت اس کے ہمراہ نہیں تھی۔ میں نے اس سے بہت پیار سے بات کی اور اسے سمجھایا کہ ایک لڑکی کی عصمت اس کی سب سے بڑی اور قیمتی شے ہوتی ہے' اس پر تم نے خود ہی جھوٹا داغ لگا دیا' تمہیں اپنے ساتھ یہ ظلم نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کیوں جھوٹ بولا تو وہ میری جانب دیکھنے لگی اور اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے' تب میں نے کہا کہ میں مانتی ہوں فواد نے غلطی کی ہے' اس نے تفریحاً ایک رانگ نمبر ملایا اور تم سے بات ہوگئی۔ یہاں غلطی تمہاری بھی ہے' تمہیں ایک اجنبی لڑکے سے بات کرنی ہی نہیں چاہیے تھی اگر تم دوبارہ فون کرنے پر اسے ڈانٹ دیتیں تو وہ پھر فون نہیں کرتا۔

دیکھو بیٹا تمہاری اور فواد کی شادی نہیں ہوسکتی' ہم لوگوں میں اور تم لوگوں میں بہت فرق ہے' شادی وہی کامیاب رہتی ہے جو اپنے لوگوں میں ہوتی ہے' نہ اپنے سے بہت اوپر اور نہ ہی اپنے سے بہت نیچے۔

اور تم فواد سے شادی کرنا چاہتی ہو جب کہ وہ تم سے شادی کرنا نہیں چاہتا' بلکہ پسند بھی نہیں کرتا تو تم کیسے ایک اچھی زندگی گزار سکتی ہو' میری بات مانو...... اس سارے قصے کو بھولنے کی کوشش کرو' اسی میں فائدہ ہے۔"

"میں مرجاؤں گی فواد کے بغیر......" وہ جھٹ میرے پیروں کے پاس بیٹھ گئی اور میرے پیروں پر سر رکھ دیا' اس کے آنسو میرے پاؤں بھگوتے گئے' میں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور اس کے آنسو صاف کیے اور تمہاری جانب سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی۔

اس نے جھٹ میرے ہاتھ پکڑ لیے اور آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولی۔ "آپ بہت اچھی ہیں آنٹی...... مجھے معاف کردیں' میں بہت غلط ارادہ لے کر آئی تھی لیکن خاموشی سے جارہی ہوں لیکن یہ بات ہمیشہ یاد رکھیے گا کہ میں فواد کو کبھی بھی اپنے دل سے نہیں نکال سکتی' شاید اس کی اس بے رخی کے بعد زندہ بھی نہ رہ سکوں...... کاش یہ فون ہی نہ بنا ہوتا...... یا پھر اللہ تعالیٰ جب ہم جیسی لڑکیوں کو جو دوسروں کی خدمت کرنے کے لیے ہی پیدا ہوتی ہیں انہیں سینے میں دل ہی نہ دیتا اور اگر دل دیا تھا تو اس میں محبت کے جذبات نہ دیئے ہوتے۔"

وہ روتی ہوئی چلی گئی فواد...... میرا دل اس کے لیے رو رہا ہے...... تم نے بڑا ظلم کیا ہے اللہ سے بہت معافی مانگو اور توبہ کرو کہ آئندہ کبھی کسی لڑکی کے ساتھ ایسا کھیل کھیلنے کی کوشش نہیں کرو گے' حقیقت بھی یہی ہے اس کا کیا قصور ہے' کہ وہ ایک غریب لڑکی ہے۔" امی نے بھیگے بھیگے لہجے میں کہا۔

"بات غریب ہونے کی نہیں ہے امی...... غریب ہونا کوئی جرم تھوڑی ہے لیکن اس کی فیملی اور بیک گراؤنڈ کیا ہے' آپ جانتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ نری ان پڑھ ہے' امی میرا اور اس کا کوئی میل ہی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"خیر چھوڑو اب وہ جاچکی ہے اور وعدہ کیا ہے کہ اب دوبارہ نہیں آئے گی لیکن سچ پوچھو تو میرے دل پر بہت بڑا بوجھ چھوڑ گئی ہے۔" امی نے کہا اور کچن میں جانے لگیں کہ میں نے کھانا بھی نہیں بنایا کچھ کھانے کے لیے انتظام کرتی ہوں لیکن میں نے انہیں بٹھا دیا کہ آپ رہنے دیں میں بازار سے کچھ لے آتا ہوں۔

پھر دن گزرتے رہے' میں سب کچھ بھلا کر اپنی پڑھائی میں مصروف ہوگیا۔ ثمینہ نے اس دن کے بعد کبھی دوبارہ فون نہیں کیا۔ کبھی کبھار ایک آدھ بار راستے میں وہ مجھے آتی جاتی دکھائی بھی دی تو میں کترا کر نکل گیا۔ میں نے اس دن کے بعد سے ریحان کے گھر ہی نہیں گیا' اس خوف سے کہ ثمینہ نہ نظر آجائے' میری عجیب سی نفسیات ہوگئی تھی۔ میں اس سے خوف زدہ سا ہوگیا تھا۔

میرا آخری سمسٹر بھی ہوگیا۔ پچھلے کئی سالوں میں' میں ثمینہ کو بھول چکا تھا۔ لیکن اتنا ہوا تھا کہ میں نے کبھی کسی اور لڑکی کی جانب بڑھنے کا سوچا بھی نہیں تھا۔

ان ہی دنوں سعودی عرب میں مقیم میری خالہ اور خالو پاکستان آئے وہ ہمارے گھر میں ٹھہرے تھے۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں' خالہ کی خواہش تھی کہ ان کی بڑی بیٹی بنفشہ کی شادی میرے ساتھ ہوجائے' امی کو وہ پسند تھی' اس لیے انہوں نے میری رائے جاننی چاہی تو میں نے یہ فیصلہ ان پر چھوڑ دیا کہ آپ کی مرضی ہے جس کو بھی چاہیں اپنی بہو بنالیں۔

ابھی میری جاب نہیں تھی' بلکہ فائنل رزلٹ آنا باقی تھا' خالو جان نے کہا کہ ابھی منگنی کرلیتے ہیں اور وہاں ریاض میں میں نے فواد کے لیے ایک جاب تلاش کر رکھی ہے' آپ لوگ بھی سعودی عرب آجائیں' پاکستان کے حالات تو ویسے بھی خراب سے خراب ہوتے جارہے ہیں۔

امی ابو اس بات کے لیے راضی ہوگئے اور ایک دن بہت دھوم دھام سے میری اور بنفشہ کی منگنی ہوگئی۔

اس روز ہم سب ہاکس بے جانے کا پروگرام بنا رہے تھے تب ریحان آ گیا۔ امی نے ریحان کی آواز سنی تو تاکید کی کہ جلدی آنا باتوں میں نہ لگ جانا ورنہ دیر ہو جائے گی۔

میں باہر آیا تو ریحان خاصا سنجیدہ دکھائی دیا۔ ”خیر تو ہے تو بڑا پریشان دکھائی دے رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے تو سنا آج کہاں تفریح کا پروگرام ہے۔“ اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”چھوڑ یار کہیں اس خبر کو سن کر تیرے رنگ میں بھنگ نہ پڑ جائے......!“ ریحان نے کہا اور جانے کے لیے پلٹ گیا۔

”ریحان سن...... بتا ناں یار کون سی خبر...... اگر تو نہیں بتائے گا تو ویسے بھی مجھے بے چینی رہے گی۔“ میں نے پیچھے سے ریحان کا ہاتھ پکڑ کر اس کا رخ اپنی جانب کر لیا۔

”کل رات ثمینہ نے خودکشی کر لی ہے۔“ ریحان نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا......!!“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ”کب کیسے......؟“

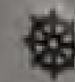
”کل دن میں ریحانہ اتفاق سے صمدانی صاحب کے گھر گئی تھی، اس نے ثمینہ کو بتایا کہ تیری منگنی ہو گئی ہے اور پھر رات میں اس نے کیڑے مارنے والی دوا پی لی۔ صمدانی صاحب کے گھر پولیس آئی تھی، لاش کو پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیا، صمدانی صاحب کو ساتھ لے گئی تھی۔ وہ تو واپس آ گئے ہیں لیکن یار وہ تجھ سے سچی محبت کرتی تھی۔ تیرے کسی اور کے ہو جانے کی خبر کو برداشت نہ کر سکی۔“

ریحان تو مجھے یہ خبر دے کر چلا گیا اور میں کتنے ہی روز بستر پر بخار میں سلگتا رہا، مجھے یہ احساس پشیمانی مارے ڈال رہا تھا کہ میں ہی اس کا قاتل ہوں۔

وقت بہت بڑا مرہم ہے یہ بڑے بڑے زخموں کو مندمل کر دیتا ہے لیکن میں آج بھی ثمینہ کو نہیں بھول پایا ہوں۔

میں، امی، ابو ریاض میں رہتے ہیں۔ میری بنفشہ سے شادی ہو چکی ہے، میں مہینے میں ایک بار ضرور حرم جاتا ہوں اور صحن کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر اللہ سے اپنی اس غلطی کی معافی اور ثمینہ کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہوں۔ اس نے حرام موت کو گلے لگایا، میری وجہ سے، میں اتنا تو کر سکتا ہوں کہ اللہ سے اس کی اس غلطی کے سلسلے میں ملنے والی سزا کو ختم کرنے کی دعا کرتا رہوں۔

میری اس کہانی کو بیان کرنے کا مقصد اپنی نوجوان نسل کو اس گمراہی سے بچانا ہے جو موبائل فون کے ذریعے پھیل رہی ہے، موبائل کمپنیوں والے بھی رات بھر کی کال فری کر دیتے ہیں کم پیسوں میں ہزار پانچ سو ایس ایم ایس فری کر دیتے ہیں، رانگ نمبر پر کسی کی شکل عمر حسب نسب نہیں آتا صرف آواز سنائی دیتی ہے اور یہ گھر بیٹھے شریف نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو بڑی رازداری کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔ نوجوان میں خواہشات ایسی ہی ہوتیں ہیں ایک ہی آرزو دل میں مچلتی رہتی ہے اور یہ آواز ہی دھوکہ دیتی ہیں، ہمارے بچے آج کی اس جدید ٹیکنالوجی سے اپنے آپ کو زخمی کر رہے ہیں، اپنا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں اور بعد میں جب رات کی تاریکی اور تنہائی میں بولنے والی کی صورت سامنے آتی ہے تو ایسی ہی کہانیاں جنم لیتی ہیں۔



روحانی علاج

حافظ شبیر احمد

محمد شہادت حسین...... راولپنڈی

جواب:۔ ہر نماز کے بعد سورۃ الفاتحہ آیتہ الکرسی اور آخری تین قل شریف 3'3 بار پڑھ کر اپنے پر پھونکیں۔

رات سونے سے پہلے 25'25 بار درود ابراہیمی اول و آخر درمیان میں ”سورۃ النصر“ 125 بار پڑھ کر (نوکری) معاشی حالات اچھے ہونے کی دعا کریں۔

اور خود بھی بھاگ دوڑ کریں ناغہ نہ ہو۔

خالدہ نورین...... میاں چنوں

جواب:۔ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ذہنی۔ پریشانی کی وجہ سے پڑھائی پر توجہ نہیں قائم رہتی۔

والدہ اور تینوں بہنیں پڑھیں۔ ”الھم انا نجعلک فی نحورھم ونعوذبک من شرورھم“

نیت:۔ اے اللہ نجات دے (چچا) اس کی نحوست اور شر سے جو ہمارے بارے میں سوچتا اور کرتا ہے۔

صبح و شام ایک ایک تسبیح۔ ہر نماز کے بعد 11 بار ذہن یکسو ہو۔

حمیرا...... وہاڑی

جواب:۔ قوت برداشت اور خود اعتمادی نہیں ہے آپ میں۔ یرقان کا مکمل علاج کروائیں سورۃ طحہ کی پہلی پانچ آیات پڑھ کر پانی پلائیں۔ آپ روزانہ سورۃ القریش ہر نماز کے بعد 41 بار پڑھ کر معاشی حالات بہتر ہونے کی دعا مانگیں۔

بیوی کے لیے:۔ ایک کلو کدو لے کر 8 پیس بنا کر 6 کلو پانی میں پکائیں۔ جب 4 کلو رہ جائے تو اس کو اتار کر ٹھنڈا کر کے چھان لیں۔ وہ پانی آپ کی بیوی پیے۔ اس کے علاوہ پانی استعمال نہ کریں روزانہ یہ عمل کرنا ہے۔

درنجف...... ٹانک سٹی

جواب:۔ ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ ”سورۃ الاخلاص“ پڑھیں۔ اپنے مسئلے کے لیے دعا کریں۔

شازیہ بی بی...... حویلیاں

جواب:۔ رات کو سونے سے پہلے سورۃ الاخلاص 11 بار پڑھ کر پانی پر پھونک مار کر چہرے کو دھوئیں۔ پانی نالی میں نہ جائے باقی جسم کا کانپنا اور درد ہونا قریبی اچھے عامل سے رجوع کریں۔ علاج روحانی ضروری ہے۔

عبدالرحمان...... میانوالی

جواب:۔ 40 روز تک روزانہ ”سورۃ یسین“ شریف مع اول و آخر 11'11 بار درود ابراہیمی کے پڑھ کر پانی پر پھونک مار کر پئیں اور گھر میں بھی چھڑکیں۔ مویشیوں پر بھی چھڑکیں۔ کوشش کریں کہ پلا بھی دیں۔ ان شاء اللہ افاقہ ہونا شروع ہوگا۔

ارم شہزادی...... ایبٹ آباد

بھائی کے لیے۔ اول و آخر 25'25 بار درود ابراہیمی درمیان میں ”سورۃ النصر“ 125 بار پڑھ کر روزگار کی دعا کریں ناغہ نہ ہو۔

ابو کے راضی ہونے کے لیے ”سورۃ الشمس“ 40 بار پڑھ کر پانی پلائیں کہ ضد چھوڑ دیں اور رشتوں کے لیے راضی ہو جائیں۔

کشمالہ سمیر خان......حیات آباد

جواب:۔ جب گھر میں چینی آئے اس پر 3 مرتبہ سورۃ مزمل (اول وآخر 3'3 مرتبہ درود شریف) پڑھ کر دم کردیں۔ وہ چینی گھر کے تمام افراد کے استعمال میں آئے گھر میں لڑائی نہیں ہوگی ان شاءاللہ۔

شوہر کے روزگار کے لیے عشاء کی نماز کے بعد 111 مرتبہ سورۃ قریش (اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف) نیت یہ ہو کہ جو حق میں بہتر ہو (نوکری یا کاروبار) اس میں کامیابی ہو۔ دعا بھی کریں۔

ثمینہ ارشاد......لیاقت پور

جواب:۔ رات کو جب دونوں بچے سو جائیں 41 مرتبہ سورۃ العصر اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

پڑھتے وقت دونوں مسئلے ذہن میں رکھیں۔ پانی پر دم کرلیں صبح نہار منہ دونوں کو پلائیں۔

ہرنماز کے بعد 11 مرتبہ سورۃ القریش پڑھیں دعا بھی کریں۔ روزی میں برکت کے لیے۔

ع ر......مانسہرہ

جواب:۔ رشتوں کے لیے:۔ نوٹ (جن کے رشتوں کا مسئلہ ہے وہ خود پڑھیں) بعد نماز فجر سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74 '70 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ دعا بھی کریں۔

بعد نماز عشاء سورۃ الفلق اور سورۃ الناس 21'21 مرتبہ۔ نیت یہ ہو کہ رشتوں میں جو بندش، رکاوٹ ہے وہ ختم ہو۔

اولاد کے لیے:۔ سورۃ ال عمران آیت نمبر 38 ہرنماز کے بعد 11 مرتبہ۔

عالیہ علی......پشاور کینٹ

جواب:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74 '70 مرتبہ۔ پڑھیں۔ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کریں۔

بعد نماز عشاء 3 مرتبہ سورۃ عبس نیت یہ ہو کہ جو رکاوٹ ہے وہ ختم ہوجائے

صدقہ بھی دیں جو حسب حیثیت ہو۔ جب چاہیں۔

صائمہ......190/9A.L

جواب:۔ آپ خود فجر کی نماز کے بعد "سورۃ الفرقان" آیت نمبر 74 '70 مرتبہ پڑھیں۔ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

عشاء کی نماز کے بعد سورۃ عبس 3 مرتبہ پڑھ کر اپنے اوپر دم کریں۔ اور نیت یہ ہو کہ جو رکاوٹ بندش ہے رشتے میں وہ ٹوٹ رہی ہے۔

"یاولی" بعد نماز عشاء 1000 مرتبہ روزانہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف معنی ذہن میں رکھ کر پڑھیں۔ دعا یہ کریں کہ جو حق میں بہتر ہو وہ فیصلہ ہوجائے۔ اللہ سب سے بہتر کام بنانے والا ہے۔ یہ وظیفہ آپ کی بہن خود پڑھیں۔

شبانہ......قصور

جواب:۔ سورۃ ال عمران آیت نمبر 38 ہرنماز کے بعد 11 مرتبہ بعد نماز عشاء۔ (41 مرتبہ سورۃ الفاتحہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف) اپنی بیماری کے ٹھیک ہونے کا تصور رکھ کر پڑھیں۔ پورے جسم پر دم بھی کریں۔ اور پانی پر پھونک مار کر پئیں بھی۔

ثمینہ کوثر......سرگودھا

جواب:۔ ہرنماز کے بعد 11 مرتبہ سورۃ الاخلاص پڑھیں۔ دعا بھی کریں۔

اللہ بہتر جانتا ہے۔

مریم خان......کراچی

جواب:۔ والدہ کو آیات سحر 11 بار پڑھ کر پانی پر پھونک مار کر پلائیں۔ (3 ماہ)

سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74 '70 مرتبہ پڑھ کر (صرف بعد فجر) رشتہ کی دعا کریں۔

محبت رسولؐ کے لیے صرف اور صرف درود شریف کا پڑھنا ہے۔

شمع......کراچی

جواب:۔ بعد نماز عشاء سورۃ النصر 125 مرتبہ۔ اول وآخر 25'25 مرتبہ درود ابراہیمی دعا بھی کریں اور تصور بھی ہو پڑھتے وقت کامیابی کا۔

طاہرہ بی بی......بہاولپور

جواب:۔ ہرنماز کے بعد سورہ الفلق، سورۃ الناس گیارہ گیارہ مرتبہ۔

جب گھر میں چینی آئے تو اس پر 3 مرتبہ سورۃ المزمل اول وآخر 3'3 مرتبہ درود شریف پڑھ کر دم کردیں چینی سب کے استعمال میں آئے۔ گھر میں بدنظمی نہیں ہوگی۔

روزانہ 313 مرتبہ "یاودود" پڑھ کر پانی پر دم کریں۔ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ وہ پانی شوہر اور بیٹے کو پلائیں۔

عبدالصمد......گوجرانوالہ

جواب:۔ رشتہ کے لیے:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74 '70 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

بعد نماز عشاء سورۃ عبس 3 مرتبہ۔ آپ کے رشتے میں بندش ہے۔ یہ دونوں وظائف کریں اس کے علاوہ کوئی اور وظیفہ رشتہ کے لیے نہ کریں۔ صدقہ بھی دیں۔

اپنے گھر اور معاشی پریشانی کے لیے سورۃ القریش روزانہ بعد نماز عشاء۔ 111 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

ابوبکر کے لیے استخارہ کرلیں کہ بیرون ملک جانا صحیح ہے یا نہیں۔

شہناز بیگم

جواب:۔ ہرنماز کے بعد 11 مرتبہ سورۃ قریش پڑھیں۔ بعد نماز عشاء 3 مرتبہ سورۃ عبس پڑھیں۔ ایک بوتل پر دم کریں اور اپنے پورے جسم پر۔

بوتل کا پانی صبح نہار منہ سب گھر کے افراد کو پلائیں۔

نرگس شاہین ہرنماز کے بعد سورۃ ال عمران آیت نمبر 38 '11 مرتبہ پڑھے۔ اور عشاء کی نماز کے بعد تین مرتبہ سورۃ عبس پڑھے۔ اولاد کی بندش ختم ہونے کے لیے۔

پڑھنے کے بعد اپنے اوپر دم کریں اور پانی پر دم کرکے پئیں بھی۔

ادیبہ جہاں......کراچی

جواب:۔ بعد نماز عشاء سورۃ القریش 111 مرتبہ روزانہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

دکان داری چلے گی اور پارلر کا بہتر حل نکل جائے گا۔ دعا بھی کریں۔ روزانہ پڑھ کر ایک بوتل پر بھی دم کریں۔ وہ پانی روزانہ دکان پر چھڑکیں۔

مریم عارف......سیالکوٹ

جواب:۔ جو بتایا وہ پڑھتی رہیں۔ صدقہ بھی دیں کام میں آسانی ہو۔

ہرنماز کے بعد سورۃ الاخلاص پڑھیں۔ 11 مرتبہ۔

بہن بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر

74' 70 مرتبہ۔ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ دعا بھی کریں۔

ہاجرہ پروین...... میاں چنوں

جواب:۔ رشتہ کے لیے روزانہ سورۃ الفرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

بعد نماز عشاء روزانہ سورۃ یٰسین آیت نمبر 58' 313 مرتبہ (اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف) آپ کے تمام مسئلوں کے لیے۔ دعا بھی کریں۔

مہر بھری...... حیدر آباد

جواب:۔ بعد نماز عشاء روزانہ 40 مرتبہ سورۃ شمس اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ ایک بوتل پر دم کر کے پانی زیادہ سے زیادہ استعمال کروائیں۔ اور وظیفہ کریں۔

نیت یہ ہو کہ دونوں کے دماغ میں جو شیطانیت بھری ہے وہ ختم ہو اور فرمانبردار بن جائیں۔ جب پانی ختم ہو جائے تو پھر سے دم کر لیں۔

قیصر جہاں...... کراچی

جواب:۔ گٹھلی اگر کینسر کی علامت ہے تو آپ کو تیل اور پانی پڑھوانا پڑے گا۔ پانی پینے کے لیے اور تیل مالش کے لیے ان شاء اللہ یہ مسئلہ ختم ہو جائے گا۔

آپ کے شوہر رات سونے سے پہلے اول و آخر 25'25 بار درود ابراہیمی اور درمیان میں "سورۃ النصر" 125 بار پڑھ کر معاشی حالات اچھے ہونے کی دعا کریں۔ ناغہ نہ ہو۔

رخشندہ...... کراچی

جواب:۔ سونے سے پہلے اول و آخر 25'25 بار درود ابراہیمی درمیان میں 125 بار سورۃ النصر پڑھ کر۔ معاشی حالات بہتر ہونے کی دعا کریں۔ ناغہ نہ ہو۔

نوشین گل...... لاہور

جواب:۔ رات کو سونے سے پہلے 25'25 بار درود ابراہیمی درمیان میں 125 بار "سورۃ النصر" پڑھ کر معاشی حالت بہتر ہونے کی دعا کریں۔ تینوں بھائی اور والد پڑھیں۔

نوٹ

جن مسائل کے جوابات دیئے گئے ہیں وہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہیں جنہوں نے سوالات کیے ہیں۔ عام انسان بغیر اجازت ان پر عمل نہ کریں۔ عمل کرنے کی صورت میں ادارہ کسی صورت ذمہ دار نہیں ہوگا۔

ای میل صرف بیرون ملک مقیم افراد کے لیے ہے۔

rohanimasail@gmail.com

روحانی مسائل کا حل کوپن برائے اگست 2013ء

نام...... والدہ کا نام...... گھر کا مکمل پتا......

......

گھر کے کون سے حصے میں رہائش پزیر ہیں......

خوشبو سخن

عمر اسرار

داستانِ محبت

داستانِ محبت ادھوری ہے
اسے انجام دے دو تم
تم نے ہر پل انجام دیا
ادھورے خوابوں کو
تشنہ امنگوں کو
نامکمل تصویر کو مکمل کیا
ساز کو نغمے کو آواز کو
کسی بھی گم گشتہ راز کو
ہمیشہ مکمل کیا تم نے
پزل ہو کوئی سا بھی
حل طلب نہ رہنے دیا تم نے
ہر چیز کو انجام دینے والے
پھر یہ کیسے ممکن ہوا تم سے
ادھوری کیسے رہنے دی تم نے
داستانِ محبت......؟؟

ریحانہ سعیدہ...... لاہور

نظم

سردیوں کی اداس راتوں میں
سینے کی دھڑکنوں میں
چھلک پڑتا ہے لہو بن کر
آنکھوں سے
کبھی بارش کے قطروں سے
کبھی گلابوں پر پڑی شبنم میں
کبھی گھنے درختوں کی چھایا میں
کبھی خشک حنائی ہتھیلی میں
گونج رہا ہے لہو میں
صرف تیرا نام
اے بے وفا میرے
بڑی مشکل سے دل لگایا تھا
بڑی مشکل سے وعدہ نبھایا تھا
اب نہ اعتبار رہا نہ اختیار!
پنجرہ کھلا، پنچھی اڑا
دور افق میں اڑتا تنہا پنچھی
دے گیا یہ پیغام
کبھی نہ دل لگانا
نہ وفا نبھانا
یہ رلائے گی
ایک تربت نئی بنائے گی

شہنی ارشاد...... کراچی

غزل

کیا نہیں دیکھا دل بے زباں میرا
پھر کس بات کا ہے امتحاں میرا
تم مسلط نہ کرو خواہشِ بے جا
یوں ٹوٹ جائے گا پیماں میرا
ہر خار پر گل ہوگا قطرۂ خون سے
رسمِ چمن آرائی ہے ایماں میرا
جب ناؤ ڈبوئے گی بھنور کی آنکھ
دل دریا میں سفر ہوگا رواں میرا
کیا بڑھ گیا تسلسل قربت کا شاہد
حالتِ نزع میں ہے روح رواں میرا

سید عبداللہ شاہد...... حیدر آباد

غزل

میرے غم کی ترجمانی کیا کرے
آنکھ سے ڈھلتا یہ پانی کیا کرے
ہے خزاؤں سے ہمارا واسطہ

ارزوئے شادمانی کیا کرے
دشمنِ جاں ہوگیا سارا جہاں
دوستوں کی مہربانی کیا کرے
تنگ نظری تھپیڑوں میں یہاں
بحرِ دل کی بیکرانی کیا کرے
ٹوٹ کر بکھرا ہو اپنا وجود
چاہتوں کی ترجمانی کیا کرے
ان کے ہونٹوں سے ادا ہوتی ہوئی
پیار کی جھوٹی کہانی کیا کرے
بوجھ ہے خود پر حبس کا وجود
دوسروں کی پاسبانی کیا کرے
ریاض حسین قمر......منگلا ڈیم

صلہ

جینا تیرے بغیر
یہ حوصلہ ہے میرا
تو بھول سکے
تو بھول جا
میری سانسیں کٹیں
میری حیات لٹے
میں برباد ہو جاؤں
محوِ فریاد ہو جاؤں
گلیوں کی خاک بنوں
یا جل کر راکھ ہو جاؤں
میرا دل ٹوٹے
ہاں، میرا دل ٹوٹے
یہ معاملہ ہے میرا
تو بھول جا
جا کسی گل بہار پر
جھول جا
میرا دل دیوانہ
میری چشم بیمار
کبھی دیکھنا بھی
تو آنسوؤں کی قطار پر نا جانا
یاد کر لینا مگر
میرے پیار تک نا جانا
جو تیرا فیصلہ ہے
وہ میرا حوصلہ ہے
نا شکوہ کسی سے
نا گلہ کسی سے
تیرے دل میں جگہ ہے میری
یہی میرے پیار کا صلہ ہے
بس، یہی صلہ ہے......
اللہ دتہ عابد......منچن آباد

جب ہم نہیں ہوں گے
پرچھائیں تک کو ترسو گے
روؤ گے
بہت تڑپو گے
گلیوں کو
راستوں کو دیکھ کر
دیوانگی کی حالت میں
غیروں سے، اپنوں سے
پوچھو گے
تب، قدر پوچھنا ہماری
اپنے پتھر دل سے
چپ چاپ، خاموش
پرنم بے کیف آنکھوں سے
محفلوں کی جگمگاہٹ
دنیا کی رونق
جیون کے حسین شوخ لمحوں میں
کیوں ہم اداس رہا کرتے تھے

پھر ہماری یاد کا روگ لے کر
ٹوٹ جاؤ گے
پل میں بکھرو گے
تب کہاں کیف ہمیں پاؤ گے؟
جب ہم نہیں ہوں گے
عبدالمالک کیف......صادق آباد

غزل

گلشن میں جب بھی پھول کھلتے ہیں دوستو
ہر طرف روشنی سی زندگی میں پاتا ہے کوئی
عشق کی راہ میں غم اٹھاتا ہے کوئی
اندھیری شب میں پھر چراغ جلاتا ہے کوئی
فسانہ اے دل کس کو سنائیں اب جا کر
میرے دل کی پکار نہیں سنتا ہے کوئی
میرے حال پر ہنستی ہے آج دنیا ساری
جانے کس جرم کی سزا پاتا ہے کوئی
کوئی کشش نہیں رہی اب زندگی میں جاوید
مجبور ہو کر سایہ دیوار تلے آنسو بہاتا ہے کوئی
محمد اسلم جاوید......فیصل آباد

غزل

لوٹ کے کوئی نہیں آتا
جو اس شہر سے نکلتا ہے
تیز ہَوا کے باوجود
چراغ میرے مکان کا جلتا ہے
خواہش دل میں رہ گئی
غریب باپ بے گھر لوٹتا ہے
نظر سے دور ہے تو کیا
دل کے وہ قریب ہوتا ہے
دروازے بند رکھنا مکان کے
قاتل شہر میں اب پھرتا ہے
رہبر پر مت اعتبار کرو
جانے وہ کیا کیا سوچتا ہے
وسیم اختر......راولپنڈی

ظالم

مدت ہوئی تیری
بے وفائی پر میری آنکھوں نے
رونا چھوڑ دیا ہے
مگر ظالم!
میرا دل اب بھی روتا ہے
انتخاب: شجاع جعفری......چکوال

غزل

زندگی میں دکھ ملے شام و سحر
پوچھنے والی نہیں کوئی نظر
چل رہا ہوں راستوں میں بے خبر
جل رہا ہے دھوپ میں خونِ جگر
زندگی پھر زندگی بن جائے گی
وہ عنایت کی اگر کر دے نظر
کیا سنائیں گے حدیث زندگی
یہ زمانہ پوچھ لے ہم سے اگر
وہ رہا کر کے مجھے خوش ہوگیا
قید میں جس کی رہا میں عمر بھر
وہ نہیں، دنیا نہیں، کچھ بھی نہیں
کیسے گزرے گا یہ جیون کا سفر
جو ہمیں منزل کا رانا دے پتا
شہر میں ایسا ہو کوئی بشر
قدیر رانا......راولپنڈی

غزل

دل کو ویران کر گئے شاید
خواب سارے بکھر گئے شاید
ایک سناٹا رہ گزار میں ہے
قافلے سب گزر گئے شاید

جس طرف دیکھیے قیامت ہے
نیک انسان مر گئے شاید
ٹیس اٹھی نہیں ہے مدت سے
زخم سب دل کے بھر گئے شاید
خوش بوئے گل نہیں چمن میں جمال
پھول سارے نکھر گئے شاید

سمیع جمال......کراچی

غزل

غم کی کوئی بات نہیں ہے
تو جو میرے پاس نہیں ہے
تیری یادیں ساتھ ہیں میرے
ملنے کی بھی کوئی آس نہیں ہے
میری آنکھیں تجھ کو ڈھونڈیں
پر تجھ کو احساس نہیں ہے
غم نگری کا ہوں میں باسی
خوشیاں مجھ کو راس نہیں ہیں
حالت یہ ہے آج کے اکثر لوگوں کی
لہجوں میں بھی مٹھاس نہیں ہے
راہِ وفا کا راہی یارو
کون یہاں اداس نہیں ہے
بے کار ہے اس کا جینا مرنا
سچ کی جسے تلاش نہیں ہے
جس کے پاس ہے علم کی دولت
وہ ہر گز قلاش نہیں ہے
وہ کیسا عجب انسان ہے لوگو
علم کی جس کو پیاس نہیں ہے
افسوس ہے مجھ کو ایسے سارے لوگوں پر
اچھے دنوں کی جن کو آس نہیں ہے
جھوٹ دغا اور دھوکا بازی
اکثر نے عادت ہے بنالی
سوچ رہا ہوں کب سے کاظم
کیوں وافر اخلاص نہیں ہے

کاظم حسین......کراچی

مجبوری

محبت
ایمان ہے میرا
اگر میں چھوڑ دوں اس کو
تو باقی کچھ نہیں بچتا
محبت
ہمسفر میری
اگر رستے میں چھوڑ دوں
تو تنہا کچھ نہیں ہوں میں
محبت
روح میں بس گئی ہے
جو اسے نکال پھینکوں تو
بدن زندہ نہیں رہتا
محبت
امید ہے میری
اگر یہ ٹوٹ جائے تو
جہاں قائم نہیں رہتا

نوخیز انجم......نوگراں جہلم



ذوق آگہی

عفان احمد

اصل اور حقیقی زندگی

یہ مہلت عمل جو زندگی کے نام سے ہمیں ملی ہوئی ہے کسی وقت بھی ختم ہوسکتی ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ اصل اور حقیقی زندگی وہ ہے جو موت کے بعد ہمیں ملے گی۔ دیناوی زندگی اخروی زندگی کی تیاری کے لیے ہے جو یہاں بوئیں گے وہاں کاٹیں گے۔ ہمیں چاہیے کہ اپنا جائزہ لیتے رہیں خوب استغفار کریں۔ مضبوط ارادے کریں عملِ خیر کریں اللہ کی راہ میں خرچ کریں۔ اللہ ربّ العالمین آپ پر خرچ کریں گے۔ آپ کے رزق میں برکت ہوگی۔

وسیم اختر......راولپنڈی

حکمت کی باتیں

- جب تک کام روپے پیسے سے نکلتا ہو جان کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہیے۔
- جو کسی بُرے کو مارتا ہے مخلوق کو اس کی تکلیف سے اور اس کو خدا کے عذاب سے نجات دیتا ہے۔
- دو انسان ملک اور دین کے دشمن ہیں۔ (۱) وہ بادشاہ جس میں بُردباری نہ ہو اور (۲) وہ عابد جس میں علم نہ ہو۔
- موسیٰ علیہ السلام نے قارون کو نصیحت کی۔ ”تو لوگوں پر اسی طرح احسان کر جیسا کہ اللہ نے تجھ پر احسان کیا ہے“
- ملک عقل مندوں سے اور دین پرہیز گاروں سے کمال اور رونق پاتا ہے۔ بادشاہ عقل مندوں کی نصیحت کے اس سے زیادہ محتاج ہیں جس قدر عقل مند بادشاہوں کے قُرب کے محتاج ہیں۔
- شیر سے پنجہ ملانا اور تلوار پر مکا مارنا عقل مندوں کا کام نہیں ہے۔
- اگر تمام راتیں شب قدر ہوتیں تو شبِ قدر کی کچھ قدر و قیمت نہ ہوتی۔
- جو نصیحت نہیں سنتا اس کا ارادہ ملامت سننے کا ہے۔
- عقل نفس کے ہاتھ میں اس طرح گرفتار ہے جس طرح عاجز و مکار عورت کے ہاتھ میں گرفتار ہے۔
- جس کی زندگی میں لوگ اس کی روٹی نہیں کھاتے جب وہ مرجاتا ہے تو اس کا نام بھی نہیں لیتے۔
- جو دوسروں سے بڑھ کر بولتا ہے تاکہ اس کی بڑائی ظاہر ہو تو لوگ اس کی جہالت کا اندازہ لگالیتے ہیں۔

واجد علی......میرپور خاص

چار شرائط

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے راستے میں بیٹھنے سے منع فرمایا اور اگر راستے میں بیٹھنا ہی ہے تو چار شرائط پر بیٹھنے کی اجازت دی ہے۔

۱) راہ میں تکلیف کا باعث نہ بننا۔
۲) نگاہ نیچی رکھنا۔
۳) سلام کا جواب دینا۔
۴) برائی سے روکنا اور نیکی کی تلقین کرنا۔

(بحوالہ صحیح مسلم کتاب اللباس)

شجاع جعفری......تلہ گنگ

شگوفے

بوڑھے نہیں ہوتے......!!

ایک دوست دوسرے سے ”یار تمہیں پتا ہے کہ سگریٹ پینے والے کبھی بوڑھے نہیں ہوتے۔“
”وہ کس طرح؟“ دوسرا دوست حیران ہوتے ہوئے۔
”وہ جوانی میں ہی گزر جاتے ہیں۔“

کیا ضرورت......!!

باپ ”تم نے لڑکی سے کہہ دیا ہے کہ اگر اس نے اپنی مرضی سے شادی کی تو اسے جائیداد میں سے کچھ نہیں ملے گا۔“
ماں ”اس سے کہنے کی ضرورت تھی میں نے لڑکے سے کہہ دیا تھا اور وہ اس دن کے بعد سے نہیں آیا۔“

ریاض بٹ......حسن ابدال

فٹ بال......!!

ایک صاحب روزانہ خواب میں دیکھتے کہ فٹ بال کھیل رہے ہیں اس کیفیت میں وہ بری طرح لاتیں چلاتے ایک روز ان کی بیوی انہیں کسی ماہر نفسیات کے پاس لے گئی۔ ماہر نفسیات نے چند گولیاں دیں اور کہا کہ آج رات سونے سے قبل ایک گولی کھالیجیے گا آپ فٹ بال نہیں کھیلیں گے۔

وہ صاحب چلائے: ہرگز نہیں' آج رات فائنل ہے۔

توہین......!!

اپنی ساس کی توہین کے جرم میں عدالت نے ایک شخص کو سزا دینا چاہی۔ جج نے مجرم سے کہا۔

''تمہارے لیے دو سزائیں تجویز کی ہیں پہلی یہ کہ ایک سال تک تمہاری ساس تمہارے گھر میں رہے گی اور دوسری یہ کہ تم کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ تم ان میں سے ایک سزا پسند کرلو۔

''جناب مجھے پھانسی کی سزا منظور ہے۔'' مجرم نے چلا کر کہا۔

اضافہ......!!

مزدور نے تنخواہ میں اضافے کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا کہ ''جناب میری شادی ہوگئی ہے لہٰذا میری تنخواہ میں اضافہ کیا جائے۔''

''کارخانے سے باہر ہونے والے حادثات کے ہم ذمہ دار نہیں ہیں۔'' منیجر نے فوراً جواب دیا۔

جاوید احمد صدیقی......راولپنڈی

ایک شاعر کا قصہ

ایک شاعر چوروں کے سردار کے پاس گیا اور اس کی بہت تعریف کی۔ اس نے حکم دیا کہ اس کے کپڑے اتارلو اور گاؤں سے باہر نکال دو۔ غریب ننگا سردی میں جارہا تھا کتے اس کو اجنبی سمجھ کر اس کے پیچھے پڑ گئے۔ اس نے چاہا کہ ایک پتھر اٹھائے اور کتوں کو بھگائے زمین پر برف جمی ہوئی تھی' اس لیے عاجز ہوگیا اور کہنے لگا۔ یہ کیا حرکت ہے کتوں کو کھول دیا ہے اور پتھر باندھ رکھا ہے۔ چوروں کا سردار یہ دیکھ کر ہنسا اور کہا کہ اے عقل مند! مجھ سے کچھ مانگ لے۔ اس شاعر نے کہا اگر تو عطا فرمائے تو میں اپنے کپڑے مانگتا ہوں' بس یہی انعام ہوگا انسان انسانوں سے بھلائی کا امیدوار ہوتا ہے۔ مجھ کو تجھ سے نیکی کی امید نہیں ہے میرے ساتھ بُرائی نہ کر۔ چوروں کے سردار کو اس پر رحم آیا اس کے کپڑے واپس کردیئے اور ایک اونی جبہ اور چند درھم اس کو مزید دیئے۔

شریر بداخلاق آدمیوں سے اگر نقصان نہ پہنچے تو یہ بھی غنیمت ہے۔

ظہور حسین شاہ......ہری پور

حاتم طائی اور لکڑہارا

حاتم طائی سے کسی نے پوچھا: آپ نے دنیا میں اپنے سے زیادہ بلند ہمت والا کوئی آدمی دیکھا ہے؟ کہا: ہاں! میں نے ایک دفعہ عرب کے مال داروں کے لیے چالیس اونٹ ذبح کرائے تھے پھر کسی ضرورت کی وجہ سے جنگل کی طرف نکلا' ایک آدمی کو سر پر لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے آتا دیکھا۔ میں نے اس سے کہا: آج حاتم طائی کی طرف سے دعوت ہے تم کھانے کے لیے کیوں نہیں گئے؟ اس نے جواب دیا: جو شخص اپنے ہاتھ کی محنت سے کما کر کھاتا ہے اس کو حاتم طائی کے احسان کا بوجھ اپنے سر پر اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھانا بڑی ہمت کی بات ہے۔

محمد کامران شہزاد......بھکر

روزہ

کبھی روزہ نہیں رکھا مگر افطار کرنا ہے
ہمیشہ خود کو ظاہر ہم نے روزہ دار کرنا ہے
یہاں پر لوڈشیڈنگ ہے تو بھونپو خاک بولے گا
میاں جلدی سے بتلاؤ کہ کب افطار کرنا ہے

فقیر محمد بخش لنگاہ......خانیوال

شیخ کا ایک قیمتی ارشاد

اللہ تعالیٰ کی بخششوں نے ایک ایسے گمراہ کے راستہ میں جو خلاف شرع کاموں میں ڈوبا ہوا تھا' ہدایت کا چراغ رکھ دیا یہاں تک کہ وہ اللہ والوں کی جماعت میں داخل

ہوگیا' اللہ والوں کی صحبت اور ان کے اخلاص کی برکت سے اس کے بُرے اخلاق واعمال اوصاف حمیدہ سے بدل گئے اور اس نے اپنے ہاتھ کو دنیا کی محبت اور لالچ سے کھینچ لیا' لیکن بُرا کہنے والوں کی زبان اس کے حق میں اسی طرح دراز رہی اور وہ کہتے رہے کہ یہ پہلے ہی طریقہ پر ہے اس کی پرہیزگاری اور نیکی کا کوئی اعتبار نہیں۔ حضرت سعدی فرماتے ہیں: عذر اور توبہ کرکے خدا کے عذاب سے بچ سکتے ہیں لیکن لوگوں کی زبان سے نہیں چھوٹ سکتے۔ وہ بے چارہ لوگوں کے طعنے برداشت نہ کرسکا اور اپنے شیخ کے سامنے شکایت کی کہ لوگوں کی زبانوں سے تنگ آ گیا ہوں۔ انہوں نے فرمایا: اس نعمت کا شکر کس طرح ادا کرے گا کہ لوگ تیرے متعلق جیسا خیال رکھتے ہیں تو اس سے کہیں بہتر حالت میں ہے' یہ حالت اس سے بہتر ہے کہ تو حقیقت میں بُرا ہو اور لوگ تجھ کو نیک سمجھتے رہیں۔

لوگوں کا گمان ہمارے بارے میں کامل ہونے کا ہو اور ہم حقیقت میں ناقص ہوں یہ بڑے خسارے اور فکر کی بات ہے۔

نایاب صدف......ملتان

اشتہار

کچھ دن پہلے ایک معروف اخبار میں ''بچھڑے درکار ہیں'' کا اشتہار دیکھ کر ایک پل کو تو ہم ہل گئے۔ اس کے نیچے لکھا تھا کہ اگر آپ اپنے بچھڑے بیچنا چاہتے ہیں تو اس نمبر پر رابطہ کریں اور نیچے دو نمبر درج تھے۔ میں ایک دم پریشان ہوگیا معاملہ کیا ہے ہم اپنے بچھڑنے والوں کو روتے ہیں ہم انہیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور یہاں بیچنے کی بات ہو رہی ہے۔ بھلا اپنے بچھڑے بھی کوئی بیچتا ہے۔ اپنے پیاروں کو بھی کوئی بیچتا ہے خیر یہ گتھی تو بعد میں سلجھی کہ دراصل ہم نے ہی اس اشتہار کو غلط نظروں سے دیکھا تھا۔ اصل میں انہیں ''بچھڑے'' درکار تھے اور ہم سمجھے ''بچھڑے'' کم عقلی کی بھی حد ہوتی ہے۔

عبدالمالک کیف......صادق آباد

حقیقی دوست کون؟

جو دُکھ درد میں شریک ہو' تکلیف اور مصیبت کے وقت کام آئے وہ حقیقی دوست ہے یوں دستر خوان پر تو دشمن بھی دوست معلوم ہوتا ہے' جو تمہاری خوش حالی میں دوستی کا دعویٰ کرتا ہے اس کی دوستی کا کوئی اعتبار نہیں۔

شیخ داؤد احمد شہباز......لاہور

دنیا کی بے ثباتی و ناپائیداری

ہوشیار آدمی کے نزدیک دنیا تنکے کی مانند ہے کہ ہر زمانہ میں دوسری جگہ ہے' دنیا سے دل لگانا فضول۔ یہ پرائی ہے' گویے کی طرح ہر روز الگ گھر میں ہے۔

ایسے دل بر کے ساتھ زندگی مناسب نہیں ہے جس کا ہر صبح نیا شوہر ہو' کسی کو یہاں ہمیشہ رہنے کی امید نہیں ہے کیوں کہ یہ دنیا خود ہمیشگی کی جگہ نہیں ہے۔

اس دنیا کی محبت اور رنگ ریلیوں میں دل مت لگانا سعدی رحمہ اللہ تعالیٰ کی یہی ایک بات کافی ہے تھوڑے دن کی اس زندگی پر فخر مت کر بلکہ سوچ سمجھ کر آخرت کے سفر کی تیاری میں مشغول رہ' اس مسافر خانہ میں کس طرح دل لگ سکتا ہے' احباب چلے گئے اور ہم راستہ میں ہیں۔

مال' حکومت' عہدہ اور لشکر کا کوئی بھروسہ نہیں تجھ سے پہلے لوگ گئے اور تیرے بعد بھی رہیں گے۔

اے بھائی! دنیا کسی کا ساتھ نہیں دیتی لہٰذا اپنے دل کو دنیا کے خالق و مالک کے ساتھ جوڑ لے۔

عالیہ انصاری......کراچی

ماں

''ماں'' میں جب بھی کبھی اس لفظ کے بارے میں سوچتی ہوں تو فوری طور پر ایک مسکراہٹ میرے چہرے پر بکھر جاتی ہے اس لفظ میں گہری آسودگی موجود ہے جسے ہر ایک خواہ مرد ہو یا عورت محسوس کرسکتا ہے۔ ایک عورت کو کئی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے' ایک وقت وہ بیٹی ہوتی ہے' ایک بہن پھر ایک بیوی اور بالآخر ایک ماں جیسا کہ ہر رشتے کی اپنی اہمیت یا قدر و قیمت ہے لیکن سب سے گہرا' معاون اور قابل قدر رشتہ ''ماں'' ہے۔ ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق اولاد پر پچھتر فیصد

حق ماں کا اور پچیس فیصد حق باپ کا ہے۔ اس حدیث کے جاننے کے بعد کیا کوئی ماں کے مقام کا تصور کرسکتا ہے؟ میں نہیں جانتی بلکہ یہ بات میرے لیے ناقابل فہم ہے کہ مدرز ڈے صرف ایک دن تک کیوں محدود ہے خاص طور پر جب مسلم دنیا میں اس رشتے کی اعلیٰ اقدار اور مقام ہے۔ "ماں" بچے کو نو ماہ تک اپنے پیٹ میں رکھتی ہے اور جب بچے کی پیدائش ہوتی ہے تو ماں ایک انتہائی تکلیف دہ عمل سے گزرتی ہے ان تمام مشقتوں اور تکالیف کے باوجود اس کی غذا کا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ انتہائی محبت سے اس کی نگہداشت کرتی ہے۔ یہ محبت اور لگن زندگی بھر کم نہیں ہوتی، درحقیقت وہ اپنی فیملی کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کردیتی ہے وہ "چلڈرنز ڈے" صرف ایک دن کے لیے نہیں مناتی اور نہ ہی وہ اپنے بچے سے ایک دن کے لیے پیار کرتی ہے تو ایسا کیوں ہے کہ مدرز ڈے صرف ایک ہی دن منایا جائے ہمارا ہر دن مدرز ڈے ہونا چاہیے۔ آج مسلم معاشرے نے مغربی دنیا سے مدرز ڈے اور "فادرز ڈے" منانے کی یہ رسم اختیار کرلی ہے لیکن درحقیقت مغربی معاشرے کے لوگ اپنی مصروفیات کے باعث اپنے بزرگوں کو اولڈ ہومز میں بھیج دیتے ہیں اور سال میں ایک مرتبہ اپنے بزرگوں سے ملنے چلے جاتے ہیں اور ایسا کرکے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان پر ان کے ماں باپ کی جو ذمہ داریاں ہیں وہ انہوں نے پوری کردی ہیں جبکہ حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ ہمارا مذہب اسلام اپنے والدین کے ساتھ اچھے سلوک کی تعلیم دیتا ہے کہ ہم عمر بھر ان سے پیار کریں، ان کی عزت کریں۔ ماں باپ سے حسن سلوک کا یہ عمل آپ کو جنت میں لے جائے گا۔ جب کبھی میں مجھ سے اور میری اولاد سے اپنی ماں کی محبت کو محسوس کرتی ہوں میں اپنے ذہن میں اللہ کی محبت کو محسوس کرتی ہوں کہ وہ ہم سے ہماری ماں کی بہ نسبت ستر گناہ زیادہ محبت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں کہ انہوں نے مجھے ماں جیسی عظیم ہستی دی جو کہ مجھ سے میری سوچ سے بھی زیادہ محبت کرتی ہے۔ انہوں نے اتنی اچھی تربیت دی جس سے مجھے معاشرے میں باعزت مقام ملا، یہ ان ہی کی جدوجہد ہے کہ نہ صرف یہ کہ میری بلکہ میری پوری فیملی کی زندگی سیدھی راہ پر گزرے جب میں بچی تھی تو میں اکثر اپنی ماں کی اور اپنی استاد کی نقل کرتی تھی کہ وہ میک اپ کیسے کرتی ہیں، کیسے زیورات پہنتی ہیں لیکن میری ماں نے مجھے یہ سمجھایا کہ میں یہ سب کچھ نہ کروں، سادگی سب سے بہترین چیز ہے۔ یہ سب باتیں بتدریج میرے ذہن میں سرائیت کر گئیں اور سادگی میری پسند اور میری زندگی کا مظہر بن گئی۔ اللہ تعالیٰ نے ماں کی شکل میں مجھے جو خوب صورت ترین تحفہ دیا ہے اگر میں اس کے لیے زندگی بھر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی رہوں تو یہ اس کے لیے یہ ایک زندگی ناکافی ہے۔ میرا تعلق کسی امیر ترین فیملی سے نہیں ہے لیکن میرے ماں باپ نے اس بات کو یقینی بنایا کہ ان محدود ذرائع کے باوجود ہم اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کرسکیں کبھی میں نے اپنی زندگی میں ماں کی محبت کی کمی محسوس نہیں کی اور اسی وجہ سے میری زندگی میں آسانیاں ہوئیں چنانچہ میں کیوں کسی ایک دن کو "مدرز ڈے" کے طور پر مناؤں میرا ہر دن مدرز ڈے ہے۔ میں دنیا میں سب لوگوں سے اور بالخصوص پاکستانیوں سے یہ کہنا چاہوں گی کہ اس دن کو کسی ایک دن تک محدود نہ کریں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ میری ماں دنیا کی بہترین ماں ہے کیوں کہ ہر ماں بہترین ماں ہے کیوں کہ ہر ماں اپنے مخصوص انداز میں اپنے بچوں سے پیار کرتی ہے۔ میں ہر اس ماں کو سلام کرتی ہوں جنہوں نے اپنی زندگی اپنے بچوں کی بہتری کے لیے وقف کردی اور یہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ ہم سوچ سکتے ہیں۔

آخری قسط

گنگا کا پجاری

اے حمید

جب بھی بارش اور جنگل کے ساتھ ہندوستان کا تذکرہ آتا ہے، ذہن میں صرف اور صرف ایک ہی شخصیت کا تصور اور پیکر چھن سے اتر آتا ہے وہ تصور اور پیکر محترم اے حمید کا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے، ان کے بارے میں نئے افق کے مدیر اور معروف کہانی کار اظہر کلیم مرحوم فرمایا کرتے تھے۔ اے حمید بارش کی منظر کشی کرتے ہیں تو کمرے میں بند قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ باہر بارش ٹھاٹھ برس رہی ہے اور جب وہ قہوہ کا ذکر کرتے ہیں تو قہوے کی خوشبو چاروں طرف پھیلی محسوس ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ جادوگر تھے جو اپنی تحریر کے ذریعے پڑھنے والے کو اپنے سحر میں جکڑ لیتے ہیں۔
زیر نظر ناول بھی اے حمید کا سفر نامہ جنوبی ہند ہے۔ جس میں آپ کو ایڈونچر سسپنس کے ساتھ معصوم محبتوں کے فسانے بھی ملیں گے۔

میں خوف کے مارے وہیں بیٹھ گیا۔ غیبی عورت کی آواز دوبارہ سنائی دی۔
"جس کی تلاش میں سانپ تمہیں یہاں لایا ہے وہ یہاں لائی ضرور گئی تھی مگر اب وہ یہاں نہیں ہے۔"
میں نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔
"آپ کون ہیں؟"
عورت کی آواز آئی۔
"میرا نام انار بیگم ہے۔ میں ہندوستان کے ایک ترک بادشاہ کی چہیتی کنیز تھی۔"
میں نے سوال کیا۔
"جس کی تلاش مجھے یہاں کھینچ لائی ہے اس کا نام پروین ہے۔ اس کا پہلا ہندوانہ نام پاروتی تھا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد فقیر بابا نے اس کا نام پروین رکھ دیا تھا۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ وہ یہاں کب آئی تھی؟ اسے کون لایا تھا؟ اور اب وہ کہاں ہوگی؟"

انار بیگم کی روح نے گہرا سانس بھرنے کے بعد کہا۔
"تم دنیا والوں کے پاس سوال بہت ہوتے ہیں۔ جواب نہیں ہوتے۔ پروین کو یہاں دو آدمی لائے تھے۔ وہ بے ہوش تھی۔ انہوں نے بے ہوشی کی حالت میں اسے میرے تابوت کے پاس لٹا کر اس پر کچھ منتر پڑھے تھے۔ دونوں آدمی خطرناک سپیرے تھے جن کو کالا علم بہت آتا تھا۔ وہ پروین کو دوبارہ سانپ کی حالت میں تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ وہ آپس میں اس قسم کی باتیں کررہے تھے۔ دیر تک وہ بے ہوش عورت پر کئی قسم کے منتر پڑھ پڑھ کر پھونکتے رہے مگر وہ عورت سانپ کی شکل میں تبدیل نہ ہوئی۔ اس کے بعد وہ اسے اٹھا کر یہاں سے لے گئے۔"
"پھر کیا ہوا؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔
انار بیگم کی روح نے کہا۔
"تم مجھ سے وہ باتیں پوچھ رہے ہو جن کا مجھے علم نہیں ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ میں نہیں

جانتی۔"
میں نے بڑے ادب سے کہا۔
"اے محترم روح! کیا تم مجھے کوئی ایسا طریقہ بتا سکتی ہو جس پر عمل کر کے میں پروین کے پاس پہنچ سکوں؟"
انار بیگم کی روح نے کہا۔
"تم اس کے پاس پہنچ بھی گئے تو تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"
"وہ کیوں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔
روح گویا ہوئی۔
"وہ اس لیے کہ ان سپیروں نے پروین پر ایسا خطرناک منتر پھونکا تھا کہ اب وہ خود پریشان ہیں کہ اس منتر کا توڑ کیسے کیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ اس منتر سے پروین سانپ میں تبدیل ہو جائے گی اور اس کی مدد سے زمین میں مدفون بادشاہوں کے خزانے لوٹ سکیں گے لیکن منتر الٹا پڑ گیا۔ پروین اب جسمانی حالت میں زندہ ضرور ہے مگر اس کی روح اس کے جسم سے نکل کر کسی اور جگہ پہنچ چکی ہے۔"
میں پریشان ہو گیا۔
"تو کیا پروین مر چکی ہے؟ کیا اب اس کی روح کبھی اس کے جسم میں واپس نہیں آئے گی؟"
اس پر انار بیگم کی روح نے جواب دیا۔
"نہیں، پروین مری نہیں، وہ زندہ ہے مگر دنیا والوں کے لیے وہ مر چکی ہے۔"
میں نے کہا۔
"کیا میں پروین کی روح سے بھی نہیں مل سکتا؟ آپ میری ملاقات پروین کی روح سے کرا سکتی ہیں؟"
انار بیگم کی روح نے کہا۔
"ہاں، ایسا ہو سکتا ہے۔ پھر شاید تمہیں پروین کی روح خود کوئی ایسا طریقہ بتا دے کہ اس کی روح دوبارہ اپنے جسم میں واپس جا سکے۔"
میں نے انار بیگم سے کہا۔
"اے نیک دل روح! مجھے ایک بار پروین سے ملا دو۔ میں تمہارا احسان ساری زندگی یاد رکھوں گا۔"
انار بیگم کی روح بولی۔
"چونکہ پروین کی روح کا رشتہ اپنے جسم کے ساتھ ابھی تک قائم ہے اس لیے اس کی روح نہ عالم بالا میں ہے نہ عالم برزخ میں ہے اور نہ عالم ارضی میں ہے۔"
"تو پھر وہ کہاں ہے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔
انار بیگم کی روح نے کہا۔
"پروین کی روح عالم ارضی اور عالم برزخ کے درمیان بھٹک رہی ہے۔ وہ اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ بات نہیں کر سکتی۔ اپنی مرضی سے کسی کے پاس نہیں جا سکتی۔"
"تو پھر میں اس سے کس طرح مل سکتا ہوں؟"
"پروین کی روح سے ملنے کا صرف ایک ذریعہ ہے۔ آگرہ شہر کے جنوب میں دلی کی طرف جاتے ہوئے ساتویں میل پر سڑک کی بائیں جانب بیری کے درختوں کے جھنڈ میں ایک پرانی خانقاہ ہے۔ اگر تم آدھی رات کو وہاں جا کر ایک خاص عمل پڑھو تو پروین کی روح ظاہر ہو جائے گی اور تم سے بات بھی کر سکے گی۔"
میں نے کہا۔
"وہ عمل کیا ہے اے نیک روح!"
انار بیگم نے مجھے ایک خاص وظیفہ بتایا اور کہا۔

"یہ وظیفہ پڑھنے سے پہلے خانقاہ کے چبوترے پر قبر کے سرہانے کی جانب اگربتیاں سلگا لینا۔ اس کے بعد وظیفہ ایک سو مرتبہ پڑھنا۔ خدا نے چاہا تو پروین سے تمہاری ملاقات ہو جائے گی۔"
میں نے انار بیگم کی روح کا شکریہ ادا کیا اور تہہ خانے سے نکل کر قلعے سے باہر آ گیا۔ ہوٹل میں پہنچا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ حیرانی کی بات ہے کہ جو وظیفہ مجھے انار بیگم کی روح نے بتایا تھا وہ مجھے زبانی یاد ہو گیا تھا۔ میں بڑی بے چینی سے شام پڑنے کا انتظار کرنے لگا۔ جب سورج غروب ہو گیا تو میں نے غسل کر کے وضو کیا۔ نئے کپڑے پہنے اور ٹیکسی لے کر آگرہ سے دلی جاتی سڑک پر نکل گیا۔ ساتویں میل کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ آگرہ شہر سے نکلنے کے بعد میں نے بائیں جانب دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ جب مجھے کھیتوں میں کہیں بھی بیری کے درختوں کے جھنڈ دکھائی نہ دیئے تو میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا۔
"یہاں ایک خانقاہ ہے۔ مجھے وہاں جانا ہے۔"
ڈرائیور بولا۔
"آپ شاہ کی خانقاہ پر جائیں گے؟"
میں نے سوچا کہ وہی خانقاہ ہو گی۔ میں نے کہا۔
"ہاں وہیں جانا ہے۔"
دو تین میل آگے جانے کے بعد بائیں جانب مجھے بیری کے درختوں کا ایک بہت بڑا جھنڈ نظر آیا۔ ڈرائیور بولا۔
"وہ سامنے شاہ جی کی خانقاہ ہے۔"
میں نے کہا۔ "بس یہیں ٹیکسی روک لو۔"
میں اپنے ساتھ اگربتیوں کا پورا بنڈل اور رومال میں گلاب کے پھول بھی لایا تھا۔ ٹیکسی والے کو رخصت کرنے کے بعد میں کھیتوں میں سے گزرتا ہوا شاہ جی کی خانقاہ کے دروازے پر پہنچ گیا۔ خانقاہ پر بیری کے گھنے درختوں نے اپنا سایہ ڈال رکھا تھا۔ درختوں کی ٹہنیاں خانقاہ کے صحن پر جھکی ہوئی تھیں۔ صحن میں ایک پرانی قبر بنی ہوئی تھی۔ میں نے جاتے ہی قبر پر گلاب کے کچھ پھول ڈالے، تین چار اگربتیاں سلگا کر قبر کے سرہانے کی طرف لگا دیں۔ پھر فاتحہ پڑھ کر مرحوم کی روح کو ثواب پہنچایا اور وہیں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔
مجھے اب آدھی رات گزرنے کا انتظار تھا۔
شام کے وقت میں اس لیے آ گیا تھا کہ رات کے اندھیرے میں مجھے خانقاہ تلاش کرنے میں مشکل پیش آ سکتی تھی۔ خانقاہ پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس خاموشی کو کبھی کبھی دور سڑک پر سے گزرنے والی کوئی گاڑی یا ٹرک کی آواز توڑتی اور اس کے بعد پھر خاموشی چھا جاتی۔ شام کا سرمئی اندھیرا آہستہ آہستہ رات کے اندھیرے میں گم ہوتا گیا۔ پھر ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ میں نے جیب سے موم بتی نکال کر قبر پر روشن کر دی اور وہیں بیٹھ کر آدھی رات کے گزر جانے کا انتظار کرنے لگا۔
میں نے کلائی پر گھڑی باندھی ہوئی تھی۔ وقفے وقفے کے بعد گھڑی پر نگاہ ڈال کر وقت دیکھ لیتا تھا۔ جیسے جیسے رات گزر رہی تھی خانقاہ پر چھائی ہوئی خاموشی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ جب رات کے ٹھیک بارہ بج گئے تو میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ قبر کے پہلو میں گلاب کے سارے پھول بکھیر دیئے باقی کی اگربتیاں بھی سلگا کر قبر کے پاس ہی لگا دیں۔ اس کے بعد اللہ کا نام لے کر وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ وظیفہ ایک سو بار پڑھنا تھا۔

میں آنکھیں بند کیے وظیفے کا ورد کرتا رہا۔ ساتھ ساتھ گنتا بھی جا رہا تھا جب پورے سو کی گنتی مکمل ہوگئی تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ خانقاہ پر موم بتی کی دھندلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اگر بتیوں کی خوشبو نے فضا کو لبریز کر دیا تھا۔

اچانک ایسی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی جیسے کسی نے ٹھنڈا سانس بھرا ہو۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

''پروین؟ پروین کیا یہ تم ہو؟''

مجھے پروین کی بڑی نحیف سی آواز سنائی دی۔

''ہاں' میں ہوں۔ پروین کی بھٹکتی ہوئی روح۔''

میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

''پروین! خدا کے لیے مجھے بتاؤ تم کہاں ہو؟ تم کس حالت میں ہو؟ مجھے اپنی صورت تو دکھا دو۔''

پروین کی آواز آئی۔

''میں نہ عالم بالا میں ہوں نہ عالم برزخ اور نہ عالم ارضی میں رہتی ہوں۔ میں چونکہ ابھی تک مردہ نہیں ہوں اور میری روح کا میرے جسم کے ساتھ ایک باریک سا رشتہ قائم ہے اس لیے میں عالم حیرت میں بھٹک رہی ہوں۔ میں صرف تمہیں خواب میں مل سکتی ہوں۔ خواب میں ہی تمہیں اپنی شکل دکھا سکتی ہوں اور خواب میں ہی تم میری شکل دیکھ سکتے ہو اور مجھ سے بات کر سکتے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''تو خدا کے لیے مجھے خواب میں ملنے کے لیے آ جاؤ۔''

پروین کی روح کی آواز آئی۔

''آج رات میں تمہیں خواب میں ملنے آؤں گی۔ تم رات کو وضو کر کے اور کلمہ شریف پڑھ کر سونا۔ میں تمہیں ملنے آ جاؤں گی۔ اب میں جاتی ہوں۔ میں زیادہ دیر کسی جگہ نہیں ٹھہر سکتی۔ شاید یہ مجھے میرے گزشتہ برے اعمال کی سزا مل رہی ہے۔ میرے حق میں دعا کرنا کہ خدا میرے گناہ معاف کر دے۔ میں جا رہی ہوں۔ خدا حافظ۔''

اس کے بعد موم بتی کی لو تھرتھرائی اور پھر پروین کی آواز نہ آئی۔ وہ جا چکی تھی۔ میں بہت اداس ہوگیا تھا۔ پروین پر سخت مصیبت نازل ہوگئی تھی۔ میں اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ میں نے پروین کو تاج محل کے مینار کے چکر لگانے کی کیوں اجازت دی۔ میں اسے روک لیتا' اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا' مگر ہونی ہو کر رہتی ہے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ گائیڈ کے روپ میں میری بدنصیبی میرے سامنے آن کھڑی ہوئی ہے۔

میں دیر تک خانقاہ میں قبر کے پاس بیٹھا خدا کو یاد کرتا اور خداوند کریم سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہا۔

ایک دو بار میری آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے۔ آخر جب آسمان پر صبح کا نور نمودار ہونے لگا تو میں نے ایک بار پھر قبر میں آسودہ خاک بزرگ کی روح کے ایصال ثواب کے لیے فاتحہ پڑھی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا خانقاہ سے باہر نکل آیا۔ سڑک پر ابھی تک پچھلے پہر کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ صبح کے نور کی روشنی آسمان کے مشرقی افق پر آہستہ آہستہ اجاگر ہو رہی تھی۔ کوئی رکشا ٹیکسی وہاں نہ ملی۔ پیدل ہی آگرہ شہر کی طرف چلنے لگا۔ شاید ایک آدھ میل پیدل چلا ہوں گا کہ پیچھے سے گاڑی کے ہارن کی آواز آئی۔ میں سڑک کے کنارے ہوگیا۔ پیچھے دیکھا تو گاڑی کی اوپر سرخ بتی جل رہی تھی۔ یہ کوئی ٹیکسی تھی اور خالی تھی۔ میں نے ہاتھ دے دیا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں ڈرائیور نے مجھے

دیکھ کر گاڑی روک لی۔

''شہر جاؤ گے بابو؟''

''ہاں بھئی۔''

میں ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور کو ہوٹل کا نام بتا کر کہا کہ مجھے اس ہوٹل میں لے جائے۔ ٹیکسی چل پڑی۔ میرے کانوں میں ابھی تک پروین کی روح کی آواز گونج رہی تھی۔ کاش میں اس کی صورت بھی دیکھ سکتا۔ اب صرف ایک ہی امید باقی رہ گئی تھی کہ پروین کو میں کم از کم خواب میں تو دیکھ سکوں گا اور اس سے باتیں کر سکوں گا۔

رات میں نے غسل کرنے کے بعد وضو کیا اور بستر پر بتی بجھا کر لیٹ گیا۔ اس خیال سے نیند بھی نہیں آ رہی تھی کہ رات کو خواب میں پروین سے ملنا ہے۔ کچھ معلوم نہیں کس وقت مجھے نیند آ گئی اور میں سو گیا۔ اس کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ میں کسی شہر کے بازار میں سے گزر رہا ہوں۔ شہر کی ساری دکانیں کھلی ہیں مگر نہ کوئی دکاندار موجود ہے اور نہ کوئی گاہک ہی نظر آ رہا ہے' سارا بازار خالی ہے۔ کسی طرف سے کوئی آواز بھی نہیں آ رہی۔ بازار آگے جا کر اپنے آپ ایک گلی کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ گلی بھی سنسان پڑی تھی۔ مکانوں کے دروازوں پر خاموشی کی مہر لگی تھی۔ کھڑکیاں دروازے بند تھے۔ ایک عجیب سا ڈرا دینے والا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

گلی آگے ایک کھلی جگہ پر نکل آئی۔

مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ یہ دن کا وقت ہے یا رات کا وقت ہے۔ ایک عجیب سی روشنی پھیلی ہوئی تھی جسے نہ آپ روشنی کہہ سکتے ہیں نہ اندھیرا۔ یہ اندھیرے اور روشنی کے درمیان کی کوئی حالت تھی۔ دھند یا کہرا ابھی نہیں تھی۔ کھلی جگہ پر آ کر میں رک گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک تالاب ہے جس کے اوپر سامنے ایک اونچی عمارت کو جانے کے لیے راستہ بنا ہوا ہے۔ یہ ایک قسم کا پل تھا۔ میں اپنے آپ عمارت میں داخل ہونے کے لیے تالاب کے پل کی طرف بڑھا۔ مجھے جیسے کوئی کہہ رہا تھا کہ سامنے والی عمارت میں چلو۔ پل پر قدم رکھتے ہی مجھے پھنکاریں سنائی دینے لگیں۔ میں نے ڈر کر نیچے دیکھا' میرے بدن میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ پل کے نیچے تالاب میں پانی کے اوپر سانپ ہی سانپ تیر رہے تھے۔ ایسے لگتا تھا کہ یہ پانی نہیں بلکہ سانپوں سے بھرا ہوا تالاب ہے۔ ہر سانپ پھنکار رہا تھا اور بار بار گردن اوپر میری طرف کر رہا تھا۔ میں ڈر کر واپس جانے لگا تو میرے دل میں جیسے کسی نے آہستہ سے کہا۔

''سامنے والی عمارت میں چلو۔'' اور میں پل پر چلنے لگا۔ میں تیز تیز چلنے کی کوشش کر رہا تھا مگر میرے پاؤں جیسے من من بھاری ہوگئے تھے۔ میں جتنی تیز چلنے کی کوشش کرتا میرے پاؤں اتنے ہی بھاری ہو جاتے۔

کسی نہ کسی طرح آخر میں عمارت کے پاس پہنچ گیا۔

عمارت کو سر اٹھا کر دیکھا تو دہشت زدہ ہوگیا۔ ساری کی ساری عمارت ایک پہاڑ جتنے بڑے سانپ کی شکل کی بنی ہوئی تھی۔ دروالعہ زہ سانپ کے کھلے ہوئے منہ کا بنا تھا۔ یعنی دروازے کی جگہ ایک اژدہا قسم کے سانپ نے اپنا منہ کھول رکھا تھا۔ اس کی زبان پر اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ خوف کے مارے مجھے پسینہ آ گیا۔ اسی وقت میرے کانوں میں پروین کی کمزور اور نحیف سی آواز آئی۔

”سانپ کے اندر آ جاؤ۔“

پروین کی آواز سن کر مجھے حوصلہ ہوا اور میں سانپ کے منہ میں داخل ہوگیا۔ سانپ کی زبان کی سیڑھیاں چڑھتا اوپر گیا تو دیکھا کہ سامنے ایک اور سانپ کے منہ کا دروازہ بنا ہوا ہے۔ میں حوصلہ کر کے اس دروازے میں بھی داخل ہوگیا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں سانپ کے پیٹ میں چل رہا ہوں۔ یہ گول سرنگ نما راستہ تھا جس کی دیواروں میں مجھے سانپ کی بڑی بڑی کمان کی طرح کی پسلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

آگے ایک چھوٹا سا طاق تھا۔ یہاں آ کر سرنگ ختم ہوجاتی تھی۔ میں نے طاق کو آہستہ سے دھکیل کر کھولا تو مجھے ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے بہت سی عورتیں آہستہ آہستہ رو رہی ہوں۔ میں نے طاق کے اندر سر ڈال کر دیکھا۔ دوسری طرف ایک چھوٹا سا باغیچہ نظر آیا۔ میں باغیچے میں اتر گیا۔ عورتوں کے رونے اور بین کرنے کی آوازیں آہستہ آہستہ دور ہوتی گئیں۔ پھر ان آوازوں کی جگہ ایک سیٹی ایسی لمبی آواز نے لے لی۔ یہ سیٹی کی آواز رک رک کر آ رہی تھی۔ مجھے یاد آ گیا۔ میں نے بچپن میں برسات کے دنوں میں ایک تالاب کے پاس یہ آواز سنی تھی اور ایک سپیرے سے پوچھا تھا کہ یہ آواز کس جانور کی ہوتی ہے۔ اس نے کہا تھا۔ یہ سانپ کی سیٹی کی آواز ہے۔ سانپ برسات کے موسم میں کبھی کبھی ایسی آواز نکالا کرتے ہیں۔ میں یہ سوچ کر وہیں رک گیا کہ کہیں آگے بھی سانپ ہی سانپ نہ ہوں۔ اتنے میں میرے کانوں نے ایک بار پھر پروین کی آواز سنی۔ اس نے میرا نام لے کر کہا۔

”رکو نہیں، چلتے آؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔“

میں نے بے اختیار ہو کر پوچھا۔

”مگر تم سامنے کیوں نہیں آتیں؟ تم نے تو کہا تھا کہ تم خواب میں میرے سامنے آ جاؤ گی مجھ سے باتیں کرو گی۔“

اس کے جواب میں پروین کی آواز آئی۔ وہی سانپ کی سیٹی تھوڑی دیر بعد سنائی دے رہی تھی۔ میں باغیچے میں چلنے لگا۔ ایک چھوٹی سی روش تھی جس پر میں چل رہا تھا۔ جب میں درختوں کے نیچے پہنچا تو دیکھا کہ ایک ایک درخت کی ٹہنیوں پر کئی کئی سانپ لپٹے نیچے لٹک رہے تھے اور اپنی گردن اٹھا اٹھا کر لہرا رہے تھے۔ جیسے ابھی مجھے ڈس دیں گے۔ میں نے سوچا کہ یہ خواب ہے میں خواب میں مر نہیں سکتا۔ اس لیے بھاگنے کی ضرورت نہیں آگے پروین میرا انتظار کر رہی ہے۔

میں درختوں کے نیچے سمٹ سمٹا کر چل رہا تھا۔ ٹہنیوں پر لٹکے ہوئے سانپ میری طرف لہرا لہرا کر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ بالکل قریب آ کر واپس پلٹ جاتے۔ جیسے جھولا ایک مقام پر آ کر واپس چلا جاتا ہے۔ روش ختم ہوئی تو سامنے ایک سرسبز گھاس والا قطعہ آ گیا۔ قطعے کے وسط میں ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ میں تخت کے پاس آیا تو معلوم ہوا کہ یہ تخت لکڑی کا نہیں ہے بلکہ سانپوں کی سریاں اور ہڈیوں کو جوڑ کر بنایا گیا ہے۔ اتنے میں میں نے ایک جانب سے پروین کو اس عالم میں آتے دیکھا کہ اس کے جسم کے گرد ایک بہت بڑا سانپ لپٹا ہوا تھا جس کے بوجھ سے وہ دہری ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے اردگرد چھ سات عورتیں اور مرد چل رہے تھے۔ ان مردوں اور عورتوں کے جسموں سے بھی سانپ لپٹے ہوئے تھے۔ میں نے پروین کو

دیکھا تو بے اختیار اس کی طرف بڑھا۔ پروین کے جسم کے گرد اژدہا قسم کا سانپ لپٹا ہوا تھا، اس نے مجھے دیکھ کر اتنی زور سے پھنکار ماری کہ مجھے لگا دھوئیں اور آگ کا بادل میرے جسم کو چھوتا ہوا گزر گیا ہے۔ تب پروین کی آواز آئی۔

”تخت کے پیچھے چلے جاؤ۔“

میں دوڑ کر گھاس پر بچھے ہوئے تخت کے پیچھے جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ پروین اپنے گرد لپٹے ہوئے بہت بڑے اژدہا سانپ کا سر دونوں ہاتھوں میں اٹھائے رک رک کر چلتی تخت کے پاس آئی۔ اور اس پر بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھتے ہی اژدہا اپنے آپ اس کے جسم سے اتر کر ایک طرف کو چلا گیا۔ اس کے بعد وہ مرد عورتیں بھی اپنے اپنے جسموں کے گرد لپٹے ہوئے سانپوں کی گردنیں پکڑے وہاں سے چلے گئے۔ جب وہاں سوائے میرے اور پروین کے اور کوئی نہ رہا تو میں جھاڑی کی اوٹ سے نکل کر پروین کے سامنے آ گیا۔ اس نے مجھے دیکھا اور ٹھنڈی آہ بھر کر بولی۔

”میں نے تمہیں اپنی حالت کا نظارہ کرنے کے لیے یہاں بلایا ہے۔ دیکھو میں کس عذاب میں مبتلا ہوں۔ یہ خدا کی طرف سے نازل کیا ہوا عذاب نہیں ہے بلکہ اس عذاب کو میں نے خود اپنے لیے دنیا میں پیدا کیا تھا۔“

میں اس کے پاس بیٹھ جاتا ہوں۔ میں نے اسے کہا۔

”پروین! کیا یہ حالت ان جرائم پیشہ سپیروں کی وجہ سے ہوئی ہے جنہوں نے تمہیں تاج محل کے مینار سے اغوا کیا تھا اور پھر تمہاری بے ہوشی کی حالت میں تم پر ایک ایسا طاقتور منتر پھونکا کہ جو الٹا پڑ گیا اور تمہاری روح نے عارضی طور پر تمہارے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا۔“

پروین عالم خواب میں میرے بالکل پاس تخت پر بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر تھکان اور شکستگی کے اثرات نمایاں تھے۔ جیسے وہ مسلسل کسی تکلیف میں مبتلا رہی ہو۔ کہنے لگی۔

”وہ تو ایک بہانہ تھا جو میرے اپنے کیے ہوئے اعمال نے پیدا کر دیا تھا تاکہ میں اپنے کیے ہوئے برے عملوں کی سزا بھگت سکوں۔“

میں نے پروین کی اس وقت کی ذہنی اور نفسیاتی حالت پر توجہ دینے کی بجائے اس سے پوچھنا شروع کر دیا کہ وہ تاج محل سے کس طرح اغوا ہوئی تھی؟ کیا گائیڈ کے علاوہ بھی وہاں کوئی اور آدمی تھا؟

پروین نے تھکی ہوئی آواز میں ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”وہ ساری باتیں اب مجھے خواب کی طرح لگتی ہیں اور اب یہ حالت جس کو تم خواب کی حالت کہتے ہو اور سمجھتے ہو مجھے حقیقی زندگی کی طرح معلوم ہو رہی ہے۔“

میں چپ سا ہو کر پروین کی طرف تکنے لگا۔

”پروین! کیا تم اس دنیا سے نکل کر میرے پاس آؤ گی؟“

اس نے کہا۔

”یہ میں اپنے جسم پر کیے گئے عذاب کی سزا بھگت رہی ہوں۔ جس طرح انسان کے جسم پر کوئی زخم لگ جائے تو زخم کو آہستہ آہستہ آرام آتا ہے اور زخم ٹھیک ہونے تک اپنا پورا وقت لیتا ہے۔ اسی طرح دنیا میں ایک آدمی گناہ کر کے اپنے اوپر جو ظلم کرتا ہے اور اپنی روح کو زخمی کر لیتا ہے اسے اگلی دنیا میں اس وقت تک تکلیفیں سہنی پڑتی ہیں جب

تک کہ اس کی روح کے زخم ٹھیک نہیں ہوجاتے۔ یاد رکھو‘ جسم کے زخم کو ٹھیک ہونے میں اتنی دیر نہیں لگتی لیکن روح پر جو زخم لگتے ہیں انہیں بھرنے میں ایک لمبی مدت لگتی ہے یہ لمبی مدت ایک سال کی بھی ہوسکتی ہے ایک ہزار سال کی بھی ہوسکتی ہے۔ دس ہزار سال کی بھی ہوسکتی ہے‘ میں نے یہاں ایسی ایسی گناہ گار روحوں کو دیکھا ہے جو دو دو کروڑ سال سے یہاں پڑی اپنی روح پر لگے ہوئے گناہوں کے زخموں کے بھر جانے کا انتظار کررہی ہیں۔“

میں تو حیران سا ہو کر پروین کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ کہنے لگی۔

”یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میری ابھی مکمل طور پر موت واقع نہیں ہوئی۔ ابھی میری روح کا رشتہ ایک باریک ڈوری کے ذریعے میرے نیم مردہ جسم سے بندھا ہوا ہے۔ اگر میری روح کسی طرح واپس اپنے جسم میں چلی گئی تو مجھے عالم ارضی میں رہ کر اپنے گناہوں کو دھونے اور توبہ کرنے کا سنہرا موقع مل جائے گا۔ کیونکہ زندہ رہ کر ایک گناہ گار اگر صدق دل سے توبہ کرلے اور آئندہ گناہ نہ کرے تو اس کی روح پر لگے ہوئے سارے زخم اللہ پاک ٹھیک کردیتا ہے اور اسے معافی مل جاتی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”خدا کے لیے مجھے بتاؤ کہ میں تمہاری روح کو تمہارے جسم میں واپس لانے کے لیے کیا کرسکتا ہوں؟ تمہارا نیم مردہ جسم اس وقت کہاں ہے اور مجھے تمہیں دوبارہ عالم ارضی میں زندہ حالت میں دیکھنے کے لیے کیا کرنا ہوگا؟“

پروین نے کہا۔

”جن لوگوں نے مجھے تاج محل کے مینار سے اغوا کیا تھا وہ لوگ بڑے قاتل قسم کے جرائم پیشہ سپیرے تھے۔ وہ کالے علم اور سانپوں کے طلسم کے بڑے ماہر تھے۔ انہوں نے مجھے کوئی دوائی سنگھا کر بے ہوش کیا تھا۔ میں تم سے الگ ہو کر گائیڈ کے ساتھ جب تاج محل کے مینار کا چکر لگانے اس کی دوسری طرف گئی تو اچانک گائیڈ نے مجھے پیچھے سے دبوچ لیا اور میرے منہ پر گیلا رومال رکھ کر اسے بند کردیا۔ میں نے اس خیال سے زور سے سانس لیا کہ سانپ بن کر اسے ڈس دوں گی لیکن اس سانس کے ساتھ ہی میرے جسم کے اندر رومال میں ملی ہوئی بے ہوشی کی دوا داخل ہوگئی اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ اس کے بعد جب ہوش آیا تو وہ لوگ مجھ پر نہ جانے کتنے ناپاک کافرانہ منتر پڑھ کر پھونک چکے تھے جس کی وجہ سے میں ہوش میں تو آ گئی تھی لیکن نہ بول سکتی تھی نہ ہاتھ پیر ہلا سکتی تھی۔ مجھ پر سکتہ طاری ہوگیا تھا‘ میں اپنی آنکھیں بھی ادھر ادھر نہ پھیر سکتی تھی۔ میرا سانس بھی بند ہوچکا تھا۔ ورنہ میں سانس بھر کر سانپ کی شکل بدل سکتی تھی۔ ایک طرح سے میں زندہ مردہ تھی۔ میرا خیال تمہاری طرف چلا گیا کہ نہ جانے میرے غائب ہوجانے سے تم کس قدر پریشان ہوگے۔ میں کسی طرح تم سے ملاقات کرنے کو بے قرار تھی۔ مگر مجھے پتا نہیں چل رہا تھا کہ تم کہاں ہو۔ اگر میں پوری طرح مر چکی ہوتی تو مجھے ایک سیکنڈ سے بھی پہلے پتا چل جاتا کہ تم کہاں ہو کیونکہ مرنے کے بعد روح کی آنکھوں کے آگے سے خدا بہت سے پردے اٹھا دیتا ہے لیکن میرے لیے سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ میں مری نہیں تھی۔ میرا جسم زندہ تھا مگر روح اس دنیا میں اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے ابتدائی مرحلے میں داخل ہوچکی تھی۔ میری پتھرائی ہوئی آنکھیں صرف میرے جسم میں روح کا جو باریک سا رشتہ قائم تھا اس کی وجہ سے

چیزوں کو دیکھ رہی تھیں۔ ورنہ میرا جسم بالکل مردہ تھا۔“

میں خواب میں پروین کے پاس بیٹھا اس کی حیران کر دینے والی‘ آنکھیں کھول دینے والی باتیں سن رہا تھا اور مجھے ایک لمحے کے لیے احساس نہیں ہو رہا تھا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں نے پروین سے کہا۔

”خدا کے لیے مجھے بتاؤ تمہارا مردہ جسم ان لوگوں نے کہاں چھپا کر رکھا ہوا ہے؟“

پروین کے ہونٹوں سے ایک سرد آہ نکل گئی۔ وہ کہنے لگی۔

”انسان اگر صرف ایک بار موت کے بعد کی زندگی کی ایک جھلک دیکھ لے تو پھر ساری زندگی کبھی کوئی گناہ نہ کرے۔ ان جرائم پیشہ سپیروں پر اب مجھے رحم آتا ہے۔ کیونکہ میں جانتی ہوں اپنی موت کے بعد انہیں انتہائی دردناک اور شدید عذاب بھگتنا پڑے گا اور کوئی پتا نہیں کہ وہ ڈاکو خونی اور جرائم پیشہ لوگ یہ اذیت ناک عذاب ایک سال تک بھگتیں گے یا ایک لاکھ سال تک عذاب میں جلتے‘ گلتے‘ سڑتے رہیں گے...... اب میں تمہیں بتاتی ہوں کہ میرا مردہ جسم ان لوگوں نے کہاں رکھا ہوا ہے۔ یہ بات ابھی ابھی کسی غیبی طاقت نے میرے دل میں ڈالی ہے‘ مجھ پر جو یہ رحم کیا گیا ہے تو صرف اس لیے کہ میری نیت نیک تھی اور میں نے ہندو دیوی دیوتاؤں کی پوجا والے مذہب کو چھوڑ کر ایک خدا کی عبادت کرنے والے دین اسلام کو قبول کرلیا ہے۔“

پروین نے آنکھیں بند کرلیں۔ میں کچھ کہنے لگا۔ لیکن جیسے کسی نے میری زبان ایک لمحے کے لیے بند کردی۔ پروین نے تین چار مرتبہ دھیمی آواز میں اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے گناہوں کی بخشش کی دعا مانگی۔ پھر آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا اور کہا۔

”آگرہ سے اٹاوا اور کانپور جاتے ہوئے راستے میں ایک اسٹیشن فیروزآباد آتا ہے‘ فیروزآباد ریلوے اسٹیشن کے پاس انگریزوں کے زمانے کا ایک مردہ خانہ ہے جو اب بالکل ویران پڑا رہتا ہے کیونکہ سرکاری مردہ خانہ شہر کے اسپتال میں بنا دیا گیا ہے۔ اس ویران مردہ خانے کے نیچے ایک تہہ خانہ ہے اس تہہ خانے میں میری نیم مردہ لاش ان لوگوں نے ترپال سے ڈھک کر رکھی ہوئی ہے۔“

میں نے پوچھا۔

”پروین! پلیز مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارا جسم دوبارہ کس طرح زندہ ہوگا۔ میں ایسا کونسا جتن کروں کہ تمہاری روح پھر سے اپنے جسم میں داخل ہوجائے؟“

پروین نے آہ بھر کر کہا۔

”یہ بات اب میرے اختیار سے بھی باہر ہوچکی ہے۔ ان سپیروں نے مجھ پر ایسا آتشی طلسم پھونکا ہے کہ جو الٹا پڑ جانے کے بعد ان کے قابو سے بھی باہر ہوگیا ہے۔ وہ خود اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ کسی طرح میں دوبارہ زندہ ہوجاؤں‘ اگر زندہ نہیں ہوتی تو کم از کم ناگن کی شکل ہی اختیار کرلوں۔“

”کیا تمہارے ذہن میں ایسا کوئی طریقہ نہیں ہے کہ تمہاری روح واپس تمہارے جسم میں چلی جائے۔“

پروین نے میرے اس سوال کے جواب میں کہا۔

''ابھی تک مجھے ایسا کوئی طریقہ معلوم نہیں ہوسکا لیکن میں اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ چونکہ میں نے آئندہ گناہ نہ کرنے کا عہد کررکھا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ مجھے ضرور بخش دے گا۔ اس دوران تم صرف ایک کام کرو کہ اس ویران مردہ خانے سے میری لاش نکال کر کسی محفوظ جگہ پر پہنچادو۔ یہ محفوظ جگہ ایسی ہونی چاہیے جہاں میرے دشمن جرائم پیشہ سپیرے نہ پہنچ سکیں۔ کیونکہ اگر انہوں نے مجھ پر مزید کوئی جادو ٹونہ نہ کیا تو ممکن ہے اب تک میرے جسم کے ساتھ روح کا جو نازک رشتہ قائم ہے وہ بھی ٹوٹ جائے اور میں پوری طرح مرجاؤں پھر میں تمہاری دنیا میں کبھی نہیں آسکوں گی۔''

میں نے کہا۔ ''تم فکر نہ کرو۔ میں اس کا انتظام ہر حالت میں کرکے رہوں گا۔ میں تمہارا نیم مردہ جسم وہاں سے نکال کر محفوظ جگہ پر لے جاؤں گا' لیکن کہیں تمہاری لاش خراب ہونا تو شروع نہیں ہوجائے گی؟''

پروین بولی۔

''جب تک میری روح' کا رشتہ میرے جسم سے قائم ہے میری لاش کو کچھ نہیں ہوگا۔''

اسی وقت اچانک ایک طرف سے عورتوں کے رونے کی ہلکی ہلکی آوازیں آنے لگیں۔ یہ وہی آوازیں تھیں جو پہلے بھی مجھے سنائی دی تھیں۔ میں نے پروین سے ان آوازوں کے بارے میں پوچھا تو اس نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

''میرے ساتھ آؤ' میں تمہیں اس دنیائے حیرت کی سیر کراتی ہوں۔''

وہ تخت پر سے اٹھی اور سامنے والے ٹیلے کی طرف چل پڑی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے میں ہوا میں تیر رہا ہوں۔

عورتوں کے بین کرنے کی آوازیں سامنے والے ٹیلے سے آرہی تھیں۔ پروین کی روح ٹیلے پر پہنچ کر رک گئی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

''اب میرے ساتھ ساتھ چلنا۔''

ٹیلے پر ایک پگڈنڈی اوپر کو جارہی تھی' ہم پگڈنڈی پر چڑھتے گئے' تھوڑا آگے جاکر پگڈنڈی ٹیلے کے پہلو کے ساتھ متوازی رخ اختیار کرگئی۔ ہم ذرا آگے گئے تو بین کرنے کی آوازیں پوری طرح سنائی دینے لگیں۔ پروین ٹیلے کے اندر بنے ہوئے غار کے دہانے پر پہنچ کر رک گئی۔ اس نے غار کی طرف اشارہ کیا اور بولی۔

''ادھر دیکھو۔''

میں نے دیکھا غار کے اندر چاروں طرف برف جمی ہوئی ہے۔ دیواریں برف کی ہیں' چھت برف کی ہے' فرش برف کا ہے' برف کے فرش پر جگہ جگہ عورتیں برف کے ستونوں کے ساتھ بندھی ہوئی ہیں۔ ان کے بال کھلے ہوئے ہیں۔ گردنیں نیچے کو جھکی ہوئی ہیں اور وہ دردناک آوازوں میں رو رہی ہیں۔ پروین نے کہا۔

''یہ وہ بدنصیب عورتیں ہیں جنہوں نے دنیا میں عیش وعشرت کی زندگی بسر کرنے کی خاطر فحاشی اور بدکاری کا راستہ اختیار کیا۔ ان کے سامنے نیکی کا راستہ بھی تھا مگر انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا اور برائی کے راستے پر چل پڑیں۔ یہ عذاب خود ان کا اپنا پیدا کیا ہوا ہے' جب تک ان دیواروں' چھتوں اور فرش کی برف پگھل نہیں جاتی یہ اسی عذاب میں مبتلا رہیں گی۔ آؤ میں تمہیں کچھ اور دکھاتی ہوں۔''

پروین کی روح مجھے آگے لے گئی۔ یہاں ٹیلے

کے دامن میں ایک سرسبز وشاداب باغیچہ تھا جس میں رنگ رنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ یہاں سے خدا کی حمد وثنا کی روح پرور پرسکون آوازیں آرہی تھیں۔ مجھے کچھ سفید پوش عورتیں نظر آئیں جن کے چہرے ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ باغیچے میں کچھ سے ایسی خوشبوئیں آرہی تھیں کہ میں نے پہلے کہیں محسوس نہیں کی۔ پروین کی روح نے کہا۔

''یہ وہ پاکباز خواتین ہیں جو اپنے خاوندوں کی وفادار ہیں۔ ساری زندگی نیکی کے راستے پر چلیں۔ رزق حلال کی روکھی سوکھی کھا کر اللہ کا شکر ادا کیا لیکن اپنی روح کو پاکیزہ رکھا۔ اپنی روح کو داغ دار ہونے سے بچایا۔ اب یہ بہشت میں ہمہ وقت خدا کی حمد وثنا میں مصروف ہیں۔ انہیں جو روحانی مسرت حاصل ہے ہم دنیا والے اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔''

میں وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے باغیچے میں سے جو خوشبو آرہی تھی وہ میری روح کو گہرا سکون عطا کررہی تھی۔ مگر پروین نے کہا۔

''آؤ آگے چلیں۔''

اور ہم ٹیلے سے اتر کر دوسری طرف آگئے۔

پروین نے مجھے اس دنیا کے کچھ اور منظر دکھائے جنہیں دیکھ کر میں نے دل میں عہد کرلیا کہ کبھی کوئی گناہ نہیں کروں گا۔ کسی کو برا نہیں کہوں گا' کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا اور خدا سے ہمیشہ اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہوں گا۔ اس کے بعد پروین اور میں ایک جگہ آکر رک گئے۔

ہمارے سامنے ایک دریا بہہ رہا تھا۔ پروین نے کہا۔

''میرا وقت پورا ہوگیا ہے۔ اب مجھے یہاں سے واپس اپنے اعمال کا حساب چکانے کے لیے واپس جانا ہوگا۔ تم جاؤ اور خدا کے حضور نماز پڑھ کر میری بخشش کی دعا کرو اگر تم میرے نیم مردہ جسم کو محفوظ کرنے میں کامیاب ہوگئے اور خدا کی رضا شامل حال رہی تو میں خواب میں آکر بتاؤں گی کہ میری روح اپنے جسم میں دوبارہ کس طرح داخل ہوسکتی ہے۔''

اتنا کہہ کر پروین دریا کی لہروں پر چلتی ہوئی میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔

میں نے دیکھا کہ میں آگرہ کے ہوٹل میں اپنے بیڈ روم میں بستر پر لیٹا ہوا ہوں اور کھڑکی پر گرے ہوئے پردوں میں سے دھوپ چھن چھن کر کمرے میں آرہی ہے۔ میرے دل ودماغ پر خواب کا گہرا اثر تھا۔ میرا دل بستر سے اٹھنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ واپس خواب کی دنیا میں چلا جاؤں لیکن ایک بار خواب ٹوٹ جائے تو پھر اسے دوبارہ دیکھنا محال ہوتا ہے۔

میں کلمہ پڑھتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ فوراً غسل خانے میں جاکر غسل کیا۔ وضو کیا' دو رکعت نفل پڑھے۔ خدا سے اپنے گناہوں کی بخشش کا طلبگار ہوا۔ پروین کے حق میں صدق دل سے دعا مانگی اور نیچے جاکر ناشتہ کیا اور وہیں بیٹھ کر سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے' وہاں سے مجھے فیروز آباد جاکر ویران مردہ خانے سے پروین کے نیم مردہ جسم کو نکال کر کسی محفوظ جگہ پر لے جانا تھا۔ فیروز آباد کا شہر آگرہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے یہی سوچا کہ میں اسی ہوٹل میں رہوں گا۔ یہاں سے فیروز آباد جاکر پروین کا نیم مردہ جسم رات کے اندھیرے میں اٹھا کر لے آؤں گا' مگر سوال یہ تھا

کہ میں اسے رکھوں گا کہاں؟ یہ کوئی زیور یا قیمتی دستاویزات نہیں تھیں کہ میں انہیں کسی بینک کے لاکر میں جمع کرادیتا۔ ایک انسانی لاش تھی' اگرچہ یہ لاش پوری طرح مردہ نہیں تھی' اسے اپنے ساتھ ہوٹل میں نہیں لاسکتا تھا۔ یہاں لاتا تو پولیس کو خبر ہوجاتی۔ پولیس والے فوراً لاش کو قبضے میں لے کر مجھے گرفتار کرلیتے۔ ہوٹل والوں کو اتنا معلوم تھا کہ میرے ساتھ ایک عورت بھی آکر کمرے میں ٹھہری تھی۔ اگر میں انہیں بتاؤں کہ وہ میری بیوی تھی اور دوسرے شہر گئی تھی' وہاں بیمار ہوکر مرگئی تو وہ لوگ ضرور یقین کرلیں گے لیکن اس حالت میں بھی لاش کو ہوٹل میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ لوگ یہی کہتے کہ اگر یہ آپ کی بیوی تھی اور مرگئی ہے تو اسے قبرستان میں دفن کیوں نہیں کرتے۔

فیروز آباد والے ویران مردہ خانے میں اگر لاش کو پڑی رہنے دیتا تو وہاں بھی وہ محفوظ نہیں رہ سکتی تھی۔ جن جرائم پیشہ سپیروں نے پروین کی لاش کو وہاں چھپایا ہوا تھا وہ ضرور واپس آکر لاش کو اٹھا کر لے جاتے۔ یا اس پر کوئی دوسرا جادو ٹونہ کرنا شروع کردیتے۔ ایک بات طے تھی کہ مجھے پروین کے نیم مردہ جسم یا لاش کو ویران مردہ خانے سے ضرور لے جانا تھا اور اسے میں آگرہ شہر والے اپنے ہوٹل میں بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ روپیہ پیسہ تو میرے پاس کافی ہے۔ کیوں نہ میں پروین کی لاش کو فیروز آباد یا آگرے کے کسی اسپتال میں داخل کرادوں' انہیں کہوں کہ میری بیوی اچانک بے ہوش ہوگئی ہے۔ اس پر سکتہ طاری ہوگیا ہے۔ میں اس کا علاج کرانا چاہتا ہوں پھر خیال آیا کہ جن لوگوں پر سکتہ طاری ہوتا ہے ان کے دل کی دھڑکن جاری رہتی ہے اور وہ بے ہوشی کی حالت میں بھی سانس ضرور لے رہے ہوتے ہیں۔ مگر پروین نے تو مجھے بتایا تھا کہ میں سانس بھی نہیں لے رہی اور میرے دل کی دھڑکن بھی بند ہوگئی ہے لیکن میرا جسم اسی طرح گرم ہے اور روح کے ساتھ جسم کا رشتہ برقرار ہے۔ اسپتال والے تو اس حالت میں پروین کو مردہ قرار دے کر لاش میرے حوالے کردیں گے۔ پھر کیا کرنا چاہیے۔

میں ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں کافی دیر تک بیٹھا سوچتا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ لاش کو کہاں چھپایا جائے۔ آخر ایک ترکیب میرے دماغ میں آگئی۔ یہ بڑی مناسب اور محفوظ ترکیب تھی۔ اس طرح میں پروین کی لاش کو چاہے جتنے دن جتنے سال چاہوں محفوظ رکھ سکتا تھا اور کسی کو ذرا سا شک بھی نہیں پڑ سکتا تھا۔ ترکیب یہ تھی کہ میں پروین کی لاش فیروز آباد سے لے کر اپنے ہوٹل میں آگرے آجاؤں اور ہوٹل والوں سے کہہ دوں کہ میری بیوی فیروز آباد اپنے عزیزوں سے ملنے گئی تھی وہاں بخار چڑھا اور مرگئی۔ اس کے بعد میں اسے آگرہ کے کسی قبرستان میں دفنادوں۔ پھر آدھی رات کو قبرستان میں جاکر قبر کی ایک جانب اتنا بڑا سوراخ بنادوں کہ جس میں سے گزر کر میں ہر رات پروین کی لاش کو دیکھنے اور چیک کرنے آتا جاتا رہوں۔ اس طرح کسی کو شک بھی نہیں پڑے گا اور مجھے لاش کی حفاظت کی پریشانی بھی نہیں اٹھانی پڑے گی۔ میں اپنی اس انوکھی اور محفوظ ترین ترکیب پر خود ہی بڑا خوش ہوا۔ اسی وقت ہوٹل کے کاؤنٹر پر گیا۔ کاؤنٹر کلرک سے کہا۔

''میری بیوی جو میرے ساتھ یہاں آئی تھی اپنے رشتے داروں سے ملنے فیروز آباد گئی تھی۔ ابھی ابھی مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہ وہاں بیمار پڑگئی ہے۔

میں اس کی خبر لینے جارہا ہوں۔ یہاں میرا کمرہ محفوظ رکھیے گا۔ میں آپ کو مزید ایک ہفتے کا کرایہ ادا کردوں گا۔''

ہوٹل کے کلرک نے کہا۔

''کوئی بات نہیں صاحب آپ ضرور اپنی بیگم صاحبہ کی خبر گیری کو جائیے۔ آپ کا کمرہ بالکل محفوظ رہے گا۔ صرف آپ کے کمرے کی ایک چابی ہمارے پاس رہے گی۔''

میں نے کہا۔ ''بے شک آپ چابی اپنے پاس رکھیے گا۔''

میں تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر اپنے کمرے میں آیا۔ تمام چیزوں کا جائزہ لیا۔ اپنے نئے پرانے کپڑوں اور پروین کے کپڑوں کو اچھی طرح تہہ کرکے الماری میں بند کیا۔ پروین کے دس ہزار روپے بھی میرے پیسوں کے ساتھ ہی میرے پاس پڑے تھے۔ ان میں سے ابھی تک بمشکل تین چار سو روپے خرچ ہوئے تھے۔ اتنی رقم میں اپنے ساتھ ساتھ لے کر نہیں پھر سکتا تھا۔

میں نے سوچا کہ یہ رقم میں ہوٹل کے منیجر کے پاس جمع کرادیتا ہوں۔ اس طرح رقم محفوظ رہے گی۔ چنانچہ میں نیچے آگیا' کاؤنٹر کلرک کو مزید ایک ہفتے کا فلیٹ کا کرایہ ادا کیا۔ تین چار سو روپے اپنے پاس رکھ لیے اور باقی نو ہزار روپے کے نوٹ جیب میں ڈال کر ہوٹل کے بڑے منیجر کے کمرے میں گیا۔ اسے ساری بات بیان کی کہ میری بیوی بیمار ہے۔ میں اس کی تیمارداری کے لیے فیروز آباد جارہا ہوں۔ میری یہ رقم اپنے پاس بطور امانت رکھ لیجیے۔ اور میں نے نو ہزار روپے کے نوٹ نکال کر منیجر کے سامنے میز پر رکھ دیئے۔ منیجر ادھیڑ عمر کا شریفانہ چہرے والا آدمی تھا۔ اس نے سارے نوٹ گنے' انہیں ایک لفافہ میں ڈال کر میرے سامنے مہر بند کیا۔ سامنے والی لوہے کی الماری کھول کر اس کے دراز میں رکھا۔ اور مجھے نو ہزار روپے کی رسید لکھ کردے دی۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں ہوٹل سے نکل کر ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگیا۔ معلوم ہوا کہ فیروز آباد جانے والی گاڑی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد ملے گی۔ میں وہیں اسٹیشن کے ریفریشمنٹ روم میں بیٹھ کر چائے وغیرہ پینے لگا۔ فیروز آباد کا ٹکٹ میں نے لے لیا تھا۔ گاڑی آئی تو میں اس میں سوار ہوکر فیروز آباد پہنچ گیا۔ اس زمانے میں یہ ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ شہر جانے کی بجائے میں گاڑی سے اترنے کے بعد ریلوے اسٹیشن کے پیچھے آگیا۔ پروین نے مجھے خواب میں بتایا تھا کہ اسٹیشن کے آس پاس ہی انگریزوں کے زمانے کا بنایا ہوا کوئی مردہ خانہ ہے جو اب ویران پڑا ہے وہاں میری لاش چھپائی گئی ہے۔ اسٹیشن کے پیچھے کھوکھا نما دکانیں تھیں۔ میں ایک دکاندار کے پاس گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''بھائی صاحب یہاں صادق علی صاحب کا مکان کہاں ہوگا۔''

دکاندار کہنے لگا۔ ''بھائی صاحب ان کا کوئی اتا پتا بھی تو معلوم ہو۔ خالی مکان کا پوچھنے سے کیا پتا چلے گا؟''

میں نے کہا۔ ''انہوں نے کہا تھا کہ میرا مکان انگریزوں کے پرانے مردہ خانے کے کہیں قریب ہی ہے۔''

دکاندار بولا۔

''تو بھائی صاحب! انگریزوں کا پرانا مردہ خانہ یہاں سے پیچھے نالہ پار کروگے تو آگے پڑے گا۔

وہاں جا کر معلوم کرنا۔"

مجھے یہی معلوم کرنا تھا کہ پرانا مردہ خانہ کس طرف ہے۔ اگر میں صرف مردہ خانے کا ہی پوچھتا تو دکاندار کو ضرور تشویش ہوتی کہ یہ شخص مردہ خانے کیا لینے جا رہا ہے۔ میں نے دکاندار کا شکریہ ادا کیا اور کھوکھوں کی دکانوں کے پیچھے کی طرف چل پڑا۔ پیچھے کچھ دور چلنے کے بعد ایک گندہ نالہ آ گیا۔ نالے کا پل پار کر کے ایک اجاڑ سے میدان میں پہنچا تو دور ایک کوارٹر سا نظر پڑا۔ قریب پہنچ کر دیکھا کہ ایک بوسیدہ سا کمرہ ہے جس کی دیواریں شکستہ ہو رہی ہیں۔ برآمدے کی آدھی چھت ڈھے چکی ہے۔ برآمدے میں ایک جگہ مٹی کھود کر ایک کالا کتا سو رہا تھا میرے قدموں کی آہٹ پر کتے نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور اٹھ کر دوسری طرف بھاگ گیا۔ میں برآمدے میں آ گیا۔ مردہ خانے کا گرد آلود دروازہ بند تھا۔ باہر تالا بھی لگا ہوا تھا۔ تالا دروازے کی بوسیدگی کے مقابلے میں نیا لگ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے دو تین روز پہلے ہی لگایا ہے۔ میں نے قریب پڑی ہوئی ایک اینٹ اٹھا کر زور سے تالے پر ماری۔ تالا تو نہ ٹوٹا مگر اس کا کنڈا ٹوٹ گیا۔ دروازہ کھول کر مردہ خانے میں داخل ہوا۔ فرش گرد آلود تھا۔ درمیان میں ایک لوہے کا اسٹریچر پڑا تھا جس کی ایک ٹانگ غائب تھی۔ اسٹریچر پر بھی گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ پروین نے کہا تھا کہ یہاں نیچے تہہ خانے میں میرا جسم چھپایا ہوا ہے۔ میں جھک کر فرش کو غور سے دیکھنے لگا۔

کونے میں ایک جگہ مجھے کچھ اینٹیں پڑی ہوئی نظر آئیں۔ میں نے انہیں ایک ایک کر کے پرے ہٹایا تو دیکھا۔ نیچے ایک گرد آلود بوریا بچھا ہوا تھا۔ بوریا ہٹایا تو نیچے لکڑی کا چوکھٹا دکھائی دیا۔ یہ کوئی چار فٹ لمبا اور پانچ فٹ کے قریب چوڑا چوکھٹا تھا۔ اس کے ساتھ کنڈا لگا ہوا تھا۔ میں نے کنڈے کو پکڑ کر چوکھٹے کو زور لگا کر اوپر اٹھا دیا۔ نیچے لوہے کا زینہ تھا۔ میں نے چوکھٹے کو دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ دروازے کو بند کیا اور ماچس جلا کر تہہ خانے کا زینہ اترنے لگا۔ چھ سات سیڑھیاں اترنے کے بعد ماچس کی تیلی بجھ گئی۔ میں نے دوسری تیلی جلائی اس کی روشنی میں سامنے دیوار کے پاس فرش پر ایک انسانی جسم پڑا دیکھا جس پر ترپال پڑی ہوئی تھی۔ پروین نے کہا تھا کہ جرائم پیشہ سپیروں نے وہاں میرا نیم مردہ جسم ڈال کر اوپر ترپال ڈالی ہوئی ہے۔ میں اس کی طرف بڑھا۔ ماچس کی تیسری تیلی جلا کر ترپال کو ہٹایا تو نیچے پروین کا چہرہ دکھائی دیا۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مجھ پر رقت سی طاری ہو گئی۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے جذبات پر قابو پایا۔ پروین کی آنکھیں ادھ کھلی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھے دیکھ رہی ہے مگر بول نہیں سکتی۔ ہاتھ پاؤں نہیں ہلا سکتی۔ مگر میری آواز ضرور سن رہی ہو گی۔ میں نے کہا۔

"پروین! تم جس قدر بھی سن سکتی ہو جس قدر بھی دیکھ سکتی ہو۔ تم ضرور مجھے دیکھ رہی ہو گی۔ میری آواز سن رہی ہو گی میں تمہارے پاس پہنچ گیا ہوں۔ اب تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ میں رات کو آؤں گا اور تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

میں نے پروین کے چہرے پر دوبارہ ترپال ڈال دی۔ تہہ خانے سے باہر آ کر اسی طرح اسے بند کیا۔ اوپر اینٹیں رکھیں پھر مردہ خانے سے باہر آ کر دروازے کا کنڈا اس طرح پھنسا دیا کہ معلوم ہوتا تالا لگا ہوا ہے۔

اب اس ایڈونچر کا سب سے مشکل مرحلہ شروع ہونے والا تھا۔ یعنی مجھے وہاں سے پروین کی لاش کو نکال کر اپنے ساتھ آگرے لے جانا تھا۔ میں کچھ دیر تک اس ویران مردہ خانے کے شکستہ برآمدے میں کھڑا سوچتا رہا۔ آخر ایک ترکیب میرے ذہن میں آ گئی۔ میں وہاں سے فیروز آباد شہر کی طرف چل پڑا۔ پروین نے مجھے خواب میں بتایا تھا کہ اس شہر میں بھی ایک اسپتال ہے۔ شہر میں آ کر میں نے اسپتال کا پتا معلوم کیا۔ وہاں پہنچ کر دیکھا کہ چھوٹا سا سرکاری اسپتال تھا۔ میں خاموشی سے واپس ہوا اور ٹیکسی تلاش کرنے لگا مگر وہاں ٹیکسیاں نہیں چلتی تھیں۔ ٹیکسی کے بغیر میں پروین کے نیم مردہ جسم کو مردہ خانے سے نکال کر نہیں لا سکتا تھا۔ آخر یہی فیصلہ کیا کہ ابھی سارا دن پڑا ہے اور آگرہ فیروز آباد سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ مجھے آگرے جا کر وہاں سے ایک ٹیکسی لے کر یہاں آنا چاہیے۔ اس وقت کوئی ریل گاڑی آگرے کی طرف جانے والی نہیں ملی تو میں ایک لاری میں بیٹھ کر آگرے پہنچ گیا۔ وہاں شہر کے بڑے ٹیکسی سٹینڈ پر آ کر ایک ٹیکسی والے سے بات کی۔ یہ ٹیکسی ڈرائیور کافی عمر کا تھا۔ شرعی داڑھی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ میری بیوی فیروز آباد کے اسپتال میں بیمار پڑی تھی۔ اس کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس کی میت آگرے لانی ہے۔ یہاں میرا کوئی جاننے والا نہیں ہے۔ ہم پنجاب سے تاج محل دیکھنے آگرہ آئے تھے۔ میری بیوی نے کہا کہ فیروز آباد بھی دیکھنا ہے۔ میں اسے وہاں لے کر گیا تو اس کے پیٹ میں شدید درد اٹھا۔ میں نے اسے اسپتال میں داخل کرا دیا۔ اسپتال والوں نے کہا کہ آپریشن کرنا پڑے گا۔ انہوں نے آپریشن کیا لیکن میری بیوی وفات پا گئی۔ فیروز آباد سے پریشان حال یہاں آیا ہوں۔ کیونکہ فیروز آباد میں کوئی ٹیکسی وغیرہ نہیں تھی۔ اسپتال والوں نے لاش مردہ خانے میں رکھ دی ہے۔ تم جتنے پیسے کہو گے میں تمہیں دے دوں گا۔

مسلمان بوڑھے ڈرائیور نے کہا۔

"کوئی بات نہیں بابو جی۔ بیٹھیے میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

کوئی ایک گھنٹے میں ہم فیروز آباد پہنچ گئے۔ میں نے ٹیکسی پرانے مردہ خانے کے باہر رکوائی۔ ڈرائیور کو باہر کھڑا کر کے خود مردہ خانے میں گیا۔ تہہ خانے سے پروین کی نیم مردہ لاش کو کاندھے پر اٹھا کر باہر لایا۔ اسے ٹیکسی کی پچھلی نشست پر لٹا دیا اور ڈرائیور سے کہا۔

"اب آگرہ لے چلو میاں۔"

ڈرائیور بولا۔

"بابو جی آپ اپنی بیوی کی میت کو پنجاب اپنے شہر میں کیوں نہیں لے جاتے؟"

میں نے کہا۔

"ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ میت کی حالت ٹھیک نہیں ہے یہ بڑی جلدی خراب ہو جائے گی۔ اسے فوراً دفن کر دو۔"

ٹیکسی آگرے کی طرف روانہ ہو گئی۔ میں پروین کے جسم کو سیدھا ہوٹل بھی نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ راستے میں میں نے مسلمان ٹیکسی ڈرائیور سے کہا کہ چونکہ آگرہ میں ہمارا کوئی واقف کار نہیں ہے اس لیے میت کو سیدھا قبرستان لے چلے۔ وہ کہنے لگا۔

"بابو جی! آپ کو اسپتال سے پرچی بنوا کر لانی

چاہیے تھی۔ کیا آپ پرچی لائے ہیں؟"
میں نے کہا۔ "میاں جی! پرچی تو میں نے نہیں بنوائی۔ کچھ آپ ہی میری مدد کیجیے گا۔ میں بڑی مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ بیوی بھی وفات پا گئی ہے۔ پنجاب لے کر گیا تو راستے میں میت کے خراب ہو جانے کا خطرہ ہے۔ چاہتا ہوں کہ اس امانت کو جتنی جلدی ہو سکے آگرہ کے کسی قبرستان میں ہی دفن کر دوں۔"
ٹیکسی ڈرائیور کہنے لگا۔
"بابو جی! شہر کے قبرستان میں گورکن لاوارث کو دفن نہیں کریں گے۔ آپ ایسا کریں تاج محل کے پیچھے ایک قبرستان ہے وہاں چونکہ دریا کا پانی مار کرنے لگا ہے اس لیے وہاں اب کوئی اپنے مردوں کو دفن نہیں کرتا۔ ہم وہاں قبر کھود کر میت کو سپرد خاک کر دیتے ہیں۔ یہی کچھ ہو سکتا ہے۔"
میں بھی یہی چاہتا تھا کہ اپنی مرضی کی قبر بنا دوں اور قبر ایسی جگہ پر بنے کہ جہاں کسی کا آنا جانا بھی نہ ہو۔ بوڑھے ٹیکسی ڈرائیور نے میرا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ آگرہ شہر میں داخل ہوئے تو بوڑھے ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی ایک الگ تھلگ جگہ پر کھڑی کر دی۔ میں نے اسے سو روپے دیئے۔ وہ بازار سے کفن دفن کا مختصر سا سامان لے آیا۔ میں نے ٹیکسی میں ہی پروین کے نیم مردہ جسم کو لٹھے کی چادر میں لپیٹ دیا۔ اس کے بعد ٹیکسی ڈرائیور تاج محل کے عقب میں دریا کے کنارے ایک ویران جگہ پر لے آیا۔ یہاں ایک پرانا تالاب تھا۔ جو نہ جانے کب سے خشک پڑا تھا۔ اس میں تھوہر کے پودے اگے ہوئے تھے۔ اس سے چند قدموں کے فاصلے پر کسی پرانی عمارت کے کھنڈر کی صرف ایک محرابی دیوار ہی باقی رہ گئی تھی جو ایک طرف کو جھکی ہوئی تھی۔ دیوار کی دوسری طرف دریا کا پانی دلدل کی شکل میں پہنچ چکا تھا۔ یہاں دس بارہ قبریں شکستہ حالت میں باقی تھیں۔ ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔
"ان قبروں پر بھی دیا جلانے والے نہیں آتے معلوم ہوتا ہے ان کے لواحقین بھی یا تو خود مر کھپ گئے ہیں یا کسی دوسرے شہر جا چکے ہیں۔"
ایک جگہ مجھے نشیب میں کسی پرانی قبر کا کافی بڑا شگاف نظر آیا۔ یہ شگاف زمین کے اندر لحد کی صورت میں تھا مجھے یہ جگہ پسند آ گئی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔
"یہ ہمیں ایک بنی بنائی قبر مل گئی ہے میں یہاں اپنی بیوی کو دفن کر دیتا ہوں۔"
میں نے پروین کے نیم مردہ جسم کو ٹیکسی میں سے اٹھا کر اپنے کاندھے پر ڈالا اور پرانی قبر کے پاس لے آیا۔ اس دوران نیک دل ٹیکسی ڈرائیور نے نشیب کی جگہ کو خوب صاف کر دیا تھا۔ میں نے "لاش" کو نشیبی لحد کے اندر لٹا دیا۔ اس کے بعد ہم نے ادھر ادھر سے اینٹیں اور پتھر اکٹھے کیے اور لحد کے شگاف پر لگا کر اسے بند کر دیا۔ ٹیکسی ڈرائیور کچھ جھاڑیاں توڑ کر لے آیا۔ اینٹوں پر ہم نے جھاڑیاں ڈال دیں۔ اب وہ قبر باہر سے کسی کو نظر نہیں آتی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ میں نے بھی ہاتھ اٹھا دیئے۔ فاتحہ تو نہ پڑھا، بس خدا سے یہی التجا کی کہ یا اللہ تو مجھے معاف کر دے۔ فاتحہ پڑھ کر ٹیکسی ڈرائیور بولا۔
"بابو جی! آپ اس قبر کو پختہ ضرور کروالیں، رات کو یہاں مردار خور جانور دریا پار کر کے آ جاتے ہیں۔ کہیں وہ اینٹیں اکھیڑ کر میت کو خراب نہ کر دیں۔"
میں نے کہا۔ "اب تو میں واپس جا رہا ہوں،

ایک ہفتے بعد آؤں گا تو قبر کو ضرور پختہ کروادوں گا۔''

میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو دو سو روپے دیئے' وہ بہت خوش ہو گیا اور مجھے میرے ہوٹل چھوڑ کر چلا گیا۔

میں سوچنے لگا کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیے۔ پروین نے کہا تھا کہ جب میں اس کی لاش کسی محفوظ جگہ پر پہنچادوں گا تو وہ مجھے بتائے گی کہ اس کی روح واپس اس کے جسم میں کیسے داخل ہو سکتی ہے۔ مجھے یہ یاد نہیں رہا تھا کہ اس نے مجھے خواب میں آ کر بتانے کے لیے کہا تھا یا نہیں جو کچھ بھی تھا میں اس کے نیم مردہ جسم کو زیادہ دیر تک ویران قبرستان کی قبر میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس بات کا اندیشہ تھا کہ دریا پار سے مردار خور وغیرہ آ کر اسے چیر پھاڑ نہ دیں۔ پروین اگرچہ مردہ حالت میں نہیں تھی۔ لیکن وہ اٹھ کر درندوں کو بھگا بھی نہیں سکتی تھی۔ میں شام ہوتے ہی ویران قبرستان چلا گیا۔ پرانی قبر کی جھاڑیاں اور اینٹیں ہٹا کر دیکھا۔ پروین کی لاش کفن میں لپٹی محفوظ پڑی تھی۔ میں نے پروین سے کہا۔

''پروین! میں نے تمہیں اپنے پاس محفوظ کر کے رکھ لیا ہے۔ اب مجھے خواب میں آ کر بتاؤ کہ تمہاری روح کس طرح تمہارے جسم میں واپس آئے گی؟ تم مجھے جو کہو گی میں اسی طرح کروں گا۔''

ہوٹل میں آ کر منہ ہاتھ دھو کر نیچے کھانا کھانے چلا گیا۔ رات کو دیر تک جاگتا رہا۔ یہی خیال آتا کہ خدا جانے پروین نے میری بات سنی بھی ہے یا نہیں۔ وہ خواب میں آئے گی یا نہیں' یہی کچھ سوچتے سوچتے میں سو گیا۔

خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک دریا بہہ رہا ہے' کنارے پر ایک گنبد والی بارہ دری ہے۔ بارہ دری میں ایک چاندی کی چوکی پر سرخ لباس پہنے پروین بیٹھی ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی۔ مجھے پاس بلایا' کہنے لگی۔

''خدا نے میرے گناہوں کو بخش دیا ہے۔ اس لیے کہ میں نے سچے دل سے گناہوں سے توبہ کی تھی۔ انسان اگر سچے دل سے توبہ کرلے اور آئندہ گناہ نہ کرے تو خدا اسے معاف کر دیتا ہے۔''

میں نے خوش ہو کر کہا۔

''اس کا مطلب ہے اب تم واپس اپنے جسم میں داخل ہو سکتی ہو۔ کیونکہ تم پوری طرح مری نہیں تھیں۔ تمہارے جسم کے ساتھ روح کا رشتہ قائم تھا۔''

وہ بولی۔ ''ہاں...... اب خدا کی طرف سے اپنے جسم میں واپس جانے کی اجازت ہے مگر اس کے لیے تمہیں ایک کام کرنا ہوگا۔''

میں پروین کی طرف دیکھنے لگا۔

''بتاؤ' مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

پروین نے کہا۔

''گیارہ دیگیں میٹھے چاول کی پکوا کر غریبوں کو کھلاؤ۔ اس کے بعد میری قبر پر آ جانا مگر رات کے وقت آنا۔ جب چاروں طرف اندھیرا چھا گیا ہو۔''

میں کچھ پوچھنے والا ہی تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔

میں دوسرے دن شہر کی سب سے بڑی مسجد کے امام صاحب کے پاس گیا۔ انہیں جا کر کہا کہ میں گیارہ دیگیں میٹھے چاولوں کی پکوا کر غریبوں محتاجوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا۔

''ضرور پکوائیں۔ ہم اعلان کروادیں گے

محتاج اور غریب لوگ یہاں پہنچ جائیں گے۔''

میں نے امام صاحب کے تعاون سے گیارہ دیگیں دم کروادیں۔ شام تک دیگیں تیار ہو گئیں۔ کتنے ہی محتاج اور غریب غربا وہاں جمع ہو گئے۔ ساری دیگوں کے چاول ان میں بانٹ دیئے گئے۔ میں نے مسجد کے دروازے کی مرمت کے لیے بھی امام صاحب کو ایک ہزار روپے بطور نذرانے کے دیئے۔ میرے پاس ابھی تک کافی رقم موجود تھی۔ جب رات ہو گئی تو میں سیدھا پرانے قبرستان پہنچ گیا۔ اس وقت چاند غروب ہو رہا تھا اور اس کی مدھم چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ پرانی قبر کے پاس گیا تو یہ دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے کہ قبر کی اینٹیں ادھر ادھر پڑی تھیں اور لحد خالی تھی۔ پروین کا جسم وہاں نہیں تھا۔ دل بیٹھنے لگا۔ یا اللہ یہ کیا مصیبت آن پڑی ہے۔ پروین کو کون اٹھا کر لے گیا ہے۔ ضرور یہ ان جرائم پیشہ سپیروں کا کام ہے مگر اب میں انہیں کہاں تلاش کرتا پھروں گا۔ وہ تو پروین کا نیم مردہ جسم اٹھا کر نہ جانے کہاں لے گئے ہوں گے۔

سخت پریشانی کے عالم میں وہیں ایک طرف بیٹھ گیا۔ اتنے میں کسی نے میرا نام لے کر مجھے آواز دی۔ یہ پروین کی آواز تھی۔ میں نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا' پھیکی چاندنی میں شلوار قمیص میں ملبوس کفن کی چادر سر پر ڈالے مجھ سے چھ سات قدم کے فاصلے پر پروین کھڑی تھی۔ کچھ نہ پوچھیں کہ خوشی سے میرا کیا حال ہوا۔ میں بے اختیار ہو کر اس کی طرف بڑھا۔ اس نے دونوں ہاتھ آگے کر کے میرے ہاتھوں کو وہیں روک لیا۔ کہنے لگی۔

''خوشی کا اظہار صرف جائز حد تک ہو تو اچھا ہوتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''پروین! تم اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ تمہیں پھر سے زندہ حالت میں دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے۔''

پروین مسکرا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

''چلو اب ہوٹل واپس چلتے ہیں۔ تم نے ہوٹل والوں کو کہیں یہ تو نہیں کہا کہ میں مر چکی ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''بالکل نہیں' میں نے انہیں صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ تم فیروز آباد گئی ہوئی تھی کہ وہاں بیمار پڑ گئیں۔''

ہم وہاں سے نکل کر سڑک پر آ گئے۔ رات کے وقت وہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کوئی ٹیکسی رکشا نہیں تھا۔ ہم پیدل ہی چل پڑے۔ شہر کے قریب پہنچ کر ایک ٹیکسی مل گئی۔ اس میں بیٹھ کر ہم ہوٹل میں آ گئے۔ پروین نے آتے ہی سب سے پہلے غسل کیا' صاف کپڑے پہنے اور اپنے بستر پر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

''مجھے بھوک بالکل نہیں ہے۔ لیکن کافی پینے کو بہت جی چاہتا ہے۔''

میں نے کہا۔

''اس وقت شاید ہی ہوٹل کی طرف سے کافی سپلائی ہو' مگر میں کوشش کرتا ہوں۔ نہیں تو میں خود نیچے جا کر بنوا لاؤں گا۔''

میں نے اوپر سے فون کر کے کہا کہ میری بیوی کے سر میں شدید درد ہے۔ اگر آپ کافی بنا کر اوپر بھجوادیں تو بہت شکر گزار ہوں گا۔ فون پر سروس کلرک نے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔ میں ابھی کافی بھجوائے دیتا ہوں۔''

میں اور پروین باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں ملازم کافی لے کر آ گیا۔ یہ دو آدمیوں کی کافی تھی۔

میں نے پروین کو کافی بنا کر دی' ایک پیالی اپنے لیے بنائی۔ پروین نے کافی کا نیم گرم گھونٹ بھرنے کے بعد کہا۔

"کافی نے میری روح کی یادوں کو تازہ کر دیا ہے۔ ایک لمحے کے لیے غور کرو کہ کہاں سے ہم نے سفر شروع کیا تھا اور کہاں پہنچ گئے ہیں۔ کیسے کیسے خطرناک حالات سے نہیں گزرے۔ کیسی کیسی تکلیفیں اور اذیتیں ہم نے برداشت نہیں کیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ میرا انجام بخیر ہوا ہے اور میں ایک مسلمان عورت کی حیثیت سے کلمہ پڑھ کر جان دوں گی۔"

میں نے کہا۔ "ابھی تو تمہاری بہت عمر پڑی ہے ابھی تم ایسی باتیں نہ کرو۔"

پروین نے کافی کی پیالی تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"تم نہیں سمجھ سکو گے۔ یقین کرو میں عالم برزخ میں نہیں تھی کیونکہ میری مکمل موت واقع نہیں ہوئی تھی۔ میں اس کرہ فلک کا نام نہیں جانتی۔ میں اسے چھوٹا عالم برزخ ہی کہوں گی۔ میں کہہ رہی تھی کہ جب سے میں نے اس چھوٹے عالم برزخ کی جھلک دیکھی ہے اور وہاں کچھ وقت گزارا ہے اس دنیا میں اب میرا جی نہیں لگتا۔ اگر انسان اس دنیا میں رہ کر برائی سے اپنے آپ کو بچائے رکھے۔ خدا کی یاد اپنے دل میں ہر وقت رکھے اور نیک کام کرے تو یقین کرو اوپر کی دنیا اور اس دنیا کی زندگی میں نیک انسانوں کو خوشیاں اور لذتیں خدا کی طرف سے عطا ہوتی ہیں اس دنیا کی لذتیں اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ میں یہ اس لیے کہہ رہی ہوں کہ میں اوپر کی دنیا کی ایک جھلک دیکھ آئی ہوں۔"

میں پروین کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔ خواب میں ہی سہی لیکن اس عالم بالا کی ایک ہلکی سی جھلک میں نے بھی دیکھ لی تھی اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب کبھی کوئی برا کام نہیں کروں گا اور اپنے آپ کو گناہوں سے بچائے رکھوں گا۔ کافی ختم ہو گئی تو پروین نے کہا۔

"اب مجھے نیند آ رہی ہے۔ باقی باتیں کل ہوں گی۔"

میں اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔ دیر تک بستر پر لیٹا گزرے ہوئے واقعات کو یاد کرتا رہا۔ پھر مجھے بھی نیند آ گئی۔ دوسرے روز پروین نے کلکتے جانے کی تیاری شروع کر دی کہنے لگی۔

"میں سب سے پہلے کلکتے میں اپنے مکان کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ جہاں میں پیدا ہوئی تھی۔ ان گلیوں کو دیکھنا چاہتی ہوں جہاں کھیل کود کر میں بڑی ہوئی۔ اس کے بعد میں کاکسز بازار کے جنگل میں سنتھالی سپیروں کے اڈے پر جا کر اس چھوٹے ناگ دیوتا کے مندر کو آگ لگانا چاہتی ہوں جہاں مجھے اغوا کر کے لے جایا گیا تھا۔"

میں نے پروین کے پروگرام پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ یہ اس کی جذباتی خواہشات تھیں اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ ٹھیک سوچ رہی تھی۔ اس نے کہا۔

"میں چھوٹے ناگ دیوتا کے مندر کو تباہ کر کے اس برائی کو جڑ سے کاٹ دینا چاہتی ہوں جہاں معصوم لڑکیوں کو اغوا کر کے ان کی زندگیاں برباد کی جاتی ہیں۔"

میں نے ہوٹل ہی سے ریلوے انکوائری کو فون کیا۔ معلوم ہوا کہ کلکتے جانے والی گاڑی ہمیں کان پور سے ملے گی۔ ہمیں پہلے آگرہ سے کان پور جانا ہو گا۔ میں نے آگرے سے کان پور تک سیکنڈ

کلاس میں دو سیٹیں بک کروالیں۔ ہمارے پاس روپیہ پیسہ آ گیا تھا تو سامان بھی نمودار ہو گیا۔ یعنی میرے اور پروین کے نئے جوڑے وغیرہ۔ اس کے لیے ہمیں ایک اٹیچی کیس خریدنا پڑا۔ ہوٹل کا حساب وغیرہ صاف کر کے ہم اٹیچی کیس لے کر ٹیکسی میں سوار ہوئے اور آگرہ کے ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔ کانپور جانے والی گاڑی ہمیں دوپہر کے بعد ملی۔ اس گاڑی نے ہمیں رات کے پچھلے پہر کان پور پہنچایا۔ کلکتہ میل وہاں سے صبح روانہ ہوئی۔ سارا دن اور ساری رات سفر میں رہے۔ اگلے دن صبح گاڑی کلکتے کے دوسرے بڑے اسٹیشن ہوڑہ پہنچ گئی۔

پروین نے اپنا اٹیچی کیس اسٹیشن کے لاک روم میں رکھوا دیا۔ وہاں سے ہم پروین کے محلے میں آ گئے۔ پروین کے ماں باپ تو مدت ہوئی اپنا مکان چھوڑ کر کسی نامعلوم مقام کی طرف جا چکے تھے۔ ان کے مکان میں کوئی اور بنگالی فیملی رہ رہی تھی۔ محلے کی عورتوں نے پروین کو پہچان لیا۔ وہ اسے مسلمانوں والے لباس شلوار قمیص میں دیکھ کر بڑی حیران ہوئیں۔ ایک بوڑھی بنگالی عورت نے اس سے پوچھا۔

"پاروتی! تم نے ساڑھی کیوں نہیں پہنی ہوئی۔"

پروین نے کہا۔

"دیدی! میں اب پاروتی نہیں ہوں۔ میرا نام پروین ہے۔ میں مسلمان ہو چکی ہوں۔"

یہ سن کر عورتیں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔ پھر وہ اپنے اپنے گھروں میں چلی گئیں۔ کسی نے پروین سے کوئی بات نہ کی۔ پروین نے مجھے کہا۔

"ہم نے دیکھ لیا کہ ہندو لوگ مسلمانوں سے کس قدر نفرت کرتے ہیں۔ جب تک ان عورتوں کو میرے مسلمان ہونے کا علم نہیں تھا مجھ سے بڑی گھل مل کر باتیں کر رہی تھیں۔ جیسے ہی انہیں پتا چلا کہ میں مسلمان ہو گئی ہوں تو مجھ سے اس طرح دور ہو گئیں جس طرح لوگ کوڑھیوں سے دور بھاگتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اس کا مجھے بھی بہت تجربہ ہو چکا ہے۔ ہندوؤں میں اچھے لوگ بھی ہیں مگر وہ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہیں۔ ہندوؤں کی اکثریت یہاں کے مسلمانوں سے نفرت کرتی ہے۔ ان کے اسی نفرت کے رویے کی وجہ سے مسلمانوں کو الگ ملک پاکستان بنانا پڑا۔"

ہم باتیں کرتے گلیوں میں سے گزر رہے تھے۔ یہ بنگالی ہندوؤں کا محلہ تھا۔ ہم اپنے لباس سے صاف پہچانے جاتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں۔ بنگالی ہندو ہمیں گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ ہم بڑے بازار میں آ گئے۔ یہاں ہم ایک ریستوران میں کافی پینے بیٹھ گئے۔

میں نے پروین سے کہا۔

"میرا خیال ہے ہم اپنا اٹیچی کیس ریلوے اسٹیشن کے لاک روم میں ہی رہنے دیتے ہیں۔ اور ان کپڑوں میں ہی کاکسز بازار کے جنگل والے سنتھالوں کے چھوٹے ناگ مندر میں چلتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟"

پروین نے کہا۔

"ایسا ہی کریں گے مگر ہم کل صبح صبح یہاں سے چلیں گے۔ آج کا دن اور رات ہم آرام کرتے ہیں۔"

"تو پھر ہمیں کسی ہوٹل میں ٹھہرنا پڑے گا۔"

"ٹھہر جائیں گے۔ ہمارے پاس پیسے موجود ہیں۔ ضرورت پڑی تو سانپ کے ذریعے کسی اور مدفون خزانے میں سے کوئی ہیرا موتی منگوالیں گے۔" پروین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا۔

"تو پھر ہم اسٹیشن سے اٹیچی کیس نکلوالیں گے۔"

ہم نے ایسا ہی کیا۔ کافی پینے کے بعد ہم ریستوران سے نکل کر اسٹیشن پر گئے۔ وہاں سے اٹیچی کیس نکلوایا اور اسٹیشن کے قریب ہی ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں ڈبل بیڈ والا بڑا کمرہ لے لیا۔ رات آرام کیا۔ دوسرے روز صبح صبح ہم کاکسز بازار کی طرف روانہ ہوگئے۔ یہ سارا علاقہ ہمارا دیکھا بھالا اور جانا پہچانا تھا۔ آگے سنتھالی کے سپیروں کے جنگل کا راستہ مجھے معلوم نہیں تھا مگر پروین ایک ایک جھاڑی ایک ایک درخت سے واقف تھی۔ اس وقت آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ دوپہر ہوچکی تھی۔ ہم جنگل میں پیدل ہی چلے جارہے تھے۔ جنگلوں میں کئی کئی میل تک پیدل چلنا ہمارے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پھر بھی ہم گھنٹہ آدھ گھنٹہ چلنے کے بعد تھوڑی دیر بیٹھ کر آرام کرلیتے تھے۔ ہم نے کھانے پینے کی چیزیں ساتھ رکھ لی تھیں۔ میرے کندھے سے پانی سے بھری ہوئی تھرمس لٹک رہی تھی۔ تھیلے میں کچھ برگر قسم کی فوڈ تھی۔ شام کے وقت ہم جنگل میں ایک جگہ کچھ کھانے پینے کے لیے بیٹھے تو پروین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہیں یاد ہے۔ کبھی مجھے بھوک لگتی تھی تو میں تمہیں جنگل میں چھوڑ کر سانپ کی تلاش میں نکل جاتی تھی۔"

اس نے ایک ہاتھ کان سے لگا کر توبہ توبہ کہا اور بولی۔

"لگتا ہے وہ میری جنگلی زندگی کا زمانہ تھا۔ اب میں تہذیب کی روشنی میں آگئی ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے سیدھی راہ دکھادی۔ اب مجھے سانپ دیکھ کر ایک سیکنڈ کے لیے بھی خیال نہیں آتا کہ اس سے اپنے آپ کو ڈسواؤں یا اسے کھا جاؤں۔ اللہ مجھے معاف کرے۔"

جب شام کا اندھیرا تھوڑا گہرا ہوگیا تو پروین نے جونگل کے سامنے والے درختوں کی طرف غور سے دیکھا۔

"ان درختوں کے پیچھے ایک ٹیلہ ہے۔ اس ٹیلے کے دامن میں جھوٹے ناگ دیوتا کا مندر ہے جہاں سنتھالی سپیروں کا اڈہ ہے۔ یہ سارے کے سارے بردہ فروش اور بدکار آدمی ہیں۔ میں ان میں سے کسی ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑنا چاہتی۔ خدا کرے کہ یہ سارے بدمعاش ڈیرے پر موجود ہوں۔"

درختوں سے نکلنے کے بعد جب ہم سامنے والے ٹیلے کی طرف بڑھے تو پروین رک گئی۔ شام کا اندھیرا گہرا ہوگیا تھا۔ میں نے پروین کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے اس شیرنی کی آنکھوں کی چمک دکھائی دی جس نے اپنے شکار کی بوسونگھ لی ہو۔ اس وقت مجھے پروین پہلے والی پاروتی معلوم ہوئی۔ وہ سامنے والے ٹیلے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"ہم سنتھالی سپیروں کے علاقے میں داخل ہوگئے ہیں۔ آگے اونچی آواز میں بات نہ کرنا۔ کھانسنا بھی نہیں۔ میرے پیچھے پیچھے دبے پاؤں چلنا آؤ۔"

وہ میرے آگے آگے جھاڑیوں میں چل پڑی۔ اس نے اپنا دوپٹہ سر کے گرد باندھ لیا تھا۔ کیونکہ کاندھے پر پڑے پڑے وہ جھاڑیوں میں الجھ رہا تھا۔ میں دل میں سوچنے لگا کہ یہ سنتھالی کے بدمعاش سپیروں کا کس طرح مقابلہ کرے گی۔ نہ اس کے پاس کوئی ہتھیار تھا نہ میرے پاس ہی کوئی ہتھیار تھا۔ کلکتے سے چلتے وقت میں نے اسے کہا تھا کہ ہم کوئی خنجر خرید کر ساتھ رکھ لیتے ہیں جس پر پروین نے جواب دیا تھا کہ اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھ رہے تھے جنگل گھنا ہوتا جارہا تھا۔ ہم دونوں کی آنکھیں جنگل کے اندھیرے کی عادی تھیں۔ ہم نے نہ جانے کتنی تاریک راتیں ان جنگلوں کی دربدری میں گزار دی تھیں۔ ہم ٹیلے کے نشیب میں پہنچ گئے تھے۔ درخت اتنے ساتھ ساتھ کھڑے تھے کہ انہوں نے ایک دیوار بنادی تھی۔

ایک بہت بڑے درخت کے پاس جاکر پروین رک گئی۔ اندھیرے میں مجھے اس کا سایہ نما خاکہ صاف نظر آرہا تھا۔ وہ بیٹھ گئی اور ہاتھ سے مجھے بھی بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے پہلو میں آکر بیٹھ گیا۔ درخت کا تنا بہت بڑے ستون کی طرح تھا۔ بیٹھتے ہی مجھے درخت کے پیچھے کچھ فاصلے پر روشنی جھلملاتی نظر پڑی۔ پروین نے میرے کان کے پاس منہ لاکر کہا۔

"یہی ناگ دیوتا کا استھان ہے۔ ہمیں رینگ کر وہاں جانا ہوگا۔"

ہم گھاس اور جھاڑیوں میں احتیاط سے رینگتے ہوئے آگے بڑھے۔ روشنی قریب ہوئی تو پتا چلا کہ وہ مٹی کے تیل کا ایک بڑا لیمپ ہے جو درخت کے تنے میں بنے ہوئے ناگ دیوتا کے بت کے آگے جل رہا ہے۔ اس کے اردگرد کچھ آدمی زمین پر لیٹے گہری نیند سو رہے تھے۔ پروین نے منہ میرے قریب لاکر سرگوشی کی۔

"یہ سنتھالی بدمعاش پجاری سو رہے ہیں۔ میں انہیں جہنم کی آگ میں دھکیلنے جارہی ہوں۔"

پروین نے اتنا کہہ کر دو تین گہری سانسیں لیں۔ دوسرے لمحے وہ سانپ بن گئی۔ یہ وہی نیلا سانپ تھا جس کے ٹکڑے میں رومال میں ڈال کر کیلاش پربت لے گیا تھا۔ سانپ نے پھن کھول کر میری طرف ایک نگاہ ڈال کر دیکھا گویا کہہ رہا ہو کہ تم اسی جگہ لیٹے رہو۔ نیلا سانپ اندھیرے میں میری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ میں نے اپنی نگاہیں مٹی کے تیل کے لیمپ کے آس پاس جمادیں۔ جہاں سنتھالی سپیرے گہری نیند سو رہے تھے۔ میں نے انہیں گنا وہ کل پانچ تھے۔ جنگل میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

یہ سناٹا پروین کے جانے کے بعد مجھے زیادہ خوفناک اور پراسرار ہوتا محسوس ہوا۔ پھر اچانک سویا ہوا ایک سپیرا اپنا آدھا دھڑ اوپر اٹھا کر بیٹھ گیا۔ اس کا منہ ایسے کھل گیا جیسے کچھ کہنے یا چلانے کی کوشش کررہا ہو مگر اس کے ساتھ ہی وہ بے جان ہوکر نیچے کو گر پڑا۔ اسی طرح دوسرا سپیرا بھی اٹھا اور کچھ کہنے کی کوشش کرتے ہوئے وہیں لڑھک گیا۔ عجیب بات تھی کہ ہر سپیرا اٹھ کر بیٹھتا، منہ کھولتا، اس کی آواز نہ آتی اور وہ پیچھے کو پچھاڑ کھا کر گر پڑتا اور پھر ساکت ہوجاتا تھا۔ وہ ہاتھ پاؤں بھی نہیں ہلاتا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ پروین سانپ کے روپ میں انہیں کچھ ایسے طریقے سے ڈس رہی ہے کہ سب سے پہلے ان کی آواز بند ہوجاتی تھی اور آدھا دھڑ مردہ ہوجاتا تھا۔ بعد میں پروین نے مجھے بتایا کہ

ان خطرناک سنتھالی سپیروں کو سانپ کے زہر سے مارنا آسان نہیں تھا۔ یہ لوگ سانپ کے ڈستے ہی ایک ایسا منتر پڑھ کر پھونک دیتے تھے کہ نہ صرف ان کے بدن پر سانپ کے زہر کا اثر ختم ہو جاتا تھا بلکہ جس سانپ نے انہیں ڈسا ہوتا تھا وہ بھی جل کر راکھ ہو جاتا تھا۔ اس لیے پروین انہیں ان کی گردن کی ایک خاص رگ پر ڈس کر زہر داخل کردیتی کہ سب سے پہلے ان کی آواز بند ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد وہ نچلے دھڑ کو ڈستی اور یوں ایک ایک کرکے پانچوں کے پانچوں بدکردار سپیرے میری آنکھوں کے سامنے اپنا دھڑ اوپر اٹھا اٹھا کر منہ کھول کھول کر بولنے کی ناکام کوشش کرتے کرتے مر گئے۔ جب پانچواں سپیرا بھی سانپ کے زہر سے مر گیا تو پروین انسانی شکل میں چل کر میرے پاس آئی اور بولی۔

''اب ہمیں کسی سے چھپنے کی ضرورت نہیں ہے میں نے تمام سپیروں کو اپنے زہر سے ہلاک کردیا ہے۔ اب میرے ساتھ آؤ اور ان بدکردار ظالم سپیروں کو جہنم کی آگ میں جلتے دیکھو۔''

ہم آہستہ آہستہ چل کر اس درخت کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے جس کے تنے میں سانپ دیوتا کا بت لگا ہوا تھا اور جس کے سامنے پانچوں سپیروں کی لاشیں پڑی تھیں۔ پروین نے ایک سپیرے کی لاش کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

''یہ وہ سپیرا ہے جس نے مجھے کلکتے میں میرے گھر سے اغوا کیا تھا۔ اب ان کا انجام دیکھو۔''

لیمپ کی روشنی میں مجھے سپیروں کی لاشوں میں سے ہلکے ہلکے بخارات اٹھتے نظر آنے لگے۔ پروین نے کہا۔

''میرے زہر نے ان کے اندر کے دوزخ کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ ان کی رگوں میں دوڑتا ہوا خون جم گیا ہے اور اب اپنے ہی گناہوں کی آگ میں سرخ ہو کر ان کے جسم کو جلانے لگا ہے۔''

پروین نے درخت کے تنے میں ناگ دیوتا کی طرف دیکھا اور کہا۔

''کل تک میں گناہوں کی دلدل میں ڈوبی ہوئی تھی اور تیری پوجا کرتی تھی۔ آج میں سچائی کی روشنی میں ہوں اور تجھے جہنم میں پھینکنے لگی ہوں۔''

یہ کہہ کر پروین نے سانس اندر کو کھینچ کر منہ سے پھنکار کی آواز نکالی۔ میں نے پہلی بار اس کے منہ سے پھنکار کے ساتھ آگ کی چنگاریاں نکلتے ہوئے دیکھیں۔ ان چنگاریوں میں اس قدر تپش اور زبردست آتش گیر مادہ تھا کہ جیسے ہی چنگاریاں درخت پر پڑیں درخت نے آگ پکڑ لی۔ ایک دھماکے کے ساتھ درخت آگ کے شعلوں کا ایک ستون بن گیا اور اس آگ میں جھوٹا ناگ دیوتا بھی جل کر بھسم ہونے لگا۔ دوسری پھنکار پروین نے پانچوں بدکردار سپیروں کی لاشوں پر پھینکی۔ پھنکار کی چنگاریاں سپیروں کی سبز اور سیاہ ہوتی لمحہ بہ لمحہ پگھلتی اور اپنی ہی آگ کے انگاروں میں جلتی لاشوں پر گریں تو وہ بھی ایک دھماکے سے آگ کے شعلوں میں تبدیل ہو گئیں۔ وہاں اب آگ ہی آگ تھی۔ شعلے ہی شعلے تھے۔ پروین نے مجھے بازو سے کھینچتے ہوئے کہا۔

''یہاں سے نکل آؤ۔''

ہم وہاں سے واپس دوڑ پڑے۔ آگ کے شعلے آگے بڑھ رہے تھے۔ یہ واقعی جہنم کی آگ معلوم ہوتی تھی کہ اس کے شعلے بلند سے بلند تر ہو رہے تھے اور جنگل میں چاروں طرف بڑھتے

ہوئے سپیروں کے چھوٹے بڑے بتوں اور مندر کو بھسم کرتے جا رہے تھے۔

☆☆☆......

جنگل کی اندھیری رات میں ہم دونوں کافی دور تک واپس دوڑتے چلے گئے۔ پروین کی پھنکاروں نے ناگ مندر کے اردگرد ایسی بھیانک آگ لگا دی تھی کہ اس نے اردگرد کے سارے جنگل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ہم ایک ندی کے کنارے پہنچ گئے۔ اس کے پل پر سے ندی پار کی اور دوسرے کنارے پر تھک کر بیٹھ گئے۔ میں بہت زیادہ تھک گیا تھا جبکہ پروین اتنی زیادہ نہیں تھکی تھی۔ ہم پلٹ کر دور جنگل کی آگ کے شعلوں کو دیکھنے لگے۔ پروین نے کہا۔

''یہ آگ کافروں کے تمام مندروں اور ان کے مکار جھوٹے پجاریوں کو جب تک بھسم نہیں کرے گی، بجھے گی نہیں۔''

آگ کے لہراتے ہوئے آسمان کی طرف بلند ہوتے شعلوں نے جنگل کی رات کو روشن کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر ہم ندی کے پاس بیٹھے آگ کو دیکھتے رہے پھر جنگل میں اس راستے پر چل پڑے جو کاکسز بازار کے سمندری ساحل کی طرف جاتا تھا۔ رات کا باقی کا حصہ ہم نے ایک کھاڑی کے پاس گھنے درختوں کے نیچے ایک چٹان کی کھوہ میں بسر کیا۔ دوسرے دن سورج نکلا تو ہم کاکسز بازار کی طرف روانہ ہو گئے۔ پروین بڑی خوش تھی کہ اس نے سنتھالی کے بدکردار سپیروں اور ناگ دیوتا کے مکار پجاریوں کو موت کے گھاٹ اتار کر ان سے اپنا بدلہ ہی نہیں چکا دیا بلکہ آئندہ کے لیے برائی کی جڑ کو ہی کاٹ دیا ہے۔

ابھی شام نہیں ہوئی تھی کہ ہم کاکسز بازار پہنچ گئے۔ یہاں سے ہم واپس کلکتے آ گئے۔ ایک دن اور ایک رات کلکتے کے ہوٹل میں آرام کیا۔ میں نے پروین سے پوچھا کہ اب جبکہ اس نے اپنے ماں باپ کے پرانے گھر کو دیکھ لیا ہے اور سنتھالی سپیروں سے اپنے ساتھ کی گئی زیادتیوں کا انتقام بھی لے لیا ہے تو اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں اس نے کیا سوچا ہے۔ اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''تم مجھے کیا مشورہ دیتے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''یہ تمہاری اپنی زندگی کا معاملہ ہے۔ اپنی زندگی جس طرح اور جہاں چاہو بسر کر سکتی ہو۔''

پروین کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمودار ہوئے۔ کہنے لگی۔

''میرا ہندوستان میں رہنے کو بالکل جی نہیں چاہتا۔ یہاں قدم قدم پر کفر کا راج ہے۔ یہ بت پرستوں، توہم پرستوں اور مسلمانوں سے نفرت کرنے والے ہندوؤں کا ملک ہے۔ وہاں ایک خدا ایک رسول ﷺ اور ایک کتاب کو ماننے والے رہتے ہیں۔ ویسے بھی ہندوستان میں اب میرا کوئی نہیں ہے، ماں باپ خدا جانے کہاں غائب ہو چکے ہیں۔ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ کوئی عزیز رشتہ دار بھی نہیں ہے، یہاں کے ہندوؤں کو جب معلوم ہوگا کہ میں ہندو تھی اور اب مسلمان ہو گئی ہوں تو مجھ سے نفرت کریں گے، میرا جینا حرام کر دیں گے۔ مجھے نہ سکون سے زندہ رہنے دیں گے اور نہ چین سے مرنے دیں گے۔''

میں نے خوش ہو کر کہا۔ ''تم میرے ساتھ

پاکستان بھی چلو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ میں وہاں تمہیں اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے ملاؤں گا۔ وہ تمہیں مل کر بڑے خوش ہوں گے۔"

پروین کہنے لگی۔ "میں اگر تمہارے ساتھ پاکستان گئی تو صرف ایک شرط پر جاؤں گی کہ تم نہ تو مجھے اپنے گھر لے کر جاؤ گے اور نہ ہی اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے ملاؤ گے۔"

"وہ کیوں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

پروین نے مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تم اس بات کو نہیں سمجھ سکو گے۔ بہرحال میں ابھی اس مسئلے پر تھوڑا اور غور و فکر کرنا چاہتی ہوں، مجھے آج رات سوچ لینے دو، کل تمہیں اپنا آخری فیصلہ بتادوں گی۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ اگر میں پاکستان گئی تو نہ تم اپنے گھر والوں کو میرے بارے میں کچھ بتاؤ گے اور نہ میں ان سے ملاقات کروں گی۔ میں پاکستان کے کسی بھی شہر میں اکیلی رہ لوں گی۔ میں نے ایف ایس سی کی ہوئی ہے، میں کسی اسپتال میں نرس بن کر بیماروں کی خدمت کروں گی اور اسپتال کے نرسز کوارٹر میں ہی رہائش اختیار کرلوں گی۔"

میں نے اس بات کو مزید آگے نہ بڑھایا۔ وہ دن اور رات بھی گزر گئے۔ اس کے اگلے دن پروین میرے ساتھ ناشتہ کررہی تھی بولی۔

"میں نے فیصلہ کرلیا ہے، میں پاکستان تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ وہاں کسی شہر میں نرسنگ ٹریننگ کا کورس کروں گی اور باقی زندگی پاکستان میں رہ کر بیماروں کی خدمت کرتے ہوئے گزار دوں گی۔ اب یہی میری زندگی کا نصب العین ہے۔ تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے؟"

پروین نے میری طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میں نے کہا۔ "مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ مجھے تو خوشی ہوگی کہ میرے وطن پاکستان کو ایک اچھی نرس مل جائے گی۔"

پاکستان کا قیام عمل میں آئے اتنا عرصہ گزر گیا تھا کہ دونوں ملکوں یعنی بھارت اور پاکستان کے درمیان سفارتی تعلقات قائم ہوچکے تھے۔ سرحدوں میں دونوں جانب باؤنڈری فورس کا قیام بھی عمل میں آچکا تھا۔ کوئی آدمی خاص پرمٹ کے بغیر سرحد پار نہیں کرسکتا تھا۔

کلکتے سے مشرقی پاکستان زیادہ قریب تھا۔ پروین کا خیال تھا کہ ہم کلکتے سے مشرقی پاکستان جائیں گے۔ وہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز یا بحری جہاز مغربی پاکستان چلے جائیں گے۔ ہم نے پتا کیا تو معلوم ہوا کہ کلکتہ میں ابھی پاکستان کا ہائی کمیشن کا آفس قائم نہیں ہوا۔ ہمیں اس کے لیے دلی جانا ہوگا۔ جہاں پاکستان کا ہائی کمیشن کام کرنے لگا تھا۔ پروین کہنے لگی۔

"تم پاکستان کے شہری ہو۔ پاکستان کے رہنے والے ہو۔ تمہیں کوئی پرمٹ لینے کی ضرورت نہیں۔ ہم مغربی بنگال سے بارڈر پار کرکے مشرقی پاکستان میں آسانی سے داخل ہوسکتے ہیں۔ یہاں بارڈر پر ابھی کسی قسم کی سختی نہیں ہے۔ مہاجرین ابھی تک ادھر سے ادھر آ جارہے ہیں۔ میں بھی مہاجر ہوں اور ہندوستان چھوڑ کر پاکستان میں آباد ہونا چاہتی ہوں۔ کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

پروین بنگال کی رہنے والی تھی۔ بنگلہ زبان اس کی مادری زبان تھی۔ مغربی بنگال کے سارے سرحدی علاقے سے وہ واقف تھی۔ چنانچہ ہم نے مشرقی پاکستان جانے کا فیصلہ کرلیا۔ ہمارے پاس

انڈین کرنسی تھی۔ ہم نے ہوٹل میں ہی ایک ایجنٹ سے اس کے عوض پاکستانی کرنسی بدلوالی۔ یہ کل سوا چھ ہزار روپے تھے۔ جو اس وقت اچھی خاصی رقم ہوا کرتی تھی۔ پروین نے کہا۔

"ہم ہلی کے مقام سے بارڈر کراس کرکے مشرقی پاکستان میں داخل ہوں گے۔"

اس نے ہوٹل کے بنگالی منیجر سے ساری معلومات حاصل کرلی تھیں۔ ہم ٹرین کے ذریعے ہلی پہنچے وہاں مسلمان مہاجروں کا ایک چھوٹا سا قافلہ مغربی بنگال سے ہجرت کرکے مشرقی پاکستان جارہا تھا۔ ہم بھی اس قافلے کے ساتھ ہوگئے۔ بارڈر پر پاکستانی فوج موجود تھی مگر وہ ضروری چیکنگ کے بعد مہاجرین کو جانے کی اجازت دے دیتی تھی۔ ہماری بھی چیکنگ ہوئی۔ میں نے پروین کو اپنی بیوی ظاہر کیا اور اپنے بارے میں بتایا کہ میں لاہور کا رہنے والا ہوں۔ کلکتے میں نوکری کرتا تھا۔ وہیں پروین سے شادی کی اور اب مشرقی پاکستان جانا چاہتا ہوں۔ ہمارے عارضی پرمٹ بنائے گئے اور ہم مشرقی پاکستان کی سرزمین میں داخل ہوگئے۔

ہلی سے ہمیں ڈھاکا جانا تھا۔ راستے میں ایک مقام پر دریا کا نیا پل بن رہا تھا جس کی وجہ سے ہم نے ٹرین سے ایک جگہ اتر کر کشتی میں دوسرے مہاجرین کے ساتھ دریا پار کیا۔ دوسری جانب ایک گاڑی کھڑی تھی۔ ہم اس میں بیٹھ گئے۔ ایک دن اور ایک رات ٹرین میں سفر کرنے کے بعد ہم ڈھاکا پہنچ گئے۔ ڈھاکا میں ہم ایک ہوٹل میں ٹھہر گئے۔ یہ درمیانے درجے کا ہوٹل تھا۔ ہم نے اپنے آپ کو میاں بیوی ظاہر کیا تھا۔ ہمیں مجبوراً ایک ہی کمرہ لینا پڑا۔ جس میں ڈرائنگ روم اور بیڈ روم ایک ہی کمرے میں تھا۔ میں نے ابھی تک مشرقی پاکستان نہیں دیکھا تھا۔ پروین اسکول کے زمانے میں اپنے ماتا پتا کے ساتھ ڈھاکا آچکی تھی۔ میں نے پروین سے کہا۔

"میں ڈھاکا شہر کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔ ایسا کرتے ہیں ہم ہوائی جہاز پر کراچی کے لیے اپنی نشستیں ریزرو کروادیتے ہیں۔ ہمیں ایک دو دن ضرور مل جائیں گے۔ اس دوران ہم شہر کی سیر کرلیں گے۔"

پروین نے کہا۔ "چلو پہلے ایئر لائنز کے آفس جاکر جہاز میں سیٹیں بک کراتے ہیں۔"

اس زمانے میں پی آئی اے کی جگہ اورینٹ ایئرویز کے جہاز ڈھاکا سے کراچی جایا کرتے تھے۔ ہم اورینٹ ایئرویز کے آفس گئے جو ڈھاکا ایئرپورٹ کے پاس ہی تھا۔ ہمیں تین دن بعد کی فلائٹ میں جگہ مل گئی۔ میں بڑا خوش ہوا۔ اس طرح مجھے ڈھاکا کی سیر کا موقع مل گیا تھا۔ ہم ہوٹل میں آگئے۔ سورج غروب ہونے والا تھا۔ پروین کہنے لگی۔

"ہم کل شہر کی سیر کرنے نکلیں گے۔ ابھی تھوڑی دیر میں رات ہوجائے گی۔"

رات کو میں نے پروین کو پلنگ پر سلایا اور خود صوفے پر سوگیا۔ کمرے کی ایک بتی میں نے روشن رہنے دی تھی۔ کچھ دیر ہم باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد پروین سوگئی۔ میں صوفے پر لیٹا کچھ دیر ڈھاکا کے اردو اخبار کا مطالعہ کرتا رہا پھر میں نے بھی اخبار ایک طرف رکھ کر آنکھیں بند کرلیں۔ میں ابھی غنودگی کے عالم میں تھا کہ مجھے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی شے صوفے کی پشت گاہ کے اوپر سے گزر رہی ہو۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔

دیوار پر لگی بتی جل رہی تھی۔ میں نے بجلی کی روشنی میں ایک سبز رنگ کے سانپ کو دیکھا جو صوفے کے اوپر سے رینگتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں جلدی سے صوفے پر سے اچھل کر قالین پرآ گیا۔ سانپ بھی وہیں رک گیا۔ اس نے گردن اٹھالی پھر اپنا پھن کھولا اور پھنکارنے لگا۔ میری جیب میں پروین کا رومال نہیں تھا۔ میں نے پروین کو آواز دے کر جگادیا۔

"کیا ہوا؟"

پروین پلنگ پر اٹھ بیٹھی۔ اب اس نے بھی سانپ کو دیکھ لیا تھا۔ سبز سانپ نے اپنی گردن اور اوپر اٹھالی اور اپنے پھن کو دائیں بائیں لہراتے ہوئے آگے کو جھکا دیا۔ پروین پلنگ پر سے اتر کر صوفے کے پاس آئی۔ اس نے سانپ کو اٹھالیا اور اسے غور سے دیکھنے لگی۔ اس نے کہا۔

"یہ بنگال کا دریائی سانپ ہے۔"

پروین کے ہاتھ میں سانپ بالکل نیم مردہ سا ہو کر لٹکنے لگا تھا۔ پروین نے اس کی گردن پکڑ کر اوپر کرلی اور پھر اس سے ہلکی ہلکی سسکاریوں میں باتیں کرنے لگی۔ جس طرح کہ وہ عام طور پر سانپوں سے باتیں کیا کرتی تھی۔ اس کے بعد پروین نے سانپ کو اپنی کلائی کے گرد لپیٹا' میرے پاس صوفے پرآ کر بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔

"لگتا ہے بنگال کے سپیروں کو میرے آنے کا پتا چل گیا ہے' انہوں نے اس سانپ کو میری سراغ رسانی کے لیے یہاں بھیجا ہے۔"

میں نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے یہاں ایک نئی مصیبت ہمارا انتظار کررہی تھی۔ اس سانپ کو واپس مت جانے دینا۔ اسے یہیں ختم کرڈالتے ہیں۔ یہ واپس جا کر ہمارے دشمن سپیروں کو ہمارا ٹھکانہ بتادے گا۔"

پروین نے سانپ کی طرف دیکھا۔ اس سے مسکرا کر کوئی بات کی۔ پھر میری طرف پلٹ کر کہا۔ "فکر نہ کرو' یہ سانپ واپس جا کر پدم سپیروں کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتائے گا۔"

میں نے کہا۔ "سانپ کا کیا بھروسہ ہے۔"

پروین بولی۔ یہ میرا مطیع ہے' میں نے اسے حکم دیا ہے کہ جس سپیرے نے اسے میری تلاش میں یہاں بھیجا ہے' اسے واپس جا کر میرے بارے میں کچھ نہ بتائے۔ گھبراؤ نہیں سانپ میرا حکم مانتے ہیں۔"

"تو کیا ہم ساری رات اس سانپ کو اپنے کمرے میں رکھیں گے۔"

پروین نے آگے بڑھ کر کمرے کی کھڑکی کھولی اور سانپ کو دوسری طرف گلی میں گرادیا۔ کھڑکی بند کر کے پلنگ پرآ گئی اور مجھے کہا۔

"بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ سانپ واپس سپیروں کے پاس جانے کی بجائے دریا کی طرف چلا جائے گا۔ جہاں وہ رہتا ہے۔"

باقی رات میں نے بڑی مشکل سے گزاری۔ پروین تو مزے سے سو گئی مگر میری آنکھ بار بار کھل جاتی ۔ ایسے محسوس ہوتا کہ سبز سانپ کمرے میں رینگ رہا ہے۔

دوسرے دن ہم ڈھاکا کی سیر کو نکل گئے۔ دوپہر تک شہر کے بازاروں باغات اور دریائے بوڑھی گنگا کی سیر کرتے رہے' دوپہر کو ہوٹل میں کھانا کھایا' کچھ دیر آرام کیا اور سورج غروب ہونے سے پہلے گھاٹ پر جا کر کشتی لی اور دریا کے دوسرے کنارے کی طرف دریا کے اوپر کی جانب نکل گئے۔ کافی آگے جا کر ہم نے کشتی چھوڑ دی اور کنارے کے درختوں کے نیچے آ کر بیٹھ گئے۔ ایک چھوٹا سا راستہ پٹ سن کے کھیتوں میں سے ہوتا ہوا آگے اونچے اونچے تاڑ اور ناریل کے درختوں کی طرف نکل گیا تھا۔ ہم اتر کر اس راستے پر چلتے ہوئے ناریل کے جھنڈوں میں آ گئے۔ ہم پھر یہاں سے بھی آگے چلے گئے۔

آگے کسی کارخانے کا بہت بڑا گودام تھا۔ آس پاس چند ایک جھونپڑیاں تھیں۔ کچھ عورتیں اور مرد بچے جھونپڑیوں کے پاس بیٹھے تھے۔ ایک کھوکھا تھا جہاں چائے پک رہی تھی۔ ہم نے وہاں چائے پی اور واپس دریا کی طرف چلنے لگے تو ایک سیاہ رنگ کی ہڈیوں کی ڈھانچہ عورت ہاتھ باندھ کر ہمارے راستہ میں کھڑی ہو گئی اور بنگلہ زبان میں تیز تیز بولنے لگی۔ پروین اس سے بنگلہ میں باتیں کرنے لگی۔ پھر پروین نے اپنے پرس میں سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اس عورت کو دیا۔ عورت نے آگے بڑھ کر پروین کا ماتھا چوم لیا۔ اس کے بعد ہم وہاں سے واپس دریا پرآ گئے۔ یہاں سے کشتی پر بیٹھے اور دریا پار بوڑھی گنگا کے دوسرے کنارے پر اتر گئے۔ یہاں سبزیوں اور پھلوں کی منڈی تھی۔ شام کے وقت بھی وہاں کاروبار ہو رہا تھا۔ ہم نے کچھ کیلے خریدے اور سائیکل رکشہ لے کر واپس اپنے ہوٹل میں چلے آئے۔

رات کو ہم نے اکٹھے کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے دوران بھی پروین بار بار اپنے ماتھے کو بائیں ہاتھ سے سہلاتی رہی۔ میں نے پوچھا۔

"کیا بات ہے پروین' کیا سر درد کر رہا ہے۔"

وہ بولی "نہیں۔ جہاں اس بھکاری عورت نے میرے ماتھے کو چوما تھا' وہاں جلن سی ہونے لگی ہے۔"

میں نے پروین کے ماتھے کو غور سے دیکھا۔ ماتھے پر ایک طرف جلد نیلی پڑ رہی تھی۔ پروین کا رنگ گہرا سانولا بلکہ کالا تھا اور نیل کا نشان بجلی کی روشنی میں صاف نظر آنے لگا تھا۔ میں نے اسے نہ بتایا کہ ماتھے پر نیل کا نشان پڑ گیا ہے۔ کھانا کھانے کے بعد وہ غسل خانے میں گئی۔ آئینے میں اس نے اپنے ماتھے کو دیکھا۔ باہر آئی تو بولی۔ "وہ عورت بھکارن نہیں تھی۔" میں چونک سا گیا۔

"تو پھر وہ کون تھی؟"

پروین صوفے پر بیٹھ گئی۔

"کیا ہمیں پرسوں کی بجائے کل کی فلائیٹ میں جگہ مل سکتی ہے؟"

"آخر بات کیا ہوئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

پروین نے کہا۔ "پہلے تم ائیر لائنز کے آفس میں فون کر کے پوچھو۔ اگر کل صبح کی یا آج رات کی فلائیٹ میں بھی جگہ مل جائے تو ہم یہاں سے کراچی پرواز کر جائیں گے۔"

مجھے معلوم تھا کہ پروین جب کبھی اس قسم کی ہدایت کرتی ہے تو اس کے پیچھے کوئی گہری بات ہوتی ہے۔ میں نے کہا۔ "میں نیچے جا کر فون کرتا ہوں۔"

میں پروین کو اپنا ماتھ سہلاتا چھوڑ کر نیچے ہوٹل کے منیجر کے کاؤنٹر پرآ گیا۔ میں نے اورینٹ ایئر لائنز کے آفس فون کر کے اپنا نام پروین کا نام اور پرسوں کی فلائیٹ میں اپنے سیٹ نمبر بتائے اور کہا۔

"ہمیں ایک ایمرجنسی آن پڑی ہے' ہمارا جلد سے جلد کراچی پہنچنا ضروری ہو گیا ہے۔ کیا ہمیں آج رات بارہ بجے کی یا کل صبح کی فلائیٹ میں دو سیٹیں مل سکتی ہیں؟"

دوسری طرف سے ریزرویشن آفیسر کی آواز آئی۔

"آج رات ایک بجے کی فلائیٹ میں دو سیٹیں آپ کو چانس پر مل سکتی ہیں۔ ہم آپ کی ریزرویشن کنفرم نہیں کرسکتے۔ آپ ایئرپورٹ پر آجائیں۔ جن لوگوں کی ریزرویشن ہوچکی ہے' اگر وہ آگئے تو آپ کو جہاز سے اترنا پڑے گا۔"

میں نے اوپر آکر پروین کو ساری بات بتائی۔ وہ بولی میں یہ چانس لینے کے لیے تیار ہوں۔"

میں نے کہا۔ "آخر ایسی کونسی بات ہوگئی ہے۔ تم مجھے بتاتی کیوں نہیں' وہ بھکارن کون تھی' کیا وہ کوئی جادوگرنی تھی؟"

پروین نے ماتھے پر پٹی باندھ لی اور کہنے لگی۔

"کپڑے وغیرہ اٹیچی کیس میں رکھ لو۔ ہم گیارہ بجے رات یہاں سے ایئرپورٹ چل دیں گے۔"

اس وقت ابھی رات کے نو ہی بجے تھے۔ ہم نے اپنے تھوڑے بہت کپڑے جو ہمارے پاس تھے اٹیچی کیس میں بند کردیئے۔ میں نیچے چلا آیا۔ ہوٹل والوں کو بلوں کی ادائیگی کی اور کہا کہ ہمیں اچانک ایک ضروری کام پڑگیا ہے' ہم رات کی فلائیٹ سے کراچی جارہے ہیں۔ ہوٹل سے باہر آکر ہم نے ٹیکسی لی اور سیدھا ایئرپورٹ آگئے۔ یہاں ائرلائینز کا ذیلی آفس کاؤنٹر کی شکل میں موجود تھا۔ انہیں اپنے ٹکٹ دکھائے۔ انہوں نے بتایا کہ ہم آپ کی ریزرویشن کنفرم نہیں کرسکتے' جن لوگوں کی یہ سیٹیں ہیں ان لوگوں کی بھی کنفرمیشن نہیں ہوئی لیکن اگر وہ عین وقت پر آگئے تو آپ کو واپس جانا ہوگا۔ ہم نے چانس لے لیا اور لاؤنج کے باہر ہال میں آکر بیٹھ گئے۔ پروین تھوڑی تھوڑی دیر بعد ماحول کا جائزہ لے لیتی تھی۔ جیسے اسے ابھی تک فضا میں خطرہ محسوس ہورہا ہو۔

رات کے ساڑھے گیارہ بجے ہماری فلائیٹ کنفرم ہوگئی۔ ہم نے بورڈنگ کارڈ لیے اور لاؤنج میں آگئے۔ میں نے پروین سے کہا۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں مطمئن ہوجانا چاہیے۔ یہاں کوئی سانپ ہماری سراغ رسانی کے لیے نہیں آئے گا۔"

پروین نے لاؤنج میں بیٹھے ہوئے مسافروں کا جائزہ لیا اور بولی۔

"جب تک جہاز ڈھاکے سے ٹیک آف نہیں کرجاتا کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ تم بنگال کے سپیروں سے واقف نہیں ہو۔"

لیکن جہاز ٹیک آف کرگیا اور کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ جب طیارہ ڈھاکا کے اوپر رات کے اندھیرے میں چکر لگا کر کراچی کی طرف روانہ ہوا تو پروین نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے چہرے پر ایسا اطمینان تھا جیسے اس کے سر پر سے کسی نے بہت بڑا بوجھ اتار دیا ہو۔ اس نے میرا نام لے کر کہا۔

"مجھے ایسے محسوس ہورہا ہے جیسے میں ماضی کی دلدل میں سے نکل کر ایک پاک صاف نئی زندگی کا آغاز کررہی ہوں۔"

کراچی ایئرپورٹ پر اترنے کے بعد مجھے بھی یوں محسوس ہوا جیسے میں دشمنوں کے ملک سے نکل کر اپنے گھر آگیا ہوں۔ یہ میرے نئے آزاد وطن پاکستان کی سرزمین تھی۔ پروین بڑی خوش تھی۔ کراچی سے ہم نے دوسری فلائیٹ لی اور لاہور آگئے۔ پروین سے کئے گئے وعدے کے مطابق میں اسے لے کر اپنے گھر جانے کی بجائے ایئرپورٹ سے سیدھا ایک ہوٹل میں آگیا۔ یہاں

پروین کے لیے ایک کمرہ لے لیا۔ اسے ہوٹل میں چھوڑ کر میں اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ ایک لمبے عرصے کے بعد میں اپنے گھر جارہا تھا۔ میرے ماں باپ اور بہن بھائی مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے پھر سب کے چہرے خوشی سے چمکنے لگے۔ سب نے مجھے گلے لگایا۔ والد صاحب نے دبی زبان میں میری آوارہ گردیوں کے خلاف ناراضگی کا اظہار کیا۔ میں نے آئندہ کبھی گھر سے نہ بھاگنے کا انہیں یقین دلایا اور معافی مانگی۔ پروین کا ذکر میں نے کسی سے نہ کیا۔ رات کو میں پروین کے پاس اس کے ہوٹل میں پہنچ گیا۔ ایک ہفتہ پروین ہوٹل میں رہی' اس دوران میں نے کوشش کرکے اسے ایک نیم سرکاری اسپتال میں بطور نرس بھرتی کرادیا۔ اس کی ٹریننگ کا کورس شروع ہوگیا۔ اسے اسٹاف ہاسٹل میں ایک کمرہ مل گیا۔ یوں پروین نے پاکستان کے شہر لاہور میں اپنی نئی زندگی کا آغاز کردیا۔

وہ بڑی محنتی اور لائق لڑکی ثابت ہوئی۔ ٹریننگ ختم ہونے کے بعد وہ اسپتال میں بطور نرس کام کرنے لگی۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ اب آزاد اسلامی ملک پاکستان ہی اس کا وطن ہے اور وہ پاکستان میں ایک نیک اور خدمت گزار زندگی بسر کرنے کی خواہش مند ہے۔ اسپتال میں پروین کی دن کی ڈیوٹی ہوتی تھی۔ میں ہر روز پروین سے ملنے نہیں جاتا تھا۔ اس نے خود مجھے منع کر رکھا تھا' ہم دوسرے تیسرے دن ایک دوسرے سے ملتے۔ ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد وہ کافی ہاؤس میں آجاتی۔ میں پہلے سے وہاں اس کا انتظار کررہا ہوتا تھا۔ ہم دونوں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کافی ہاؤس کی گیلری میں بیٹھے باتیں کرتے' کافی پیتے اور پھر پروین اپنے ہوسٹل کی طرف چلی جاتی تھی اور میں اپنے گھر کی طرف روانہ ہوجاتا تھا۔

ایک دن شام کو میں اور پروین کافی ہاؤس میں بیٹھے کافی پی رہے تھے کہ میں نے جذبات میں آکر اپنے دل کی بات بے اختیار کہہ دی۔ میں نے کہا۔

"پروین! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں' کیا تم مجھ سے شادی کروگی۔"

پروین میری طرف دیکھ کر تھوڑا شرما گئی' پھر مسکرا کر کہنے لگی۔

"اگر میں تمہاری دشمن ہوتی یا تم میرے دشمن ہوتے تو میں تم سے ضرور شادی کرلیتی۔"

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"میں تمہاری بات سمجھ نہیں سکا۔"

پروین نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

تقدیر نے مجھے عورت سے ناگن بنادیا ہے میں جس سے شادی کروں گی وہ شادی کی پہلی رات کو ہی مرجائے گا۔ اب بتاؤ میں تم سے کیسے شادی کرسکتی ہوں؟"

پروین کے اس انکشاف پر میں اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ سانپوں اور ان کے جس زہریلے عمل سے وہ گزر چکی تھی اس کے نتیجے میں وہ ایک انتہائی زہریلی عورت بن چکی تھی۔ یہاں تک کہ اگر وہ کسی کو کاٹ لے تو وہ آدمی مرجاتا پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک آدمی اس سے شادی کے بعد زندہ رہ سکتا۔

پروین کہنے لگی۔

"آج میں تم پر اپنے دل کا حال ظاہر کرتی ہوں۔ میرے سینے میں عورت کا دل ہے۔ اس دل

میں بھی محبت کے جذبات ہیں۔ جب تم پہلی بار مجھے سنتھالی سپیروں کے جنگلوں میں ملے تھے تو تم مجھے بڑے اچھے لگے تھے۔ پھر ایک عرصہ ہم نے اکٹھے بسر کیا۔ تمہاری بہادری اور شرافت نے مجھے تمہارا گرویدہ بنا دیا۔ آہستہ آہستہ میں تم سے محبت کرنے لگی۔ لیکن میں نے تم سے کبھی اس کا اظہار نہ کیا۔ اس لیے کہ میں جانتی تھی کہ میں تمہاری محبت کے لائق نہیں ہوں۔ میں جانتی تھی کہ اگر میں اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر تمہارے قریب گئی تو تم زندہ نہیں رہ سکو گے۔ مجھے اپنی محبت سے بڑھ کر تمہاری زندگی عزیز تھی۔ اس لیے میں نے تمہارے آگے بھی اپنی محبت کا اظہار نہ کیا۔ اب تم نے مجھ سے شادی کی بات کی تو میرے لیے ضروری ہو گیا کہ میں حقیقت حال بیان کر دوں۔ ہم ایک دوسرے کے بڑے اچھے دوست ہیں اور ساری زندگی بڑے اچھے دوست بن کر رہیں گے۔''

یقین کریں اس وقت میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پروین نے میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر کہا۔

''ان آنسوؤں میں تمہاری روح کی توانائی ہے' اس توانائی کو صرف ایک عورت کی محبت کی خاطر ضائع مت کرو۔ اسے دوسروں کی بھلائی کے لیے استعمال میں لاؤ۔ جس طرح میں نے پاکستان میں رہ کر بیماروں کی خدمت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا ہے اسی طرح تم بھی اپنی زندگی اپنے وطن کی تعمیر اور بھلائی کے لیے وقف کر دو۔ وہ محبت جو ہمیں انسانیت کا کوئی بلند مقام عطا نہیں کرتی جھوٹی محبت ہے۔ جو محبت ہمیں زندگی کی عمارت کی پہلی منزل سے دوسری تیسری اور چوتھی منزلوں کی راہ دکھاتی ہے وہی اصل محبت ہے' وہی سچی محبت ہے۔''

پروین متبسم نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اب میری آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ میں نے پروین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

''پروین......!''

اس سے آگے میں ایک لفظ نہ بول سکا۔ میرا خیال ہے کہ میں محبت ...... سچی محبت کے اس مقام پر پہنچ گیا تھا جہاں دنیا کی زبانوں کے تمام الفاظ' تمام آوازیں' تمام سماعتیں' ختم ہو جاتی ہیں۔ جہاں جسم پاکیزہ اور شفاف ہو کر ٹرانسپیرنٹ ہو جاتے ہیں۔ جہاں محبت کرنے والا دل دوسرے محبت کرنے والے دل کے آر پار دیکھنے لگتا ہے۔ جہاں خیال بعد میں پیدا ہوتا ہے اور مفہوم پہلے سمجھ میں آ جاتا ہے۔

شام گہری ہو گئی تھی' جب میں اور پروین لاہور کے کافی ہاؤس سے باہر آئے۔ کافی ہاؤس کے قریب ہی ایک خالی تانگہ کھڑا تھا۔ ہم اس میں بیٹھ گئے۔ میں نے پروین کو نرسنگ ہوسٹل میں چھوڑا اور خود اپنے گھر چلا آیا۔ پاکستان آ کر پروین کی زندگی ایک معمول پر آ گئی تھی۔ پروین اسپتال میں مریضوں کی تیمارداری میں مصروف ہو گئی اور میں دوبارہ اپنی کالج کی پڑھائی میں مصروف ہو گیا۔ یوں میری ایک طویل ایڈونچرس داستان کا اختتام ہو گیا۔



جونہی کوئی اطلاع آتی ہے سیٹیں کروالیں گے لیکن تمہارے داخلے کی بات ہے، تم دیر نہ کرنا یہاں سب اس کے ساتھ رہیں گے اسے اب اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔ تم سمجھ گئے ہوناں کہ اب وہ اکیلی نہیں۔''

اگلے دن ہم راول پنڈی آئے۔ گھر پہنچے مگر ماموں کار میں ہی بیٹھے رہے میں اوپر آیا دراز سے چابیاں نکالیں تو کوئی چیز چمکتی دیکھا تو ماما کی ہیرے کی انگوٹھی تھی پہلے وہ ہمیشہ پہنے رکھتی تھیں! اب کافی عرصے سے ان کے ہاتھ میں نہیں تھی وجہ ظاہر تھی میں نے وہ انگوٹھی نکال کر اپنی چھوٹی انگلی میں پہن لی کہ مہربانو کو دے دوں گا۔ پھر اپنی الماری سے پاسپورٹ، یونیورسٹی سے آئے لیٹرز وغیرہ ایک بیگ میں ڈالے۔ سارے کمرے لاک کیے باہر کے دروازے پر تالا لگایا چابیاں اکٹھی ایک رِنگ میں کیں اور باہر آگیا۔ اسپتال پہنچ کر میں ڈیڈی کے وارڈ میں گیا کچھ دیر باہر انتظار کیا اردلی اندر بتا چکا تھا۔ ڈیڈی مریض کے ساتھ ہی باہر آگئے۔ مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر خوشی آئی یا مجھے محسوس ہوا کچھ کہہ نہیں سکتا۔

''کب آئے اور امتحان کیسے ہوئے؟ انہوں نے پوچھا ساتھ ہی اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے سوالوں کا جواب دیا اور میز پر کار کی اور گھر کی چابیاں رکھ دیں۔

''یہ کیوں؟'' انہوں نے پوچھا۔

''میں لاہور جا رہا ہوں سوچا آپ کی امانت لوٹا دوں۔'' انہوں نے ایسے پوچھا جیسے کوئی بھولی بات ہو۔

''اور تمہاری ماں؟'' مجھے حیرت ہوئی ان کے سوال پر۔

''میری ماں وہ تو کافی عرصے پہلے چلی گئی تھیں۔'' انہوں نے حیرانی سے دیکھا۔ میں نے پھر کہا۔

''اصل میں وہ چار سال پورے ہوگئے تھے ناں۔

''اوہ......'' اور جیسے انہیں یاد آگیا ہو۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔

''آپ نے پوچھا نہیں کہ کہاں گئی ہیں۔ میں ہی بتا دیتا ہوں ان کی شادی ہوگئی ہے۔'' میں نے انہیں خبر سنائی۔ وہ جلال میں آگئے اور کہنے لگے۔

''تمہیں غیرت نہیں آئی ماں کی شادی کرواتے۔'' مجھے بھی غصہ آگیا حالانکہ غصہ کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

''غیرت؟ غیرت تو ہمیں تب آئی تھی جب آپ نے شادی کی تھی اور ہم دوستوں کے سامنے زمین میں گڑ گئے تھے۔ غیرت سے ہم اس دن بھی مرے تھے جب آپ دوسری بیوی کو گھر میں لائے تھے دوسری شادی سنت رسولؐ مگر طلاق؟ اسے آپ کیا کہیں گے قبیح حرکت یا نہیں۔ یہ شادی میں نے نہیں ان کے والدین نے کی ہے۔ میں نے آپ کا خط پڑھ لیا ہے۔ آپ ظالم تو تھے مگر اتنے؟ یہ اندازہ نہیں تھا۔ آپ نے ایک ماں کو 10 لاکھ کے عوض ممتا کی سولی پر لٹکا دیا۔ چار سال کے لیے یہ کہہ کر کہ ان کی اپنی اولاد ان کے ساتھ نہیں جاسکتی۔ کیوں ڈیڈی کیوں کیا آپ نے ایسا؟ آپ کو بتاؤں ان کی شادی کس کے ساتھ ہوئی ہے اسی سے جن سے آپ نے انہیں چھینا تھا۔ اس چھینا جھپٹی کی عادت نے آپ سے سارے رشتے چھین لیے۔ باپ، ماں، دوست، بیوی۔ چلیں بیوی ایک گئی دوسری مل گئی۔ اولاد؟ کیا ہے آپ کے ساتھ اور کیا رہ گیا آپ کے پاس۔ تنہا۔ خالی ہاتھ نہ بہن آپ کی نہ بھائی ساتھ میں۔ آپ نے سراسر خسارہ کمایا ہے۔'' میں یہ کہہ کر دروازے کی طرف مڑ گیا پھر خیال آیا کہ نہیں ایک بات کہنا باقی ہے۔

''میری ماما کہتی ہیں باپ کی شفقت اور محنت بُھلانے کی بات نہیں ہوتی۔ آپ کی شفقت کے لیے ہم ساری عمر ترسے ہیں مگر محنت کبھی نہیں بھولیں گے۔ آپ نے ہمیں گھر سے نہیں نکالا ہمارے خرچ پورے کیے اس کے لیے ہم تینوں آپ کے احسان مند ہیں اور انشاءاللہ کسی بھی مشکل گھڑی میں آپ کے ساتھ کے لیے ہمیشہ کھڑے ہوں گے۔ اللہ حافظ!'' میں نے دروازہ اپنے پیچھے بند کردیا اور باہر ماموں کے پاس آگیا وہ ماما کی طرح میری حالت سمجھ گئے تھے، میرا ہاتھ تھام لیا اور پھر ہم ٹیکسی رو کنے کو آگے بڑھ گئے۔



میرے ہر قدم کا ساتھی

نیلوفر عباسی

قمر علی عباسی میری زندگی میں داخل ہوئے تو ایک ہلچل مچ گئی۔ زندگی و توانائی سے بھرپور، گھنٹوں کا کام منٹوں اور منٹوں کا سیکنڈوں میں انجام دینے والے، پارہ صفت اور میں ٹھہری ہمیشہ کی سہل پسند شاید دس برس کی عمر تک اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے جو ناز نخرے میرے اٹھائے گئے تھے یہ اس کا نتیجہ تھا لیکن اس کا جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ اس ہر دم چاق و چوبند رہنے والے کا ساتھ دینے کے لیے مجھے عادتیں بدلنی ہوں گی۔ آج تک اسی کوشش میں لگی ہوں، قمر علی عباسی صبح پانچ بجے اٹھ جاتے ہیں تو میں سات بجے اٹھ کر سمجھتی ہوں کہ تیر مار لیا۔

عموماً ماتحتوں کو اپنے افسران سے اور افسران کو اپنے انڈر کام کرنے والوں سے شکایتیں رہتی ہیں لیکن یہاں میں ایک اقتباس سید علیم گیلانی کی تحریر سے حوالے کے طور پر پیش کروں گی کہ اندازہ ہو کہ جو لوگ صدقِ دل اور محنت سے کام کرتے ہیں افسران کا انہیں پسند کرنا ''مجبوری'' بن جاتا ہے۔

سید علیم گیلانی براڈ کاسٹنگ اور شعر و ادب کا ایک بڑا نام ہے کہ جنہوں نے ریڈیو، ٹیلی ویژن اور فلم کو مہدی حسن، ریشماں، شہناز بیگم، مہدی، ظہیر، افتخار عارف، عبیداللہ بیگ، قریش پور جیسے متعدد فنکار، موسیقار، کمپوزر، اینکرز دیے۔ وہ لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے، ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل بنے تو اس کی کارکردگی کو عروج پر پہنچایا۔ قمر علی عباسی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''عباسی نے بہت کچھ کیا، ہر طرح کے پروگرام کیے اور نام کمایا، چاق و چوبند، بہت جاگے ہوئے، محنتی جو کام سونپا گیا اسے پوری ذمے داری سے نبھانے کی کوشش کی، خود تو عباسی کو نہ جانے اپنی کون سی ادا پسند ہوگی مگر میرے خیال میں ان کا سب سے بڑا اور منفرد کارنامہ ریڈیو کے رسالے ''آہنگ'' کی ترتیب نو ہے، جب میں نے یہ کام ان کے سپرد کیا تو مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اسے اس بلند معیار تک پہنچا دیں گے۔''

قمر علی عباسی ایک وقت میں کئی مختلف کام یکساں خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں، 1998ء کی بقر عید کا تیسرا دن تھا، عباسی نے کچھ کاغذات

دیے۔ ''انہیں پڑھ لیجیے'' پڑھنا شروع کیا تو پتا چلا کہ انہوں نے ریڈیو کی ملازمت کے آغاز کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی یادوں کو قلمبند کیا ہے، میں خوش ہوگئی کیونکہ میں چاہتی تھی کہ بہت سی بکھری ہوئی باتیں، یادیں اور واقعات یکجا ہوجائیں۔ آٹو بائیو گرافی قسم کی کوئی چیز ہو مگر انہوں نے اس کو اپنی بتیس سالہ ریڈیو کی ملازمت تک محدود رکھا۔

قمر علی عباسی کا ایک کمال یہ ہے کہ نہایت تیز لکھنا اور سیکڑوں مصروفیات کے درمیان لکھنا ہر قسم کے ماحول، گردوپیش سے بے نیاز ہو کر، ایک خوشگوار حیرت سے میں اس وقت دوچار ہوئی جب گیارھویں دن انہوں نے اپنی ریڈیو کی ... یادداشت ''32 ناٹ آؤٹ'' پڑھنے کو دی۔ کتاب کا مسودہ مکمل تھا، ان گیارہ دنوں میں دفتری مصروفیات، ہفتے وار کالمز، تقریبات کا سلسلہ بدستور تھا، نہ جانے کس وقت لکھتے تھے؟

قمر علی عباسی کسی سفر پر نکلیں کوئی چیز نوٹ بک میں تحریر نہیں کرتے۔ دماغ کے کمپیوٹر میں محفوظ کر لیتے ہیں پھر بھی واقعات کو جس تواتر اور شگفتگی سے بیان کرتے ہیں وہ ان کا ہی خاصہ ہے۔ مشکل اور بھاری بھرکم الفاظ، تشبیہات واستعارات کا سہارا لے کر اپنی تحریر کو پُر اثر بنانے کی کوشش نہیں کرتے سیدھے سادے الفاظ میں سچائی بیان کرتے ہیں۔ شگفتگی، بے ساختگی دلچسپی صرف تحریر کا نہیں شخصیت کا بھی حصہ ہیں اس لیے عام قاری ان کو اپنے قریب تر محسوس کرتا ہے اور یہی سب سے بڑی وجہ ہے کہ بغیر کسی سفارش بغیر کسی لابنگ یا گروپ سے وابستہ ہوئے قمر علی عباسی کو اللہ تعالیٰ نے پانچ بار رائٹرز گلڈ ایوارڈ، وزیراعظم کے اے پی این ایس ایوارڈ اور صدارتی تمغۂ امتیاز کے علاوہ بھی متعدد ایوارڈز سے نوازا۔

مشکل سے مشکل وقت میں بھی قمر علی عباسی گھبراتے نہیں۔ جنرل ضیاالحق کے دور کا آغاز تھا شاہ سے زیادہ ''شاہ کے مصاحب'' ایکٹو تھے۔ ٹیلی ویژن کے پروگرام سات رنگ میں لکھے ایک خاکے پر ان کو سسپنڈ کردیا کیونکہ معین اختر نے اس خاکے میں جو گیٹ اپ کیا تھا وہ مصاحب کے خیال میں جنرل ضیاالحق سے ملتا جلتا تھا۔ اگر ایسا تھا تو اس میں رائٹر کا کیا قصور؟ یہ تو پروڈیوسر اور میک اپ آرٹسٹ اور آرٹسٹ کا معاملہ تھا بہر حال۔

برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

قمر علی عباسی کو نہ صرف سسپنڈ کیا گیا بلکہ Demote بھی کیا حالانکہ وہ پبلک سروس کمیشن سے آئے تھے اور اس طرح کی تنزلی ڈیپارٹمنٹ نہیں کرسکتا تھا لیکن ہر قاعدے قانون میں ترمیم ہوجاتی ہے۔ کیا مشکل ہے...... کچھ لائنیں کچھ clause ہی تو اِدھر اُدھر کرنے ہوتے ہیں اور اس اِدھر اُدھر میں قمر علی عباسی کی کئی سال کی seniority اِدھر اُدھر ہوگئی۔ گورنمنٹ یا نیم سرکاری اداروں میں ترقیاں ویسے بھی دیر سے ہوتی ہیں اور کئی طرح کے طریقۂ کار کی مرہونِ منت ہوتی ہیں ایسے میں یہ ہوجانا کسی کو بھی ذہنی اور جذباتی طور پر توڑ دینے کے لیے کافی ہے لیکن قمر علی عباسی کا کہنا بلکہ یقین تھا میں نے کچھ غلط نہیں کیا انشاءاللہ میری پوزیشن بحال ہوگی۔

کئی بار ایسا ہوا کہ باہر کا ٹور یا باہر کی ٹریننگ ہے قمر علی عباسی کا نام جانے والوں میں سب سے اوپر ہے مگر کسی کی ''اوپر'' سے سفارش آگئی اور وہ افسر چلا گیا جس نے واپس آکر ریڈیو پاکستان کو اس ٹریننگ سے کوئی فیض نہ پہنچایا۔ قمر علی عباسی کو لندن (بی بی سی) ٹریننگ پر بھیجا تو واپس آکر ''لندن، لندن'' تحریر کیا جس میں نہ صرف جو وہاں دیکھا سیکھا اسے ری پروڈیوس کیا بلکہ ریڈیو پاکستان کے ایک افسر کی بطور سفرنامہ نگار بھی پزیرائی ہوئی۔

قمر علی عباسی ان باتوں کی پروا نہیں کرتے ''میرا نصیب'' کہہ کر بات ختم کردیتے ہیں،

اللہ تعالیٰ نے ایک بہت بڑے انعام سے انہیں نوازا ہے اور وہ ہے کسی سے جیلس نہ ہونا، اپنا قد اونچا کرنے کے لیے دوسروں کی achievements کو نظر انداز نہیں کرتے، دوسروں کی کامیابیوں سے خوش ہوتے ہیں، تعریف کرتے ہیں اور سب سے بڑھ کر منافقت نہیں کرتے جس کے نتیجے میں اس فانی دنیا میں بڑے دھوکے اور نقصان بھی اٹھاتے ہیں۔

قمر علی عباسی فرشتہ نہیں انسان ہیں، ان میں کمزوریاں بھی ہیں، ان سے کوتاہیاں بھی ہوئی ہیں، غصہ بھی آتا ہے مگر ان سب پر وہ بہت جلد کنٹرول کرلیتے ہیں۔ یہی سب سے اچھی بات ہے۔

قمر علی عباسی نے تمام عمر اعتماد سے بسر کی فیصلے کیے تیزی سے یقین کے ساتھ جب ریڈیو پاکستان کراچی کے کنٹرولر اور اسٹیشن ڈائریکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہونے کا وقت آیا تو ڈائریکٹر جنرل صاحب نے ملازمت میں توسیع (Contract) کی بات کی، جواب میں قمر علی عباسی کا کہنا تھا ''ہم چاہتے ہیں دوسروں کو موقع ملے، تبدیلی آنی چاہیے، جہاں ہم ہیں وہاں کوئی دوسرا آنا چاہیے، نظام بدل جانا چاہیے۔ یہ قدرت کا اصول ہے، صبح، شام، رات، سردی، گرمی، برسات، بہار، خزاں تبدیلی کے نام ہیں۔''

قمر علی عباسی نے زندگی کو ہمیشہ مثبت انداز سے لیا کسی کے ریٹائرمنٹ کا دن، یقیناً افسردگی کا دن ہوتا ہے ایک ادارے سے طویل وابستگی کا دن جب داخل ہوتا ہے اس انسٹیٹیوٹ میں تو جوان توانا ہوتا ہے، امنگیں، ولولے ہوتے ہیں۔ بہت سے اچھے دوست ساتھی بنتے ہیں۔ پاور، کرسی... کام کرنے کے مواقع حاصل ہوتے ہیں اور پھر ایک دن...... یہ سب چند لمحوں میں ماضی ہوجاتا ہے۔ میں جب کسی کی ریٹائرمنٹ کا سنتی تو قریب قریب اتنی ہی افسردگی اور ملال محسوس کرتی جتنا شاید وہ شخص کررہا ہوتا لیکن قمر علی عباسی اس موقع پر بھی اپنی روایتی شگفتگی، مثبت سوچ اور مستقبل کی منصوبہ بندی پیشِ نظر رکھے ہوئے ہیں۔ ''32 ناٹ آؤٹ'' میں لکھتے ہیں۔

''آج 13 جون ہے، ہم ساٹھ سال کے ہوگئے زندگی کی ساٹھ بہاریں دیکھیں، ایک لمبا سفر کیا، اسکول کے دن شرارتوں سے بھرے لمحے کالج کے کاریڈور ایک کھلنڈرا نوجوان، امرودوں سے بھرے درختوں کے نیچے خواب بُنتا ہے، خواہشیں کرتا ہے، امیدیں باندھتا ہے، یونیورسٹی کی کینٹین ہے، زور زور سے باتیں قہقہے، گرما گرم مباحثوں کے تذکرے، ٹرافیاں جیتنے کی خوشی، ستاروں کے قصے، بہاروں کے افسانے زندہ ہوتے ہیں۔ زندگی کے بازار میں لوگوں کی بھیڑ ہے، مقابلہ ہے پھر ملازمت، تبادلے، اجنبی انجان صورتیں، چاند چہرہ ستارہ آنکھیں، پھولوں کا موسم، برستی بارشوں کے جلترنگ، ہمارے لیے زندگی پل پل محبتوں، مسرتوں اور کامیابیوں کا نام ہے، عزت، شہرت، دولت، صحت محبت کرنے والی بیوی نیلوفر...... سعادت مند بچے ثوبیہ، وجاہت، ماریہ اور باوفا دوستوں کو زندگی کہتے ہیں۔

ہم نے 32 سال ریڈیو میں خدمت کی اور آج یوں محسوس ہورہا ہے ہم 32 سال کے ہیں، جوان گرم خون جسم میں دوڑ رہا ہے۔ ہمارے پاس بہت سے منصوبے ہیں، کام ہیں، کتنے ملک ہیں جہاں جانا ہے...... ابھی تو بہت لکھنا ہے، بہت بولنا ہے، اس کے لیے نیک تمنائیں درکار ہیں، آپ کی دعائیں چاہئیں درازیِ عمر کی کہ میرا رب بڑی دعائیں سننے والا ہے۔''

بے شک اللہ تعالیٰ دعائیں سنتا ہے اور صدقِ دل سے مانگی دعائیں اس کے در پر ضرور پہنچتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قمر علی عباسی جب ایک بالکل اجنبی شہر، اجنبی دیار نیویارک پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں وہاں بھی عزت وقار اور محبتوں سے سرفراز کیا۔ ایسے دوست اور چاہنے والے دیے جنہوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا...... آج تک سر آنکھوں پر بٹھا کر رکھا ہے۔

یہ میرا اعزاز ہے کہ مجھے قمر علی عباسی کا ساتھ ملا

جنہوں نے ہمیشہ میری چھوٹی سی چھوٹی خوشی اور خواہش کو افضل جانا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ میں زندگی کی آخری سانس بھی اس دنیا میں لوں جہاں قمر علی عباسی کا توانائی سے بھرپور مہربان وجود ہو۔

کچھ اور مانگنا میرے مشرب میں کفر ہے
لا اپنا ہاتھ دے میرے دستِ سوال میں

بشکریہ۔
ماہنامہ چہارسو، راول پنڈی

اس دور کا ابنِ بطوطہ قمر علی عباسی

انجم انصار

گزشتہ ماہ پاکیزہ کے صفحات پر جناب قمر علی عباسی کی علالت کے حوالے سے دعائے صحت کی اپیل شائع ہوئی تھی۔ ابھی جون کا پاکیزہ ہر جگہ پہنچا بھی نہ ہوگا کہ ان کے انتقال کی خبر آگئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

جناب قمر علی عباسی کے نام سے تو میں عرصہ دراز سے واقف تھی کہ میرے والد انصار حسین صدیقی ریڈیو ہیڈ کوارٹرز اسلام آباد میں کنٹرولر ڈائریکٹر تھے اور عباسی صاحب جب بھی کراچی سے اسلام آباد آتے ان کے پاس ضرور آتے تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میری شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔

شادی کے بعد میں کراچی آگئی...... کچھ عرصے لکھنے لکھانے سے دور رہی اور میری ان سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ ریڈیو پاکستان کراچی کے ڈائریکٹر تھے......اور اس زمانے میں میرا وہاں ہفتہ وار ڈراما ”راستے دل کے“ نشر ہو رہا تھا جو میرے اپنے ایک ناول سے ماخوذ تھا۔ عباسی صاحب اور نیلوفر سے جو بھی ایک بار ملتا، ان کا گرویدہ ہو جاتا...... ان دونوں کی تعریفیں میں نے بلاشبہ درجنوں لوگوں سے سنی ہیں مگر سیما رضا ردا حقیقت میں عباسی صاحب کی بہت بڑی مداح ہیں، معروف پروڈیوسر ظہیر حسن تو اپنی اور عباسی صاحب کی دوستی پر فخر کرتے ہیں...... پروین خان نے تو بڑے مغموم لہجے میں مجھ سے نیلوفر کا نمبر لیا کہ وہ ان دونوں کی قریبی دوست ہیں۔ زریں زبیر، مسز منظر حسین، احمد ندیم، ڈاکٹر احمد شہاب، فیروزہ بیگم، مسز شیخ حسین، مسز قیصر قدیر، شیریں حیدر، رفاقت بخاری، میں کس کس کا نام لوں...... جو قمر علی عباسی کے انتقال کی خبر سن کر رنجیدہ ہوئے ہوں...... محترمہ عذرا رسول کا اسی وقت فون آیا...... جیسے ہی انہیں علم ہوا...... اور وہ ان ہی دنوں کو یاد کرتی رہیں...... جب جب نیلوفر کے ساتھ قمر علی عباسی پاکیزہ کے آفس آتے تھے اور ان کی باتیں سن کر سب لطف اندوز ہوتے تھے...... ان کے سامنے نہ کسی دوسرے کو بولنے کی ضرورت ہوتی تھی...... اور نہ ہی کوئی بول پاتا تھا...... کہ وہ ہر موضوع پر بولنے کی قدرت رکھتے تھے...... معروف مقرر تھے...... لفظوں کے اتار چڑھاؤ پر انہیں پورا عبور حاصل تھا...... اور دوسرے کی آواز سن کر پہچان بھی جایا کرتے تھے......

مجھے یاد ہے، جب میں نے پہلی مرتبہ ان کی کتاب کی تقریب پزیرائی میں مضمون پڑھا...... تو فوراً بولے ماشاء اللہ...... آپ تو براڈ کاسٹر معلوم ہوتی ہیں۔ تب میں نے انہیں بتایا جی ہاں میں اپنے زمانہ طالب علمی میں ریڈیو کے پروگرام کنڈکٹ کرتی رہی ہوں۔

13 جون 1938 امروہہ (یو، پی، انڈیا) میں پیدا ہونے والے قمر علی عباسی بہت بڑے ادیب تھے، جنہوں نے 30 سفرنامے، بچوں کے لیے 15 کتابیں دو سوانح عمریاں اور ایک کالموں کا مجموعہ لکھا ہو...... وہ کبھی تھکنا جانتے ہی نہیں تھے۔ پاکستان وہ ہر سال آتے تھے اور جب وہ آتے تو بہار کا موسم نہ ہونے کے باوجود بھی ہر طرف بہاراں ہو جاتی۔ ان کے اعزاز میں تقاریب ہونے لگتیں...... اور وہ خود آتے ہی اپنی کسی کتاب کی تقریب اس طرح سجاتے کہ وہ شادی کی سی تقریب لگتی۔ وسیع وعریض ہال کھچا کھچ بھر جاتا۔

جب سے میں نے ان کی کتابوں پر مضمون پڑھنے کی ابتدا کی تھی...... تو کراچی میں کوئی تقریب

ایسی نہیں ہوتی تھی جو قمر علی عباسی صاحب نے سجائی ہو...... اور اس میں میرا نام بطور اسپیکر نہ شامل ہو......

اس سال بھی ان کا پہلے جنوری پھر مارچ...... اور پھر ستمبر میں آنا طے پایا تھا...... میں عباسی صاحب کو اس دور کا ابن بطوطہ کہتی تھی / کہتی ہوں کہ نہ صرف پاکستان ہی بلکہ پورے ایشیا میں کسی دوسرے نے اتنے زیادہ سفرنامے نہیں لکھے ہوں گے...... اور پھر طرز تحریر بھی قوس قزح جیسی کہ سفرنامے میں افسانہ، انشائیہ، مکالمہ، ڈرامائیہ، طنز و مزاح، حد تو یہ ہے کہ سسپنس کے ساتھ ڈراما تک رچا ہوا تھا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں' الوداع کہتے ہوئے ہماری بھاوج نے اپنے زیورات کے ڈبے سے ایک لمبا کارتوس نکال کر ہمارے حوالے کر دیا۔ بھائی نے بتایا خالی کارتوس تو بہت سے تھے...... سب بانٹ دیے...... ایک رہ گیا ہے...... یہ آپ کے لیے ہے اسے کراچی لے جائیں۔“

قمر علی عباسی...... نے نثر میں شاعری تک کی ہے، اپنے ایک سفرنامے میں لکھتے ہیں۔ ”ایک خوب صورت مکان کی منڈیر سے گلاب کی ایک سرخ کلی ہوا سے کھیل رہی تھی۔ ہمارا راستہ روکنے لگی۔ چند لمحے ہم اسے دیکھتے رہے...... وہ مسکرانے لگی۔ ہم نے ہاتھ بڑھا کر اسے توڑ لیا۔ وہ اور کھل گئی۔“ ایسے جملے پڑھ کر زبان سے بے اختیار واہ ہی نکلا کرتا ہے۔ آپ کو اعزازات بے شمار ملے، جن میں تمغۂ امتیاز بھی شامل ہے مگر اس کے باوجود طبیعت میں منکسر المزاجی تھی...... ایک ایسی شخصیت جو باغبان کی سی ہو...... جس کے لہجے میں پھولوں کی لطافت جس کے لفظوں میں پھولوں کی رفاقت ہو...... اس کے جانے پر افسوس تو ہوتا ہے، دعا ہے اللہ انہیں غریقِ رحمت کرے اور نیلوفر اور بچوں کو صبر جمیل عطا ہو، آمین۔

ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

نزہت اصغر

ملکوں، ملکوں کا احوال بتانا اور وہ بھی کچھ اس انداز سے کہ قاری اپنے آپ کو سفرنامہ نگار کے ساتھ ساتھ سفر کرتا محسوس کرے۔ یہ محترم قمر علی عباسی کا ہی خاصہ تھا۔ قمر علی عباسی کو میں فقط ایک براڈ کاسٹر ایک سفرنامہ نگار، ڈراما نگار اور کالم نگار کی حیثیت سے ہی جانتی تھی مگر ایک خوب صورت ذہن و دل رکھنے والے ہمدرد انسان سے مکمل آگاہی جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے پانچویں پرچے دلکش کے اجرا کے موقع پر ہوئی جبھی ان سے روبرو ملاقات کا سنہری موقع میسر آیا تھا۔ ادبی تقریبات میں دور سے ادیبوں کو دیکھنا اور سننا ایک الگ بات ہے مگر جب قمر علی عباسی اور نیلوفر صاحبہ پاکیزہ کے آفس تشریف لائے تو ان سے براہِ راست گفتگو کا موقع ملا جو بے حد متنوع تھی۔ ان کی گفتگو کی خاص بات حقوق العباد کا از حد تذکرہ ہوتی تھی، وہ رب کریم سے دوستی کی بات بڑی آسانی سے کرتے تھے کہ پروردگار کے بندوں کے حقوق پورے کرنے کے ذریعے ہم اللہ تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی گفتگو میں شکر گزاری اور درگزر کے فلسفے کا عنصر بہت زیادہ تھا۔ قمر علی عباسی کی معلومات افزا اور مسحور کن باتیں تمام سامعین پر سحر طاری کر دیا کرتی تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے انہی دنوں ایک نشست میں انہوں نے سینٹرل ایشیا اور اسپین کی مکمل تاریخ اور مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان بہت جامع اور پُراثر الفاظ میں بیان کی تو ایسا لگا کہ ہم خشک تاریخ نہیں بلکہ ایک دلچسپ کہانی سن رہے ہیں۔ پہلے ان کی علالت کی خبر اور فوراً ہی انتقال کی خبر نے دل رنج سے بھر دیا۔ ابھی تو عباسی صاحب کو اپنی کتابوں کی گولڈن جوبلی کرنا تھی مگر موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ اس غم کے موقع پر میں نیلوفر عباسی اور ان کے اہلِ خانہ کو بھرپور تعزیت پیش کرتی ہوں اور خدا کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ قمر علی عباسی کو پروردگار اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ ان کے خاندان کو صبر و حوصلہ عطا ہو۔ (الٰہی آمین)

☆☆☆

گلشن رہے سدا آباد تیرا

شائستہ زریں

شادی ایک مقدس فریضہ ہے اور ہمیشہ ..... سے پاکیزہ کی روایت رہی ہے کہ سال کا ایک شمارہ ''دلہنوں'' سے منسوب کرتے ہیں۔ یوں تو شادی ساری کی ساری ہی یادگار ہوتی ہے لیکن جب دلہن کو خاص کر اس کی شادی کی رسومات یا شادی کے دنوں کے کسی یادگار واقعہ کی جانب متوجہ کرنا چاہیں تو دلہن نو بیاہتا ہو یا پرانی پل کی پل میں بابل کے آنگن سے ساجن کی دہلیز پر پہلا قدم رکھنے اور شادی کے تمام مراحل تک ذہنی مسافت ..... طے کر لیتی ہے۔ اگر رسومات سادہ اور دلچسپ ہوں تو شادی بیاہ کی تقریبات کا حُسن بن جاتی ہیں لیکن جب وقت اور پیسے کے زیاں کے ساتھ غیر ضروری تفریحات کا شکار ہو جائیں تو یہ رسومات اگر نظروں میں خار بن کر کھٹکتی ہیں تو ان کے کانٹے دل میں بھی چبھنے لگتے ہیں۔ اور کبھی کبھی کسی واقعے یا بات سے شادی ہی یادگار بن جاتی ہے۔ زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے یوں تو ذمے داری دونوں فریقین پر ہی عائد ہوتی ہے لیکن ہماری مشرقی دلہنیں کبھی اپنے فرائض نہیں بھولتیں۔ کہنے کو تو یہ چینی روایت ہے کہ ''فرمانبردار بیوی شوہر کے دل پر حکمرانی کرتی ہے''..... ہماری بیشتر دلہنوں کی کامیاب ازدواجی زندگی کا راز اسی گر کو اپنانے میں مضمر ہے کہ وہ اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ ایشیائی مرد خواہ کتنے ہی روشن خیال کیوں نہ ہوں بیوی انہیں فرمانبردار ہی اچھی لگتی ہے۔ اس کے باوجود یہ معرکہ سر کرنے کے لیے محض فرمانبرداری ناکافی ہوتی ہے اور بھی کئی ایسے رویّے اور ہنر ہیں جنہیں اختیار کر کے شوہر کا دل جیتا جا سکتا ہے..... اور جب دلہن اپنے اخلاص و محبت اور دانشمندی سے شوہر کے دل میں گھر بنا لیتی ہے تو بس یہی اس کی کامیابی کی دلیل ہے۔ جہاں دلہن اتنا سب کچھ کرتی ہے تو اپنے دولھا میاں کو پیغام دے کر اپنے دل کی بات بھی تو کہہ سکتی ہے ناں۔ تو بس اس مرتبہ ''دلہن نمبر'' کے سروے کے لیے انہی امور کے پیشِ نظر ہم نے سوال تیار کیے اور سروے میں شریک دلہنوں سے معلوم کیا کہ .....

۱: آپ کی شادی کی دلچسپ یا پریشان کُن رسم؟ یا کوئی یادگار واقعہ؟

۲: شوہر کے دل میں راج کرنے کے لیے فرمانبرداری ہی کافی ہے یا اور کوئی ہنر بھی اختیار کیا جا سکتا ہے؟

۳: دولھا میاں کے لیے کوئی پیغام؟

سروے میں شریک دلہنوں کے نظریات، خیالات اور تجربات پڑھتے ہیں ممکن ہے اس میں سے کوئی نکتہ کسی کی زندگی میں بہاروں کی نوید لے آئے تو گویا ہم اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔

روبینہ گلزار

۱: دودھ پلائی کی رسم بہت اچھی لگی۔

۲: اچھا کھانا، لڑائی جھگڑے سے گریز، پُرسکون ماحول، فضول خرچی سے پرہیز، ہر وقت چہرے پر مسکراہٹ۔

۳: جو بہت اچھا اب تک کرتے چلے آرہے ہیں اس پر ہمیشہ ثابت قدم رہیے گا یعنی برابری کے حقوق اور عزت و احترام (چونکہ بیوی، شوہر اور اس



روبینہ گلزار

کے خاندان کو لے کر چلتی ہے) زندگی کے چھوٹے بڑے فیصلوں میں مجھ سے مشورہ کرنا جس سے میرا اعتماد بھی بڑھا ہے۔ احساسِ تحفظ بھی ہوتا ہے۔

ثمرین شاہد مسرور

(گھریلو خاتون)

۱: مہندی میں گود بھرائی کی رسم بہت پریشان کُن تھی اچھا بلکہ بہت اچھا لگا تھا جب میں رخصت ہو کر سسرال آئی تو میرا والہانہ استقبال کیا گیا، پھول



ثمرین شاہد مسرور

پتیاں نچھاور کی گئیں، نہایت خوشگوار اور اپنائیت بھرا ماحول تھا مجھے احساس تک نہیں ہوا کہ ایک دوسرے خاندان میں آئی ہوں۔

۲: فرمانبرداری کے علاوہ ایک چپ سو سکھ کی حکمت پر عمل کریں۔

۳: آئے دن مجھ سے باہر چلنے کی فرمائش کرنے اور میرے انکار پر برا ماننے کے بجائے سوچیے کہ پہلے بھی تو جاتی تھی تو اب کیوں نہیں جا سکتی؟ نکاح کے وقت سے لے کر آج تک ہاں کرتی چلی آرہی ہوں، میری مجبوری سمجھ کر آئے دن باہر چلنے کی فرمائش پر کبھی نہ کبھی سن لیا کریں۔ انشاءاللہ ..... ہاں بھی ممکن ہو جائے گی۔

ثنا علی

۱: جوتا چھپائی کی رسم بہت اچھی تھی بہت انجوائے کیا تھا۔

۲: میں سمجھتی ہوں کہ فرمانبرداری کے علاوہ اگر



ثنا علی

کوئی ہنر ہے تو صرف اور صرف خوش ذائقہ کھانا کھلانا۔

۳: اپنی وائف کا خیال رکھیں اور شادی سے پہلے کیے جانے والے جو وعدے اب تک وفا نہ ہو سکے انہیں اب نباہ ہی دیجیے۔

ربیعہ شافع

ا: ویسے تو شادی کا ایک، ایک پل یادگار ہوتا ہے مگر میری شادی کراچی کے جن حالات میں ہوئی اس نے شادی کو نہ صرف میرے بلکہ تمام مہمانوں کے لیے سنسنی خیز بنادیا۔ ڈھولکی کی تقریب سے لے کر ہر، ہر موقع پر دھرنے، ہڑتال، فائرنگ کا سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ بارات والے دن نکاح کے بعد بم بلاسٹ کی جو کسر رہ گئی تھی وہ بھی پوری ہو گئی، جس کی وجہ سے ایسی جلد بازی میں، نہایت خفیہ



ربیعہ شافع

انداز میں رخصتی ہوئی کہ گھر والوں سے بھی نہ مل سکی اور نہ ہی بجی ہوئی گاڑی میں بیٹھی' حد تو یہ ہے کہ اپنی شادی کا کھانا کھانے کا موقع تک نہیں ملا۔ شادی کی تمام تقریبات اس دعا کے ساتھ گزاریں کہ تمام کام خیر و عافیت کے ساتھ ہو جائیں۔

۲: میرے میاں شادی کے پندرہ روز بعد ہی ملک سے باہر چلے گئے مگر ان پندرہ دنوں میں مجھے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو گیا کہ کچھ بھی ہو جب تک سلیقہ، شعور اور گھر والوں کی اجازت سے کوئی کام کرنا جیسے گر نہ ہوں تو میاں کے دل میں جگہ نہیں بنائی جا سکتی۔ فرمانبرداری کے ساتھ ساتھ اگر میاں جی کے نخرے اٹھائے جائیں اور خود کو نئی نویلی دلہن سمجھنے کے بجائے خود کو گھر کا ایک فرد، فیملی کا ایک حصہ سمجھ لیا جائے تو نہ صرف میاں کے دل میں جگہ بنائی جا سکتی ہے بلکہ گھر والوں کے اور قریب ہو سکتے ہیں ویسے ولیمے والے دن ہی سے میں نے میاں کے ناشتے، من پسند کھانوں کی ذمے داری لی اور آج جبکہ وہ دوسرے ملک میں ہیں تو میرے ہاتھ کے بنائے کھانوں کا ذکر کرتے ہیں۔

۳: ایک بہترین زندگی اور آنے والے کل کے لیے ہر پل اور خوشی کے لیے اللہ ہم دونوں میں بے پناہ پیار اور اعتماد پیدا کرے' آمین۔ ہاں اس کے ساتھ یہ بھی کہوں گی کہ......

تیری دو ٹکیا کی نوکری میں میرا لاکھوں کا ساون جائے

ڈاکٹر ارم حسن

ا: باڑھ رکوائی کی رسم میں بہت مزہ آیا تھا۔

۲: فرمانبرداری کے علاوہ شوہر کی ضرورتوں، آرام اور خوشیوں کا خیال رکھ کر اور ساتھ ہی ان کے مزاج کے مطابق خود کو ڈھال کر بھی شوہر کے دل پر حکمرانی کی جا سکتی ہے۔

۳: جیسے اب ہیں ہمیشہ ایسے ہی رہیے گا بلکہ اس سے بھی زیادہ اچھے بن جائیے گا۔



ڈاکٹر ارم حسن

صائمہ اسفندیار

ا: پوری شادی ایک دلچسپ واردات کی صورت میں منعقد ہوئی جسے ہم سے زیادہ خاندان والوں نے انجوائے کیا۔

۲: صرف فرمانبرداری ہی ضروری نہیں بلکہ اس کے



صائمہ اسفندیار

ساتھ ساتھ محبت، خیال، دوستانہ رویہ، ایک دوسرے کی پسند، ناپسند اور گھر داری بھی بہت ضروری ہے۔

۳: جیو اور جینے دو، ہم ساتھ ساتھ ہیں، ہم ملے پیار ملا۔

فرح طاسین

ا: روایتی رسموں میں سے ایسا کچھ نہیں ہوا تھا مگر فوٹو سیشن ایک ایسی چیز ہے جو پہلے فیشن سمجھا جاتا تھا مگر اب ایک رسم بن چکی ہے وہ بہت تھکا دینے والی اور پریشان کن تھی۔

۲: ویسے تو فرمانبرداری میں سب ہی کچھ آ جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ دل سے میاں کی پسند ناپسند اپنانے سے شوہر کے دل پر راج کیا جا سکتا ہے یعنی ہر چیز کو مجبوری سمجھ کر نہ کریں بلکہ دل اور خوشی کے ساتھ ہر کام کو انجام دیں۔

۳: آپ ہمیشہ اللہ کے شکر گزار رہیں کہ آپ وہ خوش نصیب ہیں جن کو دنیا کی بہترین بیوی ملی ہے۔

ماریہ عمر

ا: فضول رسم و رواج کے جھنجٹ میں پڑے ہی نہیں اس لیے تمام فنکشن خوش اسلوبی سے پایۂ تکمیل تک پہنچے۔

۲: صرف ان کے لیے تیار ہونا، ان کی پسند ناپسند کا خیال رکھنا۔ اپنی انا کو پس پشت ڈال کر شوہر کی انا کا خیال رکھنا۔ واپس جواب نہیں دینا، شوہر اور گھر والوں کی محبت کا جواب محبت سے دینا تو بہت ضروری ہے۔ ایسی تمام چیزیں جن سے گھر کا ماحول خوشگوار



ماریہ عمر

رہے، یہ رویہ اختیار کرلیں پھر دل جیتنا کیا مشکل؟

۳: ٹینشن اور strees کم لیا کریں، خوب دل لگا کر کام کریں اللہ کرے کہ آپ کا ماسٹرز کرنے کا خواب جلد پورا ہو جائے۔

کومل سعد قاضی

ا: مہندی کی تقریب رات کو تھی اور سہ پہر کو اچانک ہڑتال کا اعلان ہو گیا۔ اچانک ہی خوشگوار ماحول ٹینشن میں تبدیل ہو گیا، مہندی کی تقریب ملتوی ہو گئی لیکن شام تک حالات معمول پر آ گئے، اگلے روز نکاح تھا پھر یہ فیصلہ ہوا کہ نکاح دوپہر اور شام کو مہندی کی تقریب ہوگی سو ایسا ہی ہوا بہت عمدہ تقریب رہی۔ اس طرح شادی کا یہ فنکشن یادگار بن گیا۔



کومل سعد قاضی

۲: شوہر کے دل پر راج کرنا قسمت کی بات ہوتی ہے پھر بھی اچھا کھانا بنا کر، نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی بات رکھ کر دل میں جگہ بنانے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔

۳: آپ جو ہیں جیسے ہیں اپنی تمام برائیوں اور اچھائیوں سمیت مجھے دل سے قبول ہیں۔

حمنہ نجم

۱: نکاح کے بعد جب یہ اسٹیج پر آئے انہیں میرا ہاتھ پکڑنا تھا لیکن جب ان کی نظر مجھ پر پڑی تو یہ دم بخود رہ گئے۔ میرا جو ہاتھ عمر بھر تھامنے کا عہد کچھ دیر پہلے ہی (نکاح کی صورت) کر چکے تھے وقتی طور پر وہی ہاتھ پکڑنا بھی بھول گئے پلکیں جھپکائے بِنا ایک ٹک مجھے تکے جا رہے تھے، ان کی حالت پر جب وہاں موجود لوگوں کے قہقہے گونجے تب یہ ہوش میں آئے اور اپنی اس کیفیت کا سبب مجھے انہوں نے یہ بتایا تھا کہ مجھے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ تم دلہن بن کر اتنی اچھی لگو گی... اور یہ میرے لیے بہت یادگار ہے کہ ان کے لیے جو روپ سجایا تھا وہ ان کے من کو بہت بھایا۔

۲: فرمانبرداری کے ساتھ ساتھ اطاعت گزاری، خدمت گزاری، صرف شوہر کو ہی نہیں ان کے گھر والوں کو بھی اپنا بنانا اور ان کا خیال رکھنا۔

۳: مجھے اپنی زندگی میں شامل کرنے اور محبت بھرے باعزت ساتھ کا بہت شکریہ۔

قارئین! بات شادی کی رسومات کی ہو، یادگار



حمنہ نجم

واقعے کی شوہر کے دل پر حکمرانی کی یا شوہر کو پیغام دینے کی ہماری تمام دلہنیں اپنے گھر، گھر والے اور گھر والوں سے باعزت اور بے لوث بندھن میں بندھنے ہی میں خوش اور مسرور نظر آئیں یہ بہت خوش آئند ہے بلاشبہ زندگی جن سے وابستہ ہے اگر انہیں خود سے بڑھ کر چاہا جائے، عزت اور اہمیت دی جائے تو وہ خود بخود ہمارے بن جاتے ہیں شرط اخلاصِ نیت ہے اور جہاں نیت میں کھوٹ ہوتا ہے وہاں ظاہری طور پر بہت کچھ کرنے کے باوجود ہاتھ کچھ بھی نہیں آتا بے شک اللہ نیتوں کا حال بہتر جاننے والا ہے اور وہی نیتوں کا صلہ بھی دیتا ہے۔ ہاں بھئی دلہنوں سے پیغام وصول کرنے والے دولھاؤں یہ پیغام ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نہ اُڑا دینا قابلِ عمل پیغام پر عمل بھی کر لینا۔ گھر کو گھر بنانے میں دولھا کا کردار بھی اتنا ہی اہم ہوتا ہے جتنا کہ دلہن کا اور ہمارا پیغام دونوں کے لیے یہی ہے کہ

نئی زندگی کے نئے راستوں پر
تیرا آنگن بہاروں کا مسکن رہے
خوشبوؤں کی دھنک سے مہکتا رہے
خواب کے آئینوں سے مزین رہے
بے مروّت ہوائیں نہ آئیں کبھی
موسمِ گل ہمیشہ ہمیشہ رہے



شادی مبارک ہو

انجم انصار

بنیش ندیم اور فہد طلال کی شادی

گزشتہ دنوں اسلام آباد میں میری بھتیجی کی شادی تھی۔ ان دنوں کراچی شہر کے حالات خاصے ابتر تھے۔ الیکشن سے پہلے کا سیزن موسمِ بہار کا ہوتے ہوئے بھی خزاں آلود سا تھا۔ شوہر کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں تھی...... ایک دل کہہ رہا تھا کہ نہ جاؤں...... مگر دوسرا دل کہہ رہا تھا کہ چلی جاؤں...... وہاں جا کر میاں جی کی طبیعت بھی قدرے بحال ہوجائے گی اور پھر امی کے فون...... بھائی کے فون...... بھتیجیوں کے فون کہ جلدی آئیں...... ورنہ مزہ نہیں آئے گا...... مہندی کی تقریب والے دن میں اور میرے میاں اسلام آباد پہنچے، ان دنوں کراچی میں سالانہ امتحان کا سیزن بھی چل رہا تھا...... یوں عظمٰی اپنے بچوں کے امتحانات کے باعث نہیں جاسکتی تھی۔

پنجاب کی مہندیاں...... کراچی کے مقابلے میں زیادہ زور شور سے ہوتی ہیں...... یا مجھے ہی ایسا لگا۔ خوب گانے اور لُڈی ہوئی...... لڑکی والوں کی تیاری بہت اچھی تھی...... دولھا کا بھائی یا دولھا کی بہن مقابلے میں قدم رکھنے کی بھی جرأت نہیں کر سکے...... مگر سب نے دل کھول کر داد دی......

ماشاء اللہ ہم پانچ بہن بھائی ہیں۔ میں سب سے بڑی ہوں، احمد ندیم صدیقی...... میرے چاروں بھائیوں میں سب سے بڑا ہے۔ ایم فل کر چکا ہے اس کے ریسرچ پیپرز صرف ملکی سطح پر نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر پسند کیے جاتے ہیں۔ ناہید بھابی بھی ماشاء اللہ ڈاکٹر ہیں اور جاب کرتی ہیں۔ چار بچوں میں سے دو ڈاکٹر ہیں اور دو انجینئر...... دلہن بنیش

سے اس کی ناک بھی ٹھیک ہو جائے اور اس کے قد میں بھی اضافہ ہو جائے۔ ساری زندگی آپ کو دعائیں دوں گی۔

جواب:۔ ہمیں جب بھی کوئی خط ملتا ہے ہم اس کا جواب ضرور دیتے ہیں۔ لیٹ بے شک ہو جاتا ہے لیکن جواب اس کا ضرور دیا جاتا ہے۔ آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Merc. sol Teucrium Mar 30، 30, Nux Vomica 30 کے 5,5 قطرے ہر کھانے کے بعد آدھا کپ پانی میں ڈال کر استعمال کریں اور ایک ماہ بعد کیفیت سے آگاہ کریں۔

بیٹے کے لیے بھی Merc.sol 30, Staphysagria 30, Teucrium Mar 30, Baryta Carb 30 کے 5,5 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ استعمال کریں اور ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔ یاد رکھیں یہ تمام ادویات ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی ہی کی ہوں۔

☆☆☆

سر اور داڑھی کے بالوں کا گرنا

سید محبوب علی شاہ، لاہور

سوال:۔ میری داڑھی کے بال جڑ سمیت اور ٹکڑوں کی شکل میں گرتے ہیں۔ فوٹو میں داڑھی لمبی ہے لیکن اب اس سے بھی آدھی رہ گئی ہے اور داڑھی کے بال مزید گر رہے ہیں۔ مذکورہ بیماری عرصہ ایک سال سے ہے اس کا ہومیو پیتھک علاج کروایا لیکن کوئی خاص افاقہ نہیں ہوا۔ داڑھی اور سر کے بالوں کی گروتھ بھی رک گئی ہے۔ مجھے نہ تو کوئی شوگر ہے اور نہ ہی بلڈ پریشر کی شکایت ہے۔ لیکن گردن کو دائیں بائیں موڑنے سے گردن کے پٹھوں میں کھنچاؤ محسوس ہوتا ہے۔ میں روزانہ رات دس بجے سوتا ہوں اور صبح چار بجے تہجد کی نماز کے لیے اُٹھتا ہوں۔ اس کے علاوہ فجر کی نماز کے بعد پارک میں چہل قدمی کرتا ہوں۔ مہربانی فرما کر میرے لیے کوئی ہومیو پیتھک ادویات تجویز فرما دیں تاکہ میری داڑھی اور سر کے بال گرنے بند ہو جائیں اور ان بالوں کی گروتھ بھی دوبارہ شروع ہو جائے۔ بال گرنے کی وجوہات کیا ہیں؟ پرہیز اور خوراک کے بارے میں بھی تحریر فرمائیں۔ شکریہ۔

جواب:۔ بالوں کے گرنے کی کئی وجوہات ہوتی ہیں جن میں سے کچھ وجوہات جو آپ میں ہو سکتی ہیں مثلاً بالوں تک خون کا نہ پہنچنا جس سے ان میں غذا کی کمی ہو سکتی ہے۔ کسی کلر یا تیل کا استعمال جو آپ کی جلد پر کسی جلدی بیماری کا سبب بنے مثلاً ایگزیما وغیرہ۔ متوازن خوراک کا استعمال کریں۔ کیمیکل والی چیزوں کا استعمال اندرونی و بیرونی بالکل نہ کریں۔ Calendula Q کے 20 قطرے تھوڑے سے پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ داڑھی کو دھویا کریں اور جب نہائیں تو سر کو بھی دھوئیں۔ Bacillinum 200 کی صرف ایک خوراک پہلے لے کر اس کے دوسرے دن سے Rhustox 30, اور Graphites 30 کے 5,5 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ لیں۔ دو ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔ واضح رہے کہ یہ تمام ادویات ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی ہی کی ہوں۔